محمد اسحاق بھٹی

www.KitaboSunnat.com

نشریات

www.kitabosunnat.com

گزر گئی گزران

محمد اسحٰق بھٹی

نشریات

۴۰ اُردو بازار، لاہور۔ فون: ۰۳۲۱-۴۵۸۹۴۱۹

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

انتساب

www.KitaboSunnat.com

مجھے نہیں معلوم کہ میری یہ سرگزشت یا سرکھپائی

جس کا نام میں نے ''گزر گئی گزران'' رکھا ہے،

میرے دوست ظفر اللہ جنجوعہ کی توقع کے ہم آہنگ ہے یا نہیں

تاہم یہ جو کچھ بھی ہے میں اس کا انتساب ان کی طرف کرتا ہوں

محمد اسحاق بھٹی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

حرفِ چند

تقریباً آٹھ سال قبل کی بات ہے۔ جولائی کا مہینا تھا اور دن کے گیارہ بجے کا وقت ہو گا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ رسیور اُٹھایا تو آواز آئی: یہ بھٹی صاحب کا مکان ہے؟

عرض کیا: فرمایے کیا ارشاد ہے؟

جواب آیا: میں کراچی سے آیا ہوں، ظفر اللہ میرا نام ہے۔ آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔

پوچھا: اس وقت آپ کہاں ہیں؟

جواب دیا: سروس اسپتال کے قریب میرا قیام ہے۔ وہیں سے بول رہا ہوں۔

پوچھا: آپ کس ذریعے سے تشریف لائیں گے؟

کہا: کار سے آؤں گا۔

میں نے ان کو اپنے گھر پہنچنے کا راستہ بتایا اور عرض کیا کہ میں آپ کو لینے کے لیے سڑک پر کھڑا ہوں گا۔

کچھ دیر بعد ایک کار میرے قریب آ کر رکی۔ اس میں سے ایک خوب رو کشیدہ قامت شخص نکلے۔ تیکھے نقوش، سرخی مائل رنگ، داڑی صاف، نوک دار مونچھیں، ننگا سر، سفید شلوار قمیص میں ملبوس، نہایت تپاک سے ملے۔ میں انھیں گھر لے آیا۔

ان کا لباس اور حلیہ دیکھ کر خیال گزرا کہ پنجابی ہوں گے۔ چنانچہ پوچھا:

آپ کا پورا نام کیا ہے؟

بولے: ظفر اللہ جنجوعہ

میں نے کہا: جنجوعہ برادری کے لوگ جہلم کے علاقے میں بھی رہتے ہیں۔

کہا: میرا وطنی تعلق اسی علاقے سے ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ب

پانی پینے کے بعد گفتگو ہوئی۔

عرض کیا: آپ کی تشریف آوری سے بہت خوشی ہوئی۔ اس گوشہ گیر فقیر کو کیسے یاد فرمایا؟

بولے: میں اس لیے آیا ہوں کہ آپ کراچی چلیں اور کچھ عرصہ میرے پاس قیام کریں۔ وہاں آپ دو کام کریں گے۔ ایک کام یہ کہ وہاں ایک امریکی فیملی کے بعض افراد میرے ملنے والے ہیں اور وہ فارسی پڑھنا چاہتے ہیں۔ آپ ان کو فارسی پڑھائیں۔ وہ اس کا معقول معاوضہ دیں گے۔ دوسرا کام میرا ہے۔ وہ یہ کہ آپ میرے پاس رہ کر اپنے واقعات زندگی لکھیں۔

ظفر اللہ جنجوعہ صاحب نے کراچی رہنے والے میرے بعض ادیب اور مصنف دوستوں کے نام لے کر بتایا کہ ان سے میرے اچھے مراسم ہیں۔

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور معذرت خواہانہ انداز میں کہا کہ میرا تھوڑے یا زیادہ عرصے کے لیے کراچی رہنا مشکل ہے۔

انھوں نے کہا: اگر کراچی نہیں جا سکتے تو یہ وعدہ کریں کہ اپنے واقعات زندگی ضرور لکھیں گے۔

میں نے ان کے کہنے پر وعدہ تو کر لیا لیکن یہ کام کرنے کو جی نہیں مانا، اس لیے کہ یہ بہت مشکل کام ہے۔

کچھ روز کے بعد کراچی سے ان کا ٹیلی فون آیا کہ کام کہاں تک پہنچا؟ میں ان کے اس سوال کا کوئی جواب نہ دے سکا، اس لیے کہ کام شروع ہی نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد ہر اتوار کو ان کا ٹیلی فون آنے لگا۔ میں بے حد پریشان کہ اب کیا کیا جائے۔ کوئی بات لکھنے کے لیے سوجھ نہیں رہی تھی۔ ان کے بار بار فون آئے لیکن کام کا آغاز نہ ہو سکا۔ اس طرح ایک عرصہ گزر گیا اور بات وہیں کی وہیں رہی۔ اس اثناء میں کچھ اور دوستوں نے بھی یہی مطالبہ شروع کر دیا، جو ظفر اللہ جنجوعہ صاحب نے کیا تھا کہ اپنے حالات لکھو۔ لیکن میں اس سے گریز کر رہا تھا۔ گریز کی کئی وجوہ تھیں۔

ایک یہ کہ مجھے زندگی میں ایسے واقعات پیش نہیں آئے جنھیں تحریر میں لانا ضروری ہو۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

دوسری وجہ یہ تھی (جسے اصل وجہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے) کہ دوسرے پر لکھنا بہت آسان ہے اور میں نے ہزاروں لوگوں پر لکھا ہے جن میں مرحومین کے علاوہ، موجودین بھی خاصی تعداد میں شامل ہیں۔ لیکن اپنے آپ پر لکھنا کانٹوں پر گزرنے کے مترادف ہے۔ اگر کوئی اچھا کام اتفاقاً ہو گیا ہے تو اس کی تفصیل بیان کرنے پر نہ ذہن آمادہ ہوتا ہے اور نہ قلم اس کے تمام پہلوؤں کو گرفت میں لانے پر رضا مندی کا اظہار کرتا ہے، جب کہ لکھنے کے لیے ذہن اور قلم کا اتحاد ضروری ہے۔ یہ دونوں متحد نہ ہوں تو چند سطریں بھی لکھی نہیں جا سکتیں۔

تیسری بات یہ کہ میں نے اپنی مختلف کتابوں میں جن شخصیات پر لکھا ہے ان میں سے متعدد شخصیات ایسی ہیں کہ جن کے ساتھ ساتھ خود میں بھی چلتا ہوں یعنی ''درحدیث دیگراں'' کی صورت میں اپنے متعلق میں نے کافی کچھ لکھ دیا ہے۔

لیکن دوستوں کی بارگاہِ اخلاص میں میری گزارش کو قابل پذیرائی نہیں گردانا گیا۔ ان کا خیال تھا کہ میں نے پٹاری میں بہت کچھ بند کر رکھا ہے، یہ باہر آنا چاہیے۔ ان کے اصرار پر میں نے پٹاری ان کے سامنے رکھ دی ہے اور اس کا منہ کھول دیا ہے۔ اس سے انھیں کچھ ہاتھ آتا ہے یا نہیں آتا، یہ ان کی قسمت۔ اس اعتبار سے آپ اسے ''قسمت پڑیا'' بھی کہہ سکتے ہیں۔

نہ میں کسی مذہبی یا سیاسی جماعت کا لیڈر ہوں، نہ خطیب اور مقرر ہوں، نہ بہت بڑا مصنف اور ادیب ہوں، نہ سیاح اور جہاں گرد ہوں، نہ کسی محکمے کا سربراہ ہوں، نہ حاکم یا وزیر ہوں، نہ صنعت کار یا کارخانہ دار ہوں۔ جب ان اوصاف میں سے کوئی وصف بھی مجھ میں نہیں پایا جاتا تو میرے واقعاتِ زندگی کیا ہوں گے۔ محض قلم کا مزدور ہوں اور قلم کے مزدور کے پاس سوائے قلم کے اور کچھ نہیں ہوتا۔

بہر حال جو کچھ مجھے سوجھا یا جو کچھ میں نے مناسب سمجھا لکھ دیا۔ جب تک نہیں لکھا تھا، دوستوں میں بھرم قائم تھا کہ معلوم نہیں میں واقعات کے کتنے خزانوں کا مالک ہوں گا۔ مجھے شبہ ہے کہ اس کے بعد یہ بھرم بھی ختم ہو جائے گا۔ خیر اب تیر کمان سے نکل چکا ہے۔ میں نے اپنا

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

خاندانی پس منظر بھی (جیسا ہے) بیان کر دیا، اپنے دورِ طالب علمی کا تذکرہ بھی کر دیا، اپنی سیاسی زندگی، قید و بند، مزدوری، ملازمت، تدریس، آوارہ گردی، تصنیف و تالیف، سیاسی و مذہبی اکابر سے ملاقاتیں وغیرہ جو کچھ زندگی میں پیش آیا، کانپتے قلم اور لڑکھڑاتے ذہن کے ساتھ تقریباً حوالۂ قرطاس کر دیا۔ میں نے اپنے قارئین دوستوں کو دھوکے میں نہیں رکھا اور کوئی چیز جو میرے نزدیک قابل بیان تھی، ان سے چھپائی نہیں۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ میں امیر خاندان کا امیر فرد ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں غریب خاندان کا غریب فرد ہوں۔ لیکن نہایت آسودگی سے زندگی بسر کرتا ہوں۔ اپنی مالی اور فکری حالت سے بے حد مطمئن ہوں۔ یہ اللہ کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہے۔

برصغیر کی بعض مذہبی اور سیاسی جماعتوں کا بھی مختصر الفاظ میں ذکر کر دیا ہے۔ ان میں وہ جماعتیں بھی شامل ہیں جو آزادی سے پہلے قائم ہوئیں اور وہ بھی جو آزادی کے بعد حالات کے مطابق معرضِ وجود میں آئیں۔ ان کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ ان میں سے بعض مذہبی و سیاسی جماعتوں سے خود میرا تعلق بھی رہا اور میں نے حالات کی روشنی میں ان جماعتوں میں خدمات سر انجام دیں۔

کتاب میں اختصار کے ساتھ بعض ان شخصیات کا ذکر بھی آ گیا، جن سے تھوڑے یا زیادہ میرے مراسم رہے۔ وہ سیاسی شخصیات بھی ہیں، خالص تحقیقی اور علمی شخصیات بھی ہیں اور مذہبی اور سماجی شخصیات بھی ہیں۔

ایک روز صبح کے وقت اسلام آباد سے میرے دیرینہ دوست پروفیسر عبدالجبار شاکر کا ٹیلی فون آیا کہ جو کتاب تم لکھ رہے ہو، اس کے لکھانے میں میرا بھی حصہ ہے، اس لیے اسے ادارہ نشریات شائع کرے گا۔ واقعی انھوں نے فرمایا تھا کہ میں اپنے حالات لکھوں، لیکن میں نے بغیر ان کو بتائے لاہور سے بہت دُور جا کر چوری چھپے کام شروع کیا تھا۔ معلوم نہیں انھیں کیسے پتا چلا کہ میں یہ حرکت کر رہا ہوں۔ بہرکیف میں نے اپنے دوست کے ارشاد کی تعمیل کی اور جو کچھ لکھا ان کے صاحب زادوں (عزیز القدر رفیع الدین حجازی اور جمال الدین افغانی) کے یہ کہہ کر سپرد کر دیا کہ تو دانی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

حساب کم وبیش را۔

اب سنیئے کتاب کب لکھنا شروع کی اور کہاں لکھی۔

دسمبر ۲۰۰۷ء میں میرا داماد اور میری بیٹی جو بہاول نگر رہتے ہیں حج بیت اللہ کے لیے گئے۔ میرا داماد میرا ہم نام ہے اور بیٹی کا نام ہے سمیہ زیرک۔ اس نام میں عربی اور فارسی دونوں ترکیبیں جمع ہیں۔ ان کی غیر حاضری میں میرا اور میری (مرحومہ) بیوی کا اپنے نواسے نواسیوں کے پاس بہاول نگر جانے کا پروگرام بنا۔ وہاں میں نے سوچا کہ اس فرصت اور تنہائی میں ظفر اللہ جنجوعہ اور دوسرے دوستوں کے فرمان پر عمل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ چنانچہ اللہ کا نام لے کر ۲۲۔ دسمبر ۲۰۰۷ء کو قلم پکڑا اور ''خاندانی پس منظر'' کے بارے میں جو کچھ مجھے معلوم تھا، لکھ دیا۔ کتاب کا یہ پہلا باب ہے جو دوسرے دن ۲۳۔ دسمبر کو مکمل کر لیا گیا۔ پھر ۲۴۔ دسمبر کو دوسرا باب ''طلب علم کی راہ پر'' لکھا۔ اس طرح ۲۸۔ جنوری ۲۰۰۸ء تک بہاول نگر میں کتاب کے گیارہ ابواب کی تکمیل ہو گئی۔ اس کے بعد لاہور آ گیا اور دیگر تصنیفی کاموں کے ساتھ ساتھ اس کے لیے بھی آہستہ آہستہ قلم گھسیٹتا گیا۔ ہر باب کے آخر میں تاریخ تحریر اور مقام تحریر لکھا گیا ہے۔

اسے داستانِ حیات بھی کہا جا سکتا ہے، سفر زندگی بھی قرار دیا جا سکتا ہے، لوحِ زیست کے نام سے بھی موسوم کیا جا سکتا ہے، عمر رفتہ کی بے مقصد کہانی سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ چند نقوش قدم بھی کہا جا سکتا ہے، ایک فقیر ناتواں کی رودادِ شب و روز بھی کہا جا سکتا ہے، ایک گم نام مسافر کا سفر نامۂ حیات بھی کہا جا سکتا ہے۔ چوں کہ میں نے اسے زندگی کے آخری دور میں لکھا ہے، اس لیے اسے حرفِ آخر یا زندگی کی آخری منزل بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن میرا جی چاہتا ہے کہ اسے ''گزر گئی گزران'' سے تعبیر کیا جائے۔ اگر قارئین محاورہ پورا کرنا چاہیں تو اس کے ساتھ ''کیا جھونپڑی کیا میدان'' کا اضافہ کر لیں۔

میں جو کچھ کر سکتا تھا میں نے کر دیا۔ خوانندگانِ محترم اس سے کیا اثر لیتے ہیں اور اس کے مطالعہ سے ان پر کیا اثرات مترتب ہوتے ہیں، اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہر شخص کا اپنا

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ذوق اور اپنا طریقِ فہم ہے۔ اسی کی روشنی میں وہ کسی معاملے میں ردِّعمل ظاہر کرتا ہے۔

میں چوں کہ فقہی اعتبار سے ایک خاص مکتب فکر سے تعلق رکھتا ہوں اور اسی ماحول میں میری زندگی کی منزلیں طے ہوئی ہیں، اس لیے متعدد مقامات پر اس کا تذکرہ ہوا ہے۔ یہ میری مسلکی مجبوری ہے، جسے کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اُمید ہے لائق احترام قارئین اسے برداشت کریں گے۔

اس کتاب پر ”حرفِ اوّل“ کے عنوان سے میرے دیرینہ دوست پروفیسر عبدالجبار شاکر نے مقدمہ لکھا۔ افسوس ہے وہ ۱۳۔ اکتوبر ۲۰۰۹ء کو اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔ وہ بڑے محترم اور جی دار اہل علم تھے۔ اسلام آباد کے ایک اسپتال میں دل کا آپریشن کرا رہے تھے کہ موت نے آگے بڑھ کر ان کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ ان کی میت ان کے وطن شیخو پورہ لائی گئی۔ میں جنازے میں شرکت کے لیے پروفیسر ڈاکٹر محمد یحییٰ اور اپنے برادرِ صغیر سعید احمد بھٹی کے ساتھ وہاں پہنچا تو ان کا جسد خاکی لوگوں کے ہجوم میں چارپائی پر پڑا تھا اور ان کی روح جنت الفردوس میں پہنچ چکی تھی۔

اس مرحوم نے میری اس کتاب پر جو مقدمہ لکھا، وہ ان کی زندگی کی آخری تحریر ہے جو بے حد معلوماتی تحریر ہے اور ان کے وسعت مطالعہ کی غماز۔ دوسرے لفظوں میں کہنا چاہیے کہ ان کی طرف سے میرے لیے یہ آخری سوغات ہے جو انھوں نے خوبصورت الفاظ میں لپیٹ کر اس کتاب کے صفحات میں نقش کر دی۔ آیے سب مل کر ان کے لیے دُعا کریں کہ اللہ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ آمین

۱۵۔ دسمبر ۲۰۰۹ء
۲۷۔ ذوالحجہ ۱۴۳۰ھ

محمد اسحاق بھٹی
اسلامیہ کالونی، ساندہ، لاہور
ٹیلی فون: 042-37143677

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ترتیب

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ اوّل

انسان اور کائنات کا رشتہ بہت عجیب ہے۔ اظہارِ ذات کریں تو آپ بیتی، اور تذکارِ کائنات سے سروکار رکھیں تو جگ بیتی بن جاتی ہے۔ بسا اوقات آپ بیتی اور جگ بیتی یوں باہم دگر ہو جاتی ہیں کہ ان کی علمی سرحدیں ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتی ہیں۔ انسان اس کائنات میں آنکھ کھولتا ہے تو گھر کی چار دیواری کے آنگن میں بسنے والے خاندان سے مانوس ہوتا ہے۔ ممتا سے تربیت و محبت وصول کرتا ہے تو باپ کی سرپرستی اور شفقت میں اپنے سفرِ حیات کا آغاز کرتا ہے۔ وہ جیسے جیسے بچپن کی سرحدوں سے نکلتا، لڑکپن کی حدود میں داخل ہوتا اور جوانی کے مزے لوٹتا ہوا بڑھاپے اور کہولت کی منزل میں داخل ہوتا ہے تو جادۂ حیات پر چلتے چلتے بصارتوں کے حوالے سے کچھ بصیرتیں سمیٹ لیتا ہے۔ یہ تلخ و شیریں یادیں، تجربات، مشاہدات، احساسات، کیفیات، واردات، خیالات، جذبات اور مطالعات قلم و قرطاس کی زینت بن جائیں تو فرماں رواؤں کی تاریخ، فاتحین کی رزم گاہوں کے قصے، مجاہدین کے ولولہ انگیز معرکے، حریت پسندوں کی داستان اسیری، وقائع نگاروں کے تذکرے، مؤرخین کی یادداشتیں، صوفیا و مشائخ کے ملفوظات، درباریوں کے روزنامچے، سیاحوں کے سفر نامے، شعرا کے غمِ جاناں اور غمِ دوراں کے تجربات اور ادیبوں اور قلم کاروں کے نجی احوال اور ارضی مشاہدات پر مشتمل آپ بیتیاں اور خودنوشت سوانح کے نمونے بن جاتے ہیں۔ اظہار و بیان کی ان تمام صورتوں میں آپ بیتی یا خودنوشت سوانح کے عناصر ترکیبی اور اجزائے تخلیقی موجود ہوتے ہیں۔ مذکورہ بالا صورتوں میں آپ بیتی کی صنف اپنے فن اور اسلوب کے باعث بہت اہمیت کی حامل ہے۔ خودنوشت کا مصنف اگر صداقت شعاری سے حقائق آشنا ہے تو اس کی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

باطنی واردات، نفسی کیفیات، قلبی احساسات، شخصی جذبات، علمی خیالات، ذہنی مطالعات، ارضی مشاہدات اور نجی حالات ایک کامیاب آپ بیتی کا لوازمہ بن جاتے ہیں۔ آپ بیتی میں ایسی صداقت شعاری، راست بازی، حقیقت نگاری، برملا گوئی، غیر جانب داری اور صاف گوئی اس کی کتابِ حیات اور صحیفۂ زندگی کو کامیابی اور جاذبیت کا لبادہ پہنا دیتی ہے۔ ان مثبت رویوں کی نسبت اگر کوئی ادیب یا قلم کار کسی منفی جذبے کے زیر اثر خودستائی، مبالغہ آرائی، خود پسندی، غلط بیانی، غرض مندی، موقع شناسی، رنگ آمیزی، سہل انگاری، دروغ گوئی یا تعصّبات کا شکار ہو جائے تو محض عبارت آرائی اور لذتِ گفتار قارئین یا نقادوں سے خراج تحسین وصول نہیں کر سکتی۔ یہی باعث ہے کہ خودنوشت سوانح کے مصنّفین بے رحم نقادوں کے ہتھے چڑھ کر شخصی وقار کو ضائع کر دیتے ہیں اور ''عزت سادات'' کو گنوا بیٹھتے ہیں۔ یوں آپ بیتی کا فن پل صراط سے گزرنے کے مترادف ہے، جہاں مصنف صفحہ بہ صفحہ اور سطر بہ سطر ایک صلیب اٹھائے پھرتا ہے۔ اگر آپ بیتی صدفی صد حقائق پر مشتمل نہیں تو محض افسانوی اسلوب یا مبالغہ آمیزی اس کی ادبی کامیابی اور علمی کامرانی کی ضمانت نہیں ہوسکتی۔ ایک مسلمان ادیب کے لیے تو یہ مرحلہ اس کے عقیدے سے بھی مستلزم ہے۔

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

اس کائنات کی اوّلین خودنوشت سوانح خود خالق کائنات نے تحریر کی ہے۔ اس کے نقوش فلک بوس پہاڑوں، ان پر موجود گلیشیرز، ان سے گرتی آبشاروں، ان سے نکلتی شور کرتی ندیوں، گھنے جنگلوں اور ان میں بستے جانوروں، سرسبز وشاداب میدانوں، لہلہاتی فصلوں، لق ودق صحراؤں، موج در موج اچھلتے سمندروں، پھلوں اور اجناس کے ذائقوں، چہچہاتے پرندوں، آفتاب و ماہتاب کی سنہری اور روپہلی کرنوں، ظلمتِ شب کے تابندہ ستاروں، خیاباں کے پھولوں اور ان کی عطر بیز خوشبوؤں، گلستان کی رنگتوں اور شادابیوں، برگ سبز سے نکلتی اور پھیلتی رگوں، زمین کے سینے میں مدفون رنگارنگ خزانوں اور فضائے نیل گوں کے نظاروں میں بہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

خوبی اور بہ کمال دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس خالقِ ارض وسما نے اپنی آپ بیتی تحریری شکل میں بھی تین سو چودہ صحائف اور کتابوں کی صورت میں لکھیں اور اپنے مقدس فرشتے جبریل امین علیہ السلام کے توسط سے رسولانِ عظامؑ اور انبیائے کرامؑ کو بھجوائی تاکہ وہ اسے خود پڑھیں اور معرفتِ کردگار کے شعور سے خلقِ خدا کو مطلع کریں۔ اس خودنوشت سوانح اور آپ بیتی کا نقشِ آخریں اس نے قرآن مجید کی شکل میں تحریر کیا جس کے مطالعے سے اذہان کو اس کی موجودگی کا شعور وادراک، نفوس کو اس کی معرفت اور قلوب کو طمانیت کی دولت میسر آتی ہے۔ اس کتاب میں اس نے ایک ایسا لافانی اسلوب، ایک ایسی نادر لغت اور ایک ایسا دل نشیں پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے کہ جس کی نقالی یا تقلید مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ ہاں اس کتابِ زندہ کے خالق نے شاعرانہ تعلّی سے نہیں بلکہ حق گوئی سے کام لیتے ہوئے پوری انسانیت کو ایک تحدّی یا چیلنج دیا ہے کہ اس جیسی آپ بیتی یا خودنوشت لکھ کر دکھائیں۔ چودہ سوتیس برس گزر چکے، مطلع علم وادب پر ہزاروں مشاہیر اور ادیب آچکے مگر کسی ایک میں یہ طاقت اور قدرت نہیں کہ اس چیلنج کا جواب دے سکے۔ خالق ہو تو ایسا بے مثال، تخلیق ہو تو ایسی باکمال اور اسلوب ہو تو ایسا پر جمال......

سبحٰن اللہ وبحمدہ، سبحٰن اللہ العظیم۔

صفحۂ دہر پر صورت گر قدرت نے امیر
ان کی تصویر وہ کھینچی کہ قلم توڑ دیا

اجازت دیجیے کہ پیغمبر رحمت محمد رسول اللہ ﷺ کی آپ بیتی کے بارے میں محض پیرایۂ عقیدت ہی میں نہیں بلکہ حقیقت کے اسلوب میں چند باتیں عرض کروں۔ اس کائنات میں انبیائے کرامؑ کی شخصیات سب سے زیادہ برگزیدہ ہیں مگر افسوس کہ ان میں باستثنائے واحد کسی ذی وقار کی شخصیت کے احوال کاملاً موجود یا محفوظ نہیں ہیں۔ رسول اکرم ﷺ کی شخصیت اور سیرت کا یہ اعجاز ہے کہ آپؐ کی حیاتِ طیبہ اور اسوۂ حسنہ کا ایک ایک لمحہ اور ایک ایک پہلو روز روشن کی طرح واضح اور نقش کالحجر کی طرح محفوظ ہے۔ آپؐ کے مقدس وموقر حیات نامے کا ہر ورق اور اس کی ہر عبارت استناد کے ساتھ موجود ومحفوظ ہے۔ آپؐ کے شجرۂ نسب پر نگاہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

دوڑائیے، والدگرامی کی جانب سے سیدنا آدم علیہ السلام تک کامل معلومات دستیاب ہیں۔ اردو سیرت نگاری کے عظیم محقق قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری نے تو ان کی والدہ ماجدہ کا بھی مکمل شجرۂ نسب تلاش کر کے ننھیال درننھیال کا شجرہ بھی فراہم کر دیا ہے۔

تاریخ انسانی میں ایسا افتخارِ نسب ونسل کسی دوسری شخصیت کو حاصل نہیں۔ آپؐ کے احوال زندگی تو محفوظ ہیں مگر ذرا اس پہلو پر سوچیے کہ آپؐ کی عادات مبارکہ اور خصائل کا بھی مکمل نقشہ علم اور عمل ہر دو اعتبار سے ہمارے سامنے ہے۔ تاریخِ انسانی کی آپؐ واحد شخصیت ہیں کہ جس کی خاموشیوں کو بھی دستور اور آئین کا درجہ حاصل ہے۔ آپؐ کا عمل قرآن مجید کی ناطق تفسیر ہے۔ یہی باعث ہے کہ میرے ایک سکھ دوست سرجیت سنگھ لانبہ نے اپنی کتاب سیرت کا نام ہی ''قرآن ناطق ﷺ'' رکھا ہے۔ آپؐ کی شخصیت کے یہ وہ اجزائے ترکیبی ہیں جنہیں صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ نے مکمل طور پر محفوظ کر دیا ہے اور یہ سب کچھ ذخیرۂ احادیث اور گنجینۂ سنت میں روایت ودرایت کے التزام کے ساتھ موجود ہے۔ یوں جملہ احادیث صحیحہ کا ذخیرہ آپؐ کی براہ راست آپ بیتی ہے اور ان صحاح، سنن، معاجم، مستدرکات مستخرجات، مصنفات اور مسانید کے مجموعے اور ان کے ابواب وفصول آپؐ کی حیاتِ طیبہ اور اسوۂ حسنہ کی کامل اور جامع تفصیلات ہیں۔ اس ایک جامع آپ بیتی کا انعکاس ڈیڑھ لاکھ صحابہ کرامؓ کی زندگیوں میں جھلکتا ہے۔ یوں اس شخصیت کی آپ بیتی نسلاً بعد نسلٍ ہیروں کی طرح دمکتی، ستاروں کی طرح چمکتی اور پھولوں کی طرح مہکتی دکھائی دیتی ہے۔ اللھم صلِّ علی محمد وعلی آل محمد.

تاریخِ انسانی کی اس کرشمہ سازی کا جائزہ لیجیے کہ تنہا آپ کی سیرت اور احوال زندگی ہی محفوظ نہیں ہیں بلکہ ہر وہ چیز جس کا تعلق یا نسبت آپؐ سے قائم ہوئی اس کی آپ بیتی بھی محفوظ ہوگئی۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے ڈاکٹر اسپرنگر نے بجا طور پر فرمایا کہ مسلمانوں کا اسماء الرجال کا علم بھی خوب ہے کہ اپنے ایک پیغمبر کی سیرت (آپ بیتی) محفوظ کرتے ہوئے، انہوں نے پانچ لاکھ مزید (آپ بیتیوں) کو بھی محفوظ بنا دیا۔ یہ تو صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

مابعد کے افراد کے کوائف اور احوال تھے۔ ذرا اس پر توجہ دیجیے کہ جس خاندان میں آپؐ پیدا ہوئے، جن مکانوں میں رہے، جن صحراؤں میں بکریاں چرائیں، جن راستوں کو تجارت کے لیے اختیار کیا، جن پہاڑوں سے گزرے، جن غاروں میں عبادت کی یا پناہ لی، جن میدانوں میں غزوات لڑے، جن باغات کے سائے میں بیٹھے، جن حرمین اور مساجد کو عبادت گاہ بنایا، جو کھانے آپ نے تناول فرمائے، جس نوع کے لباس پہنے، جن اکل وشرب کے ظروف کو استعمال کیا، جو تلواریں اور تیر استعمال کیے، جو سواریاں استعمال کیں، جو معاہدات کیے یا مکاتیب لکھوائے، جن سیکڑوں مقدمات کے فیصلے کیے اور جن جن سے جب جب اور جیسا جیسا بھی تعلق رہا اور روابط اختیار کیے، ان سب اماکن، افراد اور وقائع کی تفصیلات بھی ایسے محفوظ ہیں، جیسے یہ سب آپ بیتیاں انہوں نے خود لکھی ہوں۔

حسنِ یوسفؑ ، دم عیسیٰؑ، ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

آپ بیتی کے آغاز وارتقا کا جائزہ لیں تو اس کے ابتدائی نقوش مشرقی تمدنوں کی بجائے مغربی تہذیبوں میں ملتے ہیں۔ مسلمانوں کی ابتدائی صدیوں میں سفرنامے یا رحلاتِ علمی کے تذکرے تو ملتے ہیں، جن میں بلاشبہ آپ بیتی کا رنگ شامل ہوتا ہے۔ اسلامی عقائد میں ادّعا گوئی، تحسین طلبی، خوشامد پرستی، ستائش کا خوگر یا تعریف وتوصیف کا رسیا ہونا معیوب تصور کیا گیا ہے۔ اسلامی ریاست میں کسی عہدے کا طلب گار ہونا بھی کسی فرد کی نااہلی کی سب سے بڑی دلیل ہے، تو سوچیے ایسی فضا میں مسلمان علماء وفضلائے روزگار کا خودنوشت سوانح کی طرف رجوع کرنا کس طرح ممکن تھا۔ اس کی بجائے مسلمانوں میں تفسیر وحدیث اور تاریخ ومغازی کے متون نے نشوونما پائی۔ انہی علوم میں اسماء الرجال کا عظیم المرتبت علم بھی ہے کہ جس میں ہزارہا صحابہ کرامؓ کے حالات وسوانح اور ان کے عادات وخصائل کو محفوظ بنایا گیا ہے۔ ان سب پر الگ سے کتب لکھی گئیں۔ تاریخ کو دروس وعبر کے وقائع سے تعبیر کیا گیا۔ سیر ومغازی پر بھی بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ یوں ان علوم کے ذریعے آپ بیتیوں اور جگ بیتیوں کی ایک

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

امتزاجی کیفیت ہزاروں کرداروں کی سوانحی تفصیلات سے معمور ہے۔

اسلامی اور مشرقی ممالک کی نسبت مغرب میں خودنوشت سوانح کی روایت کا سراغ بہت قدیم سے ملتا ہے، جس کا ابتدائی وجود اعترافات (Confessions) کی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔ اعترافات مسیحی عقائد کی روایت کا ایک مستقل حصہ ہیں، جس کے حوالے سے وہ تزکیہ یا (Catharsis) حاصل کرتے ہیں۔ انگریزی ادبیات میں سینٹ آگسٹائن کے اعترافات کو پہلی خودنوشت سوانح (Autobiography) قرار دیا جاتا ہے مگر روسو (Rousseau) کے اعترافات کو اس صنف میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس کے بعد گبن، گوئٹے، تھامس کارلائل، ہرڈر، ایچ جی ویلز، ہربرٹ اسپنسر، جان سٹورٹ مل، برٹرینڈ رسل، جی کے چیسٹرٹن، لی ہنٹ، جان رسکن، بنجمن فرینکلن، آسکر وائلڈ اور رڈیارڈ کپلنگ کی آپ بیتیوں کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ برصغیر میں خودنوشت سوانح کے ابتدائی نقوش کا سراغ لگائیں تو بعض دل چسپ حقائق سامنے آتے ہیں۔ مغل بادشاہوں میں ظہیرالدین بابر، اس کی بیٹی گلبدن بیگم اور جہانگیر نے بالترتیب تزک بابری، ہمایوں نامہ اور تزک جہانگیری جیسی لافانی تحریریں لکھی ہیں۔ محی الدین اورنگ زیب عالمگیر جو بقول علامہ اقبال ''ترکش مارا خدنگ آخریں'' تھا، اس کی ''رقعات عالمگیری'' کو بھی ہم نیم خودنوشت سوانح تصور کر سکتے ہیں۔ ان سب کے اردو تراجم ہو چکے ہیں۔ اردو زبان میں خودنوشت سوانح کی ابتدائی جھلکیاں ہمیں روزناموں، سفرناموں، خطوط، رپورتاژ اور بزرگوں کے ملفوظات میں دکھائی دیتی ہیں۔ مرزا اسد اللہ خان غالب کی زندگی کی بہت سی کیفیات ہمیں ان کے اشعار سے ملتی ہیں مگر ایک بھرپور آپ بیتی کا لوازمہ ان کے مکاتیب میں پھیلا ہوا ہے۔ میرے شاگردِ عزیز ڈاکٹر اشفاق احمد ورک نے اردو زبان میں خودنوشت خاکوں کا ایک بہترین مجموعہ ''خودستائیاں'' کے عنوان سے مرتب کیا ہے۔ جس میں مرزا غالب کے خطوط سے مرتبہ خاکے کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ کچھ اسی نوعیت کا ایک تفصیلی کام مرزا غالب کی سوانح کے سلسلے میں مولانا غلام رسول مہر نے بھی کیا ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

تاریخ ادبیات اردو کے مؤرخین اور تذکرہ نگاروں نے خودنوشت سوانح کے ابتدائی نقوش کا سراغ لگاتے ہوئے بہت دلچسپ تفصیلات فراہم کی ہیں۔ ان کی تحقیقات کی روشنی میں اردو زبان میں آپ بیتیوں کا دور انیسویں صدی عیسوی کے ربع اوّل سے شروع ہو جاتا ہے۔ ۱۸۲۰ء میں کلکتہ سے پتمبر سنگھ کی آپ بیتی شائع ہوئی۔ ۱۸۶۸ء میں رجب علی ارسطو جاہ نے اپنی خودنوشت سوانح تحریر کی جو ہنوز تشنۂ طباعت ہے۔ عبدالغفور نساخ کی آپ بیتی لائق مطالعہ ہے۔ ۱۸۸۶ء میں عظیم حریت پسند مجاہد جعفر تھانیسری کی ''تواریخ عجیبہ المعروف بہ کالا پانی'' شائع ہوئی۔ اس آپ بیتی کو بہت مقبولیت حاصل رہی ہے۔ ادبیاتِ اردو کے ایک جیّد استاد اور محقق ڈاکٹر معین الدین عقیل نے بہت تلاش و جستجو سے ''بیتی کہانی'' کا سراغ لگایا اور اس کے متن کو شائع کیا۔ یہ خودنوشت سوانح ریاست پٹودی کے نواب اکبر علی خان کی بیٹی شہر بانو بیگم نے ۱۸۸۵ء میں اپنی انگریز دوست مس فلیچر کی فرمائش اور فہمائش پر لکھی جسے اردو زبان میں کسی خاتون مصنفہ کی پہلی آپ بیتی قرار دیا جا سکتا ہے۔

ہم روزنامچوں اور مکاتیب کے حوالے سے خودنوشت سوانح کے اجزائے ترکیبی کا ذکر کر چکے ہیں۔ مولوی مظہر علی سندیلوی نے ۱۹۱۱ء میں ۹۹۷ صفحات پر مشتمل اپنا روزنامچہ یادگار چھوڑا ہے۔ دہلی کے خواجہ حسن نظامی کے روزنامچوں نے بھی بہت شہرت حاصل کی۔ مکاتیب کے سلسلے میں ہم مرزا غالب کا ذکر کر چکے۔ ان کے علاوہ شبلی نعمانیؒ، ابوالکلام آزادؒ، علامہ محمد اقبالؒ، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، فیض احمد فیض، مشفق خواجہ اور بیسیوں دوسرے مشاہیر کے مکاتیب بھی خودنوشت سوانح کا لوازمہ فراہم کرتے ہیں۔ اس نوع کے کام کی ایک شکل مرزا غالبؔ کے سلسلے میں سامنے آئی ہے۔ اس طرز تحقیق اور پیرایۂ نگارش کو مزید آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ سفرناموں میں بھی خودنوشت کا لوازمہ بہ کثرت موجود ہے، جس کے مطالعے سے سیاحوں کے احوال، مشاہدات اور دلچسپیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ یوسف خان کمبل پوش، سرسید احمد خاں، مرزا نثار علی بیگ، شیخ عبدالقادر، فتح علی قزلباش، خواجہ حسن نظامی، قاضی ولی محمد، قاضی عبدالغفار، ابوظفر ندوی، منشی محبوب عالم، محمود نظامی، بیگم

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

حسرت موہانی، آغا محمد اشرف، سید احتشام حسین، اختر ریاض الدین، ڈاکٹر عبادت بریلوی، سید ابوالحسن علی ندوی، حکیم محمد سعید، ڈاکٹر صہیب حسن اور بہت سے دوسرے سیاحوں کے سفرناموں میں ان کی نجی زندگی کے احوال وکوائف کی دل چسپ تفصیلات دیکھی جاسکتی ہیں جو اپنے فن اور لوازمے کے لحاظ سے خودنوشت سوانح ہی کی ایک جزوی کوشش ہے۔ اس طرح اردو میں رپورتاژ اور بعض ناولوں میں ان کے مصنّفین کی زندگیوں کے دل چسپ احوال ملتے ہیں۔ صوفیائے کرام کے ملفوظات کے متون کے استناد کو اگرچہ شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے مگر ان سے بھی ان شخصیات کے احوالِ سیرت کا ایک جائزہ مرتب کیا جاسکتا ہے۔ خودنوشت سوانح کے سلسلے میں ایک تحقیقی کاوش مدیر نقوش، محمد طفیل کے ہاتھوں ترتیب پائی اور وہ ان کے رسالے کا آپ بیتی نمبر ہے جو جون ۱۹۶۴ء میں منظر عام پر آیا۔ اس میں جہاں سیکڑوں عالمی شخصیات کی چھوٹی بڑی آپ بیتیاں شامل ہیں وہاں آپ بیتی کے فن اور اسلوب کے حوالے سے بہت عمدہ مضامین اور قیمتی معلومات میسر آتی ہیں۔

برصغیر کی سرزمین میں برطانوی اقتدار کے ثقافتی اثرات کے باعث جہاں ہزاروں کتابیں انگریزی زبان میں متعدد اور متنوع موضوعات پر لکھی گئیں، وہیں خودنوشت سوانح کے سلسلے میں سب سے پہلی کاوش اغلباً لطف اللہ کی ہے جو ۱۸۵۴ء میں منصّۂ شہود پر آئی۔ اس کے بعد مولانا محمد علی جوہر، سبھاش چندر بوس، نرادسی چودھری، موہن داس کرم چند گاندھی، جواہر لال نہرو، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان، ائرکموڈور انعام الحق، سردار محمد چودھری، بے نظیر بھٹو اور جنرل پرویز مشرف کے نام شامل ہیں۔ میرے ناقص فہم کے مطابق رضا شاہ پہلوی، ایوب خان اور پرویز مشرف جیسی شخصیات کی خودنوشت سوانح کرائے کے ادیبوں سے لکھوائی گئی ہیں۔ یہ ایک تحقیق طلب اور دل چسپ موضوع ہے کہ ادبیاتِ عالم میں بالعموم اور اردو زبان میں بالخصوص کون کون سی ایسی کتابیں ہیں جن کے مصنّفین کے قلم سے ان تصانیف کے کسی ورق کو سیاہ کرنے کا جرم سرزد نہیں ہوا۔ مذکورہ خودنوشت سوانح میں سے بعض کے اردو تراجم بھی سامنے آئے، ایسی کاوشوں میں جواہر لال نہرو، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان، ائرکموڈور انعام الحق

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

،سردار محمد چودھری، بے نظیر بھٹو اور پرویز مشرف کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ ان تراجم میں سردار محمد چودھری (ریٹائرڈ انسپکٹر جنرل پولیس پنجاب) کی خودنوشت سوانح ''جہانِ حیرت'' ایک تاریخ ساز اور مستند حوالہ ہے۔ اِس سوانح میں ایک ایسے خود ساز (Self Made) شخص کے وقائع ہیں جس نے عسرت بھری زندگی کو ایک جرأت مندانہ اسلوب سے طے کیا اور بیورو کریٹس کی صف میں ایک نمایاں مقام حاصل کیا۔ اپنے فرائضِ منصبی کے دوران انہیں اس مملکت خداداد پاکستان کے اقتدار کی غلام گردشوں میں رونما ہونے والے شرم ناک اور عبرت ناک واقعات کے سربستہ رازوں سے پردہ اٹھانے کا موقع ملا۔ یوں یہ آپ بیتی ایک جگ بیتی کا روپ دھار کر ہمیں اپنے سربراہوں کے کرتوتوں سے آگاہ کرتی ہے۔

اُردو ادبیات میں خودنوشت سوانح کا سفر انیسویں صدی کے ربع آخر میں شروع ہوا اور اب اس کے دامن میں سیکڑوں اچھی آپ بیتیاں لائقِ مطالعہ ہیں، جن میں ظہیر دہلوی کی ''داستانِ غدر''، خان بہادر منشی محمد عنایت حسین کی ''ایامِ غدر''، سر رضا علی کی ''اعمال نامہ''، حکیم احمد شجاع کی ''خون بہا''، مولانا حسین احمد مدنی کی ''نقشِ حیات'' مولانا ابوالکلام آزاد کا ''تذکرہ''، حسرت موہانی کی ''قیدِ فرنگ''، عبدالماجد دریا بادی کی ''آپ بیتی''، نقی محمد خان خورجوی کی ''عہدِ رفتہ''، چودھری افضل حق کی ''میرا افسانہ''، دیوان سنگھ مفتوں کی ''ناقابلِ فراموش''، رشید احمد صدیقی کی ''آشفتہ بیانی میری''، سید ہمایوں مرزا کی ''میری کہانی، میری زبانی''، عبدالمجید سالک کی ''سرگزشت''، ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی ''میری داستانِ حیات''، آغا شورش کاشمیری کی ''بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل''، چودھری ظفر اللہ خاں کی ''تحدیثِ نعمت''، میرزا ادیب کی ''مٹی کا دیا''، مسیح الدین علوی کی ''سفیرِ اودھ''، اختر حسین رائے پوری کی ''گردِ راہ'' صادق الخیری کی ''میری زندگی فسانہ'' ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کی ''رو میں ہے رخشِ عمر''، ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی ''یادوں کی دنیا''، عشرت رحمانی کی ''عشرتِ فانی''، نوب سعید احمد چھتاری کی ''یادِ ایام'' عبدالرزاق کانپوری کی ''یادِ ایام''، مرزا فرحت اللہ بیگ کی ''یادِ ایام''، شاد عظیم آبادی کی ''شاد کی کہانی، شاد کی زبانی''، ضمیر جعفری کی ''ضمیر

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

حاضر، ضمیر غائب''، شوکت تھانوی کی ''مابدولت''، شیخ محمد عبداللہ کی ''آتشِ چنار''، قدرت اللہ شہاب کی ''شہاب نامہ''، مشتاق یوسفی کی ''زرگزشت''، حجاب امتیاز علی کی ''لیل ونہار''، سعیدہ بانو احمد کی ''ڈگر سے ہٹ کر''، کشور ناہید کی ''بری عورت کی کتھا''، قرۃ العین حیدر کی ''کارِ جہاں دراز ہے''، شہرت بخاری کی ''کھوئے ہوؤں کی سرگزشت''، ممتاز مفتی کی ''علی پور کا ایلی'' اور ''الکھ نگری''، صدیق سالک کی ''میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا'' اور ''ہمہ یاراں دوزخ'' حمید نسیم کی ''ناممکن کی جستجو''، کرنل محمد خان کی ''بجنگ آمد''، محمد لطف اللہ خاں کی ''ہجرتوں کے سلسلے''، رانا تاب عرفانی کی ''اپلوں کا دھواں''، جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کی ''اپنا گریباں چاک''، ملّا واحدی دہلوی کی ''میرا افسانہ''، ائرکموڈور انعام الحق کی ''آئینہ ایام''، سردار محمد چودھری کی ''جہانِ حیرت''، بریگیڈیئر گلزار احمد کی ''تذکرۂ ایام''، محمد صدیق تہامی کی ''ذوقِ پرواز'' اور قاضی عبدالقادر کی ''یادوں کی تسبیح'' اپنے کوائف اور اسلوب کے اعتبار سے بہترین ہیں۔

پیش نظر خود نوشت سوانح ''گزر گئی گزران'' اردو زبان وادب کے ایک صاحب طرز ادیب اور ایک مخصوص اسلوبِ نگارش کی حامل شخصیت محترم محمد اسحٰق بھٹی صاحب کی آپ بیتی ہے جو برصغیر کی سیکڑوں ریاستوں میں سے مشرقی پنجاب کی ایک ریاست فرید کوٹ کے قصبہ کوٹ کپورہ میں ۱۵ مارچ ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوئے۔ فطرت نے انہیں تاریخ وتذکرہ اور سیرت وسوانح کا ایک خاص تحقیقی ذوق اور علمی مزاج عطا کیا ہے۔ گزشتہ ساٹھ صدی سے ان کے قلم سے بیسیوں تحقیقی کتابیں اور سیکڑوں علمی مضامین ومقالات زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ ان کی صحافیانہ تحریریں اس پر مستزاد ہیں۔ وہ کئی اداروں اور تنظیموں کے رسائل وجرائد کے مدیر رہے۔ خود اپنا ایک جریدہ ''منہاج'' کے نام سے نکالا۔ ممتاز علمی اور تحقیقی ادارے ''ادارہ ثقافتِ اسلامیہ'' لاہور سے منسلک ہوئے تو اپنے تحقیقی کاموں کے انبار لگا دیئے۔ ان میں سے بعض موضوعات پر تو پہلی مرتبہ علمی اور تحقیقی لوازمہ سامنے آیا۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر ان کے پروگرام نشر ہوئے۔ بیسویں صدی عیسوی میں پون صدی تک کی سیاسی، مذہبی اور سماجی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

تحریکوں کا براہ راست مشاہدہ کیا۔ برصغیر میں ملت اسلامیہ کے تاریخی اور سیاسی مدّ وجزر کے وہ براہ راست شاہد ہیں۔ گزشتہ ساٹھ سال سے ان کا قلم علمی اور تحقیقی جواہر پاروں کے ڈھیر لگا رہا ہے۔

محترم محمد اسحاق بھٹی صاحب کی شخصیت پر نگاہ ڈالیے، وہ دنیاوی عزو افتخار کے مناصب میں سے کسی پر کبھی فائز نہیں رہے۔ بیورو کریٹس والے اختیارات انہیں میسر نہیں۔ صنعت کاروں اور جاگیرداروں والے مزاج سے کوسوں دور زندگی گزارتے ہیں۔ جس علمی قبیلے اور اہل قلم کے خاندان سے ان کا تعلق ہے، ان کے عادات واطوار بھی ان میں دکھائی نہیں دیتے۔ پچاس ہزار صفحات کو اپنے خون جگر سے لکھنے والا مصنف ایک پانچ مرلے کے سادہ ترین مکان میں مشترکہ خاندانی نظام والی زندگی بڑے صبر وسکون اور قناعت سے بسر کر رہا ہے۔ اس کے مزاج کی سادگی کو دیکھیے تو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ ان کی سچائی اور صداقت شعاری کی روش کا جائزہ لیں تو ان کی پاک نفسی اور شخصیت کے اجلے پن کا اندازہ ہوتا ہے۔ نہ لباس کی تراش خراش کا خیال اور نہ لب ولہجے کی مصنوعی اداؤں سے کوئی تعلق، بس اخلاص و وفا کا مجسمہ، محبت واخوت کا پیکر، ایثار وہمدردی کی تصویر، سادگی اور قناعت کا خوگر اور علم اور قلم کی دولت سے مالا مال شخص کہ جس سے ایک بار ملو تو بار بار ملنے کو جی چاہتا ہے۔ ایک دیہاتی ماحول میں آنکھ کھولنے والے دہقان زادے کی خدماتِ جلیلہ پر نگاہ ڈالیے تو شہری تمدن کے باسی شرما جائیں۔ اس بدوی کو حضروی زندگی اختیار کرنے والوں پر کئی اعتبار سے سبقت اور فضیلت حاصل ہے۔ اس کی داستانِ حیات کے ہر ورق کو پڑھتے جایئے تو اس کے حافظے اور استحضار پر رشک آتا ہے۔ ان سب باتوں، یادوں اور یادداشتوں کو وہ جس روانی سے پیش کرتا ہے، ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی قصۂ ماضی نہیں بلکہ وارداتِ حال ہے جو ابھی اس کی نظروں کے سامنے بیت رہی ہے۔ اس آپ بیتی کا سب سے بڑا کمال مصنف کی راست گفتاری اور صداقت شعاری ہے۔ اسی خاطر آپ بیتی میں سچ بولنا پل صراط پر چلنے کے مترادف ہے۔ ستائیس ابواب کی چار سو سے زائد صفحات پر مشتمل اس خود نوشت سوانح میں مصنف جابجا اپنے کندھوں پر ایک صلیب اٹھائے دکھائی دیتا

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ہے۔ اسے نہ تو کسی کے انتقام کا خوف ہے، نہ ستائش کی تمنا اور نہ صلے کی پروا۔ اس ایک خوبی نے اس آپ بیتی میں بیسیوں محاسن پیدا کر دیئے ہیں۔ یہ وقائع صرف دل چسپ ہی نہیں سبق آموز، بصیرت افروز بلکہ بعض مقامات پر عبرت انگیز بھی ہیں۔ میں نے شاید کسی جگہ لکھا تھا کہ غزل تو جوانی میں کہی جا سکتی ہے مگر آپ بیتی کا رنگ بڑھاپے کی سرحد میں داخل ہو کر سال خوردگی کے مراحل میں چمکتا ہے، کیوں کہ یہی وہ مقام ہے جہاں خود بینی کا جوہر جہاں بینی میں ڈھلتا ہے اور خدا فراموشی، خداشناسی میں بدل جاتی ہے۔ اپنی ذات کے حسن و قبح کو پیش کرنا ایک کار دشوار ہے۔ مصنف کو اپنے ذاتی وقائع میں غربت و عسرت کی زندگی کو پیش کرتے ہوئے کسی نفسیاتی صورتِ حال کا خوف دامن گیر نہیں۔ وہ اپنے حالات پر قانع اور احوال پر مطمئن ہے۔

نہ پوچھ حال مرا چوبِ خشکِ صحرا ہوں
لگا کے آگ جسے کارواں روانہ ہوا

''ایک درویش کی یہ سرگزشت'' برصغیر کی گزشتہ ایک صدی کی جگ بیتی بھی ہے۔ اس میں زندگی اور زمانے کے سارے احوال و حوادث سمٹ آئے ہیں۔ بالخصوص برصغیر کی سیاسی تقسیم نے دنیا کی سب سے بڑی ہجرت کو جنم دیا جس کے جلو میں مصائب کا ایک سیل بے پناہ موجود تھا۔ مسلمانوں نے آگ اور خون کے اسی دریا سے گزرتے ہوئے، ایک عظیم مقصد کے لیے بے پناہ قربانیاں دیں مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ بھٹی صاحب کے قلم نے اس المیہ کی تمام تفصیلات کو مائیکروسکوپ کے منظر کی طرح پیش کر دیا ہے۔ ایسی واقعاتی تفصیلات اور جزئیات آپ کو کسی دوسری آپ بیتی میں کم دکھائی دیں گی۔ مجھے اس آپ بیتی کے جس پہلو نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ یہ ہے کہ مصنف نے اپنی زندگی کے کسی واقعہ کے کسی پہلو کو چھپانے کی کوشش نہیں کی اور ہر بات سچائی سے لکھ دی ہے۔ یہی وہ جوہر ہے جو کسی آپ بیتی کو عظمت کا تاج اور بقائے دوام کا خلعت پہنا دیتا ہے۔ اس آپ بیتی میں برصغیر کی تاریخی، سیاسی، مذہبی، علمی، ثقافتی اور معاشرتی زندگی کے ایسے نقشے ملیں گے جو سب یک جا صورت،

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

میں کسی اور جگہ میسر نہیں آتے۔ اس میں برصغیر کے مختلف شعبہ ہائے حیات سے تعلق رکھنے والی شخصیات اور اکابر کا بڑا عمدہ تذکرہ ملتا ہے۔ کسی تصنیف بالخصوص آپ بیتی میں وقائع اور اسلوب کی ایسی صفات کا جمع ہونا مصنف کے تزکیۂ نفس اور مکارمِ اخلاق سے متصف ہونے کی دلیل ہے۔ حرف اوّل کی ان سطور میں تمام وقائع کا احاطہ ممکن نہیں، قارئین اس دل چسپ اور خرد افروز داستانِ حیات کا مطالعہ کریں گے تو انہیں اس میں شعلہ وشبنم کا امتزاج ملے گا۔

ہم سمندر باش وہم ماہی کہ در اقلیمِ عشق

روئے دریا سلسبیل وقعرِ دریا آتش است

بھٹی صاحب نے ''گزر گئی گزران'' میں تجربات کا تنوع، مشاہدات کی گہرائی، واقعات کا استحضار، مطالعے کی وسعت، حافظے کی نعمت، اظہار کی قدرت، اسلوب کی ندرت اور دین کی حمیت جیسی اقدار اور خصائص کو پیش کر کے ادبیاتِ اردو کے دامن میں ایک مستقل معیار کی حامل آپ بیتی کا اضافہ کیا ہے۔ یہ آپ بیتی کراچی کے ظفر اللہ جنجوعہ صاحب کی فرمائش اور راقم کی مستقل فہمائش کے نتیجے میں تکمیل پذیر ہوئی۔ ادارہ نشریات، لاہور کے جواں سال اور جواں ہمت مدیر ومنتظم نے گزشتہ تین سالوں میں ساٹھ کے قریب معیاری کتب شائع کر کے علمی اور طباعتی افق کو روشن اور منور کیا ہے۔ یہ آپ بیتی بھی ادارے کے علمی اور طباعتی قد وقامت میں ان شاء اللہ اضافہ کرے گی۔ اردو خواں دنیا کو محترم محمد اسحٰق بھٹی صاحب کی تحریر شدہ آپ بیتی کی یہ علمی سوغات مبارک ہو۔

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال

ہم انجمن سمجھتے ہیں، خلوت میں کیوں نہ ہو

۹/اکتوبر ۲۰۰۹ء

پروفیسر عبدالجبار شاکر

ڈائریکٹر، نیشنل سیرہ اسٹڈی سنٹر،

انٹرنیشنل اسلامک یونی ورسٹی، اسلام آباد

❀❀❀❀

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

پہلا باب:

خاندانی پس منظر

میرا مختصر سلسلۂ نسب جو مجھے میرے دادا مرحوم نے بتایا تھا، یہ ہے:

محمد اسحاق بن عبدالمجید بن محمد بن دوست محمد عرف دسوندھی بن منصور بن خزانہ بن جیوا۔

میاں جیوا مشرقی پنجاب کی سابق ریاست پٹیالہ کے ضلع برنالا کے ایک قصبہ ''ہنڈائیہ'' کے رہنے والے تھے۔ ان کی تاریخ ولادت و وفات کا علم تو نہیں ہوسکا، لیکن میرے دادا میاں محمد مرحوم نے بتایا تھا کہ میاں جیوا اپنے زمانے کے مہاراجا پٹیالہ کے درباری تھے اور مہاراجا ان کا بہت احترام کرتا تھا۔ ایک دن اس نے میاں جیوا سے کہا کہ آپ اپنے بیٹوں میں سے کسی بیٹے کو دربار میں لایا کریں تا کہ اسے دربار کے طور طریقوں سے واقفیت ہوجائے اور وہ آپ کے بعد آپ کی جگہ سنبھال سکے۔

میاں جیوا نے اس عزت افزائی پر مہاراجا کا شکریہ ادا کیا اور مغموم لہجے میں جواب دیا کہ میرا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ میں تقریباً ساٹھ سال کی عمر کو پہنچ گیا ہوں، لیکن اولاد سے محروم ہوں۔ میری بیوی بھی محرومیٔ اولاد کی وجہ سے پریشان رہتی ہے اور خود مجھے بھی اس کا بے حد احساس ہے۔

میاں جیوا کی یہ بات سن کر مہاراجا حیران ہوا۔ اسے پہلی دفعہ معلوم ہوا تھا کہ اس کا یہ معزز درباری اولاد کی نعمت سے محروم ہے۔ اس نے ان کو دوسری شادی کرنے کا مشورہ دیا، لیکن وہ اس عمر میں شادی پر رضامند نہ ہوئے۔ بالآخر اصرار کر کے مہاراجا نے خود ہی ان کی شادی کردی۔ یہ آج سے کم و بیش اڑھائی سو سال پہلے کی بات ہے۔

اللہ تعالیٰ نے دوسری بیوی سے میاں جیوا کو ایک بیٹا عطا کیا، جس کا نام اُنھوں نے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

''خزانہ'' رکھا اور وہ کثرتِ اولاد و احفاد کی بنا پر واقعی خزانہ ثابت ہوئے اور ان کے بیٹوں، پوتوں اور پڑپوتوں کی تعداد اتنی بڑھی کہ ہنڈائیہ کا قصبہ ان کے لیے تنگ ہوگیا اور خاندان کے مختلف افراد طلبِ معاش کے لیے مشرقی پنجاب کے مختلف علاقوں میں چلے گئے۔

خزانہ کے ایک بیٹے کا نام منصور تھا اور منصور کے دو بیٹے تھے۔ بڑے کا نام دوست محمد تھا جو دسوندھی کے عرف سے معروف تھے اور چھوٹے کا امام الدین...... منصور کے رشتہ داروں کی اچھی خاصی تعداد کوٹ کپورہ (سابق ریاست فرید کوٹ موجودہ ضلع فرید کوٹ مشرقی پنجاب) میں فروکش تھی۔ میاں امام الدین بھی ان کے پاس کوٹ کپورہ چلے گئے تھے۔ وہ نہایت پاکیزہ اطوار بزرگ تھے اور حضرت مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی سے بیعت تھے۔

سیّد عبداللہ غزنوی کی خدمت میں:

میاں امام الدین، مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کے حلقۂ بیعت میں کس طرح شامل ہوئے؟

اس کی وجہ کوٹ کپورہ کے رہنے والے ایک بزرگ حاجی نورالدین کی زبانی سنیے، جن کا ذہن بچپن ہی سے نیکی کی طرف راغب تھا۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ان کے اور میاں امام الدین کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم تھے اور دونوں کی باہمی گفتگو نیکی کے دائرے میں رہتی تھی۔ دونوں کی تعلیم ناظرہ قرآن مجید اور شرعی مسائل پر مشتمل، اُردو کی چند کتابوں تک محدود تھی۔ ان دونوں کو پتا چلا کہ امرتسر کے قریب ایک گاؤں میں جس کا نام ''بستی خیر دین کے'' ہے، افغانستان کے شہر غزنی سے ایک بزرگ آئے ہیں جو دین کے بہت بڑے عالم ہیں اور اللہ ان کی دعا قبول فرماتا ہے۔ لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں، ان سے دینی مسائل پوچھتے ہیں اور ان کے حلقۂ بیعت میں شامل ہوتے ہیں۔ اس بزرگ کا نام عبداللہ ہے۔

یہ میاں امام الدین اور حاجی نورالدین کی جوانی کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں ریلیں اور بسیں نہیں تھیں۔ سفر یا تو پیدل کیا جاتا تھا یا اونٹوں اور گھوڑوں پر۔ رات کا سفر اس عہد میں زیادہ آسان تھا۔ دیہات کے لوگ کھدر کے چھوٹے سے کپڑے میں روٹیاں باندھ لیتے،

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

سالن کے طور پر اچار یا گڑ یا پیاز روٹیوں پر رکھ لیتے۔ ہاتھ میں لاٹھی پکڑتے اور سفر پر روانہ ہو جاتے۔ ان دونوں (میاں امام الدین اور حاجی نور الدین) نے بھی ایسا ہی کیا۔ شام کے بعد کوٹ کپورہ سے پیدل روانہ ہوئے اور دوسرے دن کسی وقت "بستی خیر دین کے" پہنچ گئے جو امرتسر سے چھ سات میل کے فاصلے پر تھی۔ جس بزرگ کی خدمت میں گئے تھے، وہ حضرت مولانا سیّد عبداللہ غزنوی تھے۔ حضرت الامام سیّد عبدالجبار غزنوی کے والد مکرم اور حضرت مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی کے جد امجد۔ تبلیغ توحید کے جرم میں افغانستان کے بادشاہ نے بہت سی تکلیفوں میں مبتلا کرنے کے بعد ان کو اور ان کے اہل وعیال کو افغانستان سے نکال دیا تھا۔ (میں نے اس کی تفصیل اپنی کتاب فقہائے ہند کی دسویں جلد میں بیان کی ہے۔)

میاں امام الدین اور حاجی نور الدین، حضرت سیّد عبداللہ غزنوی کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھیں دیکھ کر نہایت متاثر ہوئے۔ یہ واقعہ حاجی نور الدین مرحوم نے مجھے بتایا تھا۔ اُنھوں نے فرمایا کہ وہ تین دن اور تین راتیں وہاں رہے۔ ان کی اقتدا میں جو نمازیں پڑھیں، ان نمازوں میں اس قدر قلبی سرور حاصل ہوا جو نہ کبھی پہلے حاصل ہوا تھا، نہ بعد میں حاصل ہوا۔ لیکن ان کی زبان ہم نہیں سمجھتے تھے۔ وہ عربی یا فارسی یا پشتو میں بات کرتے تھے اور ہم ان تینوں زبانوں میں سے کوئی زبان بھی نہیں جانتے تھے۔ اس لیے اُنھوں نے ارشاد فرمایا کہ تم لکھو کے جاؤ اور مولانا محی الدین عبدالرحمٰن کی بیعت کرو اور جو مسئلے مسائل وہ بتائیں ان پر عمل کرو۔ چنانچہ یہ دونوں مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کے حلقۂ بیعت میں شامل ہو گئے۔ اس سے چند سال قبل مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی غزنی جا کر مولانا سیّد عبداللہ غزنوی سے شرف بیعت حاصل کر چکے تھے۔ مولانا لکھوی نے ۱۵ ذیقعدہ ۱۳۱۲ھ (۱۰ مئی ۱۸۹۵ء) کو مدینہ منورہ میں وفات پائی۔

حاجی نور الدین اور ان کی اولاد:

حاجی نور الدین آزادیٔ برصغیر کے بعد ایک بہت بڑے قافلے کے ساتھ ۱۹۴۷ء کے ستمبر کے وسط میں پاکستان کی سرحد میں داخل ہوئے اور گنڈا سنگھ والا (ضلع قصور) میں ان کا

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

انتقال ہوا۔ وہیں فیروز پور سے لاہور آنے والی سڑک کے قریب (جسے فیروز پور روڈ کہا جاتا ہے) اُنھیں دفن کیا گیا۔ میں ان کے جنازے میں شامل تھا۔ ان کے اخلاف ضلع فیصل آباد کی تحصیل جڑاں والا کے ایک گاؤں چک نمبر ۳۶ گ ب میں اقامت گزیں ہیں۔

حاجی نور الدین کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام مولوی عبداللہ تھا اور دوسرے کا صوفی محمد۔ مولوی عبداللہ نے دہلی جا کر وہاں کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی تھی اور وہ اپنے عہد اور علاقے کے معروف عالم تھے۔ ان کا کتب خانہ اگرچہ مختصر تھا، مگر علمی اور تحقیقی کتابوں پر مشتمل تھا۔

۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۶ء تک مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کوٹ کپورہ میں تدریس و خطابت کا فریضہ سرانجام دیتے رہے تھے۔ وہ کبھی کبھی اپنی ضرورت کی کسی کتاب کے سلسلے میں ان کے گھر جایا کرتے تھے۔ یہ کتابیں ایک کچے چوبارے کی الماری میں تھیں۔ میں بھی مولانا عطاء اللہ صاحب کے ساتھ جایا کرتا تھا۔ ان کتابوں میں جو مجھے یاد ہیں، تفسیر ابن کثیر، تفسیر جلالین، صحیح بخاری، عون المعبود شرح ابوداؤد، البدایہ والنہایہ جیسی کتابیں شامل تھیں۔ مولانا عبداللہ صاحب کو ہم نے نہیں دیکھا، سنا ہے کہ وہ عالم جوانی میں گھر سے نکل گئے تھے، پھر واپس نہیں آئے۔ یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ وہ جماعت مجاہدین کے ہاں یاغستان یا چمرکنڈ وغیرہ کہیں چلے گئے تھے۔ بہرحال گھر سے جانے کے بعد ان کا کوئی سراغ نہ ملا اور کسی کو ان کے متعلق صحیح طور پر کچھ پتا نہ چل سکا۔

حاجی نور الدین کے دوسرے بیٹے صوفی محمد تھے۔ یہ بھی نہایت صالح بزرگ تھے۔ بہت سال ہوئے وفات پا چکے ہیں۔ ستیانہ بنگلہ (ضلع فیصل آباد) کے مرکز دار الدعوۃ السّلفیہ کے مہتمم مولانا عتیق اللہ سلفی، صوفی محمد کے نواسے ہیں۔ یہ ماشاء اللہ بہت بڑا دار العلوم ہے جو ان کی کوشش سے جاری ہوا۔

میاں امام الدین:

اب میاں امام الدین کے متعلق چند باتیں سنیے۔

میاں امام الدین میرے دادا میاں محمد کے سگے چچا تھے، یعنی دوست محمد (عرف دسوندھی)

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کے بڑے بھائی۔ نہایت متقی اور پرہیز گار بزرگ۔ کوٹ کپورہ کی ایک مسجد کے امام تھے، جسے ''سراجاں والی مسجد'' کہا جاتا تھا۔ مسجد کے قریب ہی ان کا مکان تھا۔ مسجد میں بچوں کو قرآنِ مجید پڑھایا کرتے تھے۔ ان سے بعض ملنے والے اور ان کے متقدی بتایا کرتے تھے کہ جنات بھی ان کے شاگردوں میں شامل تھے۔ ان کے ملنے والوں میں سے بعض لوگوں نے پاکستان آ کر وفات پائی۔ ایک شخص نے بتایا کہ میاں امام الدین نے گائے رکھی تھی۔ ان کے ایک سکھ عقیدت مند نے ان سے کہا کہ آپ کسی شاگرد کو بھیج کر میرے کھیت سے گائے کے لیے چارا منگوالیں۔ میاں صاحب نے ایک لڑکے کو بھیجا اور وہ چارا لایا جس سے میاں صاحب کا گھر بھر گیا۔ میاں صاحب نے اس سے کہا اتنا چارا کیا کرنا تھا؟ کچھ دیر بعد زمین کا مالک سکھ آیا۔ اس نے ہنستے ہوئے میاں صاحب سے کہا کہ آپ نے کس لڑکے کو بھیجا تھا، وہ آدھا کھیت کاٹ لایا ہے۔ میاں صاحب نے تحقیق کی تو چارا لانے والا جن تھا، جو سکھ کے آدھے کھیت کا صفایا کر آیا تھا۔

ہمارے ایک بزرگ حاجی فیض محمد مرحوم کا مکان میاں امام الدین کی مسجد سے متصل تھا۔ اُنھوں نے ایک مرتبہ بتایا کہ کبھی کبھی رات کو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے مسجد کے اندرونی حصے کے فرش پر کوئی زور زور سے پاؤں مار رہا ہے۔ ہمیں پتا ہوتا تھا کہ یہ میاں صاحب کے شاگرد جن ہیں جو یہ حرکتیں کر رہے ہیں۔ حاجی فیض محمد نے قیامِ پاکستان کے بعد ہمارے گاؤں چک نمبر ۵۳ گ ب (جڑاں والا) میں وفات پائی۔

میاں امام الدین محنت مزدوری سے گزر اوقات کرتے تھے۔ عام طور سے وہ اینٹوں کے بھٹے کے لیے کچی اینٹیں بناتے تھے۔ ان کے بیٹے بھی ان کے ساتھ یہی کام کرتے تھے۔ جوں ہی اذان سنتے فوراً کام بند کر کے نماز کے لیے مسجد کو چل پڑتے۔ بیٹوں کو بھی حکم دیتے کہ اُٹھو اور مسجد میں جا کر نماز پڑھو۔ اگر کوئی بیٹا سستی کرتا اور اذان سن کر فوری طور پر مسجد میں نہ آتا اور خیال کرتا کہ جماعت میں ابھی دیر ہے، اتنے میں دو چار اینٹیں اور بنالی جائیں تو میاں صاحب واپس آ کر وہ اینٹیں ضائع کر دیتے جو اس نے اذان کے بعد بنائی تھیں۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

میاں صاحب کی وفات:

میاں امام الدین نے ۱۹۰۴ء کے لگ بھگ وفات پائی۔ میرے والد نے بتایا کہ میاں امام الدین اپنے بڑے بیٹے محمد کے گھر میں تھے اور کئی دنوں سے بیمار تھے۔ جس مسجد کے وہ امام تھے، وہ ان کے مکان کے قریب تھی۔ ان کی بیمار پرسی کے لیے لوگوں کی آمد و رفت کافی بڑھ گئی تھی۔ جس دن ان کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی، لوگ مسجد میں آ کر بیٹھ گئے اور ان کی صحت کے لیے دعائیں مانگنے لگے۔ رات کو بھی بہت سے لوگ مسجد ہی میں رہے۔ میرے والد بیان کرتے ہیں کہ جب فجر کی اذان کا وقت ہوا تو لوگوں نے دیکھا اور میں نے بھی دیکھا کہ محمد کے گھر سے روشنی کی ایک لمبی لکیر نکلی اور تیزی سے آسمان کی طرف چلی گئی۔ اسی وقت اعلان ہو گیا کہ میاں امام الدین وفات پا گئے۔ میرے والد کہتے ہیں کہ میری عمر اس وقت سات آٹھ سال کی تھی اور وہ اپنے والد (میاں حکیم محمد) کے ساتھ مسجد میں بیٹھے تھے۔

میاں امام الدین کی نرینہ اولاد چار بیٹے تھے۔ ان میں سے ایک کوٹ کپورہ میں وفات پا گئے تھے اور تین پاکستان میں فوت ہوئے۔ آگے ان کی اولاد کا سلسلہ چلتا ہے۔

دوست محمد عرف دسوندھی اور ان کی اولاد:

میاں امام الدین کے بڑے بھائی دوست محمد، حکیم تھے۔ ان کے بھی امام الدین کی طرح چار بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے کا نام محمد تھا، وہ میرے دادا تھے اور حکیم تھے۔ ان سے چھوٹے محمد شریف تھے، یہ بھی حکیم تھے۔ ان سے چھوٹے محمد رمضان تھے، یہ بھی حکیم تھے۔ ان کے چوتھے بیٹے حافظ محمد کریم تھے، جو نابینا تھے اور حافظ قرآن تھے۔ بچپن ہی میں مالیر کوٹلہ چلے گئے تھے جو پنجاب میں مسلمانوں کی واحد ریاست تھی۔ (موجودہ جغرافیائی اعتبار سے یہ ریاست ضلع سنگرور کی ایک تحصیل ہے) حافظ محمد کریم نے مالیر کوٹلہ میں شادی کی اور صاحب اولاد ہوئے۔

میرے والد ایک دفعہ انھیں ملنے کے لیے مالیر کوٹلہ گئے تھے۔ بازار میں ان کی برتنوں کی دکان تھی۔ والد مرحوم نے بتایا کہ انھوں نے اس سے قبل حافظ محمد کریم کو صرف ایک دفعہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

دیکھا تھا اور ان سے مصافحہ کیا تھا۔ اب مدت کے بعد دوسری دفعہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور السلام علیکم کہا تو بولے اس آواز میں میرے خون کی جھلک ہے۔ ہاتھ پکڑ کر ٹٹولنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد فرمایا تم میرے بڑے بھائی حکیم محمد کے بیٹے اور میرے بھتیجے ہو۔ پھر ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور وہ اُنھیں گھر لے گئے۔ یہ میرے والد کی ان سے آخری ملاقات تھی۔ کچھ پتا نہیں کہ ان کی آل اولاد کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔

کہا جاتا ہے کہ نابینے کی حس بہت تیز ہوتی ہے اور وہ کسی چیز کو ٹٹول کر حیرت انگیز طریقے سے صحیح نتیجے تک پہنچ جاتا ہے۔ میں جس زمانے میں مرکز الاسلام میں خدمت تدریس انجام دیتا تھا، وہاں سے قریب کے ایک گاؤں میں ایک نابینا سکھ رہتا تھا جو بیل اور بھینس پر ہاتھ رکھ کر بتا دیتا تھا کہ اس کا کیا رنگ ہے۔ کپڑا ہاتھ میں پکڑ کر اس کا رنگ بھی بتا دیتا تھا۔ اس کی وجہ صرف اس کی حس کی تیزی تھی۔ اللہ تعالیٰ کسی سے ایک چیز چھین لیتا ہے تو اس کی جگہ اسے کوئی اور چیز عطا فرما دیتا ہے۔

ہمارے ہاں کوٹ کپورہ میں ایک شخص حافظ محمد تھے جو نابینا تھے اور ارائیں برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ کلائی پر گھڑی باندھتے اور وقت بتا دیتے تھے۔

مولانا ارشاد الحق اثری نے بتایا کہ مکہ مکرمہ سے ایک عالم دین حافظ فتح محمد فتحی ایک مرتبہ فیصل آباد آئے۔ وہ نابینا تھے۔ مولانا محمد اسحاق چیمہ ان سے ملاقات کے لیے ان کی قیام گاہ پر گئے اور خاموشی کے ساتھ ان سے مصافحہ کیا۔ انھوں نے چیمہ صاحب کے ہاتھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: چیمہ صاحب! آپ آگئے "السلام علیکم"۔ حافظ فتح محمد فتحی دراصل پنجاب کے علاقہ چکوال کے رہنے والے تھے۔ اوڈاں والا (ضلع فیصل آباد) میں تعلیم حاصل کرتے رہے تھے۔ چیمہ صاحب سے ان کے میل ملاقات کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ پھر مکہ مکرمہ چلے گئے تھے۔ بہت عرصہ وہاں رہے اور وہیں وفات پائی۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ نابینے کی قوت حس بہت تیز ہوتی ہے۔

بہرحال ہنڈائیہ میرے ننھیال کا مسکن تھا۔ میں اپنے بچپن میں دو مرتبہ وہاں گیا تھا۔ اس

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کے ریلوے سٹیشن کا نام ''کھڈی'' تھا جو بھٹنڈا انبالہ ریلوے سٹیشن پر تھا۔

ہنڈائیہ اس وقت ریتلا علاقہ تھا اور اس ریتلے علاقے میں ہرنوں اور بارہ سنگھوں کے غول کے غول ادھر سے اُدھر گھومتے پھرتے تھے، اور بڑے خوب صورت لگتے تھے۔ نیل گائیں بھی وہاں کثرت سے تھیں۔ یہ جانور فصلوں کو نقصان پہنچانے کا باعث تھے اس لیے لوگ ان کا شکار کرتے تھے۔ ہم نے بچپن میں نیل گائے، ہرن اور بارہ سنگھے کا کئی مرتبہ گوشت کھایا۔

ایک مرتبہ میں اور میری چھوٹی بہن اپنے والدین کے ساتھ ہنڈائیہ گئے۔ میری عمر پانچ چھ سال کی اور بہن کی عمر دو ڈھائی سال کی ہوگی۔ میں اسے اُٹھا کر سیڑھیوں کے ذریعے مکان کی چھت سے نیچے آ رہا تھا کہ اوپر سے دوسری سیڑھی سے ہم گر گئے۔ ادھر ہماری والدہ اور ماموں نے ہمیں دیکھ لیا اور شور مچ گیا۔ ہم ایک دوسرے سے اوپر نیچے ہوتے اور لڑھکتے ہوئے زمین پر آ گرے۔ لیکن کوئی چوٹ نہیں آئی۔ وہ شور اور ہمارا چیخنا چلانا مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میری اس بہن کا نام حبیبن تھا۔ ۱۹؍ دسمبر ۱۹۶۵ء کو عالم جوانی میں اس کا انتقال ہوا۔

میاں جیوا کی اولاد کا سلسلہ ماشاء اللہ بہت وسیع ہے۔ میں ان سب کے متعلق معلومات نہیں رکھتا۔ یہ تمام لوگ آزادئ برصغیر سے بہت پہلے کوٹ کپورہ (ریاست فرید کوٹ) میں لبسے تھے۔ وہیں سے اگست ۱۹۴۷ء میں پاکستان آئے۔ یہاں سے کچھ لوگ مختلف مقامات میں چلے گئے لیکن زیادہ تعداد میں چک نمبر ۵۳ گ ب منصور پور ڈھیسیاں اور جڑاں والا شہر میں آباد ہوئے۔ کچھ لوگ فیصل آباد میں مقیم ہیں۔ بعض قریبی رشتے دار بورے والا (ضلع وہاڑی) میں بھی سکونت پذیر ہیں۔

برادری میں ہم لوگوں کو ''جیوے کے'' کہا جاتا ہے۔ انھی میں سے دو بھائی محمد ابراہیم اور حاجی محمد کریم تھے۔ محمد ابراہیم پاکستان آنے کے چند روز بعد قصور میں انتقال کر گئے تھے۔

حاجی محمد کریم اکتوبر ۱۹۵۶ء میں ہمارے موجودہ گاؤں میں فوت ہوئے۔ کوٹ کپورہ میں ہر حلقے میں ان کا احترام پایا جاتا تھا۔ پاکستان آنے کے بعد ہمارے موجودہ گاؤں میں بھی ان کو عزت کا مقام حاصل تھا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

دو بزرگ اور تھے، وہ تھے مستقیم اور قطب الدین۔ یہ دونوں حقیقی بھائی تھے۔ مستقیم بڑے تھے اور وہ کوٹ کپورہ میں فوت ہوئے۔ قطب الدین نے پاکستان میں وفات پائی۔

جیوے کی اولاد میں ایک بزرگ کا نام چراغ دین تھا۔ ان کا انتقال چک نمبر ۵۴ گ ب (جڑاں والا) میں ہوا۔

میرے دادا میاں محمد:

اپنے خاندان کی اس کہانی کے بعد اب میں اپنے دادا میاں محمد کے بارے میں چند باتیں بیان کرنا چاہتا ہوں۔ میرے اندازے کے مطابق میرے دادا کا سالِ ولادت ۱۸۶۰ء کے لگ بھگ بنتا ہے۔ اس اندازے کی بنیاد یہ ہے کہ ان کی وفات ۱۹۳۹ء میں ہوئی، اس وقت کی ان کی عمر ۸۰ برس کے پس وپیش تھی۔ اس حساب سے ظاہر ہے کہ ان کا سالِ ولادت ۱۸۶۰ء کے آس پاس ہونا چاہیے۔

ان کی ولادت سے تین سال قبل ۱۸۵۷ء کا حادثہ رونما ہو چکا تھا۔ مغلوں کی تین سو پندرہ سالہ حکومت ختم ہو چکی تھی اور انگریزوں نے مکمل طور سے برصغیر پر اپنے اقتدار کا جھنڈا لہرا دیا تھا۔ پرانا معاشرہ، جس نے مغلوں کے دور میں شعور کی آنکھ کھولی تھی، اب انگریزوں کے قبضے میں آ گیا تھا۔

میرے دادا نے عمر کی کافی منزلیں طے کرنے کے بعد حصولِ علم کی طرف توجہ کی تھی۔ پہلے اُنھوں نے کسی بزرگ سے ناظرہ قرآنِ مجید پڑھا، پھر اُردو اور پنجابی نظم کی چند کتابیں پڑھیں۔ انھی دنوں کسی سے حکمت پڑھی۔ لیکن کس سے کیا پڑھا؟ اس کا مجھے علم نہیں۔ یہ بھی یاد نہیں کہ خود اُنھوں نے اس سلسلے میں کبھی کوئی بات کی ہو، البتہ میں نے اپنے شعور کے ابتدائی دور میں جو کتابیں اپنے گھر میں دیکھیں اور اپنے دادا کو ان کتابوں کا مطالعہ کرتے دیکھا، وہ مندرجہ ذیل تھیں:

۱: بڑے سائز اور جلی حروف کا قرآنِ مجید جسے تین ترجمے والا قرآن کہا جاتا تھا۔ ایک فارسی ترجمہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا اور دو اُردو ترجمے ان کے دو صاحب

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

زادوں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے۔ یہ قرآنِ مجید میرے دادا فجر کی نماز کے بعد روزانہ پڑھتے تھے۔ اس کا ایک بڑا سا خوب صورت غلاف تھا اور اس کی جلد کے دونوں طرف پیوست کپڑے کی ایک پٹی تھی جو تلاوت کے بعد نہایت احترام سے اس کے تینوں جانب کردی جاتی تھی۔ آخری عمر میں میرے دادا پڑھنے کی عینک لگانے لگے تھے۔ عینک کا فریم سفید تھا۔ تلاوت کے بعد عینک ڈبی میں بند کرکے قرآنِ مجید کے ساتھ ہی غلاف کے اندر رکھ دی جاتی تھی۔ پاکستان آنے کے بعد میں نے اس سائز کا تین ترجمے والا قرآن تلاش کرنے کی بہت کوشش کی لیکن مجھے ملا نہیں، البتہ الگ الگ چند پارے مل گئے تھے جو مسلسل نہیں تھے۔

۲: ترجمے والے قرآنِ مجید کے علاوہ تین قرآنِ مجید ہمارے گھر میں اور تھے جو قدرے چھوٹے سائز کے تھے۔ ان میں سے دو سرخ کاغذ کے تھے اور ایک سفید کاغذ کا۔ حروف ان کے بھی جلی تھے۔ یہ قرآنِ مجید ترجمے کے بغیر تھے۔

۳: دو نسخے حافظ محمد لکھوی مرحوم کی پنجابی نظم کی کتاب ''احوال الآخرت'' کے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک کا کاغذ سرخی مائل تھا اور ایک کا سفید۔ یہ پنجابی نظم کی کتاب میرے دادا عام طور پر گھر میں پڑھتے اور ہمیں سنایا کرتے تھے۔

۴: حافظ محمد لکھوی کی پنجابی نظم کی ایک اور کتاب ''انواعِ محمدی'' تھی۔ اس میں روزانہ پیش آنے والے فقہی مسائل درج تھے۔ بعض مقامات پر عربی عبارتیں بھی تھیں۔

۵: پنجابی نظم کی حافظ محمد لکھوی کی ایک کتاب ''زینت الاسلام'' ہمارے گھر میں تھی۔

۶: پانچ کتابیں مولوی رحیم بخش کی تھیں۔ ان کا نام تھا: ''اسلام کی کتاب، حصہ اوّل، حصہ دوم، حصہ سوم، حصہ چہارم، حصہ پنجم۔ اسی نام سے کتاب کے چودہ حصے ہیں، لیکن میں نے دس حصے دیکھے ہیں۔

۷: ایک کتاب پنجابی نثر کی ''پکی روٹی'' تھی۔ یہ بھی فقہی مسائل پر مشتمل تھی۔

۸: ایک کتاب کا نام تھا: ''قصہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ''۔ یہ قصہ بھی پنجابی نظم میں تھا۔ غالباً

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

آٹھ صفحات پر مشتمل۔ اس کے مصنف کا نام مجھے یاد پڑتا ہے، روشن دین تھا۔ یہ قصہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام سے متعلق تھا۔

۹: ہمارے گھر میں حکمت یعنی علم طب کے موضوع کی دو کتابیں تھیں اور دونوں پنجابی نظم میں تھیں۔ ایک کتاب کا نام "خیر منکھ" تھا اور ایک کا "کتاب الشفاء"۔ مجھے ان کے مصنفوں کے نام یاد نہیں رہے۔ ان کا انداز پنجابی نظم میں اس قسم کا تھا کہ "جے کوئی پچھے تیرے تائیں" یعنی اگر کوئی شخص تجھ سے فلاں بیماری کے متعلق پوچھے تو تم اس کو فلاں فلاں دوا استعمال کرنے کا مشورہ دو۔

میرے دادا کی یہی مذکورہ بالا چند کتابیں تھیں جو میں نے کوٹ کپورہ میں چھوٹی عمر میں دیکھی تھیں اور جن کے نام مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ بلکہ ان کے رنگ اور سائز بھی یاد ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے اپنے دادا کی کتابوں سے محبت تھی۔ دادا مرحوم قرآنِ مجید کی تو روزانہ نمازِ فجر کے بعد تلاوت کرتے ہی تھے، اس کے علاوہ مذکورہ بالا کتابیں بھی پڑھتے اور ہمیں سناتے رہتے تھے۔ بالخصوص احوال الآخرت، انواع محمدی اور زینت الاسلام اکثر پڑھا کرتے تھے۔ ہمیں دوزخ سے ڈراتے اور جنت کی نعمتوں کا ذکر فرماتے۔

افسوس ہے مجھے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اُنھوں نے پڑھا کس سے تھا۔ خود اُنھوں نے بھی اس کے متعلق کبھی بات نہ کی اور مجھے بھی اس چھوٹی عمر میں اس قسم کی باتیں پوچھنے اور تفصیل میں جانے کا احساس نہیں تھا۔

وہ کئی سال اپنے سسرال موضع نواں پنڈ (ریاست پٹیالہ) میں رہے تھے۔ اس زمانے میں اس گاؤں کے امام ایک بزرگ میاں خیر الدین تھے جو موضع ڈربی (ضلع حصار موجودہ صوبہ ہریانہ) سے تعلق رکھتے تھے۔

نواں پنڈ سے تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک گاؤں "سورتیا" تھا، وہاں کی مسجد کے امام سے ہمارے دادا کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ ایک دفعہ مجھے بھی وہ ان امام صاحب کے پاس لے گئے تھے۔ ان کا رہنے سہنے کا انداز بہت اچھا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ان کی مسجد

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کے حجرے میں بہت سی بڑی چھوٹی کتابیں پڑی تھیں اور وہ کتابیں امام صاحب کے مطالعے میں رہتی تھیں۔ کچھ عرصہ پیشتر تک ان کا نام مجھے یاد تھا لیکن اب ذہن میں نہیں آ رہا۔ جو کتابیں وہاں پڑی تھیں، ان کے ناموں سے مطلع ہونے کا بھی اس وقت مجھے کوئی خیال نہ تھا۔ یہ معلوم کرنے کا بھی شعور نہ تھا کہ یہ کتابیں کس زبان میں ہیں۔ صرف اتنی سی بات معلوم ہے کہ لکڑی کی الماری کتابوں سے بھری ہوئی تھی اور وہ میرے دادا سے دینی مسائل کے متعلق باتیں کیا کرتے تھے۔

نواں پنڈ کے بالکل قریب ایک گاؤں ''پھگو'' تھا۔ وہاں کی مسجد کے امام کے ہاں بھی ہمارے دادا کا آنا جانا تھا۔ مجھے بھی ایک مرتبہ وہ وہاں لے گئے تھے۔ اس گاؤں کے امام سے مقامی بچے بھی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ گاؤں سے باہر کے لڑکے بھی ان کے طلبا میں شامل تھے۔ ان کے حجرے میں بھی میں نے متعدد کتابیں دیکھیں۔

ایک قصبے کا نام ''روڑی'' تھا۔ یہ قصبہ ضلع حصار (موجودہ صوبہ ہریانہ) میں واقع تھا اور نواں پنڈ سے چار یا پانچ کوس کے فاصلے پر تھا۔ اردگرد کے دیہات کا یہ مرکزی مقام تھا۔ اس قصبے میں ایک عالم دین مولانا صوفی محمد سلیمان فروکش تھے۔ دادا مرحوم سے ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ ان کے ہاں بھی ان کی آمد و رفت رہتی تھی۔ دادا مرحوم سے وہ عمر میں بڑے تھے۔ ایک مرتبہ میرے دادا مجھے بھی اپنے ساتھ روڑی لے گئے تھے۔ وہ متقی اور صالح بزرگ تھے۔ میں نے ان کو اپنے بچپن میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ وہ اپنی مسجد کے حجرے میں رہتے تھے۔ ان کی ایک بات مجھے خوب یاد ہے۔ میں ان کے قریب کھڑا تھا کہ مجھے کہا ''بیٹا ایتھے بہہ جا'' (بیٹا یہاں بیٹھ جاؤ) اس نواح میں بچے کے لیے ''بیٹے'' کا لفظ میں نے پہلی دفعہ سنا تھا، جو ہمیشہ کے لیے میرے ذہن کی لوح پر نقش ہوگیا۔ ہمارے گھروں میں بیٹے کے بجائے ''پت'' (پوت) کہا جاتا تھا۔ ''بیٹھ جا پت'' مولانا محمد سلیمان کے حجرے میں چھوٹی بڑی بہت سی کتابیں تھیں۔

اس سے کئی سال بعد میں اپنے ایک مرحوم بزرگ حاجی محمد علی کے ساتھ کوٹ کپورہ سے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

مولانا محمد سلیمان سے ملنے کے لیے روڑی گیا اور اپنا تعارف میاں محمد کے پوتے کے طور پر کرایا تو وہ ان کا نام سن کر خوش ہوئے۔

قیامِ پاکستان کے بعد وہ اپنے خاندان کے ساتھ جہانیاں منڈی (ضلع خانیوال) آگئے تھے۔ ایک مرتبہ ان سے ملاقات کی غرض سے میں وہاں بھی پہنچا۔ اُنھوں نے جہانیاں منڈی میں ۲۱ نومبر ۱۹۴۹ء کو وفات پائی۔ ان کے حالات میں نے اپنی کتاب ''قافلہ حدیث'' میں تفصیل سے لکھے ہیں۔ اپنی ایک اور کتاب ''برصغیر کے اہل حدیث خدام قرآن'' میں بھی ان کے متعلق لکھا ہے۔

ان کے فرزند گرامی مولانا حکیم عبداللہ (روڑی والے) تھے۔ معروف حکیم اور طب سے متعلق بہت سی کتابوں کے مصنف، عالم و فاضل بزرگ۔ یہ بھی میرے مہربان تھے۔ ان پر میں نے اپنی ایک کتاب ''ہفت اقلیم'' میں خاصا طویل مضمون لکھا ہے۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے دادا میاں محمد کے اپنے دور کے بعض علماء و صلحاء سے اچھے مراسم تھے۔

ہمارے دادا کچھ سخت مزاج تھے۔ اس کے ساتھ ہی نہایت جرأت مند اور بے خوف! ان کے دونوں ہاتھوں پر زخموں کے نشانات تھے۔ مَیں نے ایک روز ان نشانات کے متعلق پوچھا تو بتایا کہ ان کا ایک اڑیل اونٹ تھا۔ کسی وجہ سے اُنھوں نے اونٹ کو دو ڈنڈے مارے۔ اس وقت تو اس نے ''اڑی'' چھوڑ دی۔ لیکن دل میں غصہ رکھا۔ اُونٹ کو مارا یا سخت الفاظ میں ڈانٹا جائے تو وہ مارنے اور ڈانٹنے والے کو معاف نہیں کرتا، اس سے بدلہ لینے کی کوشش میں رہتا ہے۔ جو شخص دل میں غصہ رکھے اسے ''شتر کینہ'' کہا جاتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا غصہ اونٹ کے غصے کی طرح ہے، جو دل سے نکلتا نہیں۔

ایک روز دادا مرحوم کھیت میں دونوں ہاتھوں سے اونٹ کو کچھ کھلا رہے تھے کہ اس نے کھاتے کھاتے ان کے دونوں ہاتھ اپنے مضبوط دانتوں کی گرفت میں لے لیے۔ اس وقت وہاں کوئی شخص نہ تھا جو ان کے ہاتھ اونٹ کے دانتوں کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرتا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

اُنھوں نے پورے زور سے اپنے ہاتھ اُونٹ کے منہ سے کھینچے۔ ہاتھ تو اس کے منہ سے باہر آ گئے، لیکن باہر آتے آتے ہاتھوں کی کھال ادھڑ گئی۔ علاج سے ہاتھ ٹھیک ہو گئے، مگر زخموں کے نشانات باقی رہے۔

اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں پیدا کی ہیں، ان کی ضروریاتِ زندگی کے مطابق اُنھیں ہاتھ پاؤں اور دانت وغیرہ دیے ہیں۔ اونٹ کی غذا جنگل کی خاردار گھاس اور درختوں کی ٹہنیاں ہیں، اس لیے اس کو ویسی ہی زبان اور اسی قسم کے دانت عطا فرمائے ہیں تا کہ وہ آسانی سے ان سخت ترین شاخوں کو چبا سکے۔

دادا مرحوم درمیانے جسم کے قدرے طویل قامت تھے۔ سفید کھدر کا تہبند باندھتے اور کھدر ہی کا کھلی آستین کا کرتا پہنتے تھے۔ سر پر ململ کا عمامہ اور اس کے نیچے کھدر کی ٹوپی۔ چہرے کے نقش و نگار تیکھے اور چمک دار آنکھیں۔ ہماری ہوش سنبھلی تو ان کی داڑھی سفید ہو چکی تھی۔ داڑھی پوری تھی مگر اس کا طول و عرض زیادہ نہ تھا۔ صبح کی اذان سے پہلے جاگ پڑتے تھے۔ مجھے بھی اسی وقت جگا لیتے اور اذان سنتے ہی مسجد کو روانہ ہو جاتے۔ میں بھی ان کے ساتھ مسجد میں جاتا۔ وضو گھر سے کر کے نکلتے تھے۔ حقہ پیتے تھے، لیکن نہ کسی سے تمبا کو منگواتے اور نہ کسی سے حقہ تازہ کرواتے۔ یہ کام وہ خود ہی کرتے تھے۔

دادا مرحوم کے بھائی:

میرے دادا سے چھوٹے حکیم محمد شریف تھے۔ میں نے ان کو اپنی زندگی کے بالکل ابتدائی دور میں دیکھا تھا جب کہ وہ اپنی زندگی کی آخری منزل میں داخل ہو چکے تھے۔ گندمی رنگ، سفید لٹھے کا تنگ سی موری کا پاجامہ، سفید ہی قمیص، سر پر ململ کی دستار، سفید پوری داڑھی، ہاتھ میں چھڑی۔ ان کے چھ بیٹے تھے۔ پہلے وہ اپنے تیسرے نمبر کے بیٹے سیف الرحمٰن کے گھر رہتے تھے اور سیف الرحمٰن کی بیوی ہماری حقیقی پھوپھی کریم خاتون تھیں جو ان کی سگی بھتیجی تھیں۔ اُنھوں نے اپنے اس چچا سسر کی بہت خدمت کی۔ وہ ان کی مزاج شناس تھیں۔ ان کے سب سے چھوٹے بیٹے عبدالواحد بھی باپ کے ساتھ اسی گھر میں رہتے تھے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ہماری پھوپھی کریم خاتون وفات پا گئیں تو لائق احترام باپ کو ان کے سب سے بڑے بیٹے عبدالعزیز اپنے گھر لے گئے تھے۔ عبدالعزیز نے بھی باپ کی بہت خدمت کی۔ آخر عمر میں وہ بعض بیماریوں میں مبتلا ہو گئے تھے۔ چارپائی پر لیٹے رہتے تھے۔ میں سلام عرض کرنے ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ وہ مجھے ''بھلا مانس'' کہا کرتے تھے۔ میری والدہ ان کی عیادت کے لیے جاتیں تو فرماتے'' بھلے مانس'' کو بھیجنا۔ ان کا پیغام سن کر میں ضرور حاضر خدمت ہوتا۔ وہ خوش ہوتے اور میرے لیے دعا فرماتے۔ ان کی وفات کوٹ کپورہ میں عبدالعزیز کے گھر ہوئی۔ یہ میرے دادا حکیم محمد کی وفات سے کئی سال پہلے کی بات ہے۔

حکیم محمد شریف سے چھوٹے حکیم محمد رمضان میرے نانا تھے۔ میانہ قد، گداز جسم، چوڑا چہرہ، سرخی مائل گندمی رنگ، تہبند، قمیص اور ململ کی دستار ان کا پہناوا تھا۔ نرمی سے بولتے اور سب سے پیار کا اظہار کرتے۔ گفتگو میں کسی وقت لکنت سی آ جاتی تھی۔ لوگ ان کے پاس علاج کے لیے آیا کرتے تھے۔ پیسے دو پیسے کی، زیادہ سے زیادہ ایک آنے کی دوا دیتے تھے اور مریض تندرست ہو جاتا تھا۔ بعض ایسے مریضوں کو بھی اللہ نے ان کے علاج سے شفا بخشی، جنھیں بڑے بڑے طبیبوں اور ڈاکٹروں نے لاعلاج قرار دے دیا تھا۔ ان کے چار بیٹے تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد جڑاں والا میں اپنے سب سے چھوٹے بیٹے حاجی عبداللہ کے گھر وفات پائی۔ پہلے وہ گاؤں میں اپنے بڑے بیٹے عبدالغنی کے پاس رہتے تھے۔ پھر بیمار ہوئے تو علاج کے لیے حاجی عبداللہ اُنھیں جڑاں والا لے آئے وہیں ۱۹۵۴ء میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے۔ تینوں بھائی حکیم تھے اور اللہ نے ان کے ہاتھ میں شفا رکھی تھی۔

دادا مرحوم کے شاگرد:

اب میں آپ سے اجازت چاہوں گا کہ مجھے دوبارہ اپنے دادا حکیم محمد مرحوم کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع دیا جائے تاکہ جہاں بات ختم کی تھی، وہاں سے سلسلۂ کلام جوڑ سکوں۔

میرے دادا صبح کی نماز کے بعد گھر آتے اور بچوں کو قرآنِ مجید اور پنجابی اور اُردو کی کتابیں پڑھاتے۔ اس وقت کے ان کے شاگرد بچے قیامِ پاکستان کے بعد پوتے پوتیوں اور

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

پڑپوتے پڑپوتیوں والے ہو کر دنیا سے رُخصت ہوئے۔ ان کے جن شاگردوں نے مجھے ان سے اپنی شاگردی کے متعلق بتایا، ان کے نام یہ ہیں:

۱: عبدالمجید:۔ یہ میرے والد تھے۔ ان کے بقول انھوں نے اپنے والد (یعنی میرے دادا) سے ناظرہ قرآنِ مجید پڑھا اور حافظ محمد لکھوی کی پنجابی نظم کی احوال الآخرت اور زینت الاسلام دو کتابیں پڑھیں۔

۲: جمال الدین:۔ یہ ہمارے موجودہ گاؤں میں فوت ہوئے۔ انھوں نے دادا مرحوم سے بقول خود ناظرہ قرآنِ مجید پڑھا۔

۳: نواب الدین:۔ یہ جمال الدین کے چھوٹے بھائی تھے۔ سو سال سے زائد عمر کو پہنچ کر ہمارے موجودہ گاؤں میں ان کا انتقال ہوا۔ انھوں نے دادا مرحوم سے ناظرہ قرآنِ مجید پڑھا۔ نیز حافظ محمد لکھوی کی تصنیف احوال الآخرت پڑھی۔

۴: نور الدین:۔ یہ نواب الدین سے چھوٹے تھے، ہمارے موجودہ گاؤں میں فوت ہوئے۔ انھوں نے دادا مرحوم ومغفور سے قرآنِ مجید پڑھا۔

۵: ولی محمد:۔ یہ نور الدین سے چھوٹے تھے۔ لاہور میں وفات پائی۔ انھوں نے بھی دادا صاحب سے قرآنِ مجید پڑھا۔

۶: شمس الدین:۔ یہ میری دادی مرحومہ کے حقیقی بھتیجے تھے۔ آزادیٔ برصغیر کے بعد ضلع بہاول نگر کے قصبہ ڈونگا بونگا میں آ بسے تھے۔ ۹۰ برس سے زیادہ عمر پا کر فوت ہوئے۔ انھوں نے دادا مرحوم سے قرآنِ مجید پڑھا۔

۷: روشن الدین:۔ اپنے خاندان کے ساتھ چک نمبر ۱۶ برکیاں (ضلع قصور) میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ وہیں فوت ہوئے۔ انھوں نے ہمارے دادا سے ناظرہ قرآنِ مجید پڑھا۔

۸: ان سطور کے راقم عاجز نے اپنے دادا رحمۃ اللہ علیہ سے قرآنِ مجید بھی پڑھا۔ اس کے علاوہ احوال الآخرت، زینت الاسلام، انواع محمدی اور مولانا رحیم بخش کی اسلام کی کتاب کے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

پانچ حصے پڑھے۔ پہلا، دوسرا، تیسرا، چوتھا اور پانچواں حصہ۔

ممکن ہے اور لوگوں نے بھی ان سے کچھ پڑھا ہو، لیکن مجھے اس کا علم نہیں۔ مجھے انہی کا پتا ہے جن کے نام مندرجہ بالا سطور میں لکھے گئے ہیں۔ میں نے ان میں سے کسی کو اپنے دادا سے پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا۔ نہ مجھے اس کے متعلق کبھی میرے دادا نے بتایا۔ یہ میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے کا سلسلہ ہے۔ مجھے یہ باتیں خود انہی حضرات نے ایک سے زیادہ مرتبہ بتائیں جو ان سے پڑھتے رہے تھے۔ یہ تمام استاد شاگرد اللہ کے دربار میں پہنچ گئے ہیں۔ اللہ ان سب کی مغفرت فرمائے۔ آمین ثم آمین!

دادا مرحوم کے بارے میں چند اور باتیں:

۱۔ آزادیٔ ملک سے پہلے زیادہ تر حلوائی ہندو تھے۔ وہ دکانوں پر دودھ بیچتے تھے، حلوا پوری بناتے تھے، لڈو، جلیبیاں، بتاشے، ریوڑیاں وغیرہ زیادہ تر ہندو ہی بناتے تھے۔ اس کاروبار میں مسلمان بہت کم حصہ لیتے تھے۔ ہمارے دادا کے تعلقات غیر مسلموں سے بھی تھے، لیکن وہ غیر مسلموں کے ہاتھ کی بنی ہوئی کوئی چیز نہیں کھاتے تھے۔ بلکہ اسے ہاتھ بھی نہیں لگاتے تھے۔

۲۔ میراثی کے ہاتھ سے بھی وہ کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں لیتے تھے۔ اسے اپنا حقہ بھی نہیں پینے دیتے تھے۔ کوٹ کپورہ میں ہمارے مکان کے دروازے کے آگے اونچا سا تھڑا بنا ہوا تھا۔ ہمارے دادا پیڑھی پر وہاں بیٹھ جاتے اور عام طور سے وہیں حقہ پیتے۔ ان سے ملنے والے بھی وہیں آجاتے اور ان کے ساتھ حقہ نوشی کرتے۔ ایک دن وہ حقہ پی رہے تھے۔ میں ان کے پاس بیٹھا ان سے کچھ پڑھ رہا تھا کہ ایک نوجوان آیا اور سلام کہہ کر اس نے حقے کے ''نیچے'' پر ہاتھ رکھا۔ اس کا مقصد حقہ پینا تھا۔ دادا مرحوم نے اس سے پوچھا: کون ہو؟ اس نے جواب دیا: ''میاں جی! اللہ دیاں کھیراں، اسیں مسلمین ہونے آں'' (میاں جی! اللہ خیر کرے ہم مسلمان ہیں۔) گفتگو میں ایک خاص لہجے کے ساتھ ''اللہ دیاں کھیراں'' اور خود کو ''مسلمین'' کے الفاظ میراثی استعمال کیا کرتے تھے۔ یہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

الفاظ سن کر دادا مرحوم نے کہا: حقے کو ہاتھ نہ لگاؤ۔

۳۔ اللہ ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے، میری اُنھوں نے بہت تربیت کی۔ وہ مجھے اپنے خاص انداز میں دیکھتے رہتے کہ میں کیا حرکتیں کرتا ہوں۔ مجھے میرے ان ہم عمر لڑکوں کے ساتھ چلنے پھرنے اور کھیلنے سے سختی کے ساتھ روکتے، جو ان کے نزدیک شرارتی بچے تھے، اور وہ واقعتہً شرارتی تھے، پڑھنے لکھنے سے گریز کرتے تھے۔

ایک دن ظہر کی نماز پڑھ کر وہ مسجد سے نکلے، ان کے ساتھ ہمارے ایک اور بزرگ تھے، جو شاید ان سے عمر میں بڑے ہوں گے، ان کا نام حاجی طالب علی تھا۔ دونوں کے ہاتھ میں بانس کی ہلکی سی لاٹھیاں تھیں، جنھیں بڑھاپے میں چلنے پھرنے کا سہارا کہا جاتا ہے۔ معلوم نہیں آناً فاناً دونوں میں کیا تلخ کلامی ہوئی کہ ایک دوسرے کو مارنے کے لیے لاٹھیاں کندھوں سے اوپر اُٹھالیں۔ یہ منظر کچھ فاصلے پر سامنے بیٹھے ہوئے حاجی طالب علی مرحوم کے بیٹوں (خوشی محمد اور نور محمد) نے بھی دیکھا اور میرے والد نے بھی دیکھا۔ اور بھی بہت سے لوگوں کی اس پر نگاہ پڑی۔ سب ہنسنے لگے کہ ان کو آپس میں باتیں کرتے کرتے کیا ہوا، لیکن ان کی طرف کوئی نہیں گیا۔ چند ثانیوں میں حاجی طالب علی صاحب اپنے گھر چلے گئے اور ہمارے دادا اپنے گھر آ گئے۔

اس سے دوسرے یا تیسرے دن بعد میرے دادا حسب معمول اپنے گھر کے دروازے کے باہر بیٹھے حقہ پی رہے تھے، اور میں گھر کو آ رہا تھا۔ ادھر ہمارے بزرگ حاجی طالب علی بھی جا رہے تھے، میں نے ان کو سلام کیا۔ معلوم نہیں اُنھوں نے سنا یا نہیں سنا۔ میرے دادا دیکھ رہے تھے۔ میں گھر آیا تو فرمایا تم نے طالب علی کو سلام نہیں کیا؟ عرض کیا، سلام کیا ہے۔ فرمایا وہ تو سلام کرنے والے بچے کے سر پر ہاتھ رکھتا اور اُسے دعا دیتا ہے۔ اس نے تمھارے سر پر ہاتھ نہیں رکھا، اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے سلام نہیں کیا۔ جاؤ جا کر سلام کرو۔ ہم انھیں نانا کہا کرتے تھے۔ میں دوڑتا ہوا گیا اور کہا: نانا جی السلام علیکم۔ انھوں نے میری طرف دیکھا اور کہا: ''توں محمدے دا پوترا ایں؟'' (تم محمد کے پوتے ہو؟) میں نے کہا: ''جی ہاں!'' اُنھوں

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

نے میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور فرمایا: جیتے رہو، خدا تمھیں بڑی عمر دے اور نیک بنائے۔

یہ تھا ہمارے دادا کی تربیت کا ایک انداز۔ اُنھیں شبہ پڑا کہ کل میں اور حاجی طالب علی جھگڑ پڑے تھے، اس کا اثر شاید اس بچے پر بھی پڑا ہے، اس لیے اس نے ان کو سلام نہیں کیا۔

اب اس کے بالکل برعکس یہ حال ہے کہ ماں باپ کسی سے جھگڑ پڑیں تو اس کے خلاف اِدھر اُدھر کی جھوٹی سچی باتیں بچوں کے سامنے کرتے ہیں اور بچوں کے ذہن پوری طرح ان کے خلاف بھر دیتے ہیں۔

حاجی طالب علی بہت نیک آدمی تھے۔ ہمارے قریبی رشتہ دار تھے۔ ان کے بیٹے بیٹیاں میرے دادا کو ماموں کہا کرتے تھے۔ دوسرے تیسرے دن حاجی صاحب خود ہی میرے دادا کے پاس آئے اور باتیں کرنے لگے۔ دو روز پہلے کی بات دونوں بزرگ بھول چکے تھے۔ وہ بے حد مخلص لوگ تھے، ان کے دل کدورت سے پاک تھے۔ ادھر کوئی تلخ بات ہوئی، ادھر تھوڑی دیر بعد ختم ہوگئی۔ اب ان اوصاف کے لوگ کہاں پیدا ہوں گے۔ میں نے بے شک ان کو دیکھا ہے اور ان کی عادات سے آگاہ ہوں، لیکن مجھے یہ بات تسلیم کر لینی چاہیے کہ مجھ میں وہ اخلاص نہیں ہے جو ان لوگوں کو بارگاہِ الٰہی سے ملا تھا۔

حاجی طالب علی کے ایک پوتے حاجی محمد ارشاد کی شادی میری چھوٹی بہن سے ہوئی۔ دونوں میاں بیوی نے حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ یہ بھی اپنی اپنی باری سے اللہ کے حضور پہنچ گئے ہیں۔

۴۔ جو نیک آدمی یا عالم دین، کہیں سے کوٹ کپورہ آتے، میرے دادا دعا کے لیے مجھے ان کی خدمت میں لے جاتے۔ ایک مرتبہ انجمن اصلاح المسلمین کے سالانہ جلسے میں سیّد محمد شریف شاہ گھڑیالوی تشریف لائے۔ وہ نہایت تقویٰ شعار بزرگ تھے اور پنجاب کی جماعت اہل حدیث کے امیر تھے۔ پیکر زہد و عبادت اور بہ درجہ غایت منکسر و متواضع۔ لوگ ان کے حلقۂ بیعت میں داخل ہوتے اور ان سے صالحیت کی باتیں سنتے تھے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

میرے دادا مجھے ان کے پاس لے گئے۔ اس وقت وہ جامع مسجد میں تشریف فرما تھے اور لوگ ان کے اردگرد بیٹھے تھے۔ دادا مرحوم نے ان سے کہا کہ یہ میرا پوتا ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ اسے اپنے حلقۂ بیعت میں شامل فرمالیں اور دعا فرمائیں کہ یہ علم حاصل کرے اور امور خیر کی طرف اس کا دھیان رہے۔ چناں چہ حضرت شاہ صاحب نے مجھے اپنے حلقۂ بیعت میں شامل کرلیا اور دعا بھی فرمائی۔ مجھے کچھ نصیحتیں بھی کیں۔ اس وقت میری عمر بارہ تیرہ سال کی ہوگی۔

شاہ صاحب کی وفات کے بعد حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی نے فیروز پور میں مجھے مولانا کمال الدین ڈوگر (ساکن چھینبیاں والی) کے حلقۂ بیعت میں شامل کرادیا تھا۔

مولانا کمال الدین ڈوگر چھوٹے قد کے دبلے پتلے، ورع و زہد کا حسین تریں مجسمہ تھے۔ اس فقیر کو مولانا کمال الدین کی زیارت کا شرف دو دفعہ حاصل ہوا۔ ایک دفعہ ان کی زیارت کے لیے میں کسی کے ساتھ ان کے گاؤں چھینبیاں والی گیا اور ایک رات وہاں رہا۔ دوسری مرتبہ فیروز پور کی مسجد گنبداں والی میں ان کی زیارت ہوئی۔ اس وقت میں وہاں مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے حلقۂ درس میں شامل تھا اور مولانا کمال الدین تشریف لائے تھے۔ بہت کمزور ہوگئے تھے۔ میں وہاں ان کی بیعت سے سعادت اندوز ہوا تھا۔ اللہ ان پاک طینت لوگوں کی قبروں پر اپنی رحمت نازل فرمائے۔

۵۔ دادا مرحوم کچھ عرصہ فوج میں بھی رہے تھے۔ ہماری دادی بڑے فخر سے بتایا کرتی تھیں کہ فوج میں ان کی تنخواہ تین روپے تھی اور سواری کے لیے گھوڑی ملی تھی۔ اندازہ کیجیے وہ کیسا زمانہ تھا، جس میں تین روپے ایک فوجی کی تنخواہ تھی اور وہ اس پر بہت خوش تھے۔ لیکن وہ زیادہ مدت فوج میں نہیں رہے۔

لکھو کے (ضلع فیروز پور) کے مدرسہ محمدیہ میں حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی کے والد مکرم حضرت مولانا عبدالقادر لکھوی کی تنخواہ بھی تین روپے ماہانہ تھی۔ وہ پنجاب کے بہت بڑے عالم اور مدرس تھے، جن سے بے شمار علما و طلبا نے استفادہ کیا۔ اس دور میں اس تنخواہ پر وہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

بہت مطمئن تھے۔ (وہ مولانا معین الدین لکھوی کے نانا تھے۔)

۶۔ دادا مرحوم کے ملنے والوں میں ایک شخص کا نام سائیں مودن تھا۔ وہ صاف ستھرا لباس پہنتا تھا۔ اس کے گھر کا صحن کافی طویل وعریض تھا اور اس میں کئی درخت تھے۔ اس نے گھر میں بکریاں، مرغیاں، بطخیں، مور اور کبوتر وغیرہ جانور رکھے تھے۔ وہ لوگوں کے گھروں سے آٹا مانگ کر لاتا تھا۔ اس کے بیوی بچے بھی تھے۔ وہ دادا صاحب کے ساتھ زیادہ تر صوفیوں کے بارے میں گفتگو کیا کرتا تھا۔ ان کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں، لیکن میرے دادا ان سے مصروفِ گفتگو رہتے تھے اور دونوں ایک دوسرے کی عزت کرتے تھے۔ ایک دن میرے دادا نے اس کو مانگنے سے منع کیا تو اس نے کہا کہ میں اس لیے لوگوں کے گھروں میں مانگنے جاتا ہوں کہ اس سے غرورِ نفس ختم ہوتا ہے اور انسان کے دل میں نرمی پیدا ہوتی ہے۔ وہ مانگتے وقت کہیں نہیں رکتا تھا اور کسی کے پاس نہیں بیٹھتا تھا۔ مانگتے مانگتے ہمارے گھر ہمیشہ دس بجے کے قریب پہنچتا اور میرے دادا کے پاس ضرور بیٹھتا اور ان سے باتیں کرتا۔ اس نے کپڑے کی ایک بوری سی بنائی تھی اور گیہوں، جوار، مکئی، جو وغیرہ اجناس کا آٹا اس بوری میں ہوتا تھا۔

۷۔ دادا مرحوم کے رہن سہن کا معیار بالکل سادہ تھا۔ آمدنی محدود تھی، فضول خرچی ہم کر نہیں سکتے تھے اور اگر کبھی کسی معاملے میں کچھ زیادہ خرچ ہو بھی جاتا تو وہ ہمیں ڈانٹتے اور فرماتے زندگی گزارنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے سے بڑے کو نہ دیکھو، چھوٹے کو دیکھو کہ اس کی کتنی آمدنی ہے اور وہ کس طرح گزارا کرتا ہے۔

۸۔ اس کی ایک مثال دیتا ہوں۔ ایک مرتبہ عید کے موقع پر میں اپنے دادا کے حکم کے مطابق اپنے اور چھوٹے بھائی بہنوں کے لیے بازار سے کپڑے لایا۔ ہمارے گھر کے سامنے گلی میں چند عورتیں بیٹھی تھیں، انھوں نے مجھے آواز دے کر بلایا اور پوچھا یہ کیا لائے ہو؟ میں نے وہ کپڑے انھیں دکھائے تو وہ بہت خوش ہوئیں اور میرے خریدے ہوئے کپڑوں کا بھاؤ پوچھ کر کہا یہ بہت اچھے کپڑے ہیں اور سستے بھی ہیں۔ ان میں سے کوئی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کپڑا تین آنے گز کا تھا، کوئی چار آنے گز کا۔ البتہ میری قمیص کا کپڑا سات آنے گز کا تھا۔ میرے دادا کپڑے دیکھ کر تو خوش ہوئے، لیکن ساتھ ہی میرے سات آنے گز کے کپڑے کے متعلق انھوں نے مجھے ڈانٹا۔ میں نے ان عورتوں کا حوالہ دے کر عرض کیا کہ اُنھوں نے تو اسے پسند کیا ہے۔ فرمایا تم نواب صاحب ہو کہ چھوٹوں کے لیے ستا کپڑا لائے ہو اور اپنے لیے اتنا مہنگا۔ جاؤ اسے واپس کر کے ستا کپڑا لاؤ۔ چناں چہ میں دوبارہ بازار گیا اور سات آنے والا کپڑا واپس کر کے اپنے لیے تین آنے گز کا کپڑا لایا۔

۹۔ وہ ہر چھوٹی بڑی بات کا خیال رکھتے تھے۔ ایک دن میں چارپائی پر بیٹھا پاؤں ہلا رہا تھا۔ اُنھوں نے دیکھا تو فرمایا: پاؤں نہیں ہلانے چاہئیں۔ اس طرح کرتے ہوئے آدمی بُرا لگتا ہے۔ یہ بات بہت چھوٹی عمر سے میرے ذہن میں ایسی پیوست ہوئی کہ میں نے چارپائی پر بیٹھے ہوئے کبھی یہ حرکت نہیں کی۔

۱۰۔ مجھے اُنھوں نے نصیحت فرمائی کہ اپنے سے بڑے سے کھڑے ہو کر مصافحہ کرو۔ بیٹھے بیٹھے مصافحے کے لیے ہاتھ اس کی طرف نہ بڑھاؤ۔ ایسا کرنا بڑے کی بے ادبی ہے۔

۱۱۔ دادا مرحوم مجھے پرانے بزرگوں کے واقعات سنایا کرتے اور انبیا علیہم السلام کے قصے بیان فرمایا کرتے تھے۔ اپنا جو مختصر سا نسب نامہ میں نے ابتدا میں لکھا ہے، وہ انھی کا بتایا ہوا ہے۔ انھوں نے مجھے قرآنِ مجید پڑھایا، پنجابی اور اُردو کی بعض کتابیں پڑھائیں۔ مجھے وہ بارہا بعض اہلِ علم کی خدمت میں لے کر گئے۔ میرے لیے نیک لوگوں سے دُعائیں کروائیں اور خود کیں۔ شاہ محمد شریف صاحب سے بیعت کرائی جو اس دور کے بہت بڑے بزرگ تھے۔ وہ نمازِ فجر سے قبل مسجد میں جاتے اور مجھے بھی جگاتے اور اپنے ساتھ لے کر جاتے۔ بسا اوقات فجر کی اذان مجھ سے کہلواتے۔ اسی تربیت کی وجہ سے مجھے فجر سے پہلے جاگنے کی عادت پڑی۔ میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں کہ روزانہ فجر کی نماز سے پہلے قرآنِ مجید کی تلاوت کرتا ہوں اور قرآنِ مجید پڑھ کر نماز کے لیے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

گھر سے نکلتا ہوں۔ مجھے نمازِ فجر سے کافی پہلے جاگ آ جاتی ہے۔اگر نہ اُٹھوں تو یہ میری بدقسمتی ہے۔حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف مجھے فرمایا کرتے تھے کہ جو اچھا کام تم کر رہے ہو، یہ بزرگوں کی دُعاؤں کا نتیجہ ہے، ورنہ جو کچھ تم ہو، میں اُسے خوب جانتا ہوں۔

میری دُعا معلوم نہیں بارگاہِ خداوندی میں درجۂ قبولیت کو پہنچتی ہے یا نہیں۔حقیقت یہ ہے کہ اپنے دادا اور دوسرے بزرگوں کے لیے میں ہمیشہ دعا کرتا ہوں اور اپنی دانست میں انتہائی اخلاص کے ساتھ کرتا ہوں اور اللہ کے اس فرمان کو سامنے رکھ کر کرتا ہوں۔

((أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوْا لِيْ وَالْيُوْمِنُوْا بِيْ .))

”جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں، لہٰذا اُنھیں چاہیے کہ میرے حکم مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں۔“

عبدالعزیز:

دادا مرحوم کے چھوٹے بھائی حکیم محمد شریف کے بڑے بیٹے عبدالعزیز تھے۔ جی چاہتا ہے کہ ان کے متعلق بھی یہاں چند باتیں بیان کردی جائیں۔ وہ صالح فطرت بزرگ تھے اور اولاد سے محروم تھے۔ اِس زمانے میں کوئی اپنے ماں باپ کا نام نہیں لیتا، اس بے اولاد مرحوم کا نام کون لے گا؟ یہ مطلب کی دنیا ہے، جس سے کوئی مطلب ہے، اس کے سامنے سب جھک جھک جاتے ہیں، جس سے مطلب نہیں، اسے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ پنجابی لوک گیت کے مطابق ”دنیا مطلب دی ویکھی ٹھوک وجا“ (ہم نے خوب اچھی طرح ٹھوک بجا کر دیکھا ہے، دنیا کا ہر شخص مطلبی ہے)

عبدالعزیز کو ہم نے پہلے پہل ان کی جوانی میں دیکھا، پھر ان کے آخری دور میں بھی دیکھا۔ لمبا قد، بھرا ہوا گداز جسم، کشادہ پیشانی، چوڑا چہرہ، کھلا سینہ، موٹی چمک دار آنکھیں، سرخی مائل گندمی رنگ، میٹھی مگر کھنک دار آواز۔ ہنس مکھ اور بلند کردار۔ پوری داڑھی۔ جوانی میں سیاہ، بڑھاپے میں سفید۔ سفید قمیص، سفید لٹھے کا تہبند اور سفید ململ کی پگڑی۔ یہ تھے حکیم محمد

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

شریف کے سب سے بڑے بیٹے عبدالعزیز اور میرے دادا کے سب سے بڑے بھتیجے۔ میرے والد کے چچازاد اور میری والدہ کے تایازاد۔ ہم اُنھیں ماموں کہا کرتے تھے، وہ ہمیں بے حد شفقت سے بھانجا کہہ کر بلاتے۔

ان کا دینیات کا مطالعہ خاصا وسیع تھا۔ مسائل پر گفتگو کرتے تو حدیث و فقہ کی مستند کتابوں کے حوالے دیتے۔ ان کا خط بہت اچھا تھا۔ اُنھوں نے کہاں تعلیم حاصل کی اور کس سے کی، اس کا ہمیں علم نہیں۔ اپنے سے بڑوں کی بے حد عزت کرتے تھے۔ کوٹ کپورہ میں وہ کم ہی رہتے تھے۔ زیادہ تر بہاول نگر کی طرف سکونت رکھتے تھے۔ قیامِ پاکستان سے بہت سال قبل ایک مرتبہ ان کے چھوٹے بھائی عبدالواحد اور میرے والد کسی سلسلے میں ان سے ملنے بہاول نگر گئے تو پتا چلا کہ وہ ایک گاؤں ''روہجاں والا'' میں اقامت گزیں ہیں۔ اس گاؤں میں گئے اور ان سے خیر و عافیت کا تبادلہ ہوا تو چند منٹ کے بعد ایک شخص پکے ہوئے گرم گرم گوشت کی بڑی سی ہنڈیا اور تنور کی گرم گرم روٹیاں لے آیا۔ گوشت روٹی ابھی کھا ہی رہے تھے کہ وہی شخص کھیر لے آیا۔ اس گاؤں میں انھیں بڑی عزت کا مقام حاصل تھا۔

پھر وہاں سے کوٹ کپورہ آ گئے تھے۔ ان کی بیوی کا نام کرم بی بی تھا۔ ہم اُنھیں خالہ کہا کرتے تھے۔ وہ بھی شوہر کی طرح بلند قامت اور بھرے ہوئے جسم کی تھیں۔ چوڑا چہرہ اور گورا رنگ۔ نہایت صالحہ خاتون، تہجد گزار اور نیک اطوار۔ بہترین عادات کی مالک۔ کئی بچے پیدا ہوئے اور سب فوت ہو گئے۔ ان کے آخری بچے کا نام نوراللہ تھا۔ گورا چٹا، صحت مند، چار یا پانچ سال کو پہنچا تو وفات پا گیا۔ اس کے ماں باپ کو تو افسوس ہونا ہی تھا، عام رشتے داروں اور محلے داروں کو بھی بے حد افسوس ہوا۔ میری عمر اس وقت چودہ پندرہ برس کی تھی۔ میں جب یہ سطور لکھ رہا ہوں تو مجھے اس کی وفات کا انتہائی افسوس ہو رہا ہے۔ نوراللہ فوت ہو گیا لیکن یہ میاں بیوی اپنی زندگی میں ہمیشہ اس کا نام لیتے رہے۔ مثلاً اگر عبدالعزیز اپنی بیوی کے بارے میں کوئی بات کرتے تو کہتے نوراللہ کی ماں نے یہ کہا۔ اسی طرح ان کی بیوی اپنے شوہر کے بارے میں کچھ کہنا چاہتیں تو کہتیں نوراللہ کے ابا نے یہ کہا......

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

عبدالعزیز کھلے دل کے عمدہ خصال بزرگ تھے۔ ان کے والد حکیم محمد شریف پہلے اپنے تیسرے نمبر کے بیٹے سیف الرحمٰن کے گھر رہتے تھے اور آخر عمر میں بیمار ہوگئے تھے۔ سیف الرحمٰن کی بیوی (ہماری پھوپھی) کا انتقال ہوا تو عبدالعزیز اور ان کی اہلیہ انھیں اپنے گھر لے آئے تھے۔ ان کے گھر ہی اُنھوں نے وفات پائی۔ یہ قیامِ پاکستان سے کئی سال پہلے کی بات ہے۔ سنا تھا کہ عبدالعزیز کا مشغلہ مویشیوں کی تجارت تھا۔

آزادیٔ برصغیر کے بعد وہ میاں بیوی اسی گاؤں میں آ گئے تھے، جہاں ہم آئے۔ لیکن عبدالعزیز کا زیادہ تر وقت گاؤں کے باہر ہی گزرا۔ میں اخبار الاعتصام کا ایڈیٹر تھا، میری جب بھی ان سے ملاقات ہوتی، وہ میرے کسی نہ کسی اداریے یا مضمون کا ضرور حوالہ دیتے۔ جن الفاظ میں حوالہ دیتے وہ میرے لیے مسرت کا باعث ہوتے۔ نیز میرے لیے دعا فرماتے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ تم ہماری برادری میں واحد آدمی ہو جو تحریر و نگارش کے شعبے سے وابستہ ہو۔

آخر عمر میں وہ مستقل طور سے گاؤں آ گئے تھے۔ ان کی اہلیہ کرم بی بی بھی یہیں تھیں، لیکن گاؤں میں ان کا اپنا مکان نہیں تھا۔ وہ میری پھوپھی کی بیٹی کے گھر میں رہتے تھے۔ یہیں دونوں میاں بیوی یکے بعد دیگرے فوت ہوئے۔ وہ بیمار ہوگئے تھے۔ چارپائی پر لیٹے رہتے تھے، چلنے پھرنے کی سکت ان میں نہیں رہی تھی۔ میں گاؤں جاتا تو ان کی خدمت میں ضرور حاضری دیتا۔ وہ میری پھوپھی زاد بہن کے گھر مقیم تھے۔ (جن کے بیٹے سے میری ایک بیٹی کی شادی ہوئی) اس نے ان بوڑھے میاں بیوی کی بہت خدمت کی اور اس بے گھر، بے زر اور بے اولاد جوڑی سے ڈھیروں دُعائیں لیں۔ وہ بھی عرصہ ہوا وفات پا گئی ہے۔ رہے نام اللہ کا۔

عبدالعزیز سمیت یہ چھ بھائی تھے۔ سب نے قیام پاکستان کے بعد وفات پائی۔ چار بھائیوں نے ہمارے گاؤں اور دو نے جڑاں والا میں وفات پائی۔ میں ان سب کے جنازوں میں شریک ہوا۔ ان کی بیویاں بھی یہیں فوت ہوئیں۔ میں نے ان کے جنازوں میں بھی شرکت کی۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

حاجی محمد کریم:

گزشتہ سطور میں محمد ابراہیم اور حاجی محمد کریم دونوں بھائیوں کے نام قارئین کرام نے پڑھے۔

حاجی محمد کریم کوٹ کپورہ اور اس علاقے کی مشہور شخصیت تھے۔ لمبا قد، چھریرا بدن، تیکھی ناک، گندمی رنگ، موزوں داڑھی، مردانہ وجاہت کا خوب صورت مجسمہ۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق لٹھے کا سفید تہبند اور سفید قمیص پہنتے تھے۔ کلے پر لنگی باندھتے۔ پاؤں میں سرخ کھال کی صاف ستھری جوتی۔ ان کا بہت اچھا مکان تھا۔ اس عہد میں امیر گھروں میں لوہے کی کرسیاں ہوتی تھیں۔ حاجی صاحب کی بیٹھک اور اس کے لمبے چوڑے پختہ تھڑے پر چارپائیاں اور لوہے کی کرسیاں پڑی رہتی تھیں۔ لوگ آتے اور ان پر بیٹھتے۔ شہر میں سکھوں، ہندوؤں یا مسلمانوں کا کوئی جھگڑا ہوتا تو وہ حاجی صاحب کے پاس آتے، واقعہ بیان کرتے اور حاجی صاحب جو فیصلہ کرتے، اس سے تمام فریق مطمئن ہو جاتے۔

تھانے کچہری میں بھی ان کا اثر تھا۔ وہ مہاراجا فرید کوٹ کے درباری تھے۔ سال میں چار مرتبہ مہاراجا کا عام دربار لگتا تھا۔ اس میں شریک ہونے والوں کے لیے سفید لٹھے کا پاجامہ پہننا ضروری تھا۔ کوٹ کپورہ سے فرید کوٹ سات میل کے فاصلے پر تھا۔ حاجی صاحب پاجامہ اپنے ساتھ لے جاتے اور دربار ہال میں داخل ہوتے وقت پہن لیتے۔ دربار ہال سے باہر آ کر پاجامہ اتار دیتے اور تہبند باندھ لیتے۔ میں نے ان کو پاجامہ پہنے ہوئے صرف ایک مرتبہ دیکھا۔

وہ کوٹ کپورہ کی انجمن اصلاح المسلمین کے صدر تھے۔ اس انجمن کا قیام ہمارے ہوش سنبھالنے سے بہت پہلے ہوا تھا۔ انجمن کے قیام کے زمانے ہی سے وہ اس کے منصب صدارت پر فائز تھے۔ ہر سال انجمن کا سالانہ تبلیغی جلسہ منعقد ہوتا تھا، جس میں متحدہ ہندوستان کے علمائے کرام کو دعوتِ شرکت دی جاتی تھی۔ ان حضرات میں قاضی محمد سلیمان منصور پوری، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی، حضرت حافظ محمد گوندلوی، حضرت حافظ

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

عبداللہ روپڑی، سیّد سلیمان ندوی، مولانا محمد دہلوی جونا گڑھی، مولانا محمد اسماعیل سلفی، مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کے اسمائے گرامی خاص طور سے لائق تذکرہ ہیں۔ ہر عالم کو حاجی صاحب اپنے ہاتھ سے جوابی خط لکھ کر بھیجتے۔ تین دن جلسہ جاری رہتا، کثیر تعداد میں سامعین اس میں شامل ہوتے اور علمائے کرام کی تقریریں سنتے۔ سب علمائے کرام حاجی صاحب کو جانتے تھے۔ کوٹ کپورہ میں انجمن اصلاح المسلمین کا آخری تیئیسواں سالانہ جلسہ منعقد ہوا تھا۔ پاکستان آنے کے بعد ہمارے موجودہ گاؤں میں بھی اس کے دو تین جلسے ہوئے۔ اس وقت کوٹ کپورہ کے جلسوں میں شرکت کرنے والے بھی بہت سے لوگ زندہ تھے، جو مختلف مقامات سے آ کر ان میں شریک ہوئے اور ان علمائے کرام میں سے بھی متعدد حضرات موجود تھے جو پرانے جلسوں میں تقریر کے لیے تشریف لے جایا کرتے تھے۔

حاجی صاحب کی دو بیویاں تھیں اور ان دونوں کے لیے انھوں نے دو الگ الگ خوب صورت کمرے تعمیر کرائے۔ سات دن ایک بیوی کے کمرے میں رہتے اور سات دن دوسری بیوی کے کمرے میں۔ حاجی صاحب حقہ پیتے تھے۔ ساتویں دن نمازِ فجر کے بعد ایک بیوی خود ہی ان کا حقہ اُٹھا کر دوسری بیوی کے کمرے میں رکھ آتی۔ دونوں نہایت صلح صفائی سے رہتی تھیں۔ دونوں کے بہن بھائی اور والدین بھی دونوں سے برابر کا سلوک کرتے تھے۔ حاجی صاحب دونوں کے لیے ایک سا کپڑا لاتے اور دونوں کے بچوں کو بھی ایک سی چیزیں لا کر دیتے۔ کسی معاملے میں کسی کو ترجیح نہیں دی جاتی تھی۔ کھانا اکٹھا پکتا تھا اور سب اکٹھے رہتے تھے۔ حاجی صاحب کا یہ انصاف بہت مشہور تھا اور دو بیویوں والوں کے لیے مثالی حیثیت رکھتا تھا۔ ایک بیوی قیامِ پاکستان سے پہلے کوٹ کپورہ میں فوت ہوگئی تھی اور دوسری نے پاکستان آ کر حاجی صاحب کی وفات سے کئی سال بعد وفات پائی۔ دونوں نہایت پارسا عورتیں تھیں۔ شوہر کی طرح تہجد گزار۔ روزانہ صبح اُٹھ کر قرآن پڑھتیں۔ دونوں خود ہی گھر میں چکی سے آٹا پیستیں۔ گھر کے کام بھی خود ہی کرتیں۔ بارہا ایسا ہوتا کہ آٹا بھی پیس رہی ہیں اور قرآن بھی پڑھ رہی ہیں۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ہماری دادی:

ہماری دادی کا نام رمضان خاتون تھا۔ انھوں نے قیامِ پاکستان سے تھوڑا عرصہ قبل ۱۹۴۶ء میں بمقام کوٹ کپورہ وفات پائی۔ وہ جس زمانے میں پیدا ہوئیں اور جوانی کو پہنچیں اور جس معاشرے میں ان کی پرورش ہوئی، اس زمانے اور معاشرے میں گاؤں کے نمبردار کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور وہ نمبردار کی بیٹی تھیں، اس لیے اپنے آپ کو اونچے معاشرے کی خاتون سمجھتی تھیں۔

میرے دادا کے چھوٹے بھائیوں میں سے (یعنی ہمارے نانا محمد رمضان اور ان سے بڑے حکیم محمد شریف) میں سے کوئی بزرگ ہمارے گھر آتے تو وہ احترام سے ہماری دادی کو سلام کہتے۔ وہ فوراً ہماری بہنوں سے کہتیں "کڑیو اپنے نانے نوں منجی تے بٹھاؤ تے لسی پانی پیاؤ" (لڑکیو! اپنے نانے کو چارپائی پر بٹھاؤ اور انھیں لسی پانی پلاؤ) ہمارے حقیقی نانا (حکیم محمد رمضان) ہماری دادی کے سمدھی بھی تھے۔ ان کی دو بیٹیوں کی شادی ہمارے دو ماموؤں سے ہوئی تھی۔ وہ پرانے زمانے کی عورتوں سے تعلق رکھتی تھیں جو رشتے داری میں بڑوں سے گھونگھٹ نکالا کرتی تھیں۔

ہمارے ایک بزرگ میاں قاسم دین تھے جو ہمارے دادا کی بہن ولایت خاتون کے شوہر تھے۔ ہم نے ان کو بڑھاپے کی حالت میں دیکھا۔ پرہیزگار بزرگ تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء میں ہمارے موجودہ گاؤں میں ان کی وفات ہوئی۔ ہماری دادی بوڑھی ہوگئی تھیں، پوتے پوتیوں، نواسے نواسیوں والی تھیں، اور نابینا تھیں۔ لیکن وہ میاں قاسم دین سے آخر وقت تک گھونگھٹ نکالتی رہیں۔ وہ قدرے اونچی آواز سے کھانستے ہوئے ہمارے گھر میں داخل ہوتے، تاکہ ہماری دادی گھونگھٹ نکال لیں۔ میری چھوٹی بہنیں ان کا گھونگھٹ دیکھنے کے لیے بعض اوقات یوں ہی کہہ دیتیں: دادی "بڑے نانا جی آئے ہیں۔" وہ یہ الفاظ سنتے ہی گھونگھٹ نکال کر بیٹھ جاتیں۔ جب انھیں پتا چل جاتا کہ انھوں نے مجھ سے مذاق کیا ہے تو انھیں ڈانٹتیں۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ہم بہن بھائیوں پر وہ بے حد شفقت فرماتیں اور سردیوں میں اپنے ساتھ سلاتیں۔ میں ان کی زندگی ہی میں تحصیل علم کے لیے اپنے مسکن کوٹ کپورہ سے باہر چلا گیا تھا۔ اس وقت بیر، مونگ پھلی، بتاشے اور ریوڑیاں وغیرہ چیزیں ہمارے لیے بہت بڑا تحفہ تھیں۔ یہ یا اس قسم کی اور چیزیں کھانے کے لیے ہمارے گھر میں لائی جاتیں تو ان میں سے دادی مرحومہ میرا حصہ الگ کر لیتیں۔ پندرہ بیس روز کے بعد میں گھر آتا تو وہ نہایت پیار سے میرا حصہ مجھے دیتیں۔ اسی طرح میرے بعد چاول یا کھیر یا سویاں وغیرہ پکائی جاتیں تو میرے گھر آنے پر وہ چیزیں میرے لیے دوبارہ پکائی جاتیں۔ اللہ انھیں جنت نصیب کرے۔

والدۂ محترمہ:

ہماری والدۂ محترمہ کا نام فاطمہ تھا۔ یہ تین بہنیں تھیں۔ بڑی کا نام زینب تھا۔ وہ غالباً پیدائشی نابینا تھیں۔ قرآنِ مجید کی حافظہ تھیں۔ انھوں نے بے شمار بچوں کو قرآنِ مجید پڑھایا۔ ان کے شوہر عبدالرحمٰن کو قیامِ پاکستان کے زمانے میں ایک بڑے قافلے کے ساتھ پاکستان آتے ہوئے بم مار کر سکھوں نے قتل کر دیا تھا۔ ایک ہزار روپے کی رقم ان کے پاس تھی جو اس دور میں بہت بڑی رقم تھی، ان کے مرنے کے بعد یہ رقم سکھوں کے قبضے میں آئی۔ اس مرحوم کی تدفین قصور میں ہوئی۔

ہماری والدہ بے حد صفائی پسند تھیں۔ ان کی اولاد ہم دو بھائی تھے اور دو بہنیں۔ ہمارے پاس پہننے کو جوڑا تو ایک ایک ہی ہوتا تھا، لیکن والدہ تیسرے چوتھے روز ہمارے کپڑے دھوتیں اور روزانہ ہمیں نہلاتیں۔ میں بھاگنے کی کوشش کرتا تو مجھے پکڑ لیتیں اور صابن سے نہلاتیں۔ کہا کرتیں، تمھیں پتا نہیں چلتا تمھارے جسم پر کتنی مٹی لگی ہوئی ہے۔ وہ ہمیں مارتی یا گالی نہیں دیتی تھیں، ہمارے ساتھ پیار کا سلوک کرتیں۔ ہماری دادی اور ہماری والدہ ہم سب بہن بھائیوں کے لیے بے حساب دعائیں مانگا کرتیں۔

والدہ کی یہ نصیحت مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ نہ کسی سے لڑنا چاہیے، نہ کسی کو گالی دینا چاہیے۔ نہ جھوٹ بولنا چاہیے۔ بڑوں کی بات غور سے سننی چاہیے اور اچھی باتوں پر عمل کرنا

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

چاہیے۔ ایک دن مجھ سے پوچھا تم نے نماز پڑھی ہے؟ میں نے کہا: پڑھی ہے۔ کہا: سچ بتاؤ، جھوٹ نہ بولو۔ جھوٹ بولو گے تو دو گناہ کرو گے، ایک نماز نہ پڑھنے کا، دوسرا جھوٹ بولنے کا۔ میں جب بھی کھیل کود کے لیے گھر سے نکلتا، وہ مجھے نصیحت کرتیں کہ کسی سے لڑائی جھگڑا نہ کرنا۔ نہ کسی کو گالی دینا۔ تم کسی کو گالی دو گے تو وہ بھی تمھیں گالی دے گا۔ لیکن اب کیا ہے، بعض لوگوں کو ہم نے دیکھا کہ گالی سے بات شروع کرتے ہیں اور گالی پر ہی ختم کرتے ہیں۔ ماں باپ نے ان کی صحیح تربیت ہی نہیں کی۔ خود بھی غلط تربیت میں پلے بڑھے۔ بچوں کو بھی یہی تربیت دی جاتی ہے۔

میں یکم جنوری ۱۹۳۷ء کو مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے ساتھ حصولِ علم کے لیے گھر سے نکلا اور مرکز الاسلام کو روانہ ہوا تو والدہ نے کہا: تم ایسی جگہ جا رہے ہو جہاں تمھارا کوئی خونی رشتے دار نہیں ہے۔ وہاں چھوٹے بڑے سب کی عزت کرنا، کسی سے کوئی غلط بات نہ کرنا۔ تم دوسرے سے اچھی طرح پیش آؤ گے تو وہ بھی تمھارے ساتھ اچھا سلوک کرے گا۔

۱۹۳۷ء کے شروع میں ہماری والدہ بیمار ہوئیں۔ وہ مرضِ استسقا میں مبتلا ہو گئی تھیں۔ ہمارے دادا نے ان کے لیے بعض جڑی بوٹیوں کے عرق بنائے، اونٹنی کا دودھ بھی پلایا (حدیث شریف میں اس کا ذکر فرمایا گیا ہے) بہت علاج کیا مگر افاقہ نہ ہوا۔ درحقیقت اس مرض کا کوئی مؤثر علاج ہی نہیں ہے۔ بالآخر وہ مئی ۱۹۳۷ء میں وفات پا گئیں۔ اس وقت ان کی عمر چونتیس پینتیس سال کے پس و پیش ہوگی۔ میرے والد کی عمر شاید ان سے دو تین سال بڑی ہوگی۔ والدہ کی وفات سے کچھ دیر پہلے اسی دن ہم نے چند آدمیوں کو کھانا کھلایا تھا اور ان کے لیے دعائے صحت کرائی تھی۔ کھانے والوں میں محلے کے بچوں کی تعداد زیادہ تھی۔ کھانے کے بعد دعا کر کے لوگ اپنے گھروں کو چلے گئے اور تھوڑی دیر کے بعد والدہ کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی اور وہ وفات پا گئیں۔ یہ مغرب کے بعد کا وقت تھا۔ بہت سے رشتہ دار رات کو ہمارے گھر رہے۔ دوسرے دن دس گیارہ بجے انھیں دفن کر دیا گیا۔ ((إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ .))

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

والدہ کی وفات کے بعد ہمارے ساتھ کیا بیتی؟ چند الفاظ میں یہ بھی سنتے جایے۔
ہمارے دادا اور دادی بوڑھے تھے۔ دادی نابینا بھی تھی۔ ہم چار بہن بھائی تھے۔ میری عمر بارہ سال کی تھی، مجھ سے چھوٹی بہن کی عمر نو سال کی، اس سے چھوٹی کی چھ سال کی اور سب سے چھوٹا بھائی (محمد حسین) بہت کم عمر تھا۔ برادری کے بہت سے لوگوں کا تعلق ٹرانسپورٹ سے تھا۔ کسی کے زیادہ حصے تھے کسی کے کم۔ بسیں فیروز پور، موگا اور مکتسر کو جاتی تھیں۔ ہمارا بھی یہی سلسلہ تھا اور ہمارے والد بعض دفعہ رات کو گھر آ جاتے تھے۔ بعض دفعہ دو دو تین تین دن نہیں آتے تھے۔ ہماری سب سے چھوٹی پھوپھی رحمت بی بی کا گھر ہمارے گھر کے قریب تھا۔ وہ صبح شام آتیں اور ہمارے لیے روٹیاں پکا جاتیں۔ ہانڈی ہم خود پکا لیتے تھے۔ ہماری پھوپھی کے چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ ایک دن ان کو ہمارے دادا نے کہا کہ ہم خود ہی روٹی پکا لیا کریں گے۔ اب دادا چولھے کے آگے بیٹھ جاتے اور میری نو سالہ بہن سے روٹی پکواتے۔ روٹی توے سے اُلٹاتے اور سینکتے وقت ٹوٹ جاتی تو فرماتے کوئی بات نہیں، روٹی توڑ کر ہی تو کھانی ہے۔ کبھی کبھی ہماری نابینا دادی روٹی پکانے لگتیں۔ توے پر روٹی ڈالتے وقت کہتیں بتاؤ توا کہاں ہے۔ پھر اس کو ہاتھ لگا کر سیدھی روٹی ڈال دیتیں۔

محلے میں سرکار کی طرف سے رات کو ایک سکھ پہرا دیتا تھا جو ذات کا چھیبا تھا اور اس کا نام موتی سنگھ تھا۔ دبلا پتلا۔ لوگ اس پہرے دار کو موتی کہا کرتے تھے۔ وہ ہمارے تھڑے پر آ کر ہم سے پوچھتا تمھارے باپو گھر پر ہیں یا نہیں؟ اگر ہم کہتے کہ آج وہ نہیں آئے تو جواب دیتا بے فکر ہو کر سو جاؤ۔ میں یہیں بیٹھا ہوں۔ وہ چکر لگا کر پھر آ جاتا، اگر ہم باتیں کر رہے ہوتے تو کہتا تم ابھی تک سوئے نہیں، باتیں کر رہے ہو۔ آرام سے سو جاؤ۔

ہمارے والد کی عمر اس وقت چھتیس سینتیس برس کی ہوگی۔ ہمارے دادا کے کہنے سے ان کا نکاح ہمارے نانا نے ہماری سب سے چھوٹی خالہ سے کر دیا۔ یہ ۱۹۳۸ء کی بات ہے، اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہماری زندگی نہایت آرام سے گزری۔ کسی طرف سے کبھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ہمارے والد سے ہماری خالہ کے نکاح کے بعد جولائی ۱۹۳۹ء میں ہمارے دادا تو وفات پا گئے تھے لیکن ہماری دادی اس سے سات سال بعد ۱۹۴۶ء میں فوت ہوئیں۔ ہماری خالہ کی وہ سگی تائی تھیں۔ انھوں نے اپنی ساس کی بے حد خدمت کی اور ان سے دعائیں لیں۔ ہماری خالہ کا نام آسیہ تھا۔ ہماری دادی ان کے لیے دعا کرتیں کہ ''آسیہ جس طرح توں میری ٹہل کردی ایں اوہدے بدلے دودھیں نہائیں تے پتیں کھیڈیں۔'' (آسیہ! جس طرح تو میری خدمت کرتی ہے اس کے بدلے میں تو دودھوں نہائے پوتوں کھیلے) میری دادی ہمیشہ اپنی بہو کے لیے یہ دعا کرتی رہیں جو اللہ نے قبول فرمائی ...... اس گنہگار کی بارگاہِ خداوندی میں عاجزانہ دُعا ہے کہ وہ ان سب کی مغفرت فرمائے۔ آمین یا ربّ العالمین!

والدِ محترم:

قارئین کرام نے ملاحظہ فرمایا کہ اپنے خاندانی پس منظر میں سب سے پہلے میں نے اپنا نسب نامہ بیان کیا۔ اس کے بعد اپنے پڑدادا حکیم دوست محمد عرف دسوندھی اور ان کے چھوٹے بھائی میاں امام الدین کے متعلق چند باتیں بیان کیں جو اپنے بزرگوں کے ذریعے سے میرے علم میں آئیں۔ پھر اپنے دادا اور ان کے بھائیوں کا تذکرہ کیا۔ میرے نزدیک ایک اہم شخصیت میرے دادا کے سب سے بڑے بھتیجے اور حکیم محمد شریف کے بڑے فرزند عبدالعزیز کی تھی، جن کا تذکرہ میں کرنا چاہتا تھا اور کر دیا۔ اس نفسا نفسی کے زمانے میں ان بے اولاد اور بے گھر نیک ترین میاں بیوی کے نام بھی شاید کسی کو یاد نہیں ہوں گے۔ یہ فرض میں نے کسی حد تک پورا کر دیا۔ بعد ازاں جیوے کی اولاد کے ایک مشہور بزرگ حاجی محمد کریم کے متعلق چند باتوں سے قارئین کو مطلع کرنے کی کوشش کی۔ یہ بھی میرا فریضہ تھا۔ وہ میرے مشفق بزرگ تھے۔ پھر دادی کے بارے میں کچھ باتیں معرض بیان میں لائی گئیں۔ اس کے بعد والدہ محترمہ کا تذکرہ کیا گیا۔ نبی کریم ﷺ کی حدیث مبارکہ کی روشنی میں باپ کا حق ماں کے بعد آتا ہے۔ چناں چہ اب میں اپنے والد محترم کے بارے میں چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

میرے والد کا نام جیسا کہ سلسلۂ نسب میں بتایا گیا، عبدالمجید تھا۔ انھوں نے تقریباً ۹۰

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

برس کی عمر کو پہنچ کر ۱۸ ستمبر ۱۹۸۸ء کو وفات پائی۔ اس حساب سے وہ ۱۸۹۸ء کے قریب پیدا ہوئے۔ نکلتا ہوا قد، کسرتی سا جسم، گول چہرہ، موزوں نقش و نگار، کھلی پیشانی، تہبند اور قمیص زیب تن، سر پر ململ کی پگڑی۔ یہ تھے میرے والد محترم۔

انھوں نے قرآنِ مجید اپنے والد مکرم میاں محمد سے پڑھا۔ احوال الآخرت وغیرہ پنجابی نظم کی چند کتابیں بھی انہی سے پڑھیں۔ مولوی رحیم بخش کی تصنیف شدہ ''اسلام کی کتاب'' کے دو یا تین حصے بھی والد سے پڑھے۔ اس وقت گھروں میں یہ کتابیں پڑھنے کا عام رواج تھا۔ کبھی کبھی وہ احوال الآخرت کے اشعار ہمیں ترنم سے پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ پنجابی اشعار کے بعض چھوٹے چھوٹے مطبوعہ قصے وہ اکثر میرے لیے لایا کرتے اور مجھ سے سنا کرتے تھے۔ یہی ان کی تعلیم تھی اور یہ اس ماحول اور زمانے میں بساغنیمت تھی۔ وفات سے کئی سال پیشتر ان کا معمول تھا کہ نمازِ فجر کے بعد قرآنِ مجید روزانہ قدرے اونچی آواز سے پڑھتے۔

ہمارے والد اپنے والدین کی واحد نرینہ اولاد تھے۔ ان کی چھ بہنیں تھیں۔ تین ان سے بڑی اور تین چھوٹی۔ ہم نے ان کی بڑی بہنیں نہیں دیکھیں، چھوٹی دیکھی ہیں۔ ہمارے والد بڑے دل گردے کے آدمی تھے۔ نہ کسی معاملے میں گھبراتے تھے اور نہ کسی سے خوف زدہ ہوتے تھے۔ انھوں نے تنہا دن کو بھی سفر کیے اور رات کو بھی بارہا سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ لیکن گھبراہٹ یا خوف کا کبھی ان کے قریب سے بھی گزر نہیں ہوا۔ ان کی جوانی کا زمانہ متحدہ ہندوستان کا زمانہ تھا، جس میں مسلمان، ہندو اور سکھ اکٹھے رہتے تھے۔ بعض اوقات آپس میں لڑائی جھگڑے پر بھی نوبت آجاتی تھی اور پھر صلح بھی ہوجاتی تھی۔ لیکن اس لڑائی جھگڑے میں فریق مخالف کی خواتین کا بے حد احترام کیا جاتا تھا۔

اس کی مثال اپنے والد سے متعلق ایک واقعے سے دیتا ہوں۔ ہمارے والد کو کوٹ کپورہ میں اطلاع پہنچی کہ فلاں سکھ نوجوان نے ہمارے دادا کے بارے میں گستاخانہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔ وہ سنتے ہی طیش میں آگئے۔ رات کو ریل پر بیٹھے۔ شب کو تین بجے کے قریب ریل سے اُترے، وہاں سے جس گاؤں جانا تھا، وہ آٹھ کوس کے فاصلے پر تھا۔ اتفاق سے ایک

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

اونٹ والا مل گیا جوان سے تعلق رکھتا تھا اور وہاں جارہا تھا۔ اس نے ہمارے والد کو اونٹ پر بٹھالیا، ابھی چند قدم آگے گئے تھے کہ اس سکھ نوجوان کی بہن مل گئی جس نے ہمارے دادا کے متعلق گستاخانہ الفاظ کہے تھے۔ وہ بھی اسی ریل سے اُتری تھی اور اس نے اسی گاؤں جانا تھا۔ ان دونوں اونٹ سواروں نے اسے دیکھا تو اونٹ سے اُترے اور اس خاتون کو اونٹ پر بٹھایا۔ خود اونٹ کے ساتھ ساتھ پیدل چل پڑے۔ گاؤں پہنچے تو اس خاتون کو احترام کے ساتھ اس کے گھر پہنچایا اور خود میرے والد اس سکھ کے پاس اس کے کھیت جا پہنچے۔ وہاں اس کے والد اور والدہ بھی موجود تھے، ان کو سلام کیا اور ان کے بیٹے کو جو ہل چلا رہا تھا للکارا کہ تم نے میری زندگی میں میرے باپ کے متعلق یہ الفاظ کہے ہیں۔ تکڑے ہو جاؤ، میں تمھیں اس کی سزا دیے بغیر نہیں چھوڑوں گا۔ اس نے معافی مانگی اور اس کے ماں باپ نے بھی اپنے بیٹے کو ڈانٹا۔ کچھ اور لوگ بھی آگئے اور معاملہ ختم ہوا۔ اندازہ کیجیے اس زمانے میں اپنے مخالف کی بہو بیٹی کی بھی کتنی عزت کی جاتی تھی۔ یعنی بیٹی کو سب اپنی بیٹی سمجھتے تھے۔

اس وقت لوگ رنگ دار پگڑی باندھا کرتے تھے۔ مجھے میری دادی نے بتایا کہ تمھاری پیدائش کے بعد جب تمھاری بہن پیدا ہوئی تو تمھارے والد نے رنگ دار پگڑی باندھنا چھوڑ دی تھی کہ بیٹی کی پیدائش کا مطلب یہ ہے کہ میں داماد والا ہو گیا ہوں۔ اب شوقینی چھوڑ دینی چاہیے اور سفید پگڑی باندھنی چاہیے، جو شریف لوگ باندھتے ہیں۔

یہ تقریباً نوے برس پہلے کی بات تھی۔ اب چالیس بیالیس برس قبل کی سنیے!

مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی کے بڑے بیٹے سیّد عمر فاروق غزنوی مونچھیں چڑھا کر رکھتے ۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ مونچھیں منڈی ہوئی ہیں۔ پوچھا مونچھیں کیوں منڈوا دیں؟ جواب دیا مجھے اطلاع ملی کہ بیٹی پیدا ہوئی ہے۔ میں اسی وقت حجام کے پاس گیا اور مونچھیں منڈوا دیں کہ اب داماد والا ہو گیا ہوں اور مونچھ جھک گئی ہے۔

یہ تھا کسی زمانے کا کلچر......!

پنجابی میں ایک اصطلاح مشہور ہے ''پکی تھاں''۔ اس کا اطلاق اس جگہ پر ہوتا ہے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

جہاں لوگوں کو شبہ ہو کہ یہاں جنوں اور بھوتوں کا بسیرا ہے۔ بعض گھروں میں کسی کوٹھے یا کمرے کے بارے میں کہا کرتے ہیں کہ یہ پکا کمرا ہے یعنی یہاں جن رہتے ہیں یا اس کوٹھے میں کسی بابے کا بسیرا ہے۔ اسے خوش کرنے کے لیے وہ جمعرات کو اس کمرے میں دیا جلایا کرتے ہیں۔ میرے والد کہا کرتے تھے کہ جن بھوت کا خیال دل کا وہم اور ڈر ہے۔ ہم انھیں اگر یہ کہتے کہ جن ایک مخلوق کا نام ہے اور قرآن میں اس مخلوق کا ذکر آیا ہے اور انتیسویں پارے میں سورۂ جن کے نام سے ایک سورۃ بھی ہے تو وہ جواب دیتے کہ بے شک اس کا ذکر قرآن میں آیا ہے، لیکن یہ مخلوق ہر جگہ نہیں ہوتی۔ کسی بے آباد گھر کو جنوں کا ٹھکانا قرار دے دینا اور وہاں سے گزرتے وقت ڈرنا یا اندھیرے میں کہیں جاتے ہوئے خوف زدہ ہونا کہ میرے اردگرد جنات پھر رہے ہیں، صحیح نہیں، صرف اللہ سے ڈرنا چاہیے، اس کے سوا کسی سے ہرگز نہیں ڈرنا چاہیے۔

انھوں نے بتایا کہ جوانی کے زمانے میں ایک مرتبہ وہ گھوڑی پر رات کے وقت اپنے سسرال ''ہنڈائیہ'' جارہے تھے۔ ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ سخت اندھیری رات۔ ایک جگہ پہنچے تو دیکھا کہ دائیں جانب قبریں ہیں۔ تھوڑا سا آگے گئے تو دو برتنوں کے باہم ٹکرانے کی آواز سنائی دی۔ انھوں نے گھوڑی روک لی۔ اندھیرا بہت زیادہ ہو تو اس سے تھوڑی سی روشنی نمودار ہوجاتی ہے۔ اندازہ ہوا کہ یہ آواز قبروں کے درمیان سے آرہی ہے۔ کچا راستہ تھا اور راستے میں ایک درخت تھا۔ وہ گھوڑی سے اُترے، اسے درخت کے ساتھ باندھا اور اس کے اگلے دونوں پاؤں میں زنجیر ڈالی۔ لیکن گھوڑی ڈرگئی۔ اس کے سر اور جسم پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ لاٹھی پکڑی۔ تہبند اچھی طرح کس کر باندھا اور قبروں کے بیچ میں سے اس طرف کو چل پڑے جس طرف سے برتنوں کے ٹکرانے کی آواز آرہی تھی۔ آواز کے قریب پہنچے تو زور سے کھانسے۔ ان کو ڈرانے کے لیے برتنوں کی آواز تیز ہوگئی۔ اس کے بالکل قریب گئے تو قبر کے اندر سے ہوں ہوں کی ڈراؤنی سی آواز آئی اور دائیں بائیں جانب بڑے بڑے سیاہ بالوں والا سر تیزی سے ہلنے لگا۔ انھوں نے آگے بڑھ کر بال پکڑ لیے اور اسے قبر سے باہر کھینچنے لگے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کہا بتاؤ تم کون ہو؟ میں اب تمھیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس نے چیخ کر کہا: خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ اس کے پاس دو برتن تھے۔ ایک دیگچی اور ایک گلاس۔

اس نے بتایا کہ اتنے سال اس کی شادی پر گزر چکے ہیں، لیکن اولاد نہیں ہوئی۔ ایک پیر نے بتایا ہے کہ وہ کسی تازہ مردہ بچے پر نہائے گی تو اس کی گود ہری ہو جائے گی۔ چناں چہ یہ بچہ جس پر میں نہا رہی ہوں، آج ہی مرا ہے۔

اخبارات میں ہم پڑھتے اور لوگوں سے سنتے ہیں کہ حصولِ اولاد کے لیے عورتیں بہت سی مکروہ ترین حرکتوں کا ارتکاب کرتی ہیں۔ کسی پیر فقیر کے کہنے سے لوگوں کے بچے قتل کر دیتی ہیں اور ان کے اوپر بیٹھ کر نہاتی ہیں۔ پنجابی کی کہاوت ہے کہ ''کھوئیں جال پاندیاں نیں'' (یعنی اولاد کے لیے کنوئیں میں جال ڈال دیتی ہیں) قبر کھودنے کا یہ بہت خوف ناک واقعہ ہے۔ میرا خیال ہے اس عورت کے ساتھ ایک دو مرد بھی ہوں گے، جنھوں نے یہ قبر اکھاڑی ہوگی۔ وہ کہیں قریب ہی بیٹھے ہوں گے۔ بعد میں یہ قبر بند بھی کرنا تھی۔ لیکن جب میرے والد نے اس عورت کے بال پکڑے، کوئی شخص قریب نہیں آیا۔ اس عورت نے کہا: مجھے چھوڑ دو، اب میں جا رہی ہوں۔ چناں چہ وہ چلی گئی اور یہ گھوڑی پر سوار ہو کر اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔

اس وقت عام طور سے بچوں کو بھیج کر عورتیں اپنے پڑوسیوں کے گھر سے سالن وغیرہ منگوا لیتی تھیں۔ اب بھی دیہات میں یہ سلسلہ چلتا ہے۔ بلکہ شہروں میں بھی یہ پرانا رواج جاری ہے۔ ہمارے گھر میں اگر کوئی سالن وغیرہ لینے آتا تو میرے والد تاکید کرتے کہ اسے خالی ہاتھ نہ لوٹایا جائے۔ اگر انھوں نے خود کھانا ہوتا، لیکن کھانا شروع نہ کیا ہوتا تو اپنا سالن اسے دے دیتے اور خود چٹنی سے روٹی کھا لیتے۔ مانگنے والے کو خالی ہاتھ لوٹانا ان کے نزدیک سخت معیوب تھا۔

ہمارے والد کے متعلق ایک اور واقعہ سنیے جو بڑا دلچسپ ہے۔

انھوں نے بتایا کہ ایک دفعہ وہ کہیں سفر پر جا رہے تھے کہ راستے میں ایک گاؤں سے ان کا گزر ہوا تو ایک مکان کے آگے صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔ افسوس کے لیے یہ وہاں بیٹھ گئے۔

پوچھا: جنازہ پڑھ لیا یا پڑھنا ہے؟

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

جواب ملا: جنازہ ابھی پڑھنا ہے۔

پوچھا: کس وقت جنازہ پڑھا جائے گا؟

بولے: تین گاؤں کا ایک امام ہے، وہی جنازہ پڑھاتا ہے۔ایک گاؤں میں وفات ہوگئی ہے، وہاں جنازہ پڑھا کر امام یہاں آئے گا تو جنازہ پڑھائے گا۔ یہ معلوم نہیں کس وقت آئے گا۔

والد نے کہا: گرمیوں کا موسم ہے، میت کی حالت معلوم نہیں کیسی ہے، اگر آپ چاہیں تو جنازہ میں پڑھا دیتا ہوں۔

جواب ملا: اپنے امام کو ہم جنازہ پڑھانے کی مزدوری فصل کے موقعے پر گندم وغیرہ کی شکل میں دیتے ہیں۔ آپ جنازہ پڑھانے کے کتنے پیسے لیں گے؟ ہم آپ کو گڑ یا سیر دو سیر گندم دے دیں تو لے لیں گے؟

انھوں نے کہا: میں آپ سے کچھ نہیں لوں گا، مفت میں جنازہ پڑھاؤں گا۔

بولے: مفت کا کیا جنازہ ہوا۔ یہ تو مردے کے لیے فائدہ مند نہیں ہوگا۔

یہ جہالت میں نے سنا ہے اب بھی بعض علاقوں میں پائی جاتی ہے۔امام مسجد کی حیثیت کمین اور لاگی کی سی ہے۔ وہ چودھریوں کے حقے بھی تازہ کرتا ہے۔

ہمارے والد ہمیں کہا کرتے تھے کہ کسی دوسری جگہ کھانا کھانے کا موقع ملے تو کھانے میں نقص نہ نکالو۔ نہ کوئی خاص چیز مانگو۔ جو ملے کھالو اور کھانے والے کا شکریہ ادا کرو۔ سالن میں نمک کم ہو یا میٹھی چیز میں میٹھا کم ہو تو مانگو نہیں۔ اسی طرح کھالو۔ ممکن ہے، ان کے گھر نمک یا میٹھا نہ ہو اور وہ مانگنے سے پریشان ہوں۔

آخر عمر میں ہمارے دادا سخت بیمار ہوگئے تھے۔ ہمارے والد نے ان کی بہت خدمت کی۔ اسی طرح ہمارے والد کو بھی زندگی کے آخری دور میں بیماری نے گھیر لیا تھا۔ ہم تین بھائی لاہور رہتے ہیں اور والد کی زندگی میں تین بھائی گاؤں میں تھے،لیکن ان کی سب سے زیادہ خدمت ہمارے سب سے چھوٹے بھائی حکیم حامد محمود بھٹی نے کی۔ وہ اسی کے پاس رہتے تھے۔ حکیم کی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

حیثیت سے اس وقت وہ سمندری (ضلع فیصل آباد) کے سرکاری ہسپتال میں ملازم تھا اور سمندری شہر ہمارے گاؤں سے ۸۰ کلومیٹر سے زیادہ فاصلے پر ہوگا۔ وہ روزانہ صبح موٹر سائیکل پر سمندری جاتا اور محض والد کی خدمت کے لیے شام کو واپس گاؤں آتا تھا۔ میں اپنے دوسرے بھائیوں کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ لیکن مجھے سخت افسوس ہے اور بے حد نادم ہوں کہ اپنے والد کی خدمت نہیں کرسکا۔ میری بدقسمتی کہ میں ان کی بیماری کے دنوں میں دس دن بھی ان کے پاس نہیں رہا۔

اس کے برعکس میرے والد کی اس گنہگار پر شفقت ملاحظہ ہو کہ میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کا ناظم دفتر تھا۔ مئی ۱۹۴۹ء کے آخری ہفتے میں مرکزی جمعیت کی پہلی کانفرنس (لاہور) میں منعقد ہوئی اور کانفرنس کے انعقاد کے بعد میں بیمار ہوگیا۔ بیماری کی اطلاع والد کو پہنچی تو وہ لاہور تشریف لائے اور پندرہ سولہ دن یہاں رہے۔ کچھ افاقہ ہوا تو مجھے گاؤں لے گئے۔ تقریباً ایک مہینے کے بعد میں گاؤں سے لاہور آیا اور اپنا دفتری کام کرنے لگا۔

میں والدہ کی خدمت سے بھی محروم رہا۔ وہ نیکی بھی حامد محمود کے حصے میں آئی۔ میری جوان بہن کا جوان شوہر اچانک وفات پا گیا تھا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے بچے تھے، والدہ اس کے گھر چلی گئی تھیں اور دن رات وہیں رہتی تھیں۔ حامد ان کا خرچ سبزی، انڈے، چینی، چائے وغیرہ باقاعدہ وہیں پہنچاتا تھا۔ اسی گھر میں والدہ نے ۲۱ فروری ۲۰۰۰ء کو وفات پائی۔ ہمیں لاہور اطلاع پہنچی۔ مجھے ۲۲ فروری کی صبح کو حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہونا تھا۔ اطلاع ملنے پر ہم گاؤں پہنچے۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ نمازِ عشا کے بعد جنازہ ہوا۔ اس سے تھوڑی دیر بعد ان کی تدفین ہوئی۔ تدفین کے بعد رات کو دو بجے ہم لاہور آ گئے۔ ((أَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهَا وَارْحَمْهَا وَعَافِهَا وَاعْفُ عَنْهَا.))

حکیم حامد محمود کی اہلیہ کا گاؤں میں ہائی سیکنڈری سکول جاری ہے جو محکمہ تعلیم کی طرف سے منظور شدہ ہے۔ اس سکول سے چھوٹی بہن کے بچوں نے مفت تعلیم حاصل کی اور کر رہے ہیں۔ بڑے بیٹے نے فیصل آباد سے قرآنِ مجید حفظ کیا۔ پھر جڑاں والا کے گورنمنٹ ہائی سکول میں داخل ہوا اور میٹرک کا امتحان دیا۔ یہ بھی نیکی کا کام ہے جس کا اجر اللہ تعالیٰ کی طرف سے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ملے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

یہ ہے میرا خاندانی پس منظر۔ اس میں اگرچہ میرے خاندان کے کسی بزرگ کا کوئی علمی یا تصنیفی کارنامہ قارئین کو نہیں ملے گا، لیکن میں نے یہ سوچ کر بیان کردیا ہے کہ میں اس میں تنہا نہیں ہوں، اور بھی بہت سے لوگ ہوں گے جو خاندانی اعتبار سے کوئی خاص علمی پس منظر نہیں رکھتے ہوں گے۔ علمی پس منظر نہ ہونے کی وجہ سے خاندان کے اکابر یا اصاغر کا تذکرہ نہ کرنا بے حد معیوب بات ہے۔

۲۳ دسمبر ۲۰۰۷ء — بہاول نگر

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

دوسرا باب:

طلب علم کی راہ پر

میری تاریخ پیدائش ۱۵ مارچ ۱۹۲۵ء ہے اور مقامِ پیدائش ہے ہنڈائیہ (سابق ریاست پٹیالہ، مشرقی پنجاب) جہاں میرے ننھیال رہتے تھے۔ میں اپنے والدین کی پہلوٹھی کی اولاد تھا اور اس وقت پہلے بچے کی پیدائش سے کچھ مدت پیشتر بیٹی کو ننھیال والے اپنے گھر لے جاتے تھے۔ نانا مرحوم نے میرا نام عبدالرشید رکھا تھا، لیکن دادا مرحوم نے محمد اسحاق رکھا اور پھر یہی نام پکا ہو گیا۔

آج ۲۴ دسمبر ۲۰۰۷ء کو جب یہ سطور لکھنے بیٹھا ہوں، عیسوی حساب سے ۸۲ برس ۹ مہینے آٹھ دن کے شب و روز گزار چکا ہوں۔ بہ الفاظ دیگر یہ عمر کا آخری دور ہے۔ بچپن گیا، جوانی گئی، کہولت کا دور بیت گیا۔ اب بڑھاپا اپنا سفر تیزی سے طے کر رہا ہے۔ یہ بھی ختم ہونے والا ہے۔ جب پہلے دور نہ رہے جو اس سے کہیں مضبوط تھے تو یہ کم زور اور لڑکھڑاتا دور کب تک رہے گا۔

اتنی عمر گزر گئی، سوچتا ہوں کہ اب تک کام تو بے شمار کیے، لیکن ایسا کوئی کام نہ کر سکا، جسے اللہ کے دربار میں ذریعۂ نجات سمجھ کر پیش کیا جا سکے۔ بس اسی کے رحم و کرم کا متمنی ہوں۔ وہ چھوٹے سے چھوٹے عمل کو بھی سند قبولیت عطا کرنے پر قادر ہے۔ ممکن ہے اس گناہ گار کا بھی کوئی عمل اسے پسند آ جائے اور بیڑا پار ہو جائے۔

حصولِ علم کا آغاز:

میرے حصولِ علم کا آغاز بہت چھوٹی عمر میں دادا مرحوم کی آغوشِ شفقت میں ہوا۔ اس وقت کے رواج کے مطابق ناظرہ قرآنِ مجید اور پنجابی نظم اور دینیات کی چند اُردو کتابیں ان

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

سے پڑھیں۔ پھر سرکاری سکول میں داخل ہوا۔ چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا کہ ۱۹۳۳ء میں کوٹ کپورہ کی انجمن اصلاح المسلمین کی درخواست پر درس وخطابت کے فرائض کی انجام دہی کے لیے وہاں مولانا عطاء اللہ حنیف تشریف لے گئے۔ میرے دادا کو مجھے دینیات کی تعلیم دلانے کا شوق تھا، چناں چہ انھوں نے مجھے مولانا عطاء اللہ حنیف کے سپرد کردیا۔ اس کے بعد سرکاری سکول میں زیادہ عرصہ نہیں رہا۔

مولانا ممدوح کے سلسلۂ تدریس کی شہرت جلد ہی مختلف مقامات میں پھیل گئی تھی، اس لیے مقامی طلباء کے علاوہ بیرونی طلباء بھی خاصی تعداد میں ان کے حلقۂ درس میں کوٹ کپورہ پہنچ گئے تھے۔ مولانا ۱۹۳۶ء کے آخر تک چار سال وہاں رہے اور میں نے درسیات کی بعض کتابیں ان سے وہیں پڑھیں۔

ایک خواب اور اس کی تعبیر:

کوٹ کپورہ میں ہم تین طالب علم ہم جماعت تھے جو مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ حاجی محمد رفیق، محمد جمیل اور ان سطور کا راقم ......! محمد رفیق وہیں کا رہنے والا تھا اور ارائیں برادری سے تعلق رکھتا تھا۔ بچپن میں اس نے اپنے والدین کے ساتھ حج کیا تھا، اس لیے اسے حاجی کہا جاتا تھا۔ محمد جمیل کا تعلق حاجی رتن کی درگاہ (بھٹنڈہ) کے متولیوں سے تھا۔ کوٹ کپورہ میں وہ اپنے رشتہ داروں کے گھر رہتا تھا۔ ہم تینوں کا آپس میں دوستانہ تھا۔ کوٹ کپورہ میں شہر سے باہر ایک بہت بڑا کنواں تھا، جو معلوم نہیں کب سے خشک یعنی پانی سے خالی تھا۔ اسے ''نائی والا کھوہ'' کہا جاتا تھا۔ ایک دن محمد جمیل نے کہا کہ رات اس نے خواب دیکھا ہے کہ ہم تینوں نائی والے کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھے ہیں اور کنوئیں کا پانی اوپر آ گیا ہے جو ہمیں صاف نظر آ رہا ہے۔ اس نے مجھے کہا کہ تم نے کنوئیں میں چھلانگ لگا دی ہے۔ حاجی محمد رفیق بھی ڈرتے ڈرتے اس میں اتر پڑا ہے۔ لیکن خود میں (محمد جمیل) کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھا رہا اور میں نے اپنے آپ کو کنوئیں کے پانی سے محفوظ رکھا۔

جمیل سے یہ خواب سن کر میں بے حد پریشان ہوا۔ میں نے خیال کیا کہ میں جو کنوئیں

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

میں گر گیا ہوں، علم سے محروم رہوں گا۔ حاجی رفیق جو ڈرتے ڈرتے کنوئیں میں اترا ہے، یہ کچھ علم حاصل کرلے گا اور جمیل جو کنوئیں میں نہیں گرا، علم کی دولت سے بہرہ ور ہوگا۔

جمیل اس خواب سے بہت خوش تھا، کیوں کہ وہ کنوئیں میں گرنے سے محفوظ رہا تھا۔ یعنی کنوئیں میں گرنا ہمارے نزدیک جہالت کی زندگی بسر کرنا تھا اور نہ گرنا حصولِ علم کی علامت۔

وہاں ایک بزرگ میاں عید محمد رہتے تھے، جنھیں لوگ ''میاں عیدو'' کہا کرتے تھے۔ وہ مسجد میں بیٹھے تھے اور ان کا زیادہ وقت مسجد ہی میں گزرتا تھا۔ میاں عید محمد کے ایک ہی بیٹے ہیں، ان کا نام عطاء اللہ ہے۔ ہمارے گاؤں کی ایک مسجد کے امام ہیں۔ نہایت پرہیز گار۔ امامت کا کسی سے کوئی پیسا نہیں لیتے۔

ہم نے میاں عیدو سے خواب بیان کیا اور اس کی تعبیر پوچھی تو انھوں نے کہا کہ میرے خیال میں اس خواب کی کوئی تعبیر تو ہے، لیکن مجھے اس کا علم نہیں۔ تم حاجی نورالدین کے پاس جاؤ اور ان سے خواب بیان کرو، وہ تمھیں اس کی صحیح تعبیر بتائیں گے۔ چناں چہ ہم حاجی نورالدین صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہ اپنے گھر میں محلے کے بچوں کو قرآنِ مجید پڑھا رہے تھے۔ جمیل نے ان سے خواب بیان کیا۔ میں خاموش بیٹھا تھا اور ڈر رہا تھا کہ معلوم نہیں حاجی صاحب اس کی کیا تعبیر بیان کریں گے۔ میرے ذہن میں اس کی یہی تعبیر آرہی تھی کہ میں چوں کہ کنوئیں میں گر گیا ہوں، اس لیے پڑھ نہیں سکوں گا۔ جاہل ہی رہوں گا۔ بس جمیل پڑھ جائے گا یا حاجی رفیق تھوڑا بہت علم حاصل کرلے گا۔

حاجی نورالدین نے بڑے غور سے خواب سنا۔ وہ اونچی اونچی بولتے تھے۔ فرمایا:

''تم میں سے کنوئیں میں کون گرا ہے؟''

جمیل نے میری طرف اشارہ کرکے کہا: ''یہ گرا ہے۔''

مجھے مخاطب کرکے فرمایا: ''تم پڑھ جاؤ گے۔''

میں نے عرض کیا: ''جناب! میں تو کنوئیں میں گر گیا ہوں۔''

بولے: ''خواب میں پانی میں گرنا اچھا ہے۔ تم علم حاصل کرلو گے۔ جو تھوڑا گرا ہے، وہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

بھی کچھ پڑھ جائے گا۔ جونہیں گرا وہ نہیں پڑھ سکے گا۔'' ❶

مجھے اس تعبیر کی صحت پر شبہ ہی رہا۔ لیکن بعد میں جو حالات پیدا ہوئے، ان کے پیش نظر میں اپنے متعلق یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میں نے علم حاصل کر لیا۔ مگر ہوا یہ کہ حاجی رفیق نے مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی اور حضرت مولانا احمد اللہ دہلوی پرتاپ گڑھی کے حلقہ ہائے درس میں کھنڈیلہ (راجپوتانہ) اور دہلی جا کر کتب حدیث مکمل کر لیں اور جمیل تھوڑے عرصے کے بعد اپنے مسکن بھٹنڈہ چلا گیا۔ اس نے طب کی بعض کتابیں پڑھ کر طبابت شروع کر دی۔ حاجی رفیق فراغت کے بعد فوج میں بھرتی ہو گیا۔ اور درسیات سے اس کا تعلق منقطع ہو گیا اور میں جیسا ہوں قارئین کے سامنے ہوں۔

نہایت افسوس ہے قیامِ پاکستان کے زمانے میں جمیل اگست ۱۹۴۷ء کے ایک بڑے قافلے کے ساتھ پاکستان آتے ہوئے موضع گولے والا (ریاست فرید کوٹ) میں وفات پا گیا۔ وہ خوب صورت جوان تھا اور میرا دوست۔ اس کے بعض رشتہ دار ہمارے موجودہ گاؤں میں آ بسے تھے۔ جمیل کا دوست ہونے کی وجہ سے اس کے والد مجھ پر شفقت کرتے تھے۔ اس کا چھوٹا بھائی محمد سعید ہمارے گاؤں میں مقیم ہے۔ میرا بے حد احترام کرتا ہے۔ اس کا ایک بھائی محمد یعقوب ضلع بہاول نگر کے ایک گاؤں لوہارے والا میں سکونت پذیر ہے۔ وہ بھی میرا دوست ہے۔

حاجی رفیق اپنے خاندان کے ساتھ ہمارے گاؤں میں آ گیا تھا اور میرا بے تکلف اور مخلص ترین دوست تھا۔ وہ بچپن سے میرا راز دان بھی تھا اور راز دار بھی۔ میں بھی اس کا راز دان اور راز دار تھا۔ اس نے ۳ نومبر ۱۹۹۳ء کو وفات پائی۔ مجھے اس کی وفات کا انتہائی افسوس ہوا۔ میری تمام تصانیف اس کے پاس تھیں اور وہ نہایت شوق سے ان کا مطالعہ کرتا اور لوگوں سے ان کے مندرجات بیان کیا کرتا تھا۔ اس کا عام مطالعہ اچھا خاصا تھا۔ کتابیں خریدنے اور پڑھنے کا شائق تھا۔

---

❶ یہ وہی حاجی نور اللہ ہیں جن کا گزشتہ سطور میں مولانا امام الدین کے ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

مرکز الاسلام میں:

ضلع فیروز پور (مشرقی پنجاب) میں ایک چھوٹا سا گاؤں ''لکھوکے'' تھا جو تقسیم ملک سے تقریباً سوا سو سال پہلے سے علم و عرفان کا مرکز چلا آرہا تھا۔ اس گاؤں میں متعدد علمائے کرام پیدا ہوئے جن سے بے شمار لوگوں نے علمی اور روحانی فیض حاصل کیا۔ اس گاؤں میں ایک بہت بڑے عالم حضرت حافظ محمد لکھوی گزرے ہیں، جنھوں نے فارسی میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا اور پنجابی نظم میں ''تفسیر محمدی'' کے نام سے قرآنِ مجید کی تفسیر لکھی جو سات ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ انھوں نے حدیث شریف کی بعض کتابوں پر عربی میں حواشی تحریر فرمائے۔ ان کے شاگردوں اور عقیدت مندوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔

متحدہ پنجاب میں حافظ محمد لکھوی کی منظوم پنجابی کتابیں بڑے شوق اور اہتمام سے مسلمانوں کے گھروں میں پڑھی جاتی تھیں۔ دیہات کے لوگ خاص طور پر ان کتابوں سے بہت متاثر تھے۔ ان کی ایک کتاب کا نام ''انواعِ محمدی'' ہے جو روزانہ پیش آنے والے دینی مسائل پر محیط ہے۔ مجھے یہ کتاب میرے دادا نے پڑھائی تھی۔ اس وقت میری عمر بارہ تیرہ برس کی ہوگی۔

ایک مرتبہ ہمارے ہاں ایک مولوی صاحب تشریف لائے۔ ان کا نام مولوی مبارک علی تھا۔ ان کے ارشاد کے مطابق میں نے ان کو ''انواعِ محمدی'' کے بعض مقامات پڑھ کر سنائے تو وہ بہت خوش ہوئے اور خوشی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ کتاب پڑھ کر آدمی آدھا مولوی ہوجاتا ہے۔ لیکن اس کے بعد میری طالب علمی کا زمانہ کئی سال تک پھیلتا گیا۔ میری دادی مرحومہ نے ایک دن کہا کہ مولوی مبارک علی نے تو کئی سال پہلے تمھارے دادا کی پڑھائی ہوئی کتاب سن کر کہا تھا کہ یہ کتاب پڑھ کر آدمی آدھا مولوی ہوجاتا ہے۔ لیکن تم ابھی تک پڑھ رہے ہو۔ کیا اس کے بعد اتنے سالوں میں پورے مولوی نہیں ہوئے؟

حضرت حافظ محمد لکھوی نے آخر صفر ۱۳۱۱ھ (ستمبر ۱۸۹۳ء) میں اپنے گاؤں لکھوکے میں وفات پائی۔

انھی حافظ محمد لکھوی کے پوتے اور حضرت مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی (متوفی مئی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

۱۸۹۵ء۔ ذیقعدہ ۱۳۱۲ھ) کے فرزند گرامی مولانا محمد علی لکھوی تھے جو اپنے عہد کے جلیل القدر عالم تھے۔ وہ مجاہدانہ طبیعت کے مالک تھے اور آزاد قبائل کے مجاہدین کے خاص معاون۔ ان کی افرادی مدد بھی کرتے تھے یعنی انگریزی حکومت سے لڑنے کے لیے وہاں مجاہدین بھیجتے تھے اور مالی مدد بھی فرماتے تھے۔ انھوں نے موضع لکھوکے سے ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر دو مربعہ زمین میں ''مرکز الاسلام'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا۔ یہ ۱۹۲۸ء کے پس وپیش کی بات ہے۔ یہیں انھوں نے مستقل طور سے سکونت اختیار کر لی تھی۔ یہاں کی کل آبادی چار گھروں پر مشتمل تھی۔ اور یہ چاروں گھر مرکز الاسلام کی چار دیواری کے اندر تھے۔ ایک مولانا کا اپنا گھر، دوسرا قمر الدین ترکھان کا، تیسرا فتح محمد لوہار کا اور چوتھا ان کے ایک مزارع کا گھر تھا۔ اسی چار دیواری کے اندر ایک مدرسہ تھا اور یہیں مسجد تھی۔

۱۹۳۶ء کے دسمبر کے آخری ہفتے میں مولانا محمد علی لکھوی کوٹ کپورہ گئے اور حاجی محمد علی مرحوم کے مکاں پر ٹھہرے۔ وہیں نمازِ عشاء کے بعد انجمن اصلاح المسلمین کے ارکان سے اس موضوع پر گفتگو کی کہ وہ مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کو تدریس کے لیے مرکز الاسلام جانے کی اجازت دے دیں۔ انجمن کے ارکان نے مولانا لکھوی کے حکم کی تعمیل کی اور مولانا عطاء اللہ حنیف یکم جنوری ۱۹۳۷ء کو مرکز الاسلام پہنچ گئے۔ میں طالب علم کی حیثیت سے ان کے ساتھ گیا۔

''مرکز الاسلام'' ہمارے نزدیک ایک بھاری بھرکم نام تھا اور خیال یہ تھا کہ یہ اچھا خاصا شہر ہوگا۔ لیکن وہاں جا کر پتا چلا کہ یہ تو جنگل ہے۔ فیروز پور سے بہاول نگر اور سمہ سٹہ جانے والی ریلوے لائن پر دوسرا اسٹیشن، جھوک ٹہل سنگھ تھا جو فیروز پور سے چودہ میل کی مسافت پر تھا۔ جھوک ٹہل سنگھ سے مرکز الاسلام ریلوے لائن کے قریب دوسرے سگنل کے برابر آدھے میل کے فاصلے پر ہوگا۔ میں شہر سے گیا تھا۔ مرکز الاسلام کو دیکھ کر سخت حیرانی ہوئی۔ نہ بازار، نہ دکان، نہ گلی، نہ محلّہ۔ بس کچی اینٹوں کی چار دیواری اور کچے چار گھر۔ مسجد البتہ پختہ اینٹوں کی تھی، جو طول وعرض میں بہت چھوٹی تھی۔

مہمان وہاں بہت آتے تھے اور بعض مہمان کئی کئی دن قیام فرماتے تھے۔ مختلف مقامات

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

سے علمائے کرام کی آمد و رفت بھی رہتی تھی۔ مہمانوں اور طالب علموں کا کھانا مولانا محمد علی لکھوی کے گھر سے آتا تھا۔ مولانا کے فرزندانِ گرامی مولانا محی الدین اور مولانا معین الدین لکھوی اس وقت نوجوان تھے۔ دونوں مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ مہمانوں کا یہ بے حد احترام کرتے تھے۔

میں نے مولانا عطاء اللہ حنیف سے وہاں حدیث، اصولِ حدیث، صرف ونحو اور منطق کی چند ابتدائی کتابیں پڑھیں۔

فیروز پور میں:

۱۹۳۷ء کے آخر میں فیروز پور کی انجمن اہل حدیث کے دو رکن (خان عبدالعظیم خاں اور مولانا عبیداللہ احرار) مرکز الاسلام گئے اور مولانا محمد علی لکھوی سے ملے۔ انھوں نے مولانا سے عرض کیا کہ فیروز پور ضلعے کا مرکزی مقام ہے، لیکن وہاں کی مسجد اہل حدیث گنبداں والی میں نہ دینی مدرسہ ہے اور نہ وہاں کوئی مستقل خطیب ہے۔ اگر وہ مولانا عطاء اللہ حنیف کو وہاں بھیج دیں تو خطابت و تدریس کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ چناں چہ مولانا عطاء اللہ حنیف ۱۹۳۸ء کے شروع میں فیروز پور تشریف لے گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ فیروز پور چلا گیا۔ فیروز پور میں ان کے حلقۂ درس میں بہت سے علما و طلبا نے شرکت کی اور اپنی اپنی ذہنی استعداد کے مطابق ان سے استفادہ کیا۔ میں ۱۹۴۰ء تک فیروز پور میں مولانا ممدوح سے حصولِ فیض کرتا رہا۔ اس طرح ۱۹۳۳ء سے لے کر ۱۹۴۰ء تک اپنی محدود سی قابلیت کے مطابق میں نے مولانا عطاء اللہ حنیف سے اکتسابِ علم کیا، جس کی تفصیل اس طرح ہے:

- حضرت قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی ''رحمتہ للعالمین'' اور اُردو کی بعض کتابوں کے علاوہ شیخ سعدی کی ''گلستان'' اور ''بوستان'' ان سے پڑھیں، جو اس وقت مدارس میں طلبا کو پڑھائی جاتی تھیں۔
- قرآنِ مجید کا ترجمہ انھی سے پڑھا۔
- بلوغ المرام سے لے کر صحیح بخاری تک صحاح کی نصابی کتابوں کی تکمیل ان سے کی۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

- علم صرف کی صرف بہائی سے لے کر شافیہ تک۔
- علم نحو کی نحو میر سے شرح جامی تک۔
- عربی ادبیات کی نفحۃ الیمن، سبعہ معلقہ، مقامات حریری، متنبّی، حماسہ۔
- معانی و بیان کی مختصر المعانی اور مطول۔
- منطق کی ایساغوْجی، مقامات، شرح تہذیب اور قطبی۔
- اصولِ حدیث کی نخبۃ الفکر اور مقدمہ ابن الصلاح۔
- اصول فقہ کی اصول شاشی، نور الانوار اور توضیح تلویح۔
- علم مناظرہ کی رشیدیہ۔ علم فقہ کی قدوری، شرح وقایہ اور ہدایہ۔
- تفاسیر میں سے بیضاوی، تفسیر جلالین اور جامع البیان۔

یہ تمام درسی کتابیں مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے پڑھیں۔

فیروز پور ہم دو طالب علم ایک کمرے میں رہتے تھے۔ صبح کی نماز کے وقت ہمیشہ گلی سے آواز آتی تھی ''بکری اُدٗ''۔ آواز دینے والا اسے بار بار دہراتا ہوا آگے نکل جاتا تھا۔ ایک دن میں اس کے آنے سے پہلے دروازہ کھول کر باہر بیٹھ گیا۔ وہ پندرہ بیس بکریوں کو ہانکتا اور ''بکری اُدٗ'' کی آواز لگاتا ہوا آرہا تھا۔ وہ دراصل ''بکری دودھ'' کہتا تھا، یعنی بکری کا دودھ لے لو۔

اسی طرح شام کے بعد ایک شخص یہ آواز دیتا ہوا گزرتا تھا ''ہیکی بو'' اس کا مطلب بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اسے ایک دن باہر نکل کر دیکھا تو اس نے مٹی کے تیل کا کنستر کندھے پر اُٹھا رکھا تھا اور ہاتھ میں بوتل اور کنستر سے تیل نکالنے والی لوہے کی پچکاری سی تھی اور وہ کہہ رہا تھا ''تیل کی بوتل''۔

گوجراں والا میں:

۱۹۴۰ء میں مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی نے مجھے حضرت علامہ حافظ محمد گوندلوی اور حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کی خدمت میں گوجراں والا بھیج دیا۔ وہاں میں نے حضرت حافظ

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

صاحب سے مؤطا امام مالک اور صحیح بخاری دونوں کتابیں دوبارہ پڑھیں۔ حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی سے تفسیر بیضاوی، شرح وقایہ، ہدایہ اور حماسہ کا درس لیا۔

فیروز پور میں بعض درسی کتابیں مولانا ثناء اللہ ہوشیار پوری مرحوم سے بھی پڑھیں۔ اس طرح دینی مدارس کا مروجہ نصاب جسے درس نظامی کہا جاتا ہے، تکمیل کی منزل کو پہنچا۔ اساتذہ کا حلقہ بہت محدود ہے۔

۲۴ر دسمبر ۲۰۰۷ء　　　　　　بہاول نگر

❀❀❀❀

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

تیسرا باب:

اساتذہ کرام

گزشتہ سطور میں اپنے عظیم المرتبت اساتذہ کے اسمائے گرامی بتا چکا ہوں۔ ابتدا سے لے کر انتہا تک مروّجہ نصاب کی تمام کتابیں انہی حضرات سے پڑھیں۔ ان پر میرے تفصیلی مضامین اگرچہ میری کتاب ''نقوشِ عظمت رفتہ'' اور کسی حد تک بعض دیگر کتابوں میں چھپ چکے ہیں تاہم موقع کی مناسبت سے یہاں بھی ان کا تذکرہ ضروری ہے۔ لہٰذا ان بزرگانِ عالی مقام کے بارے میں اختصار کے ساتھ چند گزارشات پیش کی جاتی ہیں۔

مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی:

سب سے پہلے حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کا تذکرہ کرنا چاہیے، اس لیے کہ ہر مروّجہ موضوع کی کتابیں پڑھنے کی سعادت پہلے انہی کی بارگاہِ فضیلت میں حاصل ہوئی۔

مولانا ممدوح ۱۹۰۹ء کے پس و پیش موضع بھوجیاں تحصیل ترنتارن ضلع امرتسر (مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد میاں صدر الدین حسن اور والدہ مکرمہ حضرت الامام سیّد عبدالجبار غزنوی کے دائرۂ بیعت میں شامل تھے۔ دونوں میاں بیوی نہایت صالح سرشت تھے۔ لیکن غربت کے سائے میں زندگی بسر کرتے تھے۔ ماں باپ کی وراثت میں بیٹے کے حصے میں بھی غربت ہی آئی۔ چھوٹی عمر میں والد وفات پا گئے تو غربت کا سایہ مزید دراز ہو گیا۔ لیکن ماں سمجھ دار خاتون تھیں۔ انھوں نے بیٹے کی بہتر طریقے سے تربیت کرنے کا عزم کیا اور اسے تحصیل علم کی ترغیب دی۔ چناں چہ سعادت کیش بچے نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں مولانا عبدالرحمٰن بھوجیانی اور حاجی امان اللہ بھوجیانی سے حاصل کی۔ ان دونوں بزرگوں کو اگست ۱۹۴۷ء میں ان کے گاؤں (بھوجیاں) میں سکھوں نے شہید کر دیا تھا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

صاحب سے موطا امام مالک
گئے۔ وہاں مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی اور
اسماعیل سلفی سے تفسیر پڑ
لگے اور کتب حدیث انہی علمائے ذی
فیروز پور میں
ہر کھلے اور دل میں مطالعۂ کتب کے
طرح دینی م
طرف سے جو وظیفہ ملتا تھا، روزانہ
حلقہ بہ
پہ اپنے ذوق کی کتابوں کا اچھا خاصا
کتابیں ان کے مطالعہ میں رہتی تھیں۔ ان کی دلچسپی کا
دن حدیث اور رجالِ حدیث تھا۔

دہلی سے سند حدیث لینے کے بعد وہ موضع ''لکھوکے'' آئے۔ پنجاب میں ۱۸۴۲ء کے پس و پیش اہل حدیث کا پہلا مدرسہ یہیں قائم ہوا تھا اور یہاں طویل مدت سے استادِ پنجاب حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی کا سلسلۂ درس جاری تھا۔ دیگر علوم کے ساتھ ساتھ صرف ونحو کی ماہرانہ تدریس میں انھیں بالخصوص شہرت حاصل تھی۔ مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی نے ان سے بعض علوم کی تحصیل کی۔ مولانا عطاء اللہ لکھوی اپنے اس شاگرد کی فن حدیث سے دلچسپی اور رجالِ حدیث میں وسعت مطالعہ سے بہت خوش تھے۔

لکھوکے سے وہ ضلع گوجراں والا کے قصبہ گوندلاں والا میں حضرت حافظ محمد گوندلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان سے علومِ حدیث کے بارے میں بھی استفادہ کیا اور منطق و فلسفہ کی بعض کتابیں بھی ان سے پڑھیں۔ حضرت حافظ صاحب کی فراوانیٔ علم سے وہ بہ درجہ غایت متاثر ہوئے اور یہ تاثر تمام عمر قائم رہا۔ حضرت حافظ صاحب بھی ان سے زندگی بھر خوش رہے۔

اس وقت گوجراں والا میں پنجاب کی جماعت اہل حدیث کی طرف سے (جس کے منصب امارت پر حضرت سیّد محمد شریف گھڑیالوی فائز تھے) ایک دینی مدرسہ جاری کیا گیا تھا، مولانا عطاء اللہ حنیف نے علوم متداولہ سے فراغت پائی تو اس مدرسے کی خدمت تدریس پر انھیں مامور کر دیا گیا۔ تقریباً ایک سال وہ یہ خدمت سرانجام دیتے رہے۔ پھر حضرت مولانا محمد

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

اسماعیل سلفی کی تجویز سے کوٹ کپورہ کی انجمن اصلاح المسلمین کی درخواست پر وہاں تشریف لے گئے۔ یہ ۱۹۳۳ء کا واقعہ ہے۔

۱۹۳۶ء میں مہاراجا فرید کوٹ ہراندر سنگھ نے ایک مسجد پر قبضہ کر کے اسے فرید کوٹ کی میونسپل کمیٹی کا دفتر بنا دیا تھا۔ ریاست میں اس قسم کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ اس سے قبل سکھ ریاست کی طرف سے مسلمانوں کو کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچی تھی۔ اس پر ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ میری عمر اس وقت گیارہ بارہ برس کی تھی۔ لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مسجد پر قبضے کے بعد مولانا عطاء اللہ حنیف نے کوٹ کپورہ کی جامع مسجد میں جو پہلا خطبۂ جمعہ ارشاد فرمایا، اس کا آغاز سورۂ بقرہ کی اس آیت کریمہ سے کیا تھا۔

﴿وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَ سَعٰى فِيْ خَرَابِهَا اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝﴾ (البقرہ: ١١٤)

(اس شخص سے بڑا ظالم کون ہے، جو اللہ کی مسجدوں میں اس کا نام لینے سے روکتا ہے اور ان کو اجاڑنے کے درپے ہے۔ یہ لوگ مسجدوں میں ڈر ڈر کے ہی آنے پائیں گے۔ وہ دنیا میں بھی ذلیل ہوں گے اور آخرت میں بھی بڑے عذاب میں مبتلا ہوں گے۔)

اس وقت مولانا کا لہجہ بہت سخت تھا اور انھوں نے نہایت جذباتی انداز میں خطبہ دیا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ پوری ریاست اور اس کے اردگرد کے ان دیہات میں جو ضلع فیروز پور (یعنی انگریزی علاقے) میں شامل تھے، ایک ہلچل سی پیدا ہوگئی اور والیٔ ریاست کے اس اقدام پر شدید ردّعمل کا اظہار ہوا۔

انھی دنوں کی بات ہے کہ ہمارے ایک رشتے دار صوفی رفیق احمد بھٹی نے راجا فرید کوٹ کی اس مقبوضہ مسجد میں جا کر اذان دے دی۔ اس جرم میں انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ خان بہادر مولوی عبدالعزیز کی عدالت میں مقدمہ چلا اور سات سال کی قید ہوئی۔ اتفاق سے ایک

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

مرتبہ راجا فرید کوٹ جیل کے دورے پر گیا تو صوفی صاحب کی کوٹھڑی میں بھی پہنچ گیا۔ پوچھا: کیا نام ہے اور کس جرم میں قید ہوئے؟

انہوں نے نام بتایا اور کہا کہ میں نے اس مسجد میں اذان دی تھی جس پر آپ نے قبضہ کر کے اسے میونسپل کمیٹی کا دفتر بنایا ہے۔

پوچھا: کتنی قید ہوئی تھی؟

کہا: سات سال۔

پوچھا: کتنی قید کاٹ چکے ہو؟

جواب دیا: اکتیس مہینے۔

یہ سن کر اس نے باقی قید معاف کر دی اور اسی وقت رہائی کا حکم دے دیا۔ ۱۹۴۶ء میں پرجا منڈل کی تحریک کے بعد یہ مسجد مسلمانوں کو دے دی گئی تھی۔ اور ہم نے جیل سے رہائی کے بعد پہلا جمعہ اسی مسجد میں پڑھا تھا۔

یہ تو ایک سکھ ریاست کا واقعہ تھا۔ لیکن اب اسلامی ملک پاکستان میں کیا ہو رہا ہے۔ خود دارالحکومت اسلام آباد میں پرویز مشرف کے دور میں کتنی ہی مسجدیں منہدم کر دی گئیں۔ جامعہ حفصہ میں گولیوں سے سیکڑوں کی تعداد میں طالبات کو جن میں چھ چھ سات سات سال کی بچیاں بھی تھیں، فوج نے قتل کر دیا۔ لال مسجد کی بے حرمتی کی گئی، اس کے فرش اور دیواروں پر جگہ جگہ خونِ شہدا کے فوارے چلے اور گوشت کے لوتھڑے جم گئے۔ مسجد اور مدرسے کے ایک خطیب اور مدرس کو قتل کر دیا گیا اور ایک کو گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا گیا۔ الٹا اسی پر قتل کا مقدمہ بھی قائم کیا گیا۔ اس کے علاوہ ہمارے اس اسلامی ملک کی متعدد مسجدوں میں نمازی قتل ہوئے، خطیب و امام مار دیے گئے اور مسجدیں مقفل ہوئیں۔

سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے ججوں کو ان کے مناصب سے صرف اس لیے علیحدہ کر دیا گیا کہ وہ عدل و انصاف کے بارے میں چھوٹے بڑے سب کو برابر کا درجہ دیتے ہیں اور حکومت کے منصب داروں اور اقتدار پر قابض لوگوں کو عوام پر ترجیح نہیں دیتے۔ قانونی نقطۂ نظر

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کے مطابق فیصلے کرتے ہیں۔ پھر حکومت کو ان ججوں کی علیحدگی پر صبر نہیں آیا، انھیں گھروں میں قید کر دیا گیا اور مسجدوں میں جانے اور نماز پڑھنے سے روک دیا گیا۔ یہاں تک کہ جمعہ اور عید کی نماز پڑھنے کی بھی اجازت نہ دی گئی۔ www.KitaboSunnat.com

بہر حال مولانا عطاء اللہ حنیف کو حکومت نے گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔ کوٹ کپورہ کے لوگوں نے مولانا کی نظر بندی کو اپنی توہین سمجھا اور اس پر سخت افسوس کا اظہار اور شدید احتجاج کیا گیا۔ مولانا دو دن جیل میں رہے۔ تیسرے دن ان کی ضمانت کرا لی گئی اور وہ رہا ہو گئے۔ خود حکومت بھی انھیں جلد رہا کرنا چاہتی تھی تا کہ معاملہ آگے نہ بڑھے۔

مولانا ممدوح سیاسیات میں کانگرسی نقطۂ نظر کے حامی تھے اور ریاست میں ان کا رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ صرف چار سال (۱۹۳۶ء کے آخر تک) وہاں رہے۔ اس کے بعد ۱۹۳۷ء کے شروع میں مولانا محمد علی لکھوی انھیں مرکز الاسلام لے گئے تھے۔ پھر ۱۹۳۸ء میں فیروز پور کی انجمن اہل حدیث کی درخواست پر وہاں تشریف لے گئے۔ انھیں فیروز پور شہر کی کانگرس کمیٹی کا نائب صدر منتخب کیا گیا اور ضلع کی جمعیت علمائے ہند کی شاخ کے صدر بنے۔

وہ سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ گھر کے بنے ہوئے سفید کھدر کی قمیص، کھدر کا تہبند اور کھدر ہی کی دستار، یہ ان کا لباس تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد انھیں مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی نے اپنے خاندانی دار العلوم تقویۃ الاسلام (مدرسہ غزنویہ) کے منصب شیخ الحدیث پر متمکن کر دیا تھا۔ انھوں نے التعلیقات السّلفیہ کے نام سے سنن نسائی کی شرح لکھی۔ دار الدعوۃ السّلفیہ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا، جس کا کتب خانہ بیس بائیس ہزار کتابوں پر مشتمل ہے۔ ہفت روزہ الاعتصام اسی ادارے کی طرف سے شائع کیا جاتا ہے۔

مولانا ممدوح نے ۲/ اکتوبر ۱۹۸۷ء کو لاہور میں وفات پائی۔

حافظ محمد گوندلوی:

حضرت مولانا حافظ محمد گوندلوی کو قدرت کی بے پناہ فیاضیوں سے ذہانت و ذکاوت اور علم و عمل کی دولت سے خوب نوازا گیا تھا۔ وہ ۲۷ جنوری ۱۸۹۸ء (۴ رمضان ۱۳۱۵ھ) کو

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

گوندلاں والا (ضلع گوجراں والا) میں پیدا ہوئے۔ والد کا اسم گرامی مولوی فضل الدین تھا۔ والد نے بیٹے کا نام محمد اعظم رکھا اور والدہ نے صرف محمد پر اکتفا کیا اور پھر اسی نام سے مشہور ہوئے۔

مولوی فضل الدین نے گوجراں والا کے مولانا علاؤ الدین اور وزیر آباد کے حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی سے کسب فیض کیا تھا۔ بیٹے کو بھی وہ اسی راہ پر لگانے کے خواہاں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ بیٹا قرآن بھی حفظ کرے اور علم دین سے بھی بہرہ ور ہو۔ چناں چہ وہ چار پانچ سال کی عمر کو پہنچے تو گاؤں کے ایک حافظ قرآن کے سپرد کر دیے گئے اور قرآن حفظ کرنے لگے۔ اس طرح کئی پارے یاد کر لیے۔ لیکن اس اثنا میں یہ المیہ پیش آیا کہ جب وہ زندگی کے نویں سال میں داخل ہوئے تو والد پینتیس سال کی عمر میں طاعون کی بیماری سے وفات پا گئے۔ اس وقت ہونہار بیٹے نے قرآن کا زیادہ تر حصہ حفظ کر لیا تھا، باقی حصہ بعد میں حفظ کیا۔

والد کی وفات کے بعد گھر کے حالات بالکل بدل گئے اور آمدنی کے ذرائع جو پہلے ہی محدود تھے، اور سکڑ گئے۔ لیکن والدہ حوصلہ مند خاتون تھیں اور دل میں یہ عزم رکھتی تھیں کہ بیٹے کو ہر حال میں علم دین پڑھائیں گی۔ سعادت مند بیٹا بھی کم سنی کے باوجود ذہن میں حصولِ علم کا داعیہ راسخہ لیے ہوئے تھا۔ اس وقت گوجراں والا کی جامع مسجد اہل حدیث (چوک نیائیں) میں مولانا علاؤ الدین امامت و خطابت اور درس و تدریس کی خدمت سرانجام دیتے تھے، اسی بنا پر اس مسجد کو مولوی علاؤ الدین کی مسجد کہا جاتا تھا۔ بہت عرصے تک یہ مسجد اسی نام سے موسوم رہی۔ مولوی صاحب ممدوح حضرت مولانا غلام رسول (ساکن قلعہ میہاں سنگھ) کے شاگرد اور مرید تھے اور تقویٰ شعار بزرگ تھے۔ حضرت حافظ صاحب کی والدہ نے بیٹے کو ان کی خدمت میں بھیج دیا۔ وہاں انھوں نے عربی ادب اور صرف و نحو کی چند ابتدائی کتابیں پڑھیں۔

حافظ صاحب نہایت ذہین اور تیز طبع طالب علم تھے اور انتہائی شوق اور محنت سے حصولِ علم کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ اب والدہ نے ان کی تعلیم کے لیے ایک اور اقدام کیا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

گونداں والا میں ایک بزرگ عبداللہ ٹھیکیدار سکونت پذیر تھے جو کشمیری برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ حافظ صاحب کے والد گرامی مولوی فضل الدین کے عقیدت مند تھے۔ نیک بخت خاتون نے ان کی وساطت سے بچے کو امرتسر کے مدرسہ غزنویہ میں داخل کرادیا۔ اس مدرسے کی اس وقت علمی حلقوں میں بڑی شہرت تھی۔ اس میں حافظ صاحب نے مولانا سیّد عبدالجبار غزنوی، مولانا عبدالاوّل غزنوی، مولانا عبدالغفور غزنوی، مولانا محمد حسین ہزاروی اور مولانا عبدالرزاق پشاوری سے تفسیر وحدیث، فقہ وکلام اور بعض دیگر علوم کی تکمیل کی۔

اس کے بعد حافظ صاحب نے دہلی کا عزم کیا اور حکیم حافظ محمد اجمل خاں کے طبیہ کالج میں داخلہ لیا۔ اس کالج میں انھوں نے حکیم محمد اجمل خاں اور بعض دیگر اساتذۂ طب سے علم طب کی کتابیں پڑھیں۔ جس سال وہ اس کالج کی تعلیم سے فارغ ہوئے، اس سال جلسۂ تقسیم اسناد میں گاندھی جی کو بلایا گیا تھا اور انھوں نے فارغ ہونے والے طلبا کو سندیں تقسیم کی تھیں، جن میں حضرت حافظ صاحب بھی شامل تھے۔

طبیہ کالج کی تعلیم کے دوران میں انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل اور منشی فاضل کے امتحانات دیے اور ان امتحانات میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ مولوی فاضل کو اب فاضل عربی اور منشی فاضل کو فاضل فارسی کہا جاتا ہے۔

دہلی کے اسی زمانۂ قیام میں حافظ صاحب نے مولانا احمد اللہ دہلوی، مولانا عبدالرحمٰن پنجابی اور مولانا محمد اسحاق منطقی سے استفادہ کیا۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد حافظ صاحب اپنے وطن واپس آئے اور گونداں والا میں مسند درس آراستہ کی۔ بے شمار علما وطلبا نے ان کے سامنے زانوے شاگردی تہ کیے اور ان کے شاگردوں کے شاگردوں سے بھی لاتعداد حضرات مستفیض ہوئے۔ حضرت حافظ صاحب کے تلامذہ کی وسیع فہرست میں ایک صاحب قلم دوست نے مولانا محمد حنیف ندوی کو بھی شامل کیا ہے۔ یاد رہے مولانا ندوی کبھی ان کے حلقۂ شاگردی میں شامل نہیں ہوئے۔ البتہ وہ ان کے فضل وکمال، وسعت مطالعہ اور ذہانت کے بے حد مداح تھے۔ اسی طرح بعض دوستوں نے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

مولانا محمد حنیف ندوی کو علامہ سیّد سلیمان ندوی کے شاگردوں میں شمار کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ مولانا حنیف ندوی کا ان سے بھی استاذی شاگردی کا کبھی تعلق نہیں رہا۔

حافظ صاحب عربی اور اُردو کی متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کا اسلوب تحریر بہت گہرا اور محققانہ تھا۔ عام فہم اور آسان زبان میں لکھنا یا تقریر کرنا ان کے لیے مشکل تھا۔ انھوں نے تمام زندگی ہنگامۂ تدریس برپا کیے رکھا۔

اس عظیم المرتبت عالم دین نے کم و بیش ۹۰ برس کی بھرپور علمی زندگی گزار کر ۴ جون ۱۹۸۵ء (۱۴ رمضان المبارک ۱۴۰۵ھ) کو تین بجے سہ پہر اس جہانِ فانی کو خیر باد کہا اور عالم جاودانی کو روانہ ہوئے۔ دوسرے دن ۵ جون کو صبح نو بجے ان کی نمازِ جنازہ گوجراں والا کے شیراں والا باغ میں پڑھی گئی اور اس شہر کی سرزمین نے ان کے جسد خاکی کو بہ درجہ غایت مسرت کے ساتھ اپنی آغوش میں لے لیا۔ یہ فقیر حضرت مرحوم کی نمازِ جنازہ میں شامل تھا۔ رحمۃ اللہ علیہ

میں نے ان پر طویل مضمون اپنی کتاب ''نقوش عظمت رفتہ'' میں لکھا ہے۔

مولانا محمد اسماعیل سلفی:

میرے اساتذہ کی مختصر مگر وقیع فہرست میں ایک نہایت اہم نام مولانا محمد اسماعیل سلفی کا ہے۔ وہ ۱۸۹۷ء کے قریب ضلع گوجراں والا کی تحصیل وزیر آباد کے ایک گاؤں ''ڈھونیکے'' میں پیدا ہوئے۔ والد کا اسم گرامی مولانا محمد ابراہیم تھا جو تقویٰ و صالحیت کا اعلیٰ نمونہ اور اپنے زمانے کے مشہور خطاط تھے۔ حضرت مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ کی معروف تصنیف تحفۃ الاحوذی (شرح جامع ترمذی) انھی کے دست ہنر آشنا کی کتابت فرمودہ ہے۔

مولانا محمد اسماعیل سلفی اپنے والدین کی واحد نرینہ اولاد تھے۔ صالح ترین والد نے بیٹے کی بہترین طریقے سے تربیت کی اور اس عہد کے مروّجہ نصاب کی ابتدائی کتابیں خود پڑھائیں۔ پھر وہ انھیں محدث پنجاب حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کی خدمت میں لے گئے اور ان کے حلقۂ شاگردی میں داخل کرا دیا۔ لائق شاگرد نے جلیل القدر استاد سے اپنے فہم کے مطابق استفادہ کیا۔ کچھ عرصہ امرتسر کے مدرسہ غزنویہ کے اساتذہ سے مستفید ہونے کا

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

موقع بھی ملا۔۱۹۱۴ء میں دہلی کا عزم کیا اور مولانا عبدالجبار عمر پوری اور بعض دیگر اساتذہ سے فیض یاب ہوئے۔ سیالکوٹ میں حضرت مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی کے حضور زانوئے تلمذ تہہ کرنے کی سعادت حاصل کی۔

۱۹۲۱ء میں مولانا محمد اسماعیل سلفی فارغ التحصیل ہوئے۔ پھر اسی سال گوجراں والا میں مولوی علاؤالدین کی جامع مسجد اہل حدیث (چوک نیائیں) کی خطابت وتدریس کی ذمہ داری ان کے سپرد ہوئی۔ وہ دوسری جنگ عظیم کے بعد کا زمانہ تھا اور پورے ہندوستان میں انگریزی حکومت کے خلاف مختلف تحریکیں شروع ہوچکی تھیں۔ برصغیر کے علمائے کرام بھی ان تحریکوں میں حصہ لے رہے تھے۔ علمائے اہل حدیث بالخصوص انگریزی حکومت کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ علمائے اہل حدیث نے یہ سلسلہ ۱۸۲۶ء میں آزاد قبائل میں جماعت مجاہدین کے نام سے شروع کیا تھا۔ مولانا محمد اسماعیل سلفی جماعت مجاہدین سے بے حد متاثر تھے۔ گوجراں والا میں وہ جہاں درس وخطابت میں مصروف ہوئے وہاں آزادی کی تحریکات میں بھی انھوں نے حصہ لیا۔ برصغیر میں اس وقت کانگرس، آل انڈیا مجلس خلافت اور جمعیت علمائے ہند کی تحریکاتِ آزادی جاری تھیں۔ مولانا سلفی ان سب تحریکوں میں مصروفِ عمل رہے اور اس کے نتیجے میں کئی دفعہ قید وبند کے مراحل سے گزرے۔ وہ مستقل مزاج اور خوددار اہل علم تھے۔

انھوں نے گوجراں والا کو مستقل طور سے اپنا مسکن بنالیا تھا۔ تحصیل علم کے بعد پہلی مرتبہ جو انھوں نے اس شہر میں تدریس وخطابت کا آغاز فرمایا، وہ مستقل حیثیت اختیار کرگیا اور تمام عمر اسی شہر میں اقامت اختیار کیے رکھی۔ مختلف مقامات سے ان کو متعدد مرتبہ بڑے بڑے مشاہروں کی پیش کش ہوئی، لیکن وہ اس شہر کو چھوڑنے اور اپنی مسجد کے درس وخطابت کے منصب سے علیحدگی پر آمادہ نہ ہوئے۔ یہاں انھوں نے بے حد خدمات سرانجام دیں اور اپنے مسلک کی نہایت جرأت سے تبلیغ کی، جس سے لوگوں کے ذہن بالکل بدل گئے اور ان میں کتاب وسنت پر عمل کا جذبہ پیدا ہوا۔

انھوں نے جس انداز سے گوجراں والا میں تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا، اس سے لوگ بہ درجہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

غایت متاثر ہوئے اور یہ تاثر بہت کم عرصے میں ان سے گرویدگی کی حد تک پہنچ گیا۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو: وہاں ایک نوجوان نذیر احمد تھا، جسے وہاں کے لوگ ''جیرا'' کہہ کر پکارتے تھے اور ایک اس کا دوست فتح محمد تھا۔ اس کے حلقہ احباب میں اسے ''پھتا'' کہا جاتا تھا۔ ان دونوں کے درمیان بچپن ہی سے گہرے دوستانہ مراسم قائم تھے۔ یہ دونوں روزانہ مولانا محمد اسماعیل کی مسجد کے قریب سے گزرتے اور مولانا کو سنانے کے لیے اونچی آواز سے ''وہابی'' کا نعرہ بلند کرتے۔ لیکن مولانا نے کبھی جواب نہیں دیا۔ ایک دن وہ نہیں آئے تو دوسرے دن مولانا خود ''جیرے'' کے گھر پہنچ گئے۔ اس وقت وہ بھینس کو چارا کھلا رہا تھا۔ مولانا نے آواز دی تو باہر آیا۔ فرمایا: نذیر احمد! کیا بات ہوئی، کل میں انتظار کرتا رہا، نہ تم آئے اور نہ فتح محمد آیا۔ جیرے نے شرم سے سر جھکالیا۔ اس نے اپنے لیے نذیر احمد اور پھتے کے لیے فتح محمد کے الفاظ پہلی دفعہ سنے تھے۔ مولانا تو یہ کہہ کر چلے گئے لیکن وہ دونوں دوستوں کے دلوں میں ایک تڑپ پیدا ہوگئی۔ چناں چہ دونوں مسجد میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ گزشتہ گستاخیوں کی معافی مانگی اور مولانا کے حلقۂ عقیدت میں داخل ہوگئے۔ اب وہ ان کے بہت بڑے معاون اور پکے نمازی تھے، اور لوگ انھیں نذیر احمد اور فتح محمد کہہ کر پکارنے لگے تھے۔

تدریس و تقریر اور تحریر میں مولانا ممدوح کا ایک خاص اسلوب تھا جو نہایت اثر انگیز تھا۔ انھوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں، جن میں اسلامی حکومت کا خاکہ، حجیت حدیث، رسول اللہ ﷺ کی نماز، تحریک آزادئ فکر اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی مساعئ جمیلہ شامل ہیں۔ علاوہ ازیں مختلف مسائل سے متعلق ان کے فتوے، مشکوٰۃ شریف کے کچھ حصے کا ترجمہ اور درسیات کی مشہور کتاب ''سبعہ معلقہ'' کا اُردو ترجمہ ان کی تحریری خدمات میں شامل ہیں۔

ان کے بہت سے تحقیقی مقالات مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئے۔ ماہناموں میں ''رحیق'' اور ''اسلامی زندگی''۔ ہفت روزوں میں ''اہل حدیث'' (امرتسر) اور ''الاعتصام'' (لاہور) روزناموں میں ''امروز'' اور ''کوہستان'' قابل ذکر ہیں، جن میں مولانا کے رشحاتِ قلم چھپے۔ الاعتصام کے علاوہ یہ تمام رسائل و جرائد بند ہو چکے ہیں اور صحافت کی تاریخ میں فقط

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ن کے نام باقی رہ گئے ہیں۔

مولانا ممدوح کی بعض کتابوں کا بعض ہندوستانی اصحاب علم نے عربی ترجمہ بھی کر دیا ہے۔ ترجمہ کرنے والوں میں ہمارے دوست مولانا صلاح الدین مقبول احمد (کویت) کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ مولانا کا زیادہ تر وقت مطالعہ کتب میں صرف ہوتا تھا۔ وہ قائم اللیل اور تہجد گزار عالم تھے۔ قرآنِ مجید پر استحضار تھا۔ وعظ وتقریر اور عام مجلسوں میں برمحل قرآنِ مجید کی آیات پڑھتے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ ہر روز جامع مسجد میں درسِ قرآن دیتے۔ سردیوں میں نمازِ فجر کے بعد اور گرمیوں میں نمازِ مغرب کے بعد!

عام طور سے خطیب حضرات خطبہ جمعہ میں کوئی آیت تلاوت کرتے اور پھر اس کی تفسیر بیان فرماتے ہیں۔ لیکن مولانا محمد اسماعیل سلفی نے آغازِ قرآن سے خطبات جمعہ کا سلسلہ چلایا۔ ان کے صاحب زادے پروفیسر محمد چودھری مرحوم کے بقول ان کی وفات تک انیس پارے مکمل ہوئے تھے اور روزانہ درس کی صورت میں ایک قرآن مکمل ہوا تھا۔

میں تقریباً پانچ سال مولانا کی خدمت میں گوجراں والا رہا۔ پہلی مرتبہ ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۱ء میں طالب علم کی حیثیت سے اور دوسری مرتبہ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۲ء تک ہفت روزہ الاعتصام کے نائب مدیر کی حیثیت سے۔ اس اثنا میں ہمیشہ التزام کے ساتھ مولانا کے روزانہ کے دروسِ قرآن اور خطباتِ جمعہ میں شریک ہوتا رہا۔ لیکن افسوس ہے نہ کبھی ان کے دروسِ قرآن ضبط تحریر میں لانے کی طرف دھیان گیا اور نہ خطباتِ جمعہ قلم بند کرنے کا کبھی خیال آیا۔ وقت گزرنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ اگر انھیں تحریر میں لایا جاتا تو یہ ایک بہترین تفسیر قرآن ہوتی اور قرآنِ مجید کی روشنی میں خطباتِ جمعہ کا رفیع الشان مجموعہ مرتب ہوجاتا۔ میری طرح ہل حدیث طلبا کی یہ بدنصیبی ہے کہ وہ اساتذہ کے فوائد علمیہ کو جمع کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ نہ قرآن سے متعلق ان کے افکار جمع کرتے ہیں، نہ حدیث سے متعلق! مزید قابل افسوس بات یہ ہے کہ ان کے حالات اور طریق درس کا تذکرہ بھی ضبط تحریر میں نہیں لاتے۔

مولانا ممدوح کی زندگی کے آخری دور میں بعض حضرات نے اس طرف توجہ مبذول کی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

اور خطباتِ جمعہ کو تحریر کی سلک میں پرونے کا کچھ اہتمام کیا۔ یہ خدمت ان کے ایک مخلص عقیدت مند چودھری عبدالواحد گوندل نے اپنے ذمہ لی۔ میرے زمانۂ ادارت میں وہ خطبہ جمعہ لکھتے اور اخبار الاعتصام میں چھپنے کے لیے بھجوا دیتے تھے۔ چند خطبے مولانا کے لائق شاگرد خواجہ محمد قاسم مرحوم نے بھی مرتب کیے جو الاعتصام میں شائع ہوئے۔ یہ کل ستر (۷۰) خطبات ہیں جو قرآن کی آیاتِ مبارکہ کی روشنی میں ارشاد فرمائے گئے۔ اخبار میں یہ خطبات مولانا کی زندگی میں چھپ گئے تھے اور ان کے مطالعے میں آ گئے تھے، لیکن کتابی شکل میں یہ خطبات مولانا کی وفات سے بائیس برس بعد مارچ ۱۹۹۰ء میں نعمانی کتب خانہ اُردو بازار لاہور کی طرف سے ''خطباتِ سلفیہ'' کے نام سے معرضِ اشاعت میں آئے۔

مولانا محمد اسماعیل سلفی کے بعض خطباتِ جمعہ اس فقیر کے اخبار سہ روزہ ''منہاج'' (لاہور) میں بھی شائع ہوئے، جو خطبات سلفیہ کے مجموعے میں شامل نہیں ہیں۔ ''منہاج'' میں شائع شدہ خطبات کے چند عنوانات یہ ہیں:

(۱) معاشرے کی خرابی کی اصل وجہ۔ (۲) کفار سے دلی دوستی کے نتائج۔
(۳) حکومت کے وارث کون؟ (۴) اخلاق النبی ﷺ۔
(۵) عبادت کی حقیقت۔ (۶) عزت وتوقیر کا مفہوم بارگاہِ خداوندی میں۔
(۷) آدابِ مجلس۔ (۸) معاشرتی احکام۔
(۹) اسلام کا نظام عفت وعصمت۔

مولانا محمد اسماعیل سلفی نے ۲۰ فروری ۱۹۶۸ء کو اپنے وطن گوجراں والا میں وفات پائی۔ یہ فقیر ان کے جنازے میں شامل تھا۔

۲۵۔ دسمبر ۲۰۰۷ء — بہاول نگر

❀❀❀❀

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

چوتھا باب:

زندگی کے ابتدائی دور کی چند باتیں

اب میں اپنے ابتدائی دورِ زندگی کی چند باتیں بیان کرنا چاہتا ہوں۔

جس مختصر سے شہر میں میرا بچپن گزرا اور جس کی گلیوں میں گھوم پھر کر میں جوانی کی منزل کو پہنچا، اس کا نام کوٹ کپورہ تھا۔ یہاں اس کی تھوڑی سی تفصیل سنیے:

مہاراجا فرید کوٹ کا تعلق براڑ بنسی خاندان سے تھا۔ ۱۶۵۰ء کے لگ بھگ اس خاندان میں ایک شخص چودھری کپورا پیدا ہوا، جس نے ۱۷۱۰ء میں وفات پائی۔ اس نے فرید کوٹ کے حکمران خاندان کی بنیاد ڈالی۔ موجودہ شہر کوٹ کپورہ اسی کے نام سے مشہور ہوا، اور اس کا دارالحکومت یہی شہر تھا۔ کپورا کا پوتا ہمیر سنگھ تھا۔ اس خاندان میں بھی سکھوں کے دوسرے خاندانوں کی طرح باہمی قتل و غارت کا سلسلہ چلا۔ انھوں نے اپنے کمزور ہمسایوں کے بہت سے علاقوں پر قبضہ کیا۔ پھر ایک وقت آیا کہ بابا فرید الدین گنج شکر کے نام پر فرید کوٹ شہر کی تعمیر کر کے اسے اپنا دارالحکومت بنایا۔ مہاراجا رنجیت سنگھ نے بھی اس علاقے پر حملہ کیا تھا اور وہ اس پر قابض ہو گیا تھا۔

فرید کوٹ کے حکمران خاندان کے ایک راجا کا نام پہاڑ سنگھ تھا۔ اس نے ''مدکی'' کی جنگ میں سکھوں کے بجائے انگریزوں کی حمایت کی تھی۔ مشہور ہے کہ اس خاندان کا ایک حکمران مسلمان ہو گیا تھا۔

بہر حال چودھری کپورا کے نام پر اسے کوٹ کپورہ کہا جانے لگا۔ پھر کچھ عرصے کے بعد اسے دارالحکومت کا درجہ حاصل ہوا۔ وہاں چھوٹی اینٹ کا ایک بڑا قلعہ تھا۔ اس قلعے کی چھتیں اور تین دیواریں تو ہماری ولادت سے بہت پہلے منہدم ہو گئی تھیں، لیکن ایک گول سی اونچی دیوار

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ہمارے ترک وطن (اگست ۱۹۴۷ء) تک موجود تھی، جو اس کے پرانے آثار کی نشان دہی کرتی اور اس کے ماضی کے شکوہ کا پتا دیتی تھی۔

اپنے آبائی مسکن کوٹ کپورہ کی مختصر سی تاریخ بیان کرنے کے بعد اب پھر اپنے بارے میں۔

سرکاری سکول میں داخلہ:

میں چوں کہ چھوٹی عمر میں قرآنِ مجید اور اُردو کی چند کتابیں پڑھ چکا تھا، اس لیے وہاں کے سرکاری مڈل سکول میں داخلے کا امتحان لے کر مجھے چوتھی جماعت میں داخل کیا گیا۔ سکول میں داخلے سے پہلے دادا مرحوم کے ایک پٹواری دوست سے جن کا نام شہاب الدین تھا، میں نے تختی پر لکھنے کی مشق کر لی تھی اور اُردو عبارت آسانی سے لکھ پڑھ سکتا تھا۔ لیکن ریاضی کے مضمون سے نابلد تھا۔ سکول میں ریاضی کے استاد محمد انور شاہ تھے۔ انھوں نے ریاضی کے چند قواعد میرے ذہن نشین کرا دیے تھے۔ ۱۹۳۴ء میں پانچویں جماعت میں پہنچا اور اسی سال پتا چلا کہ ''سنہ'' بھی ہوتا ہے، یعنی سنہ ۱۹۳۴ء اور سنہ ۱۹۳۵ء وغیرہ۔

اس زمانے میں سکول کی نصابی کتابیں بہت محدود تھیں، اور یہ کتابیں (۲۰ × ۳۰ × ۱۶) سائز پر چھپتی تھیں۔ اُردو کی کتاب تین مضامین پر مشتمل ہوتی تھی۔ جغرافیہ، تاریخ اور اُردو۔ حساب کی کتاب البتہ الگ ہوتی تھی۔ آٹھویں جماعت تک تختی اور سلیٹ پر لکھنے کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ گھر کے بنائے ہوئے چھوٹے سے تھیلے یا کسی کپڑے میں کتابیں رکھ لی جاتی تھیں۔ استاد انفرادی طور پر ہر طالب علم کو کامل توجہ سے پڑھاتے تھے۔ طالب علموں کو دو اطراف میں ٹاٹ پر بٹھا دیا جاتا اور استاد درمیان میں چلتے ہوئے ان کو املا کراتے۔ اور ساتھ ساتھ ان کے طرزِ کتابت کو دیکھتے بھی رہتے اور سمجھاتے بھی جاتے۔ ٹیوشن کو اس وقت کوئی نہیں جانتا تھا۔ نہ اکیڈمیوں کا کہیں نام ونشان تھا۔

اس دور میں ناشتے کا بالکل تصور نہ تھا۔ رات کی رکھی ہوئی تھوڑی سی روٹی اور گھر کی لسی کا گلاس پی کر سکول کو چل پڑتے۔ جیب خرچ ایک پیسا ملتا تھا۔ اس کے ہم دو حصے کر لیتے۔ ایک

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

دفعہ آدھے پیسے کی مونگ پھلی اور دوسری دفعہ آدھے پیسے کی ریوڑیاں یا کوئی اور چیز لیتے۔
سستا زمانہ اور سادہ زندگی۔

سکول میں میرا ایک ہم جماعت عبدالستار تھا جو میرا قریبی عزیز تھا اور ہمسایہ بھی! ہم چوتھی جماعت میں دونوں اکٹھے سکول جاتے اور اکٹھے ہی آتے۔ ایک روز سکول سے نکلے اور اصل راستے کی بجائے دوسرے راستے پر چل پڑے۔ وہاں ایک مسجد کو ''میاں بلے والی مسجد'' کہا جاتا تھا۔ اس کے قریب تانگوں کا اڈہ تھا اور سامنے پیپل کا درخت، جس کے دور تک پھیلے ہوئے گہرے سائے میں کوچوان تانگے کھڑے کرتے اور گھوڑوں کو چارا وغیرہ کھلاتے تھے۔ وہیں ایک شخص لال دین لوہار بیٹھتا تھا جو گھوڑوں کو لوہے کے نعل (کھریاں) لگاتا تھا۔ اس کا لوہے کا ایک بڑا سا ڈبا تھا، جس میں وہ کیل اور نعل وغیرہ ڈالے رکھتا تھا۔ ایک موٹی سی بانس کی لاٹھی تھی، جس کے ایک سرے پر لوہے کی میخ تھی۔ اس لاٹھی کے ساتھ رسّا باندھ کر وہ گھوڑے کی ٹانگوں کو قابو میں کرتا اور نعل لگاتا۔ نعل لگا کر لاٹھی زمین پر گاڑ دیتا۔ میں اور عبدالستار سکول سے آئے اور لال دین لوہار (نعل بند) کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ باتیں کرتے ہوئے میں نے کھڑے ہو کر اس کی میخ والی لاٹھی زمین سے اکھاڑی اور پھر اسے زور سے دوبارہ زمین پر گاڑنے لگا تو عبدالستار کے پاؤں پر جا لگی اور لوہے کی میخ اس کے پاؤں کے اوپر کے حصے میں دو انچ کے قریب جا گھسی۔ درد سے اس کی چیخیں نکل گئیں اور خون سے پاؤں بھر گیا۔ میں یہ صورتِ حال دیکھ کر بے حد پریشان ہوا اور لال دین مجھے ڈانٹنے لگا۔ اس نے فوراً اِدھر اُدھر سے کاغذ اکٹھے کیے، انھیں جلایا اور ان کی راکھ زخم پر رکھی تو خون بہنا بند ہوا۔ میرے پاس اس وقت ایک پیسا تھا۔ عبدالستار رو رہا تھا اور میں اسے کہہ رہا تھا کہ یہ پیسا لے لو اور چپ ہو جاؤ۔ میں نے اسے پیسا دینے کی بہت کوشش کی، لیکن اس نے پیسا نہیں لیا۔

میں نے گھر بستہ رکھ کر مسجد میں مولانا عطاء اللہ حنیف سے پڑھنے کے لیے جانا تھا۔ آہستہ آہستہ عبدالستار کو گھر لایا اور اسے اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ کسی کو بتائے گا نہیں۔ اس کی والدہ قریب کے رشتے میں ہماری خالہ لگتی تھیں، اور میاں امام الدین کی (جن کا ذکر گزشتہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

صفحات میں ہوا) پوتی تھیں۔ انھوں نے پاؤں دیکھ کر کہا: یہ کیا ہوا؟ عبدالستار نے جواب دیا: چوٹ لگ گئی ہے اور تھوڑا سا زخم ہوگیا ہے۔ ہم نے بھینس رکھی تھی۔ میں دوڑتا ہوا گھر گیا اور چینی ڈال کر اس کے لیے گرم گرم دودھ لایا اور اسے پلایا۔ زخم پر پرانا موبل آئیل لگایا۔ چند روز تکلیف رہی، لیکن سکول جاتا رہا۔ جلد ہی آرام آ گیا۔ مگر زخم ہمیشہ کے لیے اپنا نشان چھوڑ گیا۔

ملک تقسیم ہوگیا اور ہم پاکستان آ گئے۔ عبدالستار یہاں آ کر اپنے کاموں میں مصروف ہوگیا اور میں لاہور آ گیا۔ لیکن یہ چوٹ اسے بھی یاد رہی اور میں بھی اسے نہیں بھولا۔ میری جب اس سے ملاقات ہوتی، میں اس چوٹ کا ذکر ضرور کرتا اور وہ نشان دیکھتا۔ اس نے فیصل آباد میں وفات پائی۔ مجھے لاہور اس کی وفات کی اطلاع ملی تو وہاں پہنچا اور اس کے جنازے میں شامل ہوا۔ اس کی تدفین جڑاں والا میں ہوئی۔ اس کی میت فیصل آباد سے ٹرک پر جڑاں والا لائی گئی۔ میں اس ٹرک پر سوار تھا اور میت کے پاؤں کی طرف بیٹھا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ اپنے بچپن کے اس عزیز دوست کے اس زخم کا آخری دفعہ نشان دیکھوں، جسے اپنے ساتھ لے کر یہ سفر آخرت پر روانہ ہو رہا ہے۔ لیکن نہیں دیکھ سکا۔

اب اس کے بچے بھی ماشاء اللہ بچوں والے ہیں۔ اس کی شادی میری پھوپھی کی بیٹی سے ہوئی تھی جو فیصل آباد میں اپنے بیٹے عبدالقادر کے پاس اللہ کے فضل سے پوتے پوتیوں کے جھرمٹ میں رہتی ہے۔ لال دین نعل بند قیامِ پاکستان کے بعد ہمارے گاؤں سے چند میل کے فاصلے پر چک ۳۴ گ ب میں آ بسا تھا۔ یہاں آ کر اس سے صرف دو دفعہ ملاقات ہوئی۔ لال کی وفات پر طویل مدت بیت چکی ہے۔

ہندوؤں کے تہوار:

بچپن میں ہندوؤں کے تہواروں میں شرکت ہمارے معمولات کا حصہ تھی۔ بالخصوص دیوالی میں ہم بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے اور یہ تہوار ہماری آمدنی کا ذریعہ تھا۔ ”آمدنی“ اور ”حصہ لینے“ کا مطلب یہ ہے کہ دیوالی کے دن سورج غروب ہونے کے کچھ دیر بعد ہندو لوگ کنوؤں کی منڈیروں اور پیپل کے درختوں کے تنوں پر سرسوں کے تیل کے دیے جلاتے اور

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

وہاں پیسے رکھتے تھے۔ اس سے کچھ دیر بعد ہم اپنے گروپ کے ساتھ وہاں پہنچ جاتے۔ برتن میں ڈال کر تیل بھی لے آتے اور پیسے بھی۔ پھر یہ ''مالِ غنیمت'' آپس میں بانٹ لیتے۔ بعض اوقات ہر ایک کو ایک ایک روپیہ بھی مل جاتا تھا جو اس زمانے میں بڑی اہمیت رکھتا تھا اور ہمارے لیے کئی دن کفایت کرتا تھا۔ افسوس ہے میرے ان ساتھیوں میں سے اب کوئی بھی اس دنیا میں موجود نہیں۔ وہ تھے محمد صدیق، محمد زکریا، عبدالشکور، عبدالقیوم اور عبدالرشید۔ آخر الذکر نے جھنگ میں وفات پائی۔

ہولی میں ہم عملاً حصہ نہیں لیتے تھے، کیوں کہ اس میں ایک دوسرے پر رنگ ڈالا جاتا تھا اور کپڑے خراب ہو جاتے تھے۔ البتہ ہندو مردوں اور عورتوں کو یہ تماشا کرتے ہوئے ہم دور سے دیکھتے اور خوش ہوتے۔ کسی کا منھ مختلف رنگوں سے رنگا ہوا ہے اور کسی کے کپڑے رنگ آلود ہیں۔

سال کے بعد کسی دیوتا کی یاد میں فرید کوٹ میں دسہرے کا میلہ لگتا تھا۔ بڑے بڑے بانسوں پر موٹے اور مضبوط گتوں کے دس سر بنائے جاتے تھے۔ اسی طرح دونوں طرف بڑی بڑی لکڑیوں کے ہاتھ بنا دیے جاتے تھے، جو عجیب و غریب قسم کے دکھائی دیتے تھے۔ یہ میلہ کئی دن جاری رہتا تھا۔ اس موقع پر کبڈی، کشتی اور گولا وغیرہ پھینکنے کے مختلف کھیل اور کرتب ہوتے تھے، جن میں مسلمان بھی حصہ لیتے تھے اور غیر مسلم بھی۔ مسلمانوں میں علمائے کرام کے ایک مشہور گاؤں بڈھیمال کے سلیمان نمبردار بھی گولا پھینکنے کے مقابلے میں شرکت کرتے تھے۔ ساڑھے چھ فٹ کے یہ خوب صورت جوان سب سے اوّل رہتے اور پہلا انعام حاصل کرتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد ضلع فیصل آباد کے چک نمبر ۳۶ میں فوت ہوئے۔ فرید کوٹ ہمارے شہر سے سات میل کے فاصلے پر تھا۔ تانگے کا وہاں تک کا کرایہ چھ پیسے تھا اور ریل کا دو آنے۔ ہم کسی نہ کسی طرح وہاں پہنچ جاتے تھے۔

دسہرے کے میلے میں بسیں چلتی تھیں اور ٹرانسپوٹروں کے لیے یہ آمدنی کا ذریعہ تھا۔

سال کے بعد ایک میلہ رام لیلا کا لگتا تھا، جس میں ہنومان، راون، کرشن جی اور سیتا

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

وغیرہ کو دکھایا جاتا تھا۔ یہ میلہ تقریباً ایک ہفتہ چلتا تھا اور رات کو بھر جاتا تھا۔ یہ میلہ ہمارے لیے بے حد دلچسپی کا باعث تھا۔ میں اس زمانے میں سکول کے علاوہ مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب کے حلقہ درس میں بھی شامل تھا۔ مولانا نے اس میلے میں جانے سے ہمیں سختی سے روک دیا تھا۔ لیکن ہم آنکھ بچا کر چلے جاتے تھے۔ ایک دفعہ رنگے ہاتھوں پکڑے گئے اور مستوجب سزا قرار پائے۔ اس کے بعد ہم نے یہ دھندا ترک کر دیا تھا۔

ہمارے محلے میں ایک گھر برہمنوں کا تھا۔ شام کے بعد ہر پیر یا بدھ کو (مجھے دن صحیح طور پر یاد نہیں رہا) ہماری عمر کا برہمن لڑکا جو کھیل کود میں ہمارا ساتھی تھا، کسی نہ کسی ہندو کے گھر سے گائے کے دودھ کی کھیر لے کر آتا اور ہمارے مکان کے آگے سے گزرتا تھا۔ جس گھر سے وہ کھیر لاتا تھا، اس گھر میں وہ کھیر کھاتا بھی تھا اور کھیر کھاتے وقت اس کے جو ''دانت گھستے'' تھے، اس کے اسے کچھ پیسے بھی ملتے تھے، جسے ''دند گھسائی'' کہا جاتا تھا۔ اپنے گھر کے سامنے ہم دو تین ہم عمر لڑکے اسے گھیر لیتے کہ وہ یا تو ہمیں خود ہی کھیر دے دے، ورنہ ہم اس کی کھیر کو ہاتھ لگا دیں گے اور وہ ان کے کام کی نہیں رہے گی۔ وہ ہمیشہ یہی کہتا کہ ''گاں دی سونہہ اس کھیر دا میرے گھر والیاں نوں پتا اے، ایہہ تسیں نہ لئو، میں تہانوں ہور کھیر لیاں داں گا (گئو ماتا کی سوگند! اس کھیر کا میرے گھر والوں کو پتا ہے، تم یہ کھیر نہ لو، میں تمھیں اور کھیر لا دوں گا۔) یہ ہمارا اپنے اس ہم عمر اور ہم محلّہ برہمن سے مذاق رہتا تھا۔ ہم نے نہ کبھی اس سے کھیر لی، نہ کبھی اسے ہاتھ لگایا اور نہ ہمارا اسے کھانے کو کبھی جی چاہا۔

قصہ فلم دیکھنے کا:

یہاں ہمارے فلم دیکھنے کا قصہ بھی سنتے جایے!

اپنے قدیم وطن میں ہمارا تعلق ٹرانسپورٹ سے تھا۔ (تقسیم ملک کے بعد جڑاں والا آئے تو یہاں بھی کسی حد تک یہ سلسلہ جاری رہا) ۱۹۳۶ء کی بات ہے کہ بسوں کی پاسنگ کے سلسلے میں تین چار بسیں لدھیانہ گئیں۔ گیارہ بارہ سال کے ہم چار پانچ لڑکے بھی ان بسوں پر لدھیانہ چلے گئے۔ ان میں محمد زکریا اور عبدالشکور بھی تھے۔ نہایت افسوس ہے یہ دونوں وفات

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

پا گئے ہیں۔ وہاں چھ سات روز رہنا پڑا۔ اس وقت اس علاقے میں سینما نیا نیا شروع ہوا تھا۔ بسوں والے سینما دیکھنے گئے۔ اپنے والد کے ساتھ میں بھی گیا۔ سینما ہال میں بہت سی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ پتا چلا کہ اندر جب فلم چلے گی تو یہ تمام مورتیں بولیں گی اور یہ سب لوگ آپس میں باتیں کریں گے۔ تعجب ہوا کہ یہ بے جان مورتیں کس طرح باتیں کریں گی۔ دو آنے ٹکٹ تھا۔ مجھے یاد ہے فلم کا نام سوتیلی ماں تھا۔ اندر گئے اور فلم چلی تو واقعی باہر دیواروں پر لٹکی ہوئی مورتیں بولنے لگیں۔ اس کے علاوہ گاڑیاں بھی چل رہی تھیں۔ دریا بھی تھا، جس میں کشتیاں تیر رہی تھیں اور سوتیلی ماں سوتیلی بیٹی کو ڈانٹ ڈپٹ کر رہی تھی۔ یہ تمام معاملہ ہمارے لیے تعجب انگیز تھا۔

چھ سات روز کے بعد گھر واپس آئے تو کسی ''مخبر'' نے ہمارے دادا سے میرے متعلق مخبری کی کہ یہ مسجد میں مولوی صاحب سے قرآن کا ترجمہ پڑھتا ہے اور لدھیانہ میں فلمیں دیکھتا رہا ہے۔ دادا مرحوم نے فلم کا مطلب معلوم کیا تو اس نے بتایا کہ عورتوں کے ناچنے کودنے اور مردوں کے سامنے گانے کا نام فلم ہے۔ ہمارے دادا نے ہمیں پکڑ لیا کہ تو ابھی سے بے حیاؤں اور لچے لفنگوں کو دیکھنے لگا ہے۔ مار مار کر ہمارا برا حال کر دیا۔

اپنے مارنے پیٹنے پر انھیں صبر نہیں آیا تو اس گناہ گار کو پکڑ کر مسجد میں مولانا عطاء اللہ صاحب کے حضور پیش کیا گیا۔ فلم کا مطلب پوچھنے پر دادا مرحوم نے انھیں بھی یہی بتایا جو خود انھیں بتایا گیا تھا۔ اب ہم پر مار پیٹ کی دوسری شفٹ شروع ہوئی۔ مار کھاتے کھاتے لدھیانہ میں جو کچھ دیکھا تھا، سب بھول گیا۔ دادا نے والد کو بھی ڈانٹ پلائی کہ تم فلمیں دکھا کر بچے کو خراب کر رہے ہو۔

وہ پہلی اور آخری فلم تھی جو ہم نے گیارہ سال کی عمر میں دیکھی۔ اس کے بعد نہ کبھی فلم دیکھنے کا خیال آیا اور نہ دل میں ڈراما دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ حالاں کہ ٹی وی پر جو ڈرامے چلتے ہیں، ان کے لکھنے والوں میں میرے بعض بے تکلف دوست بھی ہیں۔ لیکن مجھے ڈراما دیکھنے کا بالکل شوق نہیں۔ ڈراما چل رہا ہو تو بعض لوگ ٹی وی میں منہ پھنسا لیتے ہیں۔ اور کسی سے بات

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

نہیں کرتے۔ بات کرنے والا انھیں سخت بُرا لگتا ہے۔ میں انھیں اس محویت میں دیکھ کر حیران ہوتا ہوں۔

اب پرانا کلچر ختم ہوگیا ہے۔ ہر گھر میں ٹیلی وژن موجود ہے اور اس ڈبے میں دنیا بھر کی فلمیں جمع کر دی گئی ہیں۔ بٹن دبایئے، جس ملک کی جی چاہے فلم دیکھ لیجیے۔ فلم کے علاوہ بھی بہت کچھ دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ پرانی فلمیں تو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہیں۔ کہاں کیبل اور وی سی آر کے موجودہ معاملات اور کہاں وہ قدیم دور کی ''دقیانوسی'' فلمیں۔

بارہ آنے کا قرض:

پیسے کی کمی یا کم یابی کی ایک مثال!

ہمارے محلے میں ایک دکان دار عبدالغنی تھا۔ وہ ہمارا رشتہ دار تھا۔ نماز باجماعت کا پابند، لیکن بے حد سخت مزاج۔ میں خرچ اخراجات میں بہت محتاط تھا۔ سنبھل سنبھل کر پیسا خرچ کرتا تھا۔ جو کچھ گھر سے ملتا، اس سے بھی کم خرچ کرنے کا عادی تھا۔ ایک دن عبدالغنی کی دکان کے قریب سے گزر رہا تھا کہ اس نے آواز دی۔ اس کے پاس گیا تو اس نے مجھے ایک کاپی سی دکھائی اور کہا تمھارے ذمے دکان کا بارہ آنے قرض ہوگیا ہے۔ یہ قرض اسی وقت ادا کرو۔ میں حیران کہ بارہ آنے قرض کیسے ہوگیا۔ اس نے کہا: سوچتے کیا ہو، بارہ آنے جیب سے نکالو اور مجھے دو۔ میں نے کہا: بارہ آنے اس وقت میرے پاس نہیں ہیں۔ چار آنے ہفتے کے حساب سے تین ہفتوں میں یعنی بیس اکیس دنوں میں بارہ آنے ادا کردوں گا۔ وہ پیسے وصول کرنے کی غرض سے میری طرف بڑھ رہا تھا اور میں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہا تھا۔ مجھے خیال گزرا کہ یہ مجھے پکڑ کر مارے گا اور بات بڑھ جائے گی۔ میں وہاں سے دوڑ پڑا۔ وہ بھی میرے پیچھے دوڑا۔ لیکن مجھے پکڑ نہیں سکا۔ بڑی مشکل سے پیسے جمع کرکے بارھویں دن میں نے اس کو بارہ آنے دیے۔ یہ ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔ میں غالباً اس وقت پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا۔

قیامِ پاکستان کے بعد عبدالغنی ضلع قصور کے ایک گاؤں ''کوٹھا'' میں آبسا تھا، جس کا

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ریلوے سٹیشن کل موکل ہے۔ بہت سال ہوئے عبدالغنی وفات پا گیا ہے۔ بے حد نیک آدمی تھا۔ وہ لاہور آتا تو مجھے ضرور ملتا۔ میں بھی ایک یا دو دفعہ اسے ملنے کے لیے اس کے گاؤں کوٹھے گیا۔ وہاں اس نے کوشش کر کے ایک مسجد بنائی تھی۔ میں نے اس کے کہنے پر اس مسجد کی تعمیر میں اس سے تعاون کیا تھا۔

عبدالغنی دودھ بھی بیچتا تھا یعنی چھوٹا سا حلوائی بھی تھا۔ دودھ وہ مقامی لوگوں سے بھی لیتا تھا اور نمازِ فجر سے قبل ایک گاؤں سے بھی لاتا تھا جو شہر سے چار پانچ میل کے فاصلے پر تھا۔

ایک دفعہ رات کو وہ میرے پاس آیا۔ سردیوں کا موسم تھا۔ اس نے کہا: مجھے بخار ہو گیا ہے۔ تم فجر سے کچھ پہلے فلاں گاؤں جا کر مجھے دودھ لا دو۔ میں نے ہامی بھر لی۔ وہ نماز سے پہلے سائیکل لے کر ہمارے گھر آ گیا۔ سائیکل کے دونوں طرف دودھ والے کنستر رکھے ہوئے تھے۔ میں سائیکل پر بیٹھا اور اس گاؤں میں پہنچ گیا۔ دودھ والے کے گھر گیا۔ اس نے دودھ کنستروں میں ڈال دیا۔ میں وہاں سے چل پڑا۔ عبدالغنی کی دکان کے قریب پہنچا تو عبدالغنی وہاں کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا۔ سائیکل سے اترنے لگا تو سائیکل پھسل گیا اور سارا دودھ جو اتنی محنت سے لایا تھا ''ڈُل'' گیا۔ مجھے نہایت افسوس ہوا لیکن عبدالغنی نے کہا: افسوس کرنے کی کیا ضرورت ہے، جو ہونا تھا ہو گیا۔

سائیکل:

میرے بچپن کے ساتھیوں میں سے سائیکل سب سے پہلے محمد زکریا نے خریدی۔ جتنی اس کی عمر اور قد تھا، اسی کے مطابق سائیکل۔ وہ سائیکل چلاتا بڑا اچھا لگتا تھا اور جی چاہتا تھا کہ میرے پاس بھی سائیکل ہونی چاہیے۔ میں نے اس سے کہا مجھے بھی سائیکل چلانا سکھا دو۔ اس نے دو گھنٹوں میں سائیکل چلانا سکھا دیا۔ سائیکل چلاتا ہوا میں اپنے آپ کو بہت بڑا آدمی سمجھتا تھا۔ ہمارے قریب کی گلی میں ایک سکھ پرتاب سنگھ سنار کا گھر تھا۔ پرتاب کی بوڑھی ماں گلی کی دیوار کے ساتھ چھوٹی سی چارپائی پر بیٹھی رہتی تھی۔ اس کے پاس ہی ان کی چھوٹی سی سفید رنگ کی کتیا بیٹھی ہوتی تھی، جس کا نام انھوں نے الائچی رکھا تھا۔ میں سائیکل پر ایک دفعہ اس گلی سے گزر رہا

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

تھا کہ مجھے دیکھ کر کتیا بھونکتی ہوئی میری طرف بڑھی۔ میں گھبرا گیا اور سائیکل بے قابو ہو کر پرتاب سنگھ سنار کی ماں کی چارپائی سے ٹکرا کر اس کی ٹانگوں پر جا لگی۔ بڑھیا نے مجھے دیکھا اور کہا فاطمہ بی بی کے بیٹے ہو؟ میں نے ''ہاں'' کہہ کر جواب دیا تو بولی: کوئی بات نہیں بیٹے، تو ہمارا ہی بیٹا ہے۔ تو بچہ ہے، سائیکل دھیان سے چلایا کر۔ پھر کتیا سے کہا: چل نی الا بچی۔ چپ کر۔ اندر جا۔

میاں محمد زکریا میرا قریبی عزیز اور بچپن کا دوست تھا۔ عمر میں مجھ سے دو تین سال چھوٹا تھا اور برادری میں میرا بچپن کا آخری بے تکلف دوست۔ ۲۵۔ فروری ۲۰۰۶ء کو فوت ہوا۔ اس کی وفات سے مجھے بے حد صدمہ پہنچا۔ اب میری عمر کا میری برادری میں کوئی شخص نہیں رہا جو کوٹ کپورہ سے تعلق رکھتا ہو۔ محمد زکریا کے بچے میرا بہت احترام کرتے ہیں۔ اس سے پہلے میرا ایک اور دوست میاں محمد صدیق فوت ہوا جو عمر میں مجھ سے چار پانچ سال بڑا تھا اور میرے رشتے دار دوستوں میں سے تھا۔ اس کی شادی میری پھوپھی کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ اسی طرح اور بھی بہت سے دوست اور عزیز وفات پا گئے۔ برادری میں میرا ایک دوست ثناء اللہ تھا، وہ بھی اللہ کو پیارا ہو گیا۔

دھرم شالہ:

ہم جس گلی میں گزر کر اپنے گھر کو جاتے تھے، اس گلی میں کچی اینٹوں کا دھرم شالہ تھا۔ اس کی کھڑکیاں گلی کی طرف تھیں اور کھلی رہتی تھیں۔ اس کے دروازے کے سامنے کوئی تین فٹ اونچا چوترا (یا تھڑا) تھا۔ محلے کے غیر مسلموں میں کوئی فوت ہو جاتا تو مردے کو کچھ دیر کے لیے اس دھرم شالہ میں رکھا جاتا تھا۔ چھوٹی عمر میں رات کو میں وہاں سے گزرتا تو بہت خوف آتا اور جہاں مردہ رکھا جاتا تھا، اس جگہ کو دیکھ کر دل تیزی سے دھڑکنے لگتا۔ ہم نے سن رکھا تھا کہ ایسی جگہوں پر گرمیوں کی دوپہر میں وہ مردے آ جاتے ہیں جو یہاں رکھے گئے تھے۔ اس لیے دوپہر کو بھی وہاں سے گزرنا مشکل ہو جاتا۔ میں رات کو دھرم شالہ کے قریب آتا تو دوڑ پڑتا۔

راجا فرید کوٹ کی چوری اور بردباری:

ہمارے ہاں مضبوط اعصاب کے دو بھائی تھے۔ ہم نے ان کو نہیں دیکھا، لیکن ان کے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

بمتعلق ان کے رشتے داروں سے بعض باتیں سنی ہیں۔ وہ چوری کرتے تھے، لیکن اپنے محلے اور اردگرد کے لوگوں کا بہت خیال رکھتے اور ان کی دیکھ بھال کو اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ان کی موجودگی میں اس علاقے میں کسی بدمعاش یا چور کو آنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ ان کے گھر کے قریب ایک سرکاری کوٹھی تھی، وہ کوٹھی میں نے دیکھی ہے۔ سطح زمین سے چودہ پندرہ فٹ اونچی ہوگی۔ سنا تھا کہ راجا فرید کوٹ گرمیوں میں وہاں آتا اور اسے رات رہنے کا موقع ملتا تو اس کوٹھی کی چھت پر سوتا تھا اور اس کے پلنگ کے چاروں پاؤں کے نیچے سونے کی چار اینٹیں رکھی جاتی تھیں۔ ایک اینٹ پانچ چھ تولے کی ہوتی تھی۔ اس طرح چار اینٹوں کا وزن تقریباً بیس بائیس تولے ہوتا تھا۔

کہتے ہیں ایک دن ایک مجلس میں مہاراجا فرید کوٹ نے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ معلوم نہیں گھروں میں گھس کر چور کس طرح چوری کر لیتے ہیں، اگر انسان چوکنا رہے اور خود اپنی حفاظت کرے تو چوری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مہاراجا کی یہ بات ان دو چور بھائیوں میں سے بھی ایک بھائی کو پہنچ گئی۔ اسی اثنا میں ایک دن مہاراجا کوٹ کپورے آیا۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ وہ اپنی کوٹھی کی چودہ فٹ اونچی چھت پر سویا۔ چور نے چار ٹھیکریاں لیں۔ معلوم نہیں کس طرح کوٹھی کی اتنی اونچی پچھلی دیوار سے اوپر چڑھا۔ آہستہ سے مہاراجا کے پلنگ کے ایک پائے کے نیچے سے سونے کی اینٹ نکالی اور اس کی جگہ ٹھیکری رکھ دی۔ پھر دوسرے، تیسرے اور چوتھے پائے کے نیچے سے چاروں اینٹیں نکالیں اور ان کی جگہ چار ٹھیکریاں رکھ دیں۔ پھر خدا جانے کس طرح نیچے اترا۔ آرام سے گھر گیا اور سونے کی اینٹیں سنبھال کر کہیں رکھ دیں۔

صبح کو مہاراجا نیند سے بیدار ہوا تو شور مچ گیا کہ مہاراجا کے پلنگ کی سونے کی اینٹیں چوری ہوگئی ہیں۔ کوٹھی کے ملازموں سے پوچھ گچھ ہوئی مگر کوئی سراغ نہ مل سکا۔ مہاراجا کوٹ کپورہ سے فرید کوٹ چلا گیا۔ دس بارہ دن اسی طرح گزر گئے لیکن چور کا پتا نہ چل سکا۔ ایک روز مہاراجا اپنے وزیروں اور مشیروں میں بیٹھا تھا کہ ملازم نے اطلاع دی کہ ایک غریب آدمی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

جس نے کھدر کی میلی چادر اپنے جسم پر اوڑھی ہوئی ہے، آپ کو سلام کرنے کی اجازت چاہتا ہے۔ مہاراجا نے کہا: اجازت ہے، آ جائے۔ آنے والے نے سلام کرنے کے بعد کھدر کی میلی چادر سے سونے کی چار اینٹیں نکالیں اور مہاراجا کے سامنے رکھ دیں۔ عرض کیا: حضور سونے کی اینٹوں کا چور حاضر ہے اور اینٹیں آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہے۔

مہاراجا کھڑا ہو گیا۔ وزیر مشیر بھی کھڑے ہو گئے۔ مسکراتے ہوئے کہا: تم یہ بتاؤ کہ اتنی اونچی اور محفوظ جگہ سے چوری کیسے کی؟

عرض کیا: جناب نے فرمایا تھا کہ اپنی اور اپنے مال کی حفاظت کی جائے تو چوری نہیں ہو سکتی۔ میں نے یہ جرم کر کے آپ کے فرمان کا جواب دیا ہے۔

مہاراجا نے کہا: اب یہ اینٹیں تمھاری ہیں۔ تم لے جاؤ۔

اس نے کہا: جناب میں غریب آدمی ہوں۔ جس دن سے یہ میرے قبضے میں آئی ہیں، میری نیند ختم ہو گئی ہے۔ میں ہر وقت انھی کی حفاظت میں رہتا ہوں۔ میں اتنا قیمتی مال نہیں سنبھال سکتا۔ یہ بہت بڑا مال ہے اور اتنے بڑے مال کو سنبھالنا بڑے لوگوں کا کام ہے۔

مہاراجا نے کہا: جسے تم بڑا سمجھتے ہو وہ تو اسے نہیں سنبھال سکا۔

بہرحال اس نے اینٹیں واپس کر دیں اور مہاراجا نے اسے کچھ انعام کے طور پر دیا۔

اب ان دلیر اور جرأت مند بھائیوں کے بارے میں ایک بات اور سنیے، جو ان کی زندگی کی آخری بات ہے۔

کہتے ہیں ایک سرد رات کو یہ دونوں بھائی چوری کے لیے گھر سے نکلے اور الگ الگ دو دیہات میں گئے۔ لیکن دونوں کو کچھ نہ ملا۔ ایک واپس آ رہا تھا کہ اس کی نظر بکری کے میمنے پر پڑی۔ اس نے میمنا اُٹھایا اور واپس گھر کو چل پڑا۔ آگے گیا تو دیکھا کہ مرگھٹ میں ہندو یا سکھ اپنے مذہب کے مطابق مردہ جلا کر گئے ہیں اور مردے پر لکڑیاں ابھی جل رہی ہیں۔ یہ آدھی رات کا وقت تھا۔ اس نے سوچا کہ اس میمنے کو کہاں اُٹھائے پھروں۔ وہیں بیٹھ گیا اور چاقو سے میمنا ذبح کیا۔ اس کی کھال اُتاری اور اس کا گوشت ان لکڑیوں پر بھون کر کھانے لگا۔ ادھر

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

اتفاق سے اس کا بھائی بھی آ رہا تھا۔ اسے شبہ پڑا کہ یہ شخص جو مردے کی جلتی ہوئی لکڑیوں پر بیٹھا ہے، میرا بھائی ہوگا جو سردی کی وجہ سے آگ سینک رہا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا آگے بڑھا اور اس کے پیچھے کھڑا ہوگیا۔ اسے گوشت کھاتا ہوا دیکھ کر مذاق سے اس کے سر پر ہاتھ مارا۔ ایک دم مرگھٹ میں جو اس کے سر پر ہاتھ لگا تو وہ ڈر گیا اور اسے وہم ہوا کہ یہ کوئی بلا ہے، جس نے مرگھٹ میں اس کے سر پر ہاتھ مارا ہے۔ اسے اسی وقت بخار ہوگیا۔ یکا یک اس کی حالت غیر ہوئی تو بھائی نے اسے سنبھالا اور کہا گھبراؤ نہیں، میں تمھارا بھائی ہوں اور میں نے مذاق سے تمھارے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ تم بہادر آدمی ہو، بہادری کا ثبوت دو۔ مگر اس کا دل دہل چکا تھا، وہ گھر تو کسی طرح پہنچ گیا، لیکن سنبھل نہیں سکا، دوسرے دن وفات پا گیا۔ اس کے بعد اس کے بھائی نے چوری چکاری کا سلسلہ چھوڑ دیا۔

اندازہ کیجیے فرید کوٹ ریاست کا وہ حکمران کتنا بردبار تھا۔ خود چور اس کے دربار میں حاضر ہوتا اور اسے مال مسروقہ پیش کرتا ہے، لیکن وہ اس کی بہادری اور جرأت پر مسکراتا اور اسے معاف کر دیتا ہے۔ موجودہ دور کا کوئی حکمران ہوتا تو اس کے پورے خاندان کو پکڑ لیتا۔

طالب دین:

شہر کی جامع مسجد ہمارے محلے میں تھی۔ اس کے خادم کا نام طالب دین تھا۔ چھوٹا قد اور دبلا پتلا۔ جب ہم نے اس کو دیکھا وہ بوڑھا ہو چکا تھا اور بینائی ختم ہوگئی تھی۔ لوگ اسے تالو (یا طالو) کہتے تھے۔ معلوم نہیں وہ کب سے جامع مسجد کی خدمت کا فریضہ سرانجام دے رہا تھا۔ وہ تنہا مسجد کے ایک حجرے میں رہتا تھا۔ لوگ خود ہی مسجد میں اُسے کھانے پینے کی چیزیں پہنچا دیتے تھے۔ مجھے یاد پڑتا ہے، مسجد کے قریب ایک دو گھر اس کے رشتہ داروں کے بھی تھے۔ کھانے پینے کی بچی ہوئی چیزیں کسی بچے کو آواز دے کر وہ ان کے گھر پہنچا دیتا تھا۔

بوڑھا ہونے کے باوجود نماز کھڑا ہو کر پڑھتا تھا۔ میں نے کبھی اس کو بیٹھے ہوئے نماز پڑھتے نہیں دیکھا۔ نماز تراویح میں بعض دفعہ حافظ صاحب قرآن کے کئی کئی سپارے پڑھتے تھے۔ بسا اوقات جوان آدمی بیٹھ جاتے، لیکن طالب دین کھڑا رہتا۔ ہم لوگ آٹھ رکعت

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

تراویح پڑھتے تھے۔ وہ چار رکعت فرض نماز میں بھی کھڑا رہتا اور آٹھ رکعت تراویح اور تین وتر بھی امام کے پیچھے کھڑا ہو کر پڑھتا۔

مسجد کی صفائی وہ خود کرتا اور خود ہی صفیں بچھاتا۔ تین چار روز کے بعد وہ وضو والی نالی صاف کرتا۔ نالی صاف کرتے وقت قمیص اتار دیتا اور اپنی پتلی دبلی ٹانگوں پر تہبند کس لیتا۔ کسی سے ناراض ہو جاتا تو خفگی کے عالم میں کہتا: ''دیسی گھوڑی کراشانی دولتے''۔ اس وقت تو ان الفاظ کی کبھی سمجھ نہ آئی۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کہاوت ''دیسی گھوڑی اور خراسانی دولتے'' ہے جو اس وقت بولی جاتی ہے جب کوئی شخص عام زندگی میں ایسا انداز اختیار کرے جس کی درحقیقت وہ صلاحیت یا طاقت نہ رکھتا ہو۔

ایک دن تالو نے ایک لڑکے سے پوچھا: ''گھڑی تے کی وجیا اے''؟ اس نے جواب دیا: ''اِٹ''۔ یعنی گھڑی پر کیا بجا ہے؟ اس نے جواب دیا: ''اینٹ''۔ یہ الفاظ سنتے ہی اس کو مارنے کے لیے تالو نے غصے سے اینٹ اُٹھالی جو اتفاقاً اس کے قریب ہی پڑی تھی۔ غصہ یہ تھا کہ مسجد کی گھڑی پر یہ اینٹ مارنے کی بات کرتا ہے اور میرا مذاق اُڑاتا ہے۔ کوئی شخص مسجد میں اونچی آواز سے بولتا اور اس کے احترام کو ملحوظ نہ رکھتا تو طالب دین بے حد غصے کی حالت میں اپنی بے نور آنکھیں کھول کر اُسے ڈانٹتا اور مسجد کا احترام ملحوظ رکھنے کی تلقین کرتا۔ نہایت پرہیز گار آدمی تھا۔ مسجد ہی میں اس کی وفات ہوئی اور مسجد ہی سے اس کا جنازہ اُٹھا۔ بے شمار لوگ اس کے جنازے میں شامل تھے۔

پیلو اور بیر:

ہمارے مسکن کوٹ کپورہ سے بہ جانب شمال تقریباً تین میل کے فاصلے پر ایک سرکاری ''بیڑ'' تھا، جس میں مختلف قسم کے چھوٹے بڑے بے شمار درخت تھے۔ یعنی ایک ذخیرہ تھا جو طول وعرض میں کئی میلوں میں پھیلا ہوا تھا۔ جنگلی جانور ہرن اور نیل گائے وغیرہ بھی اس میں خاصی تعداد میں تھے۔ بیڑ کے وسط میں ایک تالاب تھا جسے ''جوشید'' کہا جاتا تھا۔ وہاں بیساکھی کا میلہ لگتا تھا۔ اردگرد کے دیہات کے لوگ اس میلے میں شامل ہوتے تھے۔ اس موقعے پر

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

بسا اوقات باہم مخالف گروہوں کے درمیان لڑائی بھی ہو جاتی تھی۔

تالاب میں مرغابیوں، بطخوں اور مور وغیرہ جانوروں کا اجتماع دیکھنے میں نہایت خوب صورت معلوم ہوتا تھا۔ پیلو کے وہاں لاتعداد درخت تھے۔ یہ گرمیوں کا میوہ تھا۔ عورتیں اور بچے بہت بڑی تعداد میں پیلو توڑنے جاتے۔ پیلو توڑنے والوں نے ٹوکریاں سی بنائی ہوئی تھیں، جنھیں ''ٹوریاں'' کہا جاتا تھا۔ میں بھی کئی دفعہ بیڑ میں گیا اور پیلو لایا۔ بیڑ کے چاروں طرف لوہے کی مضبوط حفاظتی تار لگائی گئی تھی۔ لیکن ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جانے کے لیے ایک بہت بڑا لوہے کا پھاٹک تھا جو عام طور سے کھلا رہتا تھا۔ اسی طرح بیروں کے موسم میں ہم بیریوں سے بیر اتارنے جاتے تھے۔

اولاد کی خواہش مند عورت:

ہمارے شہر میں سکھوں کے ایک محلے کو ''ہٹھاڑیاں والا اگواڑ'' کہا جاتا تھا۔ اس محلے کے بالکل قریب مین روڈ پر (جو فیروز پور سے آتی اور فرید کوٹ اور کوٹ کپورہ سے گزرتی ہوئی موگا اور آگے لدھیانہ کو جاتی تھی) درختوں کے جھنڈ میں ایک بہت بڑا کنواں تھا۔ ایک مرتبہ آدھی رات کو کچھ لوگ وہاں سے گزر رہے تھے۔ راستہ دیکھنے کے لیے انھوں نے ٹارچ جلائی تو کنوئیں کی منڈیر پر کسی کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ پہلے تو وہ خوف زدہ ہوئے، لیکن پھر دل کڑا کرکے آگے بڑھے تو ایک عورت بیٹھی تھی۔ انھوں نے اس اندھیری سرد رات میں اس سے وہاں بیٹھنے کی وجہ پوچھنا چاہی تو وہ بولی تم اپنی راہ لو، مجھے کچھ نہ کہو۔ میں بے اولاد ہوں اور ایک سادھو سنت کے کہنے کے مطابق کنوئیں پر نہا رہی ہوں۔ یہ میری گود ہری ہونے کا علاج ہے۔ اس واقعہ کا تعلق ایک سکھ عورت سے تھا، جو سکھ مذہب کے کسی سادھو سنت کی عقیدت مند تھی اور اس کے حکم سے کنوئیں پر اشنان کر رہی تھی۔

ایک اور واقعہ:

چھوٹی عمر میں ایک اور واقعہ سننے میں آیا تھا جو کسی سادھو نے دو مختلف لڑکیوں سے محبت کرنے والے دونو جوانوں کو بتایا تھا اور کہا تھا کہ وہ اس پر عمل کریں گے تو محبت میں کامیاب

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ہوں گے، ورنہ ناکام رہیں گے...... وہ عمل یہ تھا کہ کسی تازہ مرے ہوئے شخص کا دل نکال کر لاؤ۔ وہ (سادھو) اس پر منتر پڑھے گا۔ پھر اس دل کے ٹکڑے کر کے پرندوں کو کھلائے جائیں گے۔ کھانے کے بعد جیسے پرندے اُڑیں گے، اسی طرح ان لڑکیوں کے دل ان کی طرف کھنچے چلے آئیں گے۔ ان کے ماں باپ کے دل بھی نرم پڑ جائیں گے اور محبت میں انھیں کامیابی حاصل ہو جائے گی۔

محبت کے اس ٹوٹکے پر عمل کرنے کے لیے یہ نوجوان تازہ مردے کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ پتا چلا کہ فلاں قبرستان میں آج ہی کسی کو دفن کیا گیا ہے۔ انھوں نے رات کو قبر کھودی اور مردے کا دل نکال کر اسی وقت وہاں پہنچے جہاں سادھو دھونی رمائے بیٹھا تھا۔ اب محبت کے مارے ہوئے نوجوان بھی خوشی سے بے حال ہو رہے تھے اور سادھو بھی ترنگ میں تھا۔ اس نے چلم میں بھر کر سلفے کا لمبا سوٹا لگایا اور اس کا بدبودار دھواں فضا میں بکھیرتے ہوئے کہا: میں دو دن اس دل پر منتر پڑھوں گا۔ تم دو دن کے بعد رات کو اتنے بجے یہاں آؤ اور منتر پڑھنے کے اتنے پیسے دے جاؤ۔ وہ ہنسی خوشی وہاں سے رُخصت ہوئے اور دو دن کے بعد سادھو کے ٹھکانے پر پہنچے تو سادھو غائب تھا۔ اسے تلاش کیا گیا، لیکن وہ نہیں ملا۔

ایک خوش پوش ملنگ:

کوٹ کپورہ اہل حدیث حضرات کا شہر تھا، جنھیں عرف عام میں وہابی کہا جاتا ہے۔ ہمارے محلے میں بہت بڑا چوک تھا، جسے لوگ ''ستھ'' کہا کرتے تھے، وہیں انجمن اصلاح المسلمین کا سالانہ جلسہ منعقد ہوتا تھا۔ ایک دن بارہ بجے کے قریب ایک خوش پوش نوجوان آیا۔ اس نے بانس کی لمبی لاٹھی پر رنگ برنگ چیتھڑوں کا بنا ہوا جھنڈا لٹکا رکھا تھا اور ہاتھ میں ''کسی'' تھی، جسے پنجابی میں ہم لوگ ''کہی'' کہتے ہیں۔ اس نے زمین پر جھنڈا گاڑتے ہوئے بلند آواز سے نعرہ لگایا ''یا علی مدد''۔ پھر اسی لہجے میں کہا: ''یا علی تیرا ملنگ آ گیا تو اس کی مرادیں پوری کر۔'' اس کے بعد اس نے چیتھڑوں سے بنی ہوئی گدڑی زمین پر بچھائی اور حاجی محمد کریم کے مکان کی طرف رخ کر کے گدڑی پر آلتی پالتی مار کے بیٹھ گیا۔ بولا: اس مکان والا پانچ

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

روپے دے گا تو علی کا ملنگ چلا جائے گا۔ سر ہلا ہلا کر بار بار وہ یہی الفاظ کہتا رہا، ایک گھنٹے کے اندر اندر پانچ روپے آ جانے چاہئیں۔ اس کے بعد مہلت نہیں ملے گی۔ پانچ روپے اس زمانے میں اچھی خاصی رقم تھی۔ لوگ اس کے اردگرد اکٹھے ہو گئے۔ ایک گھنٹا گزر گیا تو اس نے کسی پکڑ کر زمین کھودنی شروع کر دی۔ جب کمر تک گڑھا کھودا گیا تو اس میں کھڑا ہو گیا۔ کہا پانچ روپے نہ ملے تو میں کچھ کھائے پیے بغیر یہیں مر جاؤں گا۔

لوگوں نے کہا: اس طرح مانگنے سے تمھیں کچھ نہیں ملے گا۔ یہاں سے چلے جاؤ۔ بولا: میں اسی طرح سامنے گھر والے حاجی سے پانچ روپے لے کر جاؤں گا۔ اب ایک لڑکے نے اس کی کسی پکڑی اور اس پر مٹی ڈالنا شروع کر دی اور کہا: تمھیں یہیں دفن کر دیا جائے گا۔ جب تھوڑی سی مٹی اس پر پڑی تو چیخنے چلانے لگا۔ خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو، میں بھول کر یہاں آ گیا۔ میں اللہ سے توبہ کرتا ہوں اور تم سے معافی مانگتا ہوں۔ آئندہ کبھی یہ کام نہیں کروں گا۔

یہ میرے بچپن کا واقعہ ہے، جس پر کم و بیش ۷۰ برس کی طویل مدت گزر چکی ہے لیکن میں اب بھی اس نوجوان ملنگ کو چیختے چلاتے اور توبہ کرتے سن رہا ہوں اور وہاں سے بھاگتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔

وہ وہابیوں کا شہر تھا، جب کوئی شخص کسی شخص سے کوئی ایسی چیز مانگے جس کے دینے کی وہ سکت نہ رکھتا ہو تو اس موقعے پر پنجابی کی یہ کہاوت بولی جاتی ہے ''کٹے والے گھر سے لسّی مانگ رہا ہے''۔ یعنی لسّی تو بھینس والے گھر سے ملتی ہے نہ کہ کٹے والے گھر سے۔ لیکن یہ کٹے والے گھر سے لسّی کا طالب ہے۔

بیڑ میں پھنسا:

گزشتہ سطور میں کوٹ کپورہ کے ''بیڑ'' کا ذکر کیا گیا ہے، جس میں ہم پیلو توڑنے جایا کرتے تھے۔ بیڑ کے ساتھ ہمارے ایک پڑوسی ارائیں گھرانے کی زمین تھی، وہاں انھوں نے ایک کوٹھا بنایا تھا۔ بعض اوقات وہ کئی کئی دن اپنی زمین کے اس کوٹھے میں رہتے تھے۔ ایک مرتبہ میں بھی ان کے ساتھ چلا گیا اور رات کو وہیں رہ پڑا۔ ان میں سے دو آدمی آدھی رات

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کے وقت بیڑ میں لکڑیاں کاٹنے چلے گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ چل پڑا۔ بیڑ میں ایک بھینسا رہتا تھا۔ وہ آدمی کو دیکھ لیتا یا اسے شبہ پڑ جاتا کہ اس طرف کوئی آدمی آیا ہے تو وہاں جا پہنچتا، اور پھر اس کا پیچھا نہ چھوڑتا۔ سنا تھا کہ اس نے دو تین آدمیوں کو مار بھی دیا تھا...... رات کو جس طرف وہ لکڑیاں کاٹ رہے تھے اور میں ان کے ساتھ تھا، اس طرف بڑھکیں مارتا ہوا بھینسا بھی آ گیا اور سب لوگ ڈر گئے۔ کہتے ہیں بھینسے کی قوت شامہ یعنی سونگھنے کی طاقت بہت تیز ہوتی ہے۔ رات کے اندھیرے میں ہم لوگ ایک اونچے درخت پر چڑھ گئے اور گم سم بیٹھ گئے۔ بھینسا بھی درخت کے نیچے آ کر کھڑا ہو گیا اور منہ اوپر کی طرف کر کے سونگھنے اور بڑھکیں مارنے لگا۔ ہمارے لیے یہ نہایت خطرناک وقت تھا اور اندیشہ تھا کہ بھینسا یہیں کھڑا رہے گا۔ تقریباً آدھا گھنٹا موت و حیات کی اس کش مکش میں گزرا اور پھر بڑھکیں مارتا ہوا بھینسا دور چلا گیا تو ہم لوگ درخت سے نیچے اُترے اور بیڑ سے باہر نکلے۔

پندرہ رمضان کی خوشی:

اب پرانی باتیں ختم ہو گئی ہیں۔ ہماری زندگی کے ابتدائی دور کی بات ہے کہ چودہ رمضان گزر جاتا تو پندرہ رمضان کو سحری کے وقت گھروں میں حلوہ یا کھیر پکائی جاتی۔ یہ اس خوشی کا اظہار ہوتا تھا کہ آدھا رمضان شریف خیریت سے گزر گیا۔ سحری کے وقت حلوہ یا کھیر منڈے پر رکھ کر ہمیں اپنے رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے گھروں میں بھیجا جاتا کہ ایک ایک منڈا سب گھروں میں دیا جائے۔ یہ عمل فجر کی اذان سے پہلے کیا جاتا تھا تاکہ گھر کے افراد اسے تھوڑا تھوڑا کھا سکیں۔ سردی ہو یا گرمی، بارش ہو یا آندھی، ہم نہایت خوشی سے تمام گھروں میں جا کر یہ خدمت سرانجام دیتے۔

۲ جنوری ۲۰۰۸ء　　　　　　　　　　　　بہاول نگر

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

پانچواں باب:

زمانۂ طالب علمی میں مطالعہ کا شوق

اللہ کا مجھ پر یہ خاص کرم ہے کہ عمر کے ابتدائی دور ہی میں رسائل و جرائد اور مطالعۂ کتب کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ رسائل و جرائد سے میں اپنے فہم کے مطابق حالات حاضرہ اور ملکی سیاسیات کو سمجھنے کی کوشش کرتا تھا اور کتابوں کے مطالعہ سے دینی مسائل سے آگاہی اور تاریخی واقعات کو ذہن نشین کرنا میری دلچسپی کا محور تھا۔

مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے میں نے جامعہ ملیہ دہلی کی مطبوعات میں سے ایک کتاب ''ہمارے رسول'' پڑھی، جس میں بچوں کے ذہن کے مطابق آسان زبان میں نبی کریم ﷺ کے مختصر حالات بیان کیے گئے تھے۔ پھر جامعہ ملیہ ہی کی ایک کتاب ''چار یار'' پڑھی۔ اس کتاب میں خلفاے اربعہ (حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی اور حضرت علی رضی اللہ عنہم اجمعین) کے واقعات زندگی نہایت عمدہ پیرائے میں تحریر کیے گئے تھے۔

انھی دنوں حضرت قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی تصنیف ''مہر نبوت'' کا مطالعہ کیا، جو سیرت کے موضوع کی مختصر مگر اہم کتاب ہے۔ پھر مولانا عطاء اللہ حنیف سے سبقاً سبقاً قاضی صاحب کی کتاب ''رحمۃ للعالمینؐ'' کی پہلی جلد پڑھی۔ دوسری اور تیسری جلد کا خود مطالعہ کیا۔ اس طرح سیرت کے متعلق کچھ معلومات حاصل ہوئیں۔ اسی ابتدائی زمانے میں قاضی صاحب کی ''تاریخ المشاہیر'' پڑھی جو بزرگانِ دین کے حالات پر مشتمل ہے۔ اس وقت پیسے کا حصول بہت مشکل تھا، لیکن کسی نہ کسی طرح یہ کتابیں میں نے خرید کر پڑھیں۔ چھوٹی عمر میں نبی ﷺ کی سیرت سے متعلق ایک کتاب ''عرب کا چاند'' پڑھی۔ یہ کتاب ایک ہندو سوامی لکشمن پرشاد کی تصنیف ہے۔ کتاب بڑی شستہ اُردو میں لکھی گئی ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

اسی زمانے میں خواجہ حسن نظامی کی ایک کتاب ''غدر'' سے متعلق پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ اس کتاب میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بارے میں بعض تفصیلات بیان کی گئی ہیں، جسے انگریزوں نے ''غدر'' کا نام دیا تھا۔ اس کے نتیجے میں مغل خاندان کی شہزادیوں اور شہزادوں پر جو بیتی اس کا دردناک الفاظ میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ خواجہ کی زبان اور اندازِ نگارش سے میں بے حد متاثر ہوا اور یہ تاثر ہمیشہ سطحِ ذہن پر قائم رہا۔

اسی اثنا میں ایک اور کتاب ملی۔ وہ تھی میرزا حیرت دہلوی کی ''حیاتِ طیبہ''۔ اس میں مولانا اسماعیل شہید دہلوی کے حالات اور ان کی تحریک جہاد کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس موضوع کی یہ پہلی کتاب ہے جو بہت چھپی اور بہت پڑھی گئی۔ اس تحریک پر اب کئی کتابیں معرضِ تصنیف میں آچکی ہیں۔ مولانا غلام رسول مہر کی کتاب جو چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے، اس موضوع کی نہایت محققانہ تصنیف ہے۔ پھر اسی موضوع کی سیّد ابوالحسن علی ندوی کی کتاب ہے، لیکن اس کے باوجود حیاتِ طیبہ کا اپنا رنگ ہے جو کبھی پھیکا نہیں پڑا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اس کتاب سے بہتر متاثر تھے۔ مولانا غلام رسول مہر نے ایک مرتبہ بتایا کہ ۱۹۴۶ء میں صوبہ پنجاب کی وزارت سازی کے سلسلے میں مولانا آزاد لاہور تشریف لائے تو ان کا قیام فلیٹیز ہوٹل میں تھا۔ ایک دن ان سے عرض کیا کہ میں آپ سے ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں، کس وقت آؤں؟ فرمایا نمازِ فجر سے پہلے کا وقت ٹھیک رہے گا۔ چنانچہ میں حاضر ہوا اور سیّد احمد شہید کے متعلق اپنا مسودہ انھیں دکھایا اور مختصر الفاظ میں اس کے بارے میں بتایا۔ مولانا چوں کہ حیاتِ طیبہ سے متاثر تھے، اس لیے انھوں نے میری بات سن کر اسی تاثر کا اظہار کیا اور ایسے الفاظ میں کیا کہ ان کی پانچ منٹ کی تقریر سے میری تحقیق کی عمارت ہلنے لگی۔

مولانا غلام رسول مہر کا نام آیا ہے تو ان کے متعلق عرض کردوں کہ عمر کے ابتدائی دور میں ان کی سب سے پہلی کتاب جو میں نے پڑھی اس کا نام ''سیرت ابن تیمیہ'' تھا۔ اس کے صفحہ اوّل پر مصنف کا نام اس طرح لکھا تھا: ''چودھری غلام رسول مہر ایڈیٹر روزنامہ زمیندار لاہور''۔ یہ کتاب ''الہلال'' بک ایجنسی فاروق گنج لاہور نے شائع کی تھی، جس کے مالک

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

عبدالعزیز آفندی تھے اور وہ مولانا ابوالکلام آزاد کے عقیدت مند تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد میں لاہور آیا تو عبدالعزیز آفندی کی خدمت میں کئی دفعہ حاضری کا موقع ملا۔ اس وقت وہ فالج کے مرض میں مبتلا تھے، لیکن نہایت حوصلہ مند شخص تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق میں نے اولیں کتاب روشن دین پٹیالوی کی پڑھی۔ اس کتاب کا نام میرے ذہن سے نکل گیا ہے۔ اسی زمانے میں کسی اخبار میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تصویر دیکھی۔ خوب صورت آدمی کی خوب صورت تصویر۔ ان کی فرنچ کٹ داڑھی اور چڑھی ہوئی مونچھیں بہت اچھی لگیں۔ میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ میں اسی قسم کی داڑھی اور اسی قسم کی مونچھیں رکھوں گا۔ ۱۹۴۳ء میں میرا چہرہ بالوں سے آشنا ہوا تو میں نے وہی کیا جس کا فیصلہ کر چکا تھا۔ طویل عرصے تک اس فیصلے پر قائم رہا۔ لیکن پھر فیصلہ واپس لے لیا۔

۱۹۳۷ء میں موضع مرکز الاسلام میں مولانا محمد علی صاحب لکھوی کے پاس پہلی دفعہ مولانا آزاد کی تصنیف ''تذکرہ'' دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس میں دیمک کے سوراخ تھے، جنھیں دیکھ کر مولانا محمد علی صاحب کو افسوس ہو رہا تھا۔ انھوں نے فرمایا کہ کئی سال پہلے انھوں نے ''تذکرہ'' خریدا تھا اور مختلف اوقات میں دو تین دفعہ اسے پڑھا۔ میں اس وقت مرکز الاسلام میں مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے حلقۂ درس میں شامل تھا۔ میں نے مولانا محمد علی لکھوی کی اجازت سے ''تذکرہ'' کی چند سطریں پڑھیں تو خوش ہو کر فرمایا، تم اسے پڑھ سکتے ہو تو پڑھ لو۔ میں نے چار پانچ روز میں اسے پڑھ تو لیا لیکن اس کے مندرجات کو سمجھنا اس وقت میرے لیے مشکل تھا۔

اس کے بعد مجھے مولانا ابوالکلام آزاد کے ہفت روزہ ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کی فائلیں ایک دوست سے مل گئیں۔ ان کی کوئی بات سمجھ میں آئی، کوئی نہ آئی لیکن میں نے پڑھ ڈالیں۔ چند روز کے بعد ان کی کتاب ''مسلمان عورت'' خرید کر پڑھی جو مصری مصنف فرید وجدی کی عربی تصنیف ''المرأة المسلمه'' کا اُردو ترجمہ ہے۔ میں نے یہ کتاب چھوٹی عمر میں دو دفعہ خریدی۔ پہلی دفعہ لاہور سے خریدی۔ لاہور سے کوٹ کپورہ کے لیے ریل پر سوار ہوا اور

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کوٹ کپورہ کے ریلوے اسٹیشن پر اترا تو اتفاقاً وہاں کے سکھ اسٹیشن ماسٹر کی اس پر نظر پڑی۔ اس نے وہ کتاب مجھ سے لے لی اور کہا، اس کی قیمت لے لو۔ میں اُسے خود بھی پڑھوں گا اور میری لڑکیاں بھی پڑھیں گی۔ لیکن میں نے اس سے قیمت نہیں لی۔ اس کے بعد فیروز پور گیا تو وہاں دہلی دروازے کے باہر بک سٹال سے دوبارہ کتاب خریدی اور پڑھی۔

اسی اثنا میں ''قولِ فیصل'' کے نام سے مولانا آزاد کا وہ تاریخی بیان پڑھا جو انھوں نے تحریری صورت میں علی پور جیل (کلکتہ) میں دیا تھا۔ یہ اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد عدالتی بیان ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ مولانا نے کس جرأت اور دلیری سے ظالم انگریز حکمران کے سامنے کلمۂ حق بلند کیا اور کن الفاظ اور کس انداز سے اپنے حریف کو للکارا، جس کی ہیبت نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا پر چھائی ہوئی تھی اور جس کی حکمرانی کے طول وعرض کا یہ عالم تھا کہ کہیں اس پر سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ جس علاقے میں سورج غروب ہونے کا وقت آتا، وہ علاقہ انگریزوں کی قلمرو میں ہوتا تھا۔ بیان کا وہ حصہ انتہائی زور دار ہے، جہاں انھوں نے ''فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ'' کے عنوان سے مجسٹریٹ کو مخاطب کیا ہے۔ (یعنی جو جی چاہے فیصلہ کرو، مجھے کوئی پروا نہیں)

طالب علمی کے زمانے ہی میں مولانا شبلی نعمانی کی ''الفاروق'' کا مطالعہ کیا جو خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حالات پر محیط ہے۔ سیّد سلیمان ندوی مرحوم کے ''خطبات مدراس'' کا پتا بھی انھی دنوں چلا اور یہ ساتوں خطبات جو سیرت کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہیں، بڑے شوق اور توجہ سے پڑھے۔

اسی دور میں معروف ادیب میرزا ادیب مرحوم کی ایک کتاب ''صحرا نورد کے خطوط'' پڑھی۔ یہ ان کی پہلی کتاب تھی جو میں نے پڑھی۔ یہ کتاب پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ واقعتہً کوئی صحرا نورد خطوط لکھ رہا ہے۔ تقسیم ملک سے کچھ عرصہ بعد میں لاہور آیا تو میرزا ادیب سے ملاقات ہوئی اور یہ ملاقات جلد ہی دوستی میں بدل گئی۔ میرزا ادیب نے میری ایک کتاب ''بزم ارجمنداں'' پر مقدمہ بھی لکھا۔ انھوں نے خود ہی اس کتاب پر مقدمہ لکھنے کی پیش کش کی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

تھی۔ یہ ان کی طرف سے مجھ پر شفقت کا اظہار تھا۔ وہ پچاس سے زیادہ ادبی کتابوں کے مصنف تھے۔ بے حد شریف اور ہمدرد۔ میں لاہور کی آبادی سانده میں رہتا ہوں۔ ان کا مکان میرے گھر کے قریب تھا اور ہمارا ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا رہتا تھا۔

مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کی ''تاریخ اسلام'' کا بھی عہد طالب علمی میں مطالعہ کیا۔ یہ کتاب تین ضخیم جلدوں میں پھیلی ہوئی ہے اور زبان، اسلوب اور ترتیب کے لحاظ سے بہترین کتاب ہے۔ میں اس کے مشمولات سے بہت متاثر ہوا۔ یہ کتاب باریک خط میں صوفی سبز منڈی بہاؤالدین کی چھپی ہوئی تھی۔ میں نے اس زمانے میں تین روپے میں خریدی تھی۔ انہی دنوں اسی مصنف کی ایک اور کتاب ''آئینہ حقیقت نما'' پڑھی۔ ان کی قول فیصل بھی پڑھی۔ اس مصنف کی اور بھی بعض تصانیف پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

۱۹۳۴ء میں مولانا عطاء اللہ حنیف کے پاس کوٹ کپورہ میں بذریعہ ڈاک سہ روزہ اخبار ''مدینہ'' آتا تھا۔ اس کے ایڈیٹر ملک نصر اللہ خاں عزیز تھے۔ اس کے صفحہ اوّل پر اخبار کے نام کے نیچے لکھا ہوتا تھا: ''مدیر نصر اللہ خاں عزیز بی۔ اے۔'' یہ اخبار یوپی کے شہر بجنور سے شائع ہوتا تھا اور اس کے مالک مولوی محمد مجید حسن تھے۔ اخبار نیشنلزم کا حامی اور سیاسیات میں کانگرس کے نقطۂ نظر کا داعی تھا۔ اس کا اداریہ، ادارتی شذرات، ملکی اور غیر ملکی خبریں اور مضامین وغیرہ سب مشتملات دلچسپی سے پڑھے جاتے تھے۔ اخبار ''مدینہ'' کا ایک کالم ''سر راہے'' تھا جو سنجیدہ مزاح کا عمدہ نمونہ تھا۔ اس کے ایڈیٹر ملک نصر اللہ خاں عزیز بعد میں جماعت اسلامی میں شامل ہو گئے تھے۔ میں لاہور آیا تو ان سے تعلقات پیدا ہوئے۔

مولانا ثناء اللہ امرتسری کے اخبار ہفت روزہ ''اہل حدیث'' کا بھی اسی عہد میں پتا چلا اور میں اس کا مطالعہ کرتا رہا۔ اس اخبار کے قارئین صرف اہل حدیث مسلک کے لوگ ہی نہیں تھے بلکہ ان میں ہندو، سکھ اور عیسائی بھی شامل تھے۔ نیز دیوبندی، بریلوی، شیعہ اور مرزائی سب اس کے انتظار میں رہتے تھے۔ اس لیے کہ اس کے ایڈیٹر مولانا ثناء اللہ امرتسری ان تمام مذاہب و مسالک کے بارے میں لکھتے رہتے تھے اور ان مذاہب سے تعلق رکھنے والے اہل علم

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

سے ان کی بحثیں جاری رہتی تھیں۔

دیوان سنگھ مفتون ایک مشہور صحافی تھے۔ وہ اصل میں رہنے والے تو حافظ آباد کے تھے لیکن لاہور وغیرہ کے چکر کاٹتے ہوئے دہلی چلے گئے تھے۔ وہاں سے انھوں نے ہفت روزہ ''ریاست'' جاری کیا۔ اس اخبار نے بڑی شہرت پائی۔ ہندوستان کی ریاستوں کے کسی نہ کسی نواب اور راجے مہاراجے سے دیوان سنگھ مفتون ٹکر لگائے رکھتے تھے۔ صاف گو صحافی تھے۔ آزادیٔ ملک کے بعد ہندوستان کی ریاستیں ختم ہوئیں تو یہ اخبار بھی ختم ہوگیا۔ مولانا ابوالکلام آزادؔ نے وزارتِ تعلیم کی طرف سے دیوان سنگھ مفتون کا تین سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا تھا جو اس زمانے میں معقول وظیفہ تھا۔ وہ دہلی کی سکونت ترک کر کے ڈیرہ دون چلے گئے تھے۔ وہیں فوت ہوئے۔ میں اخبار ''ریاست'' کا قاری تھا۔

لاہور کے روزناموں میں مولانا ظفر علی خاں کے ''زمیندار'' اور سیّد حبیب کے ''سیاست'' کا علم بھی طالب علمی کے دور میں ہوا۔ ان کی قیمت ایک ایک آنہ تھی۔ کوٹ کپورہ میں بعض لوگ یہ اخبار منگواتے تھے اور میں انھیں پڑھنے کی کوشش کرتا تھا۔

لاہور کے روزنامہ اخبارات جس گاڑی سے کوٹ کپورہ جاتے تھے، وہ بارہ بجے وہاں پہنچتی تھی۔ ایک ہندو لڑکا سائیکل پر انھیں لوگوں کے گھروں میں پہنچاتا تھا۔ سائیکل چلاتا ہوا وہ ''اخبار آ گیا'' کی آواز لگاتا جاتا تھا۔

لاہور سے ایک ماہنامہ ''بیسویں صدی'' نکلتا تھا۔ یہ ادبی رسالہ تھا اور اس میں ملک کے مختلف ادیبوں کے افسانے چھپتے تھے۔ اس کا ایڈیٹر ہندو تھا۔ اس کا نام تو غالباً رگوناتھ تھا لیکن وہ خوشتر گرامی کہلاتا تھا۔ یہ رسالہ میرے خیال میں ایک سو صفحات پر مشتمل ہوگا۔ اس میں کئی صفحات کے اشتہارات ہوتے تھے۔ میں نے وہ رسالہ ایک دفعہ فیروز پور کے ایک بک سٹال سے چار آنے میں خریدا۔ اس میں ایک افسانہ اسحاق رام نگری کا تھا۔ مجھے یہ نام پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی اور ایسے لگا جیسے یہ افسانہ خود میں نے ہی لکھا ہے۔ سب سے پہلے میں نے یہی افسانہ پڑھا۔ اس سے قبل میں نے افسانہ کبھی نہیں پڑھا تھا۔ افسانہ پڑھتا جاتا تھا اور خوش ہوتا

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

جاتا تھا۔ افسانہ ختم کیا تو ایسے محسوس ہوا کہ اسے آگے چلنا چاہیے تھا۔ چناں چہ میں نے رسالے کے تمام صفحے دیکھے، اس کا باقی حصہ کہیں نہیں تھا۔

اس کے بعد دوسرا افسانہ پڑھا اور پھر تیسرا، حتیٰ کہ تمام افسانے پڑھ لیے، لیکن سب کا ایک ہی معاملہ تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے پوری بات بیان نہیں ہوئی، آخری حصہ بیان ہونے سے رہ گیا ہے۔ دوسرے مہینے کا ''بیسویں صدی'' پھر کسی سے فیروز پور سے منگوایا اور پڑھا۔ بس ہم نے یہی افسانے پڑھے جو ''بیسویں صدی'' کے ان دو شماروں میں چھپے تھے۔ اس کے بعد افسانے سے دلچسپی نہیں رہی۔ پڑھنا چاہوں بھی تو نہیں پڑھ سکتا۔

ہمارے طالب علمی کے ابتدائی دور میں مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے پاس ڈاک سے جو اخبار اور رسالے آتے تھے ان میں ایک ماہنامہ رسالہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا ''ترجمان القرآن'' تھا۔ یہ رسالہ اس زمانے میں حیدرآباد (دکن) سے شائع ہوتا تھا۔ میں اسے بھی پڑھنے کی کوشش کرتا تھا۔ مولانا عطاء اللہ حنیف کی یہ عادت تھی کہ جو اخبار اور رسالے ان کے پاس آتے تھے، وہ نہایت خوش دلی سے اپنے شاگردوں اور دوسرے لوگوں کو مطالعے کے لیے عنایت فرمادیتے۔ بلکہ بسا اوقات ان کے مطالعے کی تاکید فرماتے۔ لیکن ''ترجمان القرآن'' کے اکثر مضامین کئی کئی قسطوں میں چلتے تھے۔ اس کے مختصر اور چھوٹے مضمون تو میں پڑھ لیتا تھا لیکن لمبے مضمون پڑھنا مشکل ہوتا تھا۔

اپنے متعلق یہ بھی بتاتا جاؤں کہ مولانا عطاء اللہ حنیف کے حلقۂ شاگردی میں رہنے کی وجہ سے ابتدا ہی میں انگریزی حکومت کی مخالفت کا جذبہ دل میں پیدا ہوگیا تھا۔ بے شک ملکی سیاسیات کی اس وقت زیادہ سمجھ نہ تھی، لیکن یہ جذبہ روز بروز شدید سے شدید تر ہوتا گیا۔ جن لوگوں کی زبان یا قلم سے کسی صورت میں انگریز کی حمایت کا پہلو نکلتا تھا، ان سے میرا متاثر ہونا ناممکن تھا۔ مولانا مودودی صاحب نے ۱۹۳۷ء میں ''ترجمان القرآن'' میں ''مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش'' کے عنوان سے مضامین کا ایک طویل سلسلہ شروع کیا۔ اس سلسلۂ مضامین میں انھوں نے انگریزی حکومت کی مخالفت کے بجائے ان سیاسی جماعتوں کو ہدفِ

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

تنقید ٹھہرانا ضروری سمجھا جو انگریزی حکومت کی مخالفت کر رہی تھیں۔ کانگرس، مسلم لیگ، جمعیت علماے ہند، مجلس احرار وغیرہ جماعتوں کو انھوں نے آڑے ہاتھوں لیا۔ ان جماعتوں کے رہنماؤں کا طریق کار اگرچہ مختلف تھا لیکن انگریزی حکومت کے خاتمے کے بارے میں سب کا ایک ہی نقطۂ نظر تھا۔ ظاہر ہے انگریز کی مخالف جماعتوں کی مخالفت کا مطلب انگریز کی حمایت تھا۔ اس لیے میں مولانا مودودی کی تحریروں سے متاثر نہیں ہوا۔ البتہ ان کی کتاب ''خطبات'' مجھے پسند آئی اور بہت سے لوگوں کو میں نے اس کے خریدنے اور پڑھنے کا مشورہ دیا۔

مولانا مودودی کے مضامین ''مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش'' ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' میں چھپنے کے بعد تین حصوں میں کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ ان کے اوّلیں ایڈیشن جو ۴۲، ۱۹۴۱ء میں چھپے، پڑھ لیے جائیں تو ان کا سیاسی نقطۂ نظر واضح ہو جاتا ہے، اور پتا چل جاتا ہے کہ وہ انگریزی حکومت کے مخالف تھے یا حامی۔ نیز یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ تحریک پاکستان اور اس کے رہنماؤں کے متعلق ان کے خیالات کس قسم کے تھے۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ بعض لوگ مولانا مودودی کے یہی مضامین پڑھ کر ان سے متاثر ہوئے اور مجھے انھی مضامین کے مطالعہ نے ان کے دائرہ تاثر سے باہر رکھا۔ اپنی اپنی سمجھ ہے۔ ممکن ہے ان کے مضامین میری سمجھ میں نہ آئے ہوں۔ ویسے بھی کسی سے اتفاق یا اختلاف کفر اور اسلام کا مسئلہ نہیں ہے۔ نہ اختلاف کرنے والا دوزخی ہے، نہ اتفاق کرنے والے کو جنت کی بشارت دی گئی ہے۔

طالب علمی کے دور میں درسی کتابوں کے علاوہ اُردو کی جو کتابیں میں نے پڑھیں، ان میں مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی کی کتابیں بھی شامل ہیں۔ یہ تاریخی ناول ہیں۔ ان کی زبان اور انداز سے میں بہت متاثر ہوا اور ان کے مطالعہ سے مجھے بے حد فائدہ پہنچا۔ یہ آج سے کم و بیش ستر سال پہلے کی بات ہے۔ اس کے بعد ان کتابوں کے مطالعے کا موقع نہیں ملا۔ شرر سے مجھے اس لیے بھی دلچسپی ہوئی کہ کسی نے بتایا تھا کہ یہ اہل حدیث ہیں اور حضرت میاں سیّد نذیر

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

حسین دہلوی کے شاگرد ہیں۔ (اور یہ بات صحیح تھی) میں نے ان کی مندرجہ ذیل کتابیں چھوٹی عمر میں پڑھیں:

۱: حسن انجلینا:۔ یہ شرر کا ایک خوب صورت تاریخی ناول ہے اور یہ ان کا پہلا ناول تھا جو میں نے پڑھا۔

۲: ملک العزیز ورجنا:۔ یہ بھی تاریخی ناول ہے۔ یہ کہانی ملک العزیز اور ورجنا کے درمیان گھومتی ہے۔

۳: فلورا فلورنڈا:۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ گرجوں میں عیسائی ننوں کے ساتھ کیا بیتتی ہے۔

۴: جویائے حق:

۵۔ حسن بن صباح:

عبدالحلیم شرر نے لکھنؤ سے ایک رسالہ ''دلگداز'' جاری کیا تھا۔ اس کے بھی چند شمارے پڑھنے کو ملے۔ نیز ''مضامین شرر'' کا مطالعہ کیا۔

شرر کی کتابوں میں سے حسن انجلینا، ملک العزیز ورجنا، فلورا فلورنڈا اور جویائے حق تو میں نے خریدی تھیں۔ باقی کتابیں کسی سے پڑھنے کے لیے لی تھیں۔ فلورا فلورنڈا کے بعض مقامات میں نے ۱۹۳۷ء میں مولانا محی الدین لکھوی سے مرکز الاسلام میں سمجھے تھے۔ مجھے ننوں کے متعلق معلوم نہ تھا کہ کیا ہوتی ہیں، یہ بھی انھی نے بتایا تھا۔ شاید کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب کی ''کتاب التوحید'' کا اُردو ترجمہ پہلی مرتبہ عبدالحلیم شرر نے کیا تھا، جب کہ وہ دہلی میں حضرت میاں صاحب کے حلقہ درس میں شامل تھے یعنی یہ ان کی طالب علمی کا زمانہ تھا۔

۱۹۳۶ء میں مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی نے (۲۰×۳۰×۱۶) سائز کے چند رسالوں کا مجلد سیٹ مجھے دیا۔ یہ مولانا احمد علی لاہوری مرحوم کے رسائل تھے، جن کے نام اس قسم کے تھے۔ اصلی حنفیت، مروجہ مولود، اطاعت رسولؐ، مسئلہ توحید وغیرہ۔ یہ رسالے بھی میں نے پڑھے۔ یہ رسالے مولانا عطاء اللہ صاحب لاہور سے لے کر گئے تھے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

طالب علمی کے زمانے میں ہی ہندوؤں کی بعض کتابیں پڑھیں، جن میں ایک کتاب ''مہابھارت'' ہے۔ یہ کتاب سنسکرت زبان میں لکھی گئی تھی۔ مغل حکمران جلال الدین اکبر کے زمانے میں ''رزم نامہ'' کے نام سے اس کا فارسی زبان میں ترجمہ ہوا۔ پھر کسی نے اُردو میں کیا۔ میں نے اُردو ترجمہ پڑھا۔ انہی دنوں رامائن اور بھگوت گیتا کے اُردو ترجمے پڑھے۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے ہندو مذہب اور ہندوؤں کی تاریخ کے بہت سے عجیب و غریب معاملات کا پتا چلتا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے جو یہ لکھا ہے کہ ہندوؤں کی کوئی مرتب تاریخ نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بالکل صحیح لکھا ہے۔ مہابھارت میں ایسے ایسے واقعات مرقوم ہیں کہ جن کی کوئی کل بھی سیدھی دکھائی نہیں دیتی۔ بہرکیف ہم نے یہ کتابیں بھی شوق سے پڑھیں اور ان کے بعض مندرجات اب بھی یاد ہیں۔

مندرجہ بالا کتابیں میں نے طالب علمی کے ابتدائی زمانے میں پڑھیں جو ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۹ء تک چلتا ہے۔ اس وقت میرے مطالعہ کی رفتار اوسطاً دو سو صفحات روزانہ تھی۔ ہمارے محلے سے متصل سرکاری باغ تھا، جس میں والئی فرید کوٹ کی کوٹھی بھی تھی۔ میں اکثر صبح کو اس باغ میں چلا جاتا اور شام تک وہاں بیٹھا پڑھتا رہتا۔ اس زمانے میں پڑھنے کا بہت شوق تھا اور میری دلچسپی کا اصل موضوع اسلامی تاریخ تھا۔

کتب و رسائل کے مطالعہ کے ساتھ عمر کے مطابق کھیل کود اور شرارتوں کا سلسلہ بھی باقاعدگی سے جاری رہتا تھا۔ میں نے پڑھائی میں شاید کبھی مار نہیں کھائی ہوگی۔ البتہ شرارتوں میں مار پیٹ سے بچ گیا تو ڈانٹ ڈپٹ میں تو کم ہی ناغہ پڑتا ہوگا۔

۶ر جنوری ۲۰۰۸ء — بہاول نگر

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

چھٹا باب:

پہلی ملازمت

فیروز پور کے قریب ایک گاؤں میں ایک بزرگ احمد دین پٹواری سکونت پذیر تھے۔ ان کے ایک ہی بیٹے تھے، جن کا نام برکت علی تھا۔ برکت علی عمر میں مجھ سے کئی سال بڑے تھے اور مجھ پر نگاہِ شفقت رکھتے تھے۔ حصولِ تعلیم کے بعد انھوں نے اے۔ جی آفس (لاہور) میں ملازمت کر لی تھی اور جلد ہی اکاؤنٹس آفیسر ہو گئے تھے۔ ۱۹۴۲ء میں جب میں مروّجہ تعلیم سے فارغ ہوا، وہ ہیڈ سلیمان کی میں بہ حیثیت اکاؤنٹس آفیسر خدمات سرانجام دیتے تھے۔ مجھے انھوں سے اپنے ہاں بلایا اور کہا: آج سے تم یہاں ملازم ہو اور دفتر میں کلرک کے طور پر کام کرو گے۔ وہ خوش مزاج آفیسر تھے اور ان کے چہرے پر مسکراہٹ طاری رہتی تھی۔ صاف ستھرا مگر سادہ لباس پہنتے اور کلّے پر سفید ململ کی پگڑی باندھتے تھے۔ ان کے ماتحت چھوٹے بڑے متعدد لوگ کام کرتے تھے اور وہ سب سے خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔ ہر ملازم ان کے رویے سے خوش تھا اور محنت سے کام کرتا تھا۔

وہ میری طبیعت سے واقف تھے۔ مجھے انھوں نے کہا کہ میں تمھاری ایسی جگہ ڈیوٹی لگانا چاہتا ہوں، جہاں تمھارے مطالعے کا شغل جاری رہے۔ چناں چہ مجھے انھوں نے سٹور کیپر بنا دیا اور سٹور کے ساتھ ہی ایک کمرے میں میز اور دو تین کرسیاں رکھ دی گئیں۔ میرا زیادہ وقت مختلف موضوع کی کتابوں کے مطالعہ میں صرف ہوتا تھا۔ وہاں ایک اونچے گنبد والی شان دار مسجد تھی۔ اس سے چند گز کے فاصلے پر میری رہائش کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ دو کمرے، ان کے آگے برآمدہ، ساتھ ہی باورچی خانہ۔ اس سے ذرا ہٹ کر غسل خانہ۔ کھلا صحن اور چار دیواری۔ پچیس روپے ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی جو اس زمانے میں بہت مناسب تنخواہ تھی۔ اسماعیل نامی ایک

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

بیل دار کو کہہ دیا گیا کہ وہ دفتری اوقات میں میرے ساتھ رہے اور جو شخص سٹور سے ضرورت کی کوئی چیز لے گا یا واپس کرے گا وہ اس بیل دار کو دے گا اور اسی سے لے گا اور میں رجسٹر میں اس کا اندراج کروں گا۔ میری تقرری جمعہ کے دن ہوئی تھی۔ مسجد میں جمعہ پڑھنے گئے تو چودھری برکت علی نے جمعہ پڑھایا۔ چودھری برکت علی اہل حدیث تھے، لیکن وہاں رفع یدین اور آمین بالجہر کی سنت ادا کرنے والا میں اکیلا ہی تھا۔ نمازیوں کی تعداد پچاس کے قریب ہوگی۔

عصر کی نماز کا وقت ہوا تو اس میں بھی اتنے ہی نمازی تھے جتنے جمعہ میں تھے۔ چودھری برکت علی کے کہنے پر عصر کی نماز میں نے پڑھائی اور رفع یدین کی۔ اس کے بعد مغرب اور عشا کی نمازیں بھی میں نے پڑھائیں۔ ایک دو روز ہی میں سب نمازی میرے واقف ہو گئے اور میں نے بھی ان سے تعلق پیدا کر لیا۔ چناں چہ اسی روز عشا کے بعد تین چار آدمی میرے پاس میرے کوارٹر میں آئے اور دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ پھر آہستہ آہستہ میرا ان سے دوستانہ ہو گیا۔

ہیڈ سلیمان کی پرفضا جگہ تھی، جہاں زیادہ تر دفتری لوگ رہتے تھے یا وہاں کام کرنے والے مزدور تھے جن میں اردگرد کے دیہات کے رہنے والے بھی تھے، جو صبح آتے اور شام کو چلے جاتے۔ اور ایسے مزدور بھی تھے جو وہیں خس کی بنی ہوئی جھگیوں میں رہتے تھے۔ ہوٹل اس زمانے میں وہاں نہیں تھا، البتہ دو تین تنور تھے، جن میں عورتیں روٹی اور سالن پکاتی تھیں اور مزدور کھاتے تھے۔ اس طرح بعض لوگوں کی آمدنی کی ایک صورت بنی ہوئی تھی۔ اسماعیل بیل دار کی ماں کا بھی ایک تنور تھا۔

فاضلکا بنگلا، ہیڈ سلیمان کی سے بہ جانب مشرق نو میل کے فاصلے پر تھا۔ موجودہ حساب سے چودہ پندرہ کلومیٹر۔ پکی سڑک تھی جس پر تانگے چلتے تھے۔ ریلوے لائن بھی تھی، جس پر کبھی کبھی مال گاڑی پتھر یا روڑی وغیرہ لے کر آتی تھی۔ دفتر کے لوگوں کی آمد و رفت کے لیے ریلوے کے محکمے کا ٹھیلہ چلتا تھا۔ میں عام طور پر اتوار کے روز ٹھیلے پر فاضلکا چلا جاتا۔ ٹھیلہ چلانے کے لیے دو ٹرینڈ آدمی مقرر تھے۔ وہ دونوں طرف ریل کی لائن پر اسے دھکیلتے جاتے، جب رفتار تیز ہو جاتی تو ان میں سے ایک تیزی سے چھلانگ لگا کر ٹھیلے پر بیٹھ جاتا اور ایک

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

دھکیلتا جاتا۔ پھر دوسرا اسی تیزی سے اتر کر لائن پر آ جاتا اور اس کا ساتھی ٹھیلے پر بیٹھ جاتا۔ کسی وقت ایسا بھی ہوتا کہ دونوں ٹھیلے پر بیٹھ جاتے اور ٹھیلہ خود ہی دوڑتا جاتا۔ یہ ریلوے لائن بنگلہ فاضلکا سے چل کر ہیڈ سلیمان کی پر ختم ہو جاتی ہے۔

ہیڈ سلیمان کی سے دو نہریں گزرتی تھیں۔ ایک منچن آباد کی طرف جاتی تھی۔ دوسری بھی شاید بہاول نگر کے کسی علاقے کی طرف جاتی تھی۔ وہاں مچھلی عام تھی۔ ٹھیکے دار اسے جال لگا کر پکڑتے تھے اور فاضلکا یا دیگر مقامات میں لے جا کر بیچتے تھے۔ میرے لیے اسماعیل بیل دار مچھلی لایا کرتا جسے سٹور میں میرے ساتھ لگایا گیا تھا۔ دریا کی وہ بہترین مچھلی تھی۔ ہم بڑے شوق سے مچھلی پکاتے اور کھاتے۔ ہانڈی روٹی کا سلسلہ اپنے ہاتھ سے چلتا تھا اور اس میں ہمیں کافی مہارت ہو گئی تھی۔

میرے وہاں جانے سے پہلے چودھری برکت علی جمعہ پڑھایا کرتے تھے۔ پانچ وقت کی جماعت بھی بالعموم وہی کراتے تھے لیکن میں گیا تو جمعہ جماعت کا معاملہ میرے سپرد کر دیا گیا۔ فجر کی نماز کے بعد میں نے درسِ قرآن کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ میں نے درس یا خطبۂ جمعہ میں کبھی اختلافی بات نہیں کی۔ اس قسم کی باتیں ضرور کرتا تھا کہ نماز آرام سے پڑھنی چاہیے۔ اس کے ارکان کا خیال رکھنا چاہیے اور رکوع کے بعد کی اور دو سجدوں کے درمیان کی وہ دعائیں پڑھنی چاہئیں جن کے پڑھنے کا نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے۔ عشا کے بعد تقریباً روزانہ دفتر کے دو چار آدمی میرے پاس آتے اور کافی دیر ان سے سلسلۂ گفتگو جاری رہتا۔ اس گفتگو میں بھی میں اختلافی بات کرنے سے گریز کرتا۔ کبھی انبیا علیہم السلام میں سے کسی نبی کا کوئی واقعہ بیان کیا جاتا، کبھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی صحابی کا تذکرہ شروع ہو جاتا۔ کبھی کسی امام یا کسی بزرگ کے واقعات بیان کیے جاتے۔ وہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا جو ستمبر ۱۹۳۹ء سے لے کر جون ۱۹۴۵ء تک (چھ سال) جاری رہی تھی۔ اس جنگ کی باتیں بھی اس مجلس میں کی جاتی تھیں۔ میرے وہاں جانے کے بعد اکثر نمازی رفع یدین بھی کرنے لگے تھے اور آمین کی آواز بھی سنائی دینے لگی تھی۔ میں اسے اپنا کمال قرار نہیں دیتا لیکن یہ ضرور عرض

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کرنے کو جی چاہتا ہے کہ ایک خاموش تبلیغ بھی ہوتی ہے جو اپنا اثر دکھاتی ہے اور میل جول کا ایک طریقہ بھی ہوتا ہے جو صاف دل لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔

دفتر میں زیادہ لوگ داڑھیوں والے تھے۔ ان کے افسر چودھری برکت علی بھی داڑھی والے تھے۔ ایک صاحب جن کا شمار بڑے افسروں میں ہوتا تھا، میل جول میں میرے زیادہ قریب ہو گئے تھے۔ ان کا قد درمیانہ اور بدن کچھ بھرا ہوا تھا۔ لمبی داڑھی پورے چہرے پر پھیلی ہوئی۔ کلے پر عمامہ۔ شلوار ٹخنوں سے اوپر۔ عمر پینتالیس برس کے قریب ہوگی۔ وہ پانچوں نمازیں مسجد میں باجماعت پڑھتے تھے۔ میں جب وہاں گیا وہ رفع یدین نہیں کرتے تھے لیکن میرے جانے کے دو تین روز بعد بعض دوسرے نمازیوں کی طرح وہ بھی رفع یدین کرنے اور آمین بالجہر پکارنے لگے تھے۔ ایک دن نمازِ جمعہ کے بعد دوسرے لوگ تو چلے گئے لیکن وہ بیٹھے رہے۔ میں جانے لگا تو مجھے بھی بٹھالیا۔ پھر چند منٹ کے بعد کہا: آیئے! آج میرے ساتھ کھانا کھایئے۔ پہلے تو میں نے معذرت کی، لیکن ان کا اصرار بڑھا تو ان کے ساتھ چلا گیا۔ انھوں نے جس کمرے میں کھانے کے لیے مجھے بٹھایا، اس کمرے میں دو یا تین الماریوں میں بڑے سلیقے سے کتابیں رکھی تھیں۔ کھانا دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ خاص طور سے تیار کیا گیا ہے۔

افسوس ہے میں ان کا نام بھول گیا ہوں۔ ان کی کتابیں دیکھنے لگا تو انھوں نے بتایا کہ ان کا تعلق بٹالہ (ضلع گورداس پور) سے ہے اور وہ مولانا محمد حسین بٹالوی مرحوم کے بھتیجے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ مطالعہ کے لیے میں کوئی کتاب لینا چاہوں تو لے سکتا ہوں۔ چناں چہ دو تین کتابیں میں نے ان سے لیں اور پڑھ کر واپس کر دیں۔ یہ آج سے ۶۵، ۶۶ سال پہلے ۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ میں نے آٹھ نو مہینے یہ نوکری کی، پھر اپنے وطن کوٹ کپورہ چلا گیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد دو تین دفعہ وہاں سے بس پر گزرنے کا اتفاق ہوا۔ اس پرانے ٹھکانے کو دیکھنے کو جی چاہتا تھا لیکن دیکھ نہیں سکا تھا۔ ۲۰۰۶ء کے نومبر کا مہینا تھا کہ میں اپنی بیٹی سے ملنے بہاول نگر گیا۔ اس کا شوہر میرا ہم نام محمد اسحاق بھٹی ہے اور ماشاء اللہ دو دفعہ حج بیت اللہ کر چکا ہے۔ میری بیٹی سمیہ زیرک بھی اس کے ساتھ حج کر چکی ہے۔ اللہ ان کا حج قبول

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

فرمائے۔ میری بہاول نگر سے واپسی اپنے داماد محمد اسحاق بھٹی کے ساتھ کار پر ہیڈ سلیمان کی کی طرف سے ہوئی۔ اس مسجد کے سامنے کار کھڑی کی، جس میں ہم نماز پڑھا کرتے تھے۔ کار سے اتر کر وہ علاقہ دیکھا۔ اپنا کوارٹر بھی دیکھا جو مسجد سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ وہ سرکاری کوارٹر اسی طرح تھا لیکن اس کی چار دیواری گر چکی تھیں۔ دو تین چار پائیوں پر چند عورتیں اور بچے بیٹھے تھے۔ تین چار بکریاں اور ان کے میمنے تھے۔ دس پندرہ منٹ ہم ادھر اُدھر گھومتے رہے اور پھر وساوے والا اور دیپال پور سے ہوتے ہوئے لاہور آ گئے۔

یہ وہ جگہ تھی جسے چند مہینے رہنے کی وجہ سے دیکھنے کو جی چاہ رہا تھا۔ اس سے اپنے آبائی وطن کے متعلق اندازہ کیجیے جہاں بچپن سے جوانی تک رہا اور جہاں کی گلیوں میں گھوما پھرا، اسے دیکھنے کو دل کس قدر بے تاب ہوگا۔

قیامِ پاکستان کے بعد چودھری برکت علی لاہور آ گئے تھے اور اے۔ جی آفس میں اسی منصب پر فائز ہو گئے تھے۔ اپنے دفتر کی وہ ایک مؤثر شخصیت تھے۔ محکمے کے تمام لوگ ان کا احترام کرتے تھے۔ میری گزارش پر بعض نوجوانوں کو انھوں نے اے۔ جی آفس میں ملازمت دلائی، جن میں مولانا محمد حنیف ندوی کے بیٹے وقار الاسلام بھی شامل تھے۔

لاہور میں چودھری برکت علی نے شادباغ میں مکان بنالیا تھا۔ بھکر کے علاقے میں ان کی زمین تھی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہیں چلے گئے تھے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ چودھری برکت علی کے علاوہ ہیڈ سلیمان کی میں ملازمت کرنے والے بعض دیگر حضرات بھی لاہور آ گئے تھے، جن سے کئی دفعہ میری ملاقات ہوئی، لیکن مولانا محمد حسین بٹالوی کے بھتیجے سے اس کے بعد کبھی ملاقات نہ ہوسکی۔ بہرکیف میں نے پہلی ملازمت ہیڈ سلیمان کی میں کی۔ اس دور کی چھوٹی بڑی باتیں اب تک یاد ہیں اور وہاں کا پورا نقشہ اور ماحول آنکھوں کے سامنے گھوم رہا ہے۔ چودھری برکت علی کی شادی فیروز پور میں مولانا عبیداللہ احرار کی بھانجی سے ہوئی تھی، میں اس شادی میں شامل تھا۔

۷ر جنوری ۲۰۰۸ء　　　　بہاول نگر

❀❀❀❀

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ساتواں باب:

دہلی، آگرہ اور دیگر مقامات کا سفر

انسان زندگی میں بہت سے کام کرتا ہے اور اس کا کاروانِ عمل بے شمار نشیب و فراز سے گزرتا ہے۔ اثنائے راہ میں بعض ایسے موڑ بھی آتے ہیں جو اس کی یادوں کا ایک مستقل باب بن جاتے ہیں اور ہمیشہ کے لیے اس کے ذہن پر نقش ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کی بعض یادیں میرے ذہن پر بھی نقش ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ ان میں سے چند یادوں کو ذہن کی لوح سے اُتار کر کاغذ پر مرتسم کر دیا جائے۔ یہ یادیں زندگی کے طویل سفر کا وہ حصہ ہیں جن کا علم و تحقیق کی وادی سے اگرچہ دور و نزدیک کا کوئی تعلق نہیں ہے، تاہم یادیں تو ہیں، جنھیں ایک مدت سے میں نے اپنے ذہن میں محفوظ کر رکھا ہے۔

میں ہیڈ سلیمان کی میں بہت مطمئن تھا۔ دفتر کے چھوٹے بڑے اہل کاروں سے بھی میرے خوش گوار تعلقات قائم ہو گئے تھے اور وہاں کی مختصر سی آبادی کے لوگوں سے بھی واقفیت ہو گئی تھی، مطالعۂ کتب کا شوق بھی پورا ہو جاتا تھا، نمازی بھی میرا احترام کرتے تھے، حالانکہ ان میں زیادہ تر افراد عمر اور منصب میں مجھ سے بڑے تھے۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ چودھری برکت علی نے جمعہ و جماعت کی خدمت میرے سپرد کر دی تھی اور اپنے طور پر میں نے درس قرآن کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا۔ پھر ایک بات یہ بھی تھی کہ میں کسی اختلافی مسئلے کو موضوعِ بحث نہیں بناتا تھا۔ حالات کے تقاضے کو ملحوظِ خاطر رکھتا تھا۔ اسلام اختلافی مسائل تک ہی محدود نہیں ہے، اس کا دائرۂ عمل بے حد وسیع ہے جو زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہے اور شب و روز کی تگ و دو میں پیش آنے والے تمام امور کی نشان دہی کرتا ہے۔ کہیں اشاروں کے رنگ میں، کہیں وضاحت کی صورت میں۔ کم عمری کے باوجود وہاں گفتگو کرتے وقت میں نے ہمیشہ اس

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

نقطۂ نظر کو سامنے رکھا اور یہ سبق میں نے زمانۂ طالب علمی میں اپنے ان عظیم المرتبت اساتذہ سے سیکھا، جن کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں ''اساتذہ کرام'' کے عنوان سے کیا جاچکا ہے۔

بہر حال میں یہ جگہ چھوڑ کر اپنے گھر چلا گیا۔ ہماری برادری کے بہت سے لوگوں کا تعلق ٹرانسپورٹ سے تھا۔ میرے والد بھی اسی شعبے میں کام کرتے تھے۔ بے کار رہنا تو مشکل تھا، میں بھی اسی کام میں مصروف ہوگیا۔ ہمارے ایک بزرگ حاجی محمد علی تھے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ بس پر لے جاتے تھے۔ چند روز کے بعد انھوں نے مجھے اسٹیرنگ پر بٹھایا۔ پہلے تو میں کچھ گھبرایا۔ پھر انھوں نے کچھ ضروری باتیں بتائیں۔ میں چار مہینے ان کے ساتھ رہا بعض لوگوں نے مجھے کہا کہ تعلیم حاصل کرنے کا کیا فائدہ۔ یہ ڈرائیوری کنڈیکٹری تو جاہل بھی کرتے ہیں اور تم سے بہتر طریقے سے کرتے ہیں۔ ان کی یہ بات بالکل صحیح تھی اور خود مجھے بھی اس کا احساس تھا۔ چنانچہ میں نے اسے اپنا پیشہ نہیں بنایا۔ یہ ایک عارضی سا معاملہ تھا جو کچھ عرصہ چلا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آگے بڑھنے سے پہلے یہاں حاجی محمد علی کا تعارف کرادیا جائے۔

قیامِ پاکستان کے زمانے میں وہ ہمارے ساتھ ہی ہمارے موجودہ گاؤں میں آباد ہوئے اور یہیں انھیں زمین الاٹ ہوئی، لیکن انھوں نے ٹرانسپورٹ کے سلسلے میں سکونت جھنگ میں اختیار کی۔ رشتے داری کی وجہ سے ہمارے گاؤں میں ان کی آمد و رفت رہتی تھی اور ٹرانسپورٹ کے متعلق کام کاج کے لیے وہ لاہور بھی آتے تھے۔ میرے وہ مہربان تھے، اس لیے مجھے ضرور ملتے تھے، بعض دفعہ میرے پاس ہی قیام کرتے تھے۔ پہلا حج انھوں نے ہمارے بچپن کے زمانے میں کیا تھا، جس کا مجھے تھوڑا سا پتا ہے، دوسرا حج پاکستان آنے کے بہت سال بعد سمندری جہاز سے اپنی اہلیہ کے ساتھ کیا۔

ان کی نرینہ اولاد چار بیٹے تھے۔ جھنگ جانے سے تین سال بعد ان کا بڑا بیٹا رضی اللہ فوت ہوا۔ دوسرے بیٹے عطاء اللہ نے عین عالم جوانی میں اس سے کئی سال بعد اچانک وفات پائی۔ سفر حج کے دوران جہاز میں ان کی اہلیہ کا انتقال ہوا اور اس کی میت سمندر کی لہروں کے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

سپرد کی گئی۔ کچھ عرصہ بعد خود بھی ۱۳ / اگست ۱۹۸۵ء کو جھنگ میں وفات پا گئے۔ ان کا ایک بیٹا آغا عبداللہ ہمارے گاؤں میں سکونت پذیر تھا، وہ یہیں فوت ہوا۔ حاجی صاحب کی بیوی کے سوا میں نے سب کے جنازوں میں شرکت کی۔ ان کا سب سے چھوٹا بیٹا سہیل نیّر ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ اسے اور اس کے اہل و عیال کو صحت و عافیت کی نعمت سے نوازے رکھے۔ آمین!

دوسرے حج کے لیے حاجی محمد علی اور ان کے ساتھیوں کا قرعہ نہیں نکلا تھا۔ یہ جنرل ضیاء الحق کا زمانہ تھا۔ حاجی صاحب نے مجھ سے تعاون کے لیے فرمایا۔ میں انھیں اسلام آباد لے گیا۔ اس وقت موجودہ مسلم لیگ (ن) کے رہنما راجا ظفر الحق پاکستان کے وزیر مذہبی امور تھے۔ اس محکمے کے سیکرٹری سے میرے کچھ مراسم تھے۔ میں نے ان سے بات کی۔ انھوں نے حاجی صاحب کی طرف سے خود ہی چند لفظی درخواست لکھی، جس پر حاجی صاحب کے دستخط کرائے اور حج کی اجازت مل گئی۔

اب پھر اسی طرف آتے ہیں، جہاں حاجی صاحب کے تعارف سے پہلے پہنچے تھے۔

وہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا اور محوری طاقتوں یعنی جاپان، اٹلی اور جرمنی وغیرہ کی فوجیں برطانیہ اور اس کے اتحادیوں پر تابڑ توڑ حملے کر رہی تھیں۔ ہندوستان برطانیہ کا مقبوضہ ملک تھا جو شدید خطرے میں تھا۔ ہندوستان میں اس وقت ہوائی اڈے چند ہی شہروں میں تھے۔ آگرہ ایک اہم اور بڑا شہر تھا جو صوبہ یوپی کے وسط میں تھا۔ لیکن وہاں ہوائی اڈا نہیں تھا۔ انگریزی حکومت نے اس شہر میں ہوائی اڈا بنانے کا فیصلہ کیا اور اعلان کیا کہ دریائے چنبل سے آگرہ میں ریت لانے کے لیے ٹرکوں کی ضرورت ہے، اس کا معقول معاوضہ دیا جائے گا، چناں چہ وہاں پنجاب سے ٹرک پہنچنا شروع ہو گئے۔ کوٹ کپورہ کی ٹرانسپورٹ کمیٹی میں ایک ڈرائیور کا نام محمد علی تھا۔ نیک اور نمازی۔ ارائیں برادری سے اس کا تعلق تھا۔ مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے اس نے قرآنِ مجید کا ترجمہ پڑھا تھا۔ میرا وہ گہرا دوست تھا۔ اس کی نیکی کی وجہ سے لوگ اسے ملا جی کہا کرتے تھے۔ اس کی یہ جوانی کی عمر تھی۔ حاجی محمد علی نے مجھے اور محمد علی (ملا) کو آگرہ جانے کے لیے کہا اور نیا ٹرک ہمارے حوالے کیا، جس کا نمبر ۱۱۲ ایف ایس

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

(فرید کوٹ سٹیٹ) تھا۔ ایک اور شخص کو بھی ہمارے ساتھ جانے کے لیے تیار کر دیا۔ وہاں کچھ مدت رہنے کا پروگرام تھا۔ چناں چہ ایک دن ہم صبح کے وقت گھر سے روانہ ہوئے اور ملکسر، ابوہر اور دیگر مقامات سے ہوتے ہوئے ضلع حصار میں داخل ہوئے۔ اس زمانے میں ٹریفک کا یہ سلسلہ نہ تھا جو ہم اب جگہ جگہ دیکھ رہے ہیں۔ کہیں کہیں کوئی بس یا ٹرک دکھائی دیتا تھا۔ حصار کے علاقے کو ''سوتر'' کا علاقہ کہا جاتا تھا۔ اس علاقے میں ایک بڑے پل پر سے ہم گزرے تو پتا چلا کہ اسے ''سوتر کی نالی'' کہا جاتا ہے۔ یہ دراصل دریائے گھاگرا ہے جو خشک ہو چکا تھا اور سوتر والی نالی کے نام سے معروف تھا، یعنی دریا کا نام اس علاقے میں نالی رکھا گیا تھا۔ اس نواح کے ایک گاؤں ''رانیاں'' کے رہنے والے ایک بہت بڑے عالم مولانا نور محمد تھے جو ۱۷۸۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۶۲ء کے پس و پیش فوت ہوئے۔ وہ پنجابی کے مشہور شاعر اور توحید کے معروف مبلغ تھے۔ ان کی پنجابی نظم کی کتابوں میں ایک کتاب کا نام ''شہباز شریعت'' ہے۔ اس کا ایک مصرع ہے:

سوتر والی نالی دے وچ نورؔ چلائے بیڑے

یعنی سوتر کے علاقے کی نالی (دریائے گھاگرا) میں نور محمد نے تبلیغ توحید کی کشتیاں چلائی ہیں، لیکن غلط عقیدے کے لوگ اسے نہیں مانتے۔

ہم اس نالی یعنی دریائے گھاگرا پر دو ڈھائی بجے کے قریب پہنچے۔ وہاں ہم نے گاڑی روکی اور کچھ دیر کھڑے اِدھر اُدھر دیکھتے رہے۔ اب معلوم نہیں اس علاقے کی کیا حالت ہے۔ اس وقت یہ خشک علاقہ اور چاروں طرف ریت کے ٹیلے تھے جو دُور تک پھیلے ہوئے تھے۔ ظہر اور عصر کی نمازیں ہم نے اکٹھی وہاں پڑھیں اور مولانا نور محمد کو یاد کیا، جو تمام عمر اس علاقے میں توحید کی تبلیغ کرتے رہے تھے اور جن کی تبلیغ سے اثر پذیر ہو کر بے شمار لوگ اسلام کی صراطِ مستقیم پر گامزن ہوئے تھے۔

وہاں سے روانہ ہو کر ہم حصار شہر سے گزرتے ہوئے شام کے بعد روہتک پہنچے۔ سڑک سے کچھ فاصلے پر بائیں جانب ایک مسجد کے اونچے مینار پر نظر پڑی۔ پتا چلا کہ یہ روہتک کی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

جامع مسجد ہے۔ پتا نہیں اب کیا صورتِ حال ہے۔ کسی زمانے میں روہتک کی ریوڑی اور متھرا کے پیڑے کی بڑی شہرت تھی۔ ریلوے اسٹیشنوں پر چیزیں بیچنے والے آوازیں دیا کرتے تھے: روہتک کی ریوڑی...... متھرا کا پیڑا۔

جس دور کی میں بات کر رہا ہوں، اس دور میں حصار کا علاقہ سخت قحط کی زد میں تھا اور پنجاب میں شامل تھا۔ تقسیم ملک کے بعد بھی کچھ عرصہ مشرقی پنجاب میں شامل رہا۔ پھر حکومت ہند نے مشرقی پنجاب کے تین صوبے بنا دیے تھے۔ ایک پنجاب، دوسرا ہریانہ اور تیسرا ہماچل پردیش۔ ضلع حصار کو صوبہ ہریانہ میں شامل کر دیا گیا تھا۔

روہتک سے چل کر نو بجے کے قریب ہم دہلی پہنچے۔ دہلی میں داخل ہونے سے پہلے اس شہر کی روشنیاں نظر آئیں تو دل میں مسرت کی ایک لہر اُٹھی۔ اس شہر کو دیکھنے کا بڑا شوق تھا، جس سے مسلمانوں کی تاریخ کا ایک طویل سلسلہ وابستہ تھا جو کئی صدیوں پر مشتمل تھا، حکمرانی کے اعتبار سے بھی، دینی علوم کے اعتبار سے بھی اور شعروادب کے اعتبار سے بھی!

ہم نے سبزی منڈی کے قریب ٹرک کھڑا کیا اور وہاں ایک چھوٹا سا کمرہ کرائے پر لیا۔ تھوڑی دیر بعد شہر کی سیر کو روانہ ہو گئے۔ وہاں رات کا کوئی تصور نہ تھا۔ جدھر دیکھو روشنیوں کا راج اور بجلی کے قمقموں کی بہار! یہ آج سے کم و بیش پینسٹھ سال قبل کی بات ہے، اب تو معاملہ کہیں سے کہیں پہنچ گیا ہوگا۔

ہمارا تیسرا ساتھی ہمارے ساتھ سیر کو نہیں گیا تھا، وہ اکیلا ہی کہیں گیا۔ گیارہ بجے کے قریب ہم واپس آئے تو وہ نہیں آیا تھا۔ دو ڈھائی گھنٹے کے بعد آیا تو اس کے منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی اور وہ بہکی بہکی سی باتیں کر رہا تھا۔ محمد علی (ملا) نے پوچھا:

"تم نے شراب پی ہے؟"

جواب دیا:

"تمھیں اس سے کیا غرض؟ میں جو جی چاہے کروں۔"

محمد علی نے یہ الفاظ سنتے ہی اس کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا اور دھکا دے کر کمرے سے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

باہر نکال دیا۔ رات کا باقی حصہ اس نے باہر گزارا۔ دوسرے دن واپس آ گیا۔

دہلی کے بعض بازاروں اور علاقوں میں ہم نے ''ریل'' چلتے دیکھی، جسے ٹرام کہا جاتا تھا۔ ایک آنہ ٹکٹ تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی تھی۔ لوگ اس پر سوار ہوتے اور اترتے رہتے۔ ایک آنہ کرایہ کم ہی لوگ دیتے ہوں گے۔ ہم بارہ تیرہ دن دہلی رہے اور بہت گھومے پھرے۔

پرانے قلعوں کی سیر:

ایک دن میں پوچھتا پچھاتا صدر بازار جماعت غربائے اہل حدیث کی مسجد میں چلا گیا۔ وہاں مجھے ایک طالب علم عبدالستار ملا جو کوٹ کپورہ کے رہنے والے ایک عالم دین مولانا محمد اسحاق سوتری کا بیٹا تھا اور غربائے اہل حدیث کے مدرسے میں تعلیم حاصل کرتا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ مجھے بھی اس سے مل کر خوشی ہوئی۔ اس نے کہا: میں تمھیں دہلی کی سیر کراؤں گا۔ چناں چہ چلتے چلتے ہم قدیم دور کے بادشاہوں کے قلعوں کی طرف نکل گئے۔ اب تو لازماً وہ صورتِ حال نہیں رہی ہوگی۔ ایک جگہ ہم نے دیکھا کہ آمنے سامنے دور تک پھیلی ہوئی بہت بڑی دو دو منزل کی مضبوط عمارتیں ہیں اور ان کی کھڑکیوں میں بنیانیں اور نیکریں پہنے ہوئے بہت سے گورے رنگ کے لوگ کھڑے ہیں۔ دونوں عمارتوں کے درمیان صاف ستھری چوڑی سڑک ہے۔ یہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ عبدالستار نے بتایا کہ یہ ہندوستان کے خلجی اور تغلق بادشاہوں کے قلعے ہیں، جنھیں لوگ دیکھنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ لیکن اب ان میں انگریزوں نے جرمنی، اٹلی اور جاپان کے ان لوگوں کو قید کر رکھا ہے جو جنگ شروع ہونے کے وقت ہندوستان میں موجود تھے۔ انگریزوں نے مختلف مقامات سے انھیں پکڑا اور ان قلعوں میں لا کر بند کر دیا۔ اس کے علاوہ معلوم نہیں انگریزوں کے ان دشمن ملکوں کے لوگ کہاں کہاں قید ہوں گے...... یاد رہے دوسری جنگ عظیم ستمبر ۱۹۳۹ء میں شروع ہوئی اور چھ سال بعد جون ۱۹۴۵ء کو ختم ہوئی تھی۔

اس سے آگے گئے تو کھنڈروں کی صورت میں بہت سی عمارتوں کے آثار نشیب و فراز میں دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ عبدالستار نے بتایا کہ ان کھنڈروں کے بارے میں کہا جاتا ہے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کہ یہ کورو پانڈوؤں کے زمانے کی عمارتوں کے آثار ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد عبدالستار کے والد مولانا محمد اسحاق سوتری ضلع خوشاب کے ایک گاؤں میں چلے گئے تھے۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔

مدرسہ سعیدیہ:

ایک روز میں نے اور محمد علی نے صبح کی نماز مولانا ابوسعید شرف الدین کے مدرسہ سعیدیہ میں پڑھی۔ یہ مدرسہ پھاٹک حبش خاں میں تھا۔ نماز کے بعد مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم کوٹ کپورہ کے رہنے والے ہیں اور مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے حلقۂ شاگردی سے تعلق رکھتے ہیں۔ کسی زمانے میں مولانا عطاء اللہ حنیف دہلی میں مولانا ممدوح سے اکتسابِ علم کرتے رہے تھے۔

مولانا شرف الدین کا شمار اپنے دور کے جلیل القدر علما و اساتذہ میں ہوتا تھا۔ وہ دراصل گجرات (پنجاب) کے رہنے والے تھے اور طویل عرصے سے دہلی میں مقیم تھے اور پھر دہلوی کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ ان کے شاگردوں کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ وہ قدیم دور کے اصحابِ تحقیق علما کی پُرعظمت نشانی تھے۔ نیاز مندانہ سلام کے بعد ہم نے ان سے اجازت طلب کی تو فرمایا ناشتے کے بعد اجازت ملے گی۔ تھوڑی دیر کے بعد سبز چائے کے ساتھ رات کی رکھی ہوئی روٹی کا ناشتہ آیا۔ انھوں نے بھی ہمارے ساتھ ہی ناشتہ کیا اور فرمایا: میں یہی ناشتہ کیا کرتا ہوں۔ پُرلطف اور لذیذ ناشتہ۔

پرانے بزرگ تکلّفات سے دامن کشاں رہتے تھے۔ جو کچھ میسر آیا، مہمان کے سامنے رکھ دیا، نہ خود پریشان ہوئے نہ کسی کو پریشانی میں مبتلا کیا۔ سادہ زندگی، سادہ معاشرت۔ اخلاص سے بھرپور میل جول۔

انھی دنوں پہلی دفعہ لال قلعہ دیکھا اور جامع مسجد دیکھی۔ یہ دونوں عظیم الشان عمارتیں مغل حکمران شاہ جہاں نے تعمیر کرائی تھیں جو ایک دوسرے کے بالمقابل پورے شکوہ سے کھڑی ہیں اور درمیان میں بہت بڑا میدان ہے۔ ہرے بھرے کا مزار بھی وہیں ہے۔ مولانا ابوالکلام

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

آزادؔ کی وفات کے بعد ان کا مدفن بھی وہی مقام ہوا۔ اب اسے مولانا ابوالکلام آزاد کی طرف منسوب کر کے آزاد پارک کہا جاتا ہے۔

دہلی کا چاندنی چوک بھی اسی وقت دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس بازار کی اصل رونق رات کو اپنا جلوہ دکھاتی ہے، جب لوگ چل پھر کر نوع بہ نوع کی بے شمار چیزیں فروخت کرتے ہیں۔ کسی نے کسی چیز کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھا، بیچنے والا اس طرح اس کے پیچھے پڑ گیا کہ اس سے جان چھڑانا مشکل ہو گیا۔

ان دنوں ہم نے ہمایوں کا مقبرہ بھی دیکھا، جہاں سے ۱۸۵۷ء کے زمانے میں انگریزوں نے بہادر شاہ ظفر اور اس کے بیٹوں کو گرفتار کیا تھا۔ پھر ایک کے سوا سب بیٹوں کو قتل کر دیا گیا تھا۔

ڈولی:

دلّی کا اس زمانے میں عجیب کلچر تھا۔ ایک روز میں اور محمد علی ایک چوڑی سی گلی سے گزر رہے تھے۔ دن کے دس بجے کا وقت ہوگا۔ گلی کی دوسری جانب ایک اور شخص جا رہا تھا۔ اس نے ہندوؤں کی طرح دھوتی باندھی ہوئی تھی، جس سے ہمیں اندازہ ہوا کہ یہ ہندو ہے۔ پیچھے سے آواز آئی: ڈولی...... پھر یہی آواز کانوں سے ٹکرائی، ڈولی...... تین چار دفعہ یہ آواز ہم نے سنی۔ لیکن نہ ہم نے پیچھے گردن گھما کر دیکھا اور نہ یہ پتا چلا کہ ڈولی کا کیا مطلب ہے۔ اتنے میں اس ہندو نے ہمیں آواز دی، ''آپ نے سنا نہیں، پیچھے سے ڈولی کی آواز آ رہی ہے۔ دوسری طرف منہ کر لیں۔'' یہ کہہ کر فوراً ہی وہ گلی کی طرف پیٹھ اور دیوار کی جانب منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ ہم نے دیکھا کہ پیچھے سے واقعی ڈولی آ رہی ہے، یعنی دو آدمی کسی چیز کو اُٹھائے آ رہے ہیں، جس کے چاروں طرف لکڑی کے اوپر کپڑا باندھا ہوا ہے۔

ڈولی آگے نکل گئی تو وہ شخص ہمارے قریب آیا اور کہا آپ پنجاب کے رہنے والے ہیں؟ ہم نے اثبات میں جواب دیا تو اس نے کہا کہ یہ لڑکی کسی مسلمان شریف گھرانے کی بہو بیٹی ہے، جسے اس کے دو بھائی یا بھانجے بھتیجے ڈولی میں بٹھا کر تا کہ پردہ رہے، اپنے کسی عزیز کے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

گھر لے جارہے ہیں، اسے ڈولی کہا جاتا ہے۔ جب ڈولی کی آواز سنو تو منھ دوسری طرف کر لینا چاہیے۔

دلّی کے بعض گھرانوں میں اس وقت بہو بیٹی کے پردے کا اتنا اہتمام کیا جاتا تھا۔ وہ برقعے میں بھی پیدل نہیں چلتی تھیں۔ کہیں جانا ضروری ہوتا تو ڈولی میں بیٹھ کر جاتی تھیں، اور پھر غیر مسلم بھی ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ یہ تقسیم ملک سے صرف پانچ سال پہلے کی بات ہے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے، وہ سب کو معلوم ہے۔ غیر مسلموں کو چھوڑیے، مسلمانوں کے دلوں میں مسلمان خواتین کا احترام ختم ہو چکا ہے۔ اور خود خواتین نے بھی اپنی حرکتوں سے لوگوں کے دلوں سے اپنا احترام ختم کرا دیا ہے۔

اب آگرہ کا سفر:

چند روز دہلی میں قیام کے بعد ہم آگرہ کو روانہ ہوئے جو ہماری اصل منزل تھا۔ اُس وقت کی پیمائش کے مطابق دہلی سے آگرہ ایک سو پچیس میل کے فاصلے پر تھا۔ پچیس میل متھرا اور اس سے سو میل آگے آگرہ۔ متھرا پہنچے تو دریاے گنگا کے درشن کیے۔ اب مجھے مولانا ظفر علی خاں کے شعر یاد آ رہے ہیں جو انھوں نے شدھی کی تحریک کے زمانے میں ۸/ جنوری ۱۹۲۷ء کو پنڈت مدن موہن مالویہ کے بارے میں کہے تھے۔ یہ اشعار مولانا ظفر علی خاں کی کتاب ''بہارستان'' کے صفحہ ۳۷۱، ۳۷۲ پر درج ہیں۔

کوئی مالوی جی سے جا کر یہ کہہ دے ستائے ہوؤں کو اگر تم نے چھیڑا
تو نکلے گا بے اختیار اُن کے منھ سے کرو غرق گنگا میں شدھی کا بیڑا
انھیں پائیں گے بور کے آپ لڈو جنھیں آپ سمجھے ہیں متھرا کا پیڑا
سلاؤ گے جاتی کی چولی کو کس سے اگر ہم نے ایک ایک ٹانکا ادھیڑا
کدال ایک لائیں گے اچھی سی ہم بھی گڑا کوئی مردہ جو تم نے اکھیڑا
جہاں گیریٔ دین برحق کی زد سے بچے گا نہ بھارت کا کوئی بھی کھیڑا

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ہیں ہم تم سے خوش اور ہمارا خدا خوش
اگر چھوڑ دو سنگھٹن کا بکھیڑا

متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں اور ہندوؤں میں اس قسم کی بحثیں چلتی رہتی تھیں، جنھیں لوگ دلچسپی سے پڑھتے تھے۔

اب ان اشعار کے بارے میں تھوڑی سی تفصیل!

پہلی جنگ عظیم کے بعد (جو جولائی ۱۹۱۴ء میں شروع اور اکتوبر ۱۹۱۸ء کو ختم ہوئی) برصغیر کی آزادی کے لیے ہندو مسلم اتحاد کی ایک خوش گوار فضا پیدا ہوگئی تھی۔ اس وقت آزادیٔ وطن کے لیے جو لوگ گرفتار ہوئے ان میں ایک مشہور آریہ سماجی رہنما منشی رام بھی تھے، جنھیں ہندو مسلم اتحاد کا حامی سمجھا جاتا تھا۔ انگریزی حکومت اس اتحاد کو برداشت نہ کرسکتی تھی، چناں چہ اس نے اپنے ذرائع سے جیل میں منشی رام سے بات کی اور انھیں اس شرط پر رہا کردیا گیا کہ وہ ملک میں ”شدھی“ کا سلسلہ شروع کریں، یعنی مسلمانوں کو جبراً ہندو بنانے کی تحریک چلائیں۔ اب انھوں نے اپنا نام منشی رام کے بجائے سوامی شردھانند رکھا اور شدھی کی تحریک شروع کردی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۳ دسمبر ۱۹۲۶ء کو ایک ۴۵ سالہ شخص عبدالرشید نے دہلی میں ان کے گھر جاکر انھیں پستول کی گولی کا نشانہ بنایا اور وہ اسی وقت مرگئے۔ اس پر ملک میں ہنگامہ بپا ہوگیا۔ پنڈت مدن موہن مالویہ بھی میدان میں اتر آئے۔ لالہ لاجپت رائے کے اخبار ”بندے ماترم“ کی اشاعت ۶ رجنوری ۱۹۲۷ء میں ایک ہندو کی حسب ذیل نظم شائع ہوئی:

کون کہتا ہے سوامی مرگئے، ہرگز نہیں — موت کے پردہ میں مرنا اک بہانہ ہوگیا
ورنہ کرنے کے لیے شدھی گئے افلاک پر — اہل جنت کی بھی شدھی کا بہانہ ہوگیا
جنت الفردوس میں شدھی کی لہریں دیکھیو — کھل گیا رستہ ادھر کا آنا جانا ہوگیا
چرخِ ہفتم پر بھی آخر گڑ گئے شدھی کے کیمپ — واں بھی استادہ ہمارا شامیانہ ہوگیا
نت نئی ہوکر مرتب ہوجائے گی شدھی کی فوج — قافلہ سالار پہلے ہی روانہ ہوگیا

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

عاصی جنت والے بھی ہندو بنائے جائیں گے
سوامی شردھا نند کا واں بھی گھرانہ ہوگیا

مولانا ظفر علی خان کے جو اشعار پہلے درج کیے گئے ہیں وہ انھوں نے اخبار ''بندے ماترم'' کے انھی اشعار کے جواب میں سپردِ قلم کیے تھے۔

اب آگے چلیے!

ہندوستان میں متھرا اسی طرح ہندوؤں کے مندروں کا شہر ہے، جس طرح پاکستان میں ننکانہ صاحب سکھوں کے گوردواروں کا شہر ہے۔ دریائے گنگا متھرا کے قریب سے گزرتا ہے۔ ہندوؤں کے نزدیک یہ اس قدر پاک دریا ہے اور اس کا پانی اتنا پوتر ہے کہ اس میں نہانے والا بلکہ اس کے درشن کرنے والا بھی نجات کا مستحق ہو جاتا ہے۔ غور فرمایے ہندو مذہب میں نجات کا یہ کتنا آسان نسخہ ہے۔

آگرہ شہر سے چھ سات میل پہلے سڑک کے قریب ایک مقام سکندرہ ہے، جہاں تیسرا مغل حکمران جلال الدین اکبر مدفون ہے۔ ہم نے وہاں ٹرک روکا اور جلال الدین اکبر کی قبر پر گئے۔ بے شک یہ عمارت خاصے رقبے میں پھیلی ہوئی ہے اور بارعب عمارت ہے۔ کافی لوگ وہاں موجود تھے، لیکن سچی بات یہ ہے کہ میرے لیے وہاں ٹھہرنا اور اکبر کے مدفن کو گھوم پھر کر دیکھنا سخت مشکل تھا۔ جی چاہتا تھا کہ یہاں سے جلدی سے نکلیں اور آگے چلیں۔ چناں چہ چند منٹ کے بعد ہم وہاں سے آگرہ شہر کو روانہ ہو گئے جو سامنے دکھائی دے رہا تھا۔

آگرہ کے جس محلے یا علاقے میں ہم گئے، اس کا نام نصیر آباد تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے اس محلے میں کسی بزرگ کی قبر تھی، جہاں نذر و نیاز وغیرہ کے سلسلے میں لوگوں کا آنا جانا رہتا تھا۔ اسی علاقے میں وہ ٹرک کھڑے تھے جو پنجاب سے گئے تھے۔ ہمارا قیام بھی وہیں تھا۔ وہاں ہماری ملاقات ہمارے ایک رشتے دار خوشی محمد سے ہوئی جو کچھ مدت سے وہاں مقیم تھے اور ہمارے رشتے دار تھے۔ ملنسار اور خوش مزاج آدمی تھے۔ انھیں مستری خوشی محمد کہا جاتا تھا اور ''مستری'' کا اطلاق اس پیشے میں اس وقت موٹر مکینک پر ہوتا تھا۔ چوں کہ وہ جنگ کا زمانہ تھا، اس لیے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

امریکی فوجی بھی وہاں خاصی تعداد میں تھے۔ امریکی عورتیں بھی ان کے ساتھ تھیں جو اپنے خاص وطنی لباس میں ملبوس تھیں۔ اس لباس اور تہذیب کا ہمیں زندگی میں پہلی دفعہ پتا چلا تھا اور اس سے نہایت متعجب ہوئے۔ اب تو سابق فوجی حکمران پرویز مشرف کی روشن خیالی کی تبلیغی کوششوں سے ہمارے اسلامی ملک کا تقریباً ہر فرد اس تہذیب سے آشنا ہو گیا ہے اور اس کے برگ و بار ہمارے معاشرے میں روز بروز توانا سے توانا تر ہوتے جا رہے ہیں۔

دریائے چنبل جہاں سے ریت لانا مقصود تھا، آگرہ سے پینسٹھ میل اور دھول پور شہر سے پانچ میل آگے تھا۔ (آج کل کے حساب سے تقریباً ایک سو کلومیٹر) یہ سڑک گوالیار سے ہوتی ہوئی بمبئی جاتی ہے۔ ہم اس نواح سے ناواقف تھے، اس لیے مستری خوشی محمد نے ہمیں کچھ باتیں سمجھائیں، ٹرک پر ریت لادنے اور اتارنے کے لیے پانچ چھ مزدوروں سے کہا اور دن کے ایک بجے کے قریب ہم آگرہ سے دھول پور کو روانہ ہوئے۔ ہماری ناواقفیت کی وجہ سے پہلے دن خوشی محمد صاحب خود ہمارے ساتھ گئے۔

اب اس سڑک اور علاقے کی تھوڑی سی کیفیت ملاحظہ ہو: آگرہ اس وقت آبادی اور حجم کے اعتبار سے درمیانے درجے کا شہر تھا۔ جس سڑک پر ہم دھول پور اور اس سے آگے دریائے چنبل کو جا رہے تھے، وہ تارکول کی سڑک نہیں تھی بلکہ چھوٹے چھوٹے سفید روڑوں کی بنی ہوئی پکی سڑک تھی۔ زیادہ چوڑی بھی نہیں تھی۔ اس پر آمد و رفت بہت کم تھی۔ آگرہ سے تیرہ میل آگے ایک قصبہ نما گاؤں آتا تھا، جس کا نام ''تہیرہ'' تھا۔ وہاں سڑک پر بے شمار درخت تھے اور ہر درخت پر چھوٹے بڑے بہت سے بندر بیٹھے تھے۔ چند دکانیں بھی تھیں۔ اس سے آگے پچاس میل کے لگ بھگ دھول پور ہے۔ تہیرہ سے دھول پور تک اس وقت سڑک کے اردگرد کوئی گاؤں تھا نہ درخت تھے۔ دونوں طرف خشک زمین تھی۔ تہیرہ اور دھول پور کے وسط میں سڑک کے بائیں جانب تین چار فرلانگ کے فاصلے پر ایک خاصا اونچا خشک پہاڑ تھا۔ پچیس چھبیس برس پہلے میں ایک مرتبہ کراچی سے حیدر آباد بذریعہ سڑک آیا تھا۔ یہ تقریباً سو میل کا سفر تھا۔ راستے میں بائیں جانب دو چار ہوٹل تھے، جہاں ٹرک

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کھڑے تھے، ہماری بس بھی وہاں رکی تھی اور ہم نے وہاں چائے پی تھی۔ ممکن ہے سڑک سے دور کہیں آبادی ہو، لیکن مجھے نظر نہیں آئی۔ یہ ماحول دیکھ کر آگرہ سے دھول پور تک کا وہ ماحول میری نظروں کے سامنے آ گیا، جس سے ۱۹۴۳ء میں کچھ عرصہ ہم گزرتے رہے تھے۔ اب تو یقیناً صورتِ حال بدل گئی ہوگی۔

آگرہ سے دھول پور کو جاتے ہوئے دائیں جانب تقریباً پندرہ میل کے فاصلے پر درختوں کے جھنڈ میں دو بڑی بڑی سرائیں تھیں، جو سرخ رنگ کی چھوٹی اینٹوں کی بنی ہوئی تھیں۔ وہاں پانی کے نل بھی تھے اور کچھ لوگ بھی بیٹھے تھے جو مسافر معلوم ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک سرائے میں ایک بارات بیٹھی ہوئی دیکھی۔ ہم وہاں تھوڑی دیر رکے۔ دولھا پانچ چھ سال کا ہوگا۔ ہم نے اس سے ہاتھ ملائے۔ معلوم ہوا کہ ادھر اس عمر کی شادیوں کا عام رواج ہے۔ بعض لوگوں نے بتایا کہ یہ سرائیں مسافروں کے آرام کے لیے مغل حکمرانوں نے تعمیر کرائی تھیں۔ دھول پور سے آگے دو اونچے سرسبز پہاڑوں کے بیچ میں سے سڑک نکالی گئی تھی اور دریائے چنبل کو عبور کرنے کے لیے کشتیوں کا پل بنایا گیا تھا، جو سڑک سے کافی ڈھلوان میں تھا۔ ہم اونچائی سے نہایت احتیاط سے نیچے کو پل پر اُترے۔ ٹرک پل پر چلنے لگا تو کشتیاں ہچکولے کھانے لگیں۔ پل تقریباً ایک فرلانگ کا ہوگا۔ آگے بڑھے تو خشکی میں بہت سے ٹرک کھڑے تھے جو زیادہ تر پنجاب سے آئے تھے۔ یہ دریائے چنبل کا خشک کنارہ تھا اور یہیں سے ٹرک پر ریت بھرا جاتا تھا جو آگرہ میں زیرِ تعمیر ہوائی اڈے پر سیمنٹ میں ملانے کے لیے لایا جاتا تھا۔

یہ جنگ کا زمانہ تھا اور کشتیوں کا یہ پل دراصل فوجی گاڑیوں کے لیے بنایا گیا تھا جو گوالیار اور بمبئی وغیرہ شہروں سے آگرہ آتی تھیں۔ اس پر خالی گاڑیاں گزر سکتی تھیں، بھری ہوئی گاڑیوں کا راستہ اور تھا۔ اس کے لیے دریائے چنبل سے پانچ چھ میل آگے جا کر دوسری سڑک پر آنا پڑتا تھا۔ اس سڑک پر ریل کا پل تھا جو دو فرلانگ سے زیادہ لمبا ہوگا اور یہ بہت خطرناک راستہ تھا۔ اوپر سے چھتا ہوا تھا اور دونوں طرف لوہے کی مضبوط دیواریں بنی ہوئی تھیں۔ یہاں

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

سے بمبئی ایکسپریس گزرتی تھی جو لاہور سے چلتی اور براستہ دہلی اور آگرہ بمبئی پہنچتی تھی۔ بس اور ٹرک کا ایک پہیہ ریل کی دو لائینوں کے درمیان ہوتا تھا اور ایک پہیہ لائن کے دوسری طرف۔ خطرہ رہتا تھا کہ ٹرک کا پہیہ دو چار انچ بھی پھسل گیا تو لائن کے ساتھ جا لگے گا اور ٹائر پھٹ جائے گا۔ پھر پیچھے آنے والی تمام ٹریفک رُک جائے گی۔ اگر اس اثنا میں کسی طرف سے ٹرین آ جائے تو معاملہ بگڑ جانے کا خطرہ۔

اس پل پر زیادہ تر ٹرینوں کی آمد و رفت رہتی تھی۔ عام ٹریفک کے لیے یہ بہت محدود وقت کے لیے کھلتا تھا۔ پل سے گزر کر تین چار میل آگے دھول پور شہر آ جاتا تھا اور یہاں سے کچھ کھا پی کر لوگ آگرہ کو چل پڑتے تھے۔

قیامِ آگرہ کے زمانے کی چند اور باتیں:

۱: ہم روزانہ آگرہ سے براستہ دھول پور ریت لینے کے لیے دریائے چنبل پر جاتے تھے۔ اسی علاقے میں ''ساموں گڑھ'' ہے، جہاں پانچویں مغل حکمران شہاب الدین محمد شاہ جہاں کی زندگی میں اس کے دو بیٹوں دارا شکوہ اور اورنگ زیب عالم گیر کے درمیان تخت نشینی کے مسئلے پر جنگ ہوئی تھی۔ دارا شکوہ شکست کھا کر فرار ہو گیا تھا اور فتح اورنگ زیب عالم گیر کے حصے میں آئی تھی۔ یہ واقعہ مئی ۱۶۵۸ء میں پیش آیا تھا۔

۲: پہلی رات ہمیں دریائے چنبل پر آئی تو آدھی رات کو شیروں کے دھاڑنے اور مختلف قسم کے جنگلی جانوروں اور درندوں کی آوازیں آنے لگیں۔ معلوم ہوا کہ یہ آوازیں ایک جنگل سے آ رہی ہیں جو یہاں سے کئی میل کے فاصلے پر ہے۔

۳: چند سال پیشتر ہندوستان کے اخبارات میں ڈاکوؤں کے ایک گروہ کی دہشت گردی اور قتل و غارت کی خبریں تسلسل کے ساتھ آتی رہی تھیں، اس گروہ میں شامل ایک عورت پھولاں دیوی کا تذکرہ بھی ہوتا رہا۔ اس گروہ کا اصل ٹھکانا یہی دریائے چنبل کے اردگرد کا علاقہ تھا ڈاکو ملک کے مختلف مقامات میں واردات کر کے یہاں آ جاتے تھے۔ یہ ان کی پناہ گاہ تھی۔ بعد میں پھولاں دیوی ہندوستان کی پارلیمنٹ کی رکن منتخب ہوئی اور پھر

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

اسے کسی نے قتل کر دیا تھا۔

۴: دھول پور راجپوت ریاست تھی۔ صاف ستھرا شہر اور کھلے بازار۔ پوری ریاست میں کسی جانور کے شکار کی اجازت نہ تھی۔ کسی سے بلی بھی مر جاتی تو اسے ریاست کے قانون کے مطابق سزا دی جاتی تھی۔ ہم نے دھول پور کے کسی ہوٹل میں روٹی نہیں دیکھی۔ ہوٹلوں پر کھانے کے لیے حلوہ پوری ملتا تھا یا مٹھائی۔ حلوائیوں کی دکانوں پر لسی اور دودھ کی فراوانی تھی۔

دھول پور میں مسلمان بھی خاصی تعداد میں آباد تھے۔ جماعت اہل حدیث کی بھی وہاں مسجد تھی، جس میں دینی مدرسہ بھی جاری تھا۔ تدریس وخطابت کے فرائض پنجاب کے ایک عالم دین مولانا عبدالمجید دینانگری سرانجام دیتے تھے جو قیامِ پاکستان کے بعد ایک عرصے تک جہلم کی جامع مسجد اہل حدیث کے منصب خطابت و تدریس پر فائز رہے۔ دھول پور میں ان سے جن حضرات نے تحصیل علم کی ان میں ہمارے ایک دوست پروفیسر مبارک علی بھی شامل تھے جو آزادیٔ ملک کے بعد دارالعلوم تقویۃ الاسلام لاہور میں علم حاصل کرتے رہے۔ کراچی یونیورسٹی لائبریری میں لائبریرین کا منصب ان کے سپرد تھا۔ ان کی تحقیق کا دائرہ بڑا وسیع تھا۔ مشہور مقالہ نگار اور مصنف تھے۔ جماعت اہل حدیث کے خلاف جب کسی نے کچھ لکھا، اس کا انھوں نے محققانہ انداز میں پورے زور سے جواب دیا۔ مرحوم نیک طینت اور خوش کردار عالم تھے۔

۵: دریائے چنبل سے ریت لے کر دن کے تین بجے کے پس وپیش تمام ٹرک اکٹھے روانہ ہوتے تھے اور سورج غروب ہونے کے قریب دھول پور پہنچتے تھے۔ یہاں سے آگرہ کو چل پڑتے تھے۔ ایک دن حسب معمول دھول پور آئے تو دھول پور ریاست کی پولیس نے پنجاب کے ٹرک وہاں روک لیے۔ پتا چلا کہ آج مہاراجا دھول پور کی بہن کی شادی مہاراجا نابھہ کے بھائی سے ہو رہی ہے اور بارات آنے والی ہے۔ ریاست نابھہ چوں کہ پنجاب میں ہے، اس لیے رواج کے مطابق پنجاب کے لوگوں کو دھول پور کے داماد قرار دیا گیا اور رات کے نو بجے جب شاہی محل میں بارات کو کھانا دیا گیا تو پنجاب کے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ان لوگوں کو بھی جو دھول پور میں موجود تھے وہی کھانا پہنچایا گیا اور اگر کسی پنجابی نے اس دن شہر کی کسی دکان سے کوئی چیز لی تو اس کی قیمت نہیں وصول کی گئی، کیوں کہ وہ وہاں کا داماد ہے اور داماد سے پیسے نہیں لیے جاتے۔ کھانا تقسیم کرنے والے لوگ نو بجے کے قریب آئے اور سب پنجابیوں کو بڑے احترام سے مٹھائی کے ڈبے دیے، اور جس طرح اس زمانے میں لڑکی والے کھانے کے دوران کہا کرتے تھے کہ ہم غریب لوگ ہیں اور معذرت خواہ ہیں کہ آپ کی شان کے مطابق آپ کی خدمت نہیں کر سکے، مٹھائی تقسیم کرنے والوں نے بھی ہر ایک سے اسی قسم کے الفاظ کہے۔

۶: ایک دن شام کے بعد دھول پور سے ہم آگرہ کو جا رہے تھے۔ دیکھا کہ ایک جگہ سڑک کے کنارے کچھ لوگ بیٹھے لکڑیاں جلا رہے ہیں۔ ہم نے ٹرک روکا کہ دیکھیں یہ کون لوگ ہیں جو اس وقت یہاں بیٹھے ہیں۔ نیچے اُترے تو وہ ہیجڑے تھے جو کہیں سے آئے تھے اور وہاں کھانا تیار کر رہے تھے۔ بالکل وہی انداز، اسی قسم کی باتیں، اسی قسم کا لہجہ، وہی چال ڈھال جو پنجاب کے ہیجڑوں کی ہے۔ فرق صرف یہ تھا کہ پنجاب کے ہیجڑے پنجابی بولتے ہیں اور وہ اُردو بولتے تھے۔ پتا چلا کہ ہیجڑا کلچر سب جگہ ایک سا ہے۔ پنجابیوں کو وہاں سردار کہہ کر پکارا جاتا تھا، ہیجڑوں نے ہمیں اپنے خاص لہجے میں کمریں ہلاتے ہوئے کہا: ''آؤ سردار...... کھانا حاضر ہے۔'' ہم نے شکریہ ادا کیا اور آگے چل پڑے۔

۷: آگرہ جانے کے بعد پہلا جمعہ وہاں کی جامع مسجد میں پڑھا۔ بہت بڑی اور مضبوط مسجد۔ پتا چلا کہ یہ مسجد چھٹے مغل حکمران اورنگ زیب عالم گیر کی بیٹی شہزادی زیب النساء نے تعمیر کرائی تھی۔ نمازیوں سے بھری ہوئی۔ بڑے دروازے کی چھت پر شہد کی بڑی مکھیوں کے دو چھتے لگے ہوئے تھے۔ امام نے سلام پھیرا تو فوراً اعلان ہوا کہ نمازی تشریف رکھیں۔ پنڈت عبدالرحیم تقریر فرمائیں گے۔ ان کی تقریر غور سے سنیے!

تعجب ہوا کہ مقرر پنڈت بھی ہیں اور عبدالرحیم بھی ہیں۔ اب پنڈت جی تقریر کے لیے کھڑے ہوئے۔ گورا رنگ، چھریرا بدن، داڑھی کے کچھ بال سیاہ اور کچھ سفید۔ کلے پر سفید

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

عمامہ۔ شلوار اور کوٹ پہنے ہوئے۔ تقریر شروع ہوئی تو پتا چلا کہ وہ آریہ سماجی پنڈت تھے۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری کے ساتھ مختلف اوقات میں ان کی گفتگو بھی ہوئی اور تحریری مقابلے بھی ہوئے۔ پھر ایک وقت آیا کہ مولانا کے دلائل سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ انھیں پہلے چوں کہ پنڈت کہا جاتا تھا، اسلام قبول کرنے کے بعد بھی یہ لفظ ان کے ساتھ رہا۔ انھوں نے اپنا پہلا نام بھی بتایا تھا جو مجھے یاد نہیں رہا۔ آگرہ کی جامع مسجد میں مولانا ثناء اللہ امرتسری کا اسم گرامی سن کر نہایت مسرت ہوئی۔ تقریر کے بعد لوگوں نے پنڈت عبدالرحیم سے دعا سلام کی، ہم نے بھی ان سے مصافحہ کیا۔

۸: آگرہ کے زمانۂ قیام میں ہم کئی دفعہ تاج محل گئے۔ شان دار عمارت۔ مغلوں نے برصغیر پر تین سو سال سے زیادہ عرصہ حکومت کی۔ اس طویل دورِ حکمرانی میں انھوں نے اس خطے کے مختلف مقامات میں قلعوں، باغوں، مسجدوں، سراؤں اور سیر گاہوں کی صورت میں بے شمار عمارتیں بنوائیں جو پائداری، استحکام اور خوب صورتی کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہیں۔ تاج محل کو طرزِ تعمیر اور خوب صورتی میں منفرد مقام حاصل ہے اور وہ دنیا کے سات عجائبات میں شامل ہے۔ سفید سنگ مرمر کی اس عمارت کو دیکھنے کے لیے روزانہ لاتعداد لوگ آتے ہیں۔ اس کے سامنے کے کھلے میدان میں صبح سے شام تک مزدور اس عمارت کے سلسلے کا کوئی نہ کوئی کام کرتے رہتے تھے۔ کشادہ سیڑھیوں سے چڑھتے ہوئے لوگ اپنے دونوں ہاتھ دیواروں پر لگاتے جاتے، جس کی وجہ سے دیواروں کے یہ حصے کچھ سیاہ ہو گئے تھے، لیکن مزدور تین چار روز کے بعد اس سیاہی کو کسی ایسی چیز سے دھو دیتے، جس سے سیاہی کے آثار ختم یا کم ہو جاتے۔

ایک دن ہم تاج محل گئے تو وہاں ایک شخص جو شلوار قمیص پہنے ہوئے تھا، اپنے تین چار بچوں کے ساتھ گھوم رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک خاتون تھی، جس نے اس زمانے کے رواج کے مطابق ٹوپی والا سفید برقع پہن رکھا تھا۔ مجھے ان کے لباس سے اندازہ ہوا کہ یہ پنجابی فیملی ہے۔ چناں چہ میں نے اس شخص کو سلام کیا اور علاقے کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

وہ لاہور کے رہنے والے ہیں۔ مجھے خوشی ہوئی کہ یہ ہمارے پنجابی بھائی ہیں۔

ایک روز ہم وہاں گئے تو دیکھا کہ پولیس ایک امریکی مرد اور امریکی لڑکی کو پکڑ کر لے جارہی ہے۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ انھوں نے یہاں بے حیائی کا مظاہرہ کیا اور پولیس کو اطلاع ہوئی تو انھیں گرفتار کرلیا گیا۔

۹: تاج محل سے کچھ فاصلے پر اکبر کا قلعہ ہے۔ طویل وعریض رقبے پر محیط۔ خوف ناک قلعہ اور بہت بڑا ہیبت ناک اس کا دروازہ۔ ہم نے قلعے کے ہر حصے کو دیکھا اور اس عہد کی تاریخ بہت سے گوشوں کے ساتھ نظروں کے سامنے گھوم گئی۔ اسی قلعے میں اکبر کی رہائش، اسی میں اس کا تخت وتاج، اسی میں اس کے نورتنوں اور وزیروں کے دفاتر، اسی میں جیل، اسی میں مہمان خانے۔ اکبر کے مذہبی پہلوؤں سے تو کسی صحیح العقیدہ مسلمان کو اتفاق نہیں ہوسکتا، لیکن اس کی تعمیر کرائی ہوئی عمارتیں بڑی اہم ہیں۔

۱۰: اکبر کے قلعے سے ٹھیک اکیس میل کے فاصلے پر فتح پور سیکری ہے۔ ایک روز ہم وہاں بھی گئے۔ آگرہ سے فتح پور سیکری جائیں تو اس وقت بائیں جانب ہر میل پر ایک برج تھا جو سطح زمین سے آٹھ دس فٹ اونچا تھا اور اتنا چوڑا کہ اس پر تین چار آدمی آسانی سے کھڑے ہوسکیں۔ ان برجوں کی وجہ یہ بتائی گئی کہ جب بادشاہ کا آگرے سے فتح پور سیکری یا فتح پور سیکری سے آگرہ جانے کا پروگرام ہوتا تو اکیس برجوں پر دو دو آدمی کھڑے کردیے جاتے تھے۔ پہلے برج کے آدمی زور سے نقارہ بجاتے، اس کی آواز دوسرے برج والوں تک پہنچتی تو وہ نقارہ بجاتے، اس طرح چند لمحوں میں یہ آواز آخری برج والوں تک پہنچ جاتی اور لوگوں کو معلوم ہوجاتا کہ بادشاہ آرہا ہے۔

فتح پور سیکری میں اس وقت کئی شاہی محل تھے اور بہت سی خوب صورت عمارتیں۔ بارونق مقام۔ ہر چیز وہاں مل سکتی تھی۔ حلوائیوں کی بہت سی دکانیں تھیں۔ ڈالڈا گھی کو تو اس زمانے میں کوئی نہیں جانتا تھا، دیسی گھی چلتا تھا۔ جلیبیاں تین یا چار آنے کی سیر ملتی تھیں۔ ہم نے وہاں گرم گرم جلیبیاں کھائیں۔ موٹے بان کی چوکھٹا بنی ہوئی بانس کی چارپائی ایک روپیہ چار

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

آنے میں خریدی اور ٹرک میں رکھی۔ چلتے چلتے راستے میں جہاں نیند آتی، اس چارپائی پر سو جاتے۔ آگرہ اور فتح پور سیکری کے راستے میں بے شمار درخت تھے اور ہر درخت پر بندروں کی بہتات۔

۱۱: ایک دن گیارہ بجے کے قریب ہم دھول پور سے چلے۔ تین بجے ہوں گے کہ تیہرہ سے دو میل ادھر گاڑی خراب ہوگئی۔ بہت کوشش کی لیکن ٹھیک نہ ہوئی۔ جو پرزہ ٹوٹ گیا تھا، وہ آگرہ سے ہی مل سکتا تھا۔ میرے ساتھی محمد علی اسے لینے کے لیے پیچھے سے آنے والے ٹرک پر بیٹھے جو آگرہ کو جارہا تھا۔ جہاں گاڑی خراب ہوئی تھی، وہاں چھوٹی سی نہر چلتی تھی، صاف ستھرا پانی۔ اردگرد جنگل۔ میں سفید کھدر کا کرتا اور پاجامہ لے گیا تھا تاکہ کام کاج سے فارغ ہوکر کہیں سیر وغیرہ کے لیے جاتے وقت اسے پہن لیا جائے۔ محمد علی گاڑی کا پرزہ لینے کے لیے آگرہ کو روانہ ہوا تو میں نے نہر میں غسل کیا، کرتا پاجامہ پہنا اور عصر کی نماز پڑھی۔ ادھر ادھر نظر دوڑائی تو دیکھا کہ تقریباً ڈیڑھ فرلانگ پر ایک کٹیا سی ہے اور وہاں ایک آدمی بیٹھا ہے۔ میں وقت گزارنے کے لیے ادھر کو چل پڑا۔ اس کٹیا میں صاف ستھرا سفید لباس پہنے ہوئے ایک ہندو نوجوان بیٹھا آٹا گوندھ رہا تھا۔ ایک دری بچھی ہوئی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر کھڑا ہوا۔ بولا: ''ٹھاکر ہوہ؟'' میں نے کہا: ''جی ہاں۔ (ٹھاکر سے اس کی مراد تھی راجپوت، اور میں راجپوت ہی تھا) دری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''یہاں بیٹھیے۔'' میں ذرہ فاصلے پر جوتی اتار کر دری پر بیٹھ گیا۔

اس نے روٹی پکائی۔ ایک چھوٹی سی کٹوری میں اچار ڈالا۔ ایک میں دال ڈالی۔ صاف گلاس میں پانی ڈالا۔ پھر دو چپاتیاں، پانی کا گلاس، دال اور اچار والی کٹوریاں، چاروں چیزیں پیتل کی تھالی میں رکھ کر میرے سامنے لایا اور کہا: ''کھایے ٹھاکر جی۔''

مجھے اس وقت سخت بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے روٹی کھائی، اس کے ساتھ چند باتیں کیں اور شکریہ ادا کرکے اس سے اجازت چاہی اور اپنی گاڑی کے پاس آگیا۔ اتنے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

میں محمد علی صاحب بھی آ گئے اور پرزہ ڈال کر ہم آگرہ کو روانہ ہو گئے۔

اس ہندو نوجوان نے ٹھاکُر (کاف کے پیش کے ساتھ کہا تھا) اس کے کہنے پر مجھے معلوم ہوا کہ یہ لفظ کاف کے پیش کے ساتھ ہے، ورنہ اس سے قبل میں کاف کے زبر کے ساتھ (ٹھاکَر) کہا کرتا تھا۔

لاہور ٹیلی ویژن میں ہمارے ایک دوست نصرت ٹھاکر تھے۔ ایک عرصے کے بعد سنا کہ انھیں کاف کے پیش کے ساتھ لوگ ٹھاکر صاحب کہا کرتے تھے۔

۱۲: بعض لوگوں سے سنا تھا کہ آگرہ اور دھول پور کے درمیان ایک خشک پہاڑ کے قریب شیر رہتا ہے، لیکن شیر بہت بوڑھا ہو چکا ہے، زیادہ دوڑ نہیں سکتا۔ ایک دفعہ آدھی رات کے وقت میں اور محمد علی آگرہ سے دھول پور جا رہے تھے کہ نیند نے غلبہ پا لیا اور ہم ٹرک میں اس چارپائی پر سو گئے جو چند روز پہلے فتح پور سیکری سے ایک روپیہ چار آنے میں خریدی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد اُٹھے اور چل پڑے۔ زیادہ سے زیادہ ایک میل آگے گئے ہوں گے کہ دیکھا سامنے سڑک پر ہماری طرف منھ کیے شیر کھڑا ہے۔ ظاہر ہے یہ موت کا نہایت قریبی پیغام تھا۔ سخت گھبراہٹ ہوئی، اگر گاڑی پیچھے کو موڑتے ہیں تو شیر کے دوڑ کر آ جانے کا خطرہ ہے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا یا کسی سے سنا تھا کہ شیر کو تیز روشنی دکھائی جائے تو اس کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں اور وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ خدا جانے یہ بات صحیح ہے یا غلط لیکن میں نے محمد علی سے کہا اللہ کی آس سے روشنی بھی تیز کر دو اور گاڑی بھی تیز کر دو۔ ہم آگے بڑھے تو شیر پیچھے ہٹ گیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیں شیر سے محفوظ رکھا۔ وہی زندگی دینے والا اور وہی موت سے ہم کنار کرنے والا ہے۔ ﴿ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴾

۱۳: ایک دن آگرہ کے زیرِ تعمیر ہوائی اڈے پر مزدور ہمارے ٹرک سے ریت اتار رہے تھے۔ تھوڑے فاصلے پر ایک بہت بڑا ہوائی جہاز کھڑا تھا۔ اس سے قبل ہم نے فضا میں اُڑتے جہاز تو دیکھے تھے، لیکن زمین پر کھڑا جہاز نہیں دیکھا تھا۔ کسی نے بتایا کہ یہ جنگی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

جہاز ہے۔ وہ اڑنے کی تیاری میں تھا۔ ہم قریب سے دیکھنے کے لیے اس کی طرف گئے، اس کے بڑے بڑے پر تیزی سے گھوم رہے تھے اور ان کی ہوا اتنی تیز تھی کہ ہم پیچھے مڑنے پر مجبور ہو گئے۔ ادھر ہمیں روکنے کے لیے کچھ لوگ بھی ہماری طرف بڑھے۔ ہم پیچھے کو مڑے تو تیز ہوا نے زمین پر قدم نہیں جمنے دیے، بھگاتی چلی گئی۔

۱۴: آگرہ اور دھول پور کے جو مزدور وہاں کام کرتے تھے، انھیں دیکھ کر بالکل پتا نہیں چلتا تھا کہ یہ مسلمان ہیں یا ہندو۔ ان کے ناموں سے بھی ان کے مذہب کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ ان میں سے بعض کو بابو کہا جاتا تھا۔ اب بابو سے کیا پتا چلے کہ یہ مسلمان ہے یا ہندو۔ اگر اسے بابو خاں کہا جاتا تو وہ مسلمان تھا اور بابو رام کہا جاتا تو ہندو۔

ہم کچھ عرصہ وہاں رہے، پھر واپس آ گئے۔ اس کے بعد بھی میں کچھ مدت ادھر اُدھر آوارہ گردی کرتا رہا۔ یہ میری زندگی کا عجیب وغریب دور تھا۔ اس دور میں ہندوستان کے بہت سے مقامات دیکھے۔

آگرہ میں اس وقت ایک ہوٹل کو پنجاب ہوٹل کہا جاتا تھا۔ محض پنجابی ہونے کی وجہ سے ہم اکثر اس ہوٹل میں جایا کرتے تھے۔ یہ متعصّبانہ نقطۂ نظر نہیں ہے، قدرتی بات ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ ہر انسان اگرچہ وہ کسی طبقے سے تعلق رکھتا ہو، اپنے محدود یا غیر محدود دائرے میں بہت سے حالات سے گزرتا ہے، اور اس کا ہر قدم زندگی کا ایک نیا تجربہ ہوتا ہے۔ کسی تجربے میں وہ کامیاب رہتا ہے اور کسی میں ناکام ہو جاتا ہے۔ پھر ادھر اُدھر کی ٹھوکریں کھاتا ہوا، ایک منزل پر آ رُکتا ہے۔ ایک محدود دائرے میں رہتے ہوئے میرا بھی یہی حال ہے۔

۱۳ر جنوری ۲۰۰۸ء — بہاول نگر

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

آٹھواں باب:

مرکز الاسلام میں خدمتِ تدریس

مارچ ۱۹۴۳ء میں مَیں استاذ محترم مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت وہ فیروز پور کی مسجد گنبداں والی میں خطابت و تدریس کا فریضہ سرانجام دیتے تھے۔ مقصد فقط انھیں سلام عرض کرنا تھا۔ مولانا نے فرمایا: اچھا ہوا تم آ گئے، کل مولانا معین الدین لکھوی آئے تھے اور تمھارے متعلق پوچھ رہے تھے۔ انھوں نے کہا ہے کہ فوراً مرکز الاسلام پہنچو اور وہاں خدمت تدریس انجام دو۔ مولانا معین الدین سے میرے دیرینہ تعلقات تھے اور ہمارے بزرگ ان کے بزرگوں کے حلقۂ ارادت میں رہے تھے۔ ان کے پیغام کے چندروز بعد میں مرکز الاسلام پہنچا۔

مرکز الاسلام کیا تھا اور کہاں تھا؟ اس کا ذکر اگرچہ گزشتہ صفحات کے (دوسرے باب) میں کیا گیا ہے، لیکن موقع کی مناسبت سے یہاں بھی چند الفاظ میں سن لیجیے۔

مرکز الاسلام کی بنیاد موضع ''لکھوکے'' سے دو میل دور مولانا محمد علی لکھوی نے ۱۹۲۸ء میں رکھی تھی۔ مولانا ممدوح حضرت حافظ بارک اللہ لکھوی کے پڑپوتے، حافظ محمد لکھوی کے پوتے اور مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کے فرزند عالی قدر تھے۔ ان کے دادا حافظ محمد لکھوی صوبہ پنجاب کے بہت بڑے مصلح اور متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ قرآنِ مجید کا فارسی میں پہلا ترجمہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے کیا تھا۔ اس کے بعد پورے قرآنِ مجید کا فارسی زبان میں ترجمہ حافظ محمد لکھوی نے کیا اور پنجابی نظم میں قرآن کی تفسیر لکھی، جو تفسیرِ محمدی کے نام سے سات ضخیم جلدوں میں تقسیم ملک سے قبل کئی دفعہ چھپی۔

مولانا محمد علی لکھوی ۱۸۹۰ء (۱۳۰۷ھ) میں بمقام لکھوکے پیدا ہوئے۔ ان کی پیدائش

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

سے پہلے مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کے دو یا تین بیٹے بچپن میں فوت ہو گئے تھے۔ انھوں نے مرزا غلام احمد قادیانی پر کفر کا فتویٰ لگایا تھا اور فرمایا تھا کہ مجھے اللہ کی طرف سے القا ہوا ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کافر ہے اور قرآن کی یہ آیت سامنے آئی ہے: ﴿وَقَارُونَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامَانَ....﴾ یعنی ''وہ قارون، فرعون اور ہامان کا ساتھی ہے۔'' اس کے بعد مرزا صاحب نے، غصے میں بددعا کرتے ہوئے پیش گوئی کی کہ اب محی الدین عبدالرحمٰن کے گھر بیٹا پیدا نہیں ہوگا اور یہ اولادِ نرینہ سے محروم رہیں گے۔ لیکن اس بددعا اور پیش گوئی کے بعد مولانا محمد علی پیدا ہوئے اور زندہ بھی رہے، اس لیے بعض اوقات مولانا محمد علی مسکراتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ میں مرزا غلام احمد قادیانی کی بددعا کا نتیجہ ہوں۔

بیٹے کی پیدائش سے چند سال بعد مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی حج بیت اللہ کے لیے گئے اور ۱۵۔ ذیقعدہ ۱۳۱۲ھ ۱۰۔ مئی ۱۸۹۵ء کو مسجد نبویؐ میں نماز پڑھتے ہوئے وفات پائی۔ ان کے فرزند گرامی مولانا محمد علی لکھوی نے اپنے آبائی مسکن لکھوکے میں مولانا عبدالقادر لکھوی سے، وزیر آباد میں حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی سے، امرتسر کے مدرسہ غزنویہ میں حضرت امام سیّد عبدالجبار غزنوی سے اور لاہور کے مدرسہ نعمانیہ کے بعض اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔

مروّجہ تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ عرصہ اپنے آبائی مدرسہ محمدیہ (لکھوکے) میں پڑھاتے رہے۔ یہ مدرسہ ان کے جدامجد حضرت حافظ محمد لکھوی نے قائم کیا تھا اور انہی کے نام سے مشہور ہوا۔ مولانا محمد علی نے مجاہدانہ طبیعت پائی تھی اور وہ مولانا اسماعیل شہید دہلوی اور سیّد احمد شہید کی جماعت مجاہدین سے تعلق رکھتے تھے، جن کے ارکان برصغیر کی آزادی کے لیے آزاد قبائل میں انگریزی حکومت سے برسرپیکار تھے۔ مولانا محمد علی مجاہدین کی مالی امداد بھی کرتے تھے اور جہاد کے لیے وہاں مجاہدین بھی بھیجتے تھے۔ خود بھی ایک یا دو دفعہ مرکز مجاہدین کا چکر لگا چکے تھے۔ برصغیر میں ان کی وابستگی ہمیشہ آزادی خواہ جماعتوں سے رہی۔ مجلس احرار قائم ہوئی تو اس سے تعلق پیدا ہو گیا اور وہ ایک رہنما کی حیثیت سے اس کی کانفرنسوں میں شرکت

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

فرماتے اور تقریریں کرتے رہے۔

۱۹۲۸ء میں انھوں نے اپنے آبائی مسکن لکھوکے سے ڈیڑھ دو میل سے فاصلے پر ''مرکز الاسلام'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا اور یہیں سکونت پذیر ہو گئے۔ یہ گاؤں کا نام بھی تھا اور تدریسی ادارہ بھی تھا۔ یہ ادارہ اور گاؤں جو پینتالیس ایکڑ زمین میں پھیلا ہوا تھا، بہت مختصر آبادی پر مشتمل تھا۔ ریلوے سٹیشن جھوک ٹہل سنگھ تھا۔ وہاں سے مرکز الاسلام صرف دو فرلانگ کے فاصلے پر دوسرے سگنل کے برابر تھا۔ میں ۱۹۳۷ء میں یہاں طالب علم کی حیثیت سے رہا۔ پھر مارچ ۱۹۴۳ء میں مدرس کے طور پر یہاں حاضری کا موقع ملا۔ یہاں اردگرد کے دیہات کے طلباء بھی حصولِ علم کے لیے آتے تھے جو شام کو واپس چلے جاتے تھے اور بیرونی طلباء بھی خاصی تعداد میں تھے۔ مرکز الاسلام میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید علوم انگریزی، ریاضی اور جغرافیہ وغیرہ پڑھانے کا انتظام بھی تھا۔

۱۹۴۴ء میں چودھری غلام حسین تہاڑیہ کی خدمات حاصل کر لی گئی تھیں، انھوں نے فیروز پور کے رام سکھ داس (آر۔ ایس۔ ڈی) کالج سے بی۔ اے پاس کیا تھا اور یہاں آنے سے قبل ریلوے کے محکمے میں گڈس ٹرین کے گارڈ کے طور پر ملازمت کرتے تھے۔ اس وقت وہ چوبیس پچیس سال کے نوجوان ہوں گے۔ حلیم الطبع مگر خوش مزاج۔ تبلیغ اسلام میں سرگرم اور طلباء کے ہمدرد۔ صالحیت اور جوانی کا اجتماع بہت مشکل ہے لیکن وہ اس کا قابل رشک مجموعہ تھے۔ افسوس کہ میں اس وصف سے محروم رہا۔ میری ان سے قلبی دوستی ہو گئی تھی جو اللہ کے فضل سے آج تک قائم ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ اپنے خاندان کے ساتھ تلونڈی (ضلع قصور) میں سکونت پذیر ہو گئے تھے اور پنجاب یونیورسٹی سے لائبریرین کا امتحان پاس کر کے سرکاری ملازمت اختیار کر لی تھی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد تلونڈی ہی میں اقامت گزیں ہیں اور ان سے میل ملاقات کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ہمارے ملک کے ممتاز صحافی اسد اللہ غالب ان کے داماد ہیں اور نوجوان کالم نگار صحافی عمار چودھری ان کے نواسے...... میرے ان سب سے مراسم ہیں۔

میں نے اپنی ایک کتاب ''محفل دانشمنداں'' میں چودھری غلام حسین پر مضمون لکھا ہے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

جس میں ان کے حالات خاصی تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ (یہ کتاب ابھی شائع نہیں ہوئی۔)

فیروز پور سے جھوک ٹہل سنگھ کی طرف دن میں دو ٹرینیں آتی تھیں جو بنگلہ فاضلکا اور بہاول نگر سے ہوتی ہوئی سمہ سٹہ جاتی تھیں۔ ایک ٹرین دن کے بارہ بجے اور دوسری شام کو چھ بجے۔ دو ٹرینیں سمہ سٹہ سے چل کر بہاول نگر اور فاضلکا سے گزرتی ہوئی وہاں سے فیروز پور جاتی تھیں۔ ایک صبح نو بجے اور دوسری دوپہر کے تین بجے۔ تقریباً ہر ٹرین سے مرکز الاسلام آنے والے مہمان اُترتے تھے۔ بعض اوقات مہمانوں کی گنتی بیس بائیس تک پہنچ جاتی تھی۔ ان سب کا کھانا مولانا محمد علی لکھوی کے گھر سے آتا تھا۔ طلباء کا کھانا بھی ان کے گھر میں پکتا تھا۔ اس گھر کی قابل احترام خواتین کھانا خود تیار کرتی تھیں۔ گرمی سردی ہر موسم میں یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔ بعض مہمان کئی کئی دن رہتے تھے۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ رہنے کے لیے ہی آتے تھے۔ بعد میں موضع برج کے ایک شخص یعقوب عرف بیلا کو باورچی مقرر کرلیا گیا تھا۔ لیکن پھر بھی بعض افراد کا کھانا مولانا کے گھر سے آتا تھا۔ مولانا ممدوح کے دونوں بیٹے ...... مولانا محی الدین اور معین الدین ...... مہمانوں اور وہاں رہنے والوں کی بے حد خدمت کرتے تھے۔

مجھے اعتراف کرلینا چاہیے کہ میں نے اس گھر کا بہت نمک کھایا ہے۔ اتنا کہ اگر اسے کسی طرح ایک جگہ اکٹھا کیا جاسکے تو کوہستانِ نمک کا ایک اچھا خاصا ''کوہ'' یعنی پہاڑ بن جائے۔

مرکز الاسلام میں میرے قیام کے دو دور ہیں۔ ایک طالب علمی کا دور اور دوسرا تدریس کا۔ ان دونوں ادوار میں وہاں بہت سے اہل علم کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ ان اہل علم میں ایک بزرگ صوفی نذیر احمد کاشمیری تھے۔ ۱۹۳۷ء کی سردیوں کا موسم تھا اور ہم لوگ دھوپ میں بیٹھے تھے کہ آواز گونجی ''السلام علیکم''۔ خوب صورت جوان اور مرعوب کن شخصیت۔ بغیر کسی تمہید کے بہ آواز بلند کہا: ''مولوی محمد علی کہاں ہیں؟''

مولانا کو ان کی آمد کی اطلاع دی گئی اور وہ تشریف لائے۔ باتیں ہونے لگیں تو انھوں نے مجلس احرار اور دیگر سیاسی جماعتوں پر تنقید شروع کردی۔ مولانا محمد علی اور دوسرے لوگ

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

خاموشی سے معزز مہمان کی باتیں سنتے رہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ مولانا محمد علی مجلس احرار سے تعلق رکھتے تھے اور تھوڑی دیر بعد تین بجے کی ٹرین سے ملتان جا رہے تھے، جہاں مجلس احرار کی کانفرنس ہو رہی تھی اور مولانا نے اس میں تقریر کرنا تھی۔ اڑھائی بجے تو مولانا نے فرمایا: مجھے اجازت دیجیے میں ایک ضروری سفر پر جا رہا ہوں۔ آپ جب تک جی چاہے یہاں تشریف رکھیے، میرے دونوں بیٹے محی الدین اور معین الدین اور دوسرے لوگ آپ کی خدمت کے لیے موجود ہیں۔ ان کو آپ کی مجلس میں بیٹھ کر، آپ کے ارشادات سن کر اور آپ کی خدمت کر کے خوشی ہوگی۔

میں نے اپنی کتاب ''قافلۂ حدیث'' (مطبوعہ ۲۰۰۳ء) میں صوفی نذیر احمد کاشمیری مرحوم ومغفور کا خاصی تفصیل سے تذکرہ کیا ہے، جو کتاب کے صفحہ ۱۸۹ سے شروع ہو کر صفحہ ۲۱۵ تک چلا گیا ہے۔

صوفی صاحب ریاست کشمیر کے صدر مقام پونچھ میں ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ وہ عقیل ہاشمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ فارسی، عربی، اُردو، انگریزی، کشمیری اور پنجابی زبانوں پر انھیں عبور حاصل تھا۔ انگریزی اور اُردو کی متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ تقسیم ملک کے بعد ہندوستان میں سکونت پذیر ہو گئے تھے اور اس ملک میں اسلام کے بہت بڑے مبلغ تھے۔ ان کا کمال یہ تھا کہ وہ ہندوؤں کے مذہبی مراکز میں جا کر اسلام کی تبلیغ کرتے۔ بارعب شخصیت کے مالک۔ لمبی داڑھی، لمبا قد، موٹی آنکھیں، گرج دار آواز، پر جوش مقرر، شلوار قمیص میں ملبوس۔ ہاتھ میں ڈنڈا، تیز رفتار، تیز نویس، بلا خوف وخطر بات کرتے تھے۔ کسی سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ مضبوط اعصاب کے مالک اور طبیعت پر جلال کا غلبہ۔ اپنی بات پورے زور اور دبدبے کے ساتھ سامعین تک پہنچاتے تھے۔ اس وقت ان کے دو بیٹے کھوٹہ (ضلع باغ، آزاد کشمیر میں) اقامت گزیں ہیں۔ بڑے بیٹے کا اسم گرامی مختار احمد ہاشمی ہے اور چھوٹے کا نام گلزار احمد ہاشمی۔ دونوں بھائی اس فقیر سے مخلصانہ مراسم رکھتے ہیں۔

صوفی صاحب کی زندگی عجیب وغریب مراحل سے گزری، جس کی تفصیل ''قافلۂ حدیث''

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

میں بیان کی جا چکی ہے۔ اس مردِ تبلیغ پیشہ نے ۵/ دسمبر ۱۹۸۵ء کو ہندوستان کے صوبہ یوپی کے شہر سہارن پور میں وفات پائی۔

کچھ عرصہ پیشتر مجھے دمام (سعودی عرب) سے ہندوستان کے ممتاز عالم دین مولانا عبدالکریم سلفی کا مکتوب گرامی موصول ہوا تھا۔ اس میں مولانا ممدوح نے صوفی صاحب کے متعلق دو دلچسپ واقعات بیان فرمائے ہیں۔ یہ واقعات حکیم ابوالحسن عبیداللہ کشمیری کی تصنیف ''اسلام کا اجتماعی نظام'' (طبع بمبئی) میں مرقوم ہیں۔ ان مطبوعہ واقعات کی انھوں نے فوٹو کاپی مجھے بھجوائی ہے، جو قارئین کرام کے پیش خدمت ہے۔ پہلے مولانا عبدالکریم سلفی کا خط ملاحظہ فرمایے۔ پھر ان دو واقعات کا مطالعہ کیجیے۔

فضیلۃ الشیخ محمد اسحاق بھٹی حفظہ اللہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ وبعد

آپ کی تالیف کردہ کتاب ''قافلۂ حدیث'' میرے ہاتھوں میں ہے۔ دورانِ مطالعہ جناب صوفی نذیر احمد کاشمیریؒ کا ذکر آیا۔ میں نے ان کو جامعہ سلفیہ بنارس میں طالب علمی کے زمانے میں دیکھا تھا۔ لیکن استفادے کا موقع نہ مل سکا۔ البتہ ان کے ایک مخلص دوست جناب حکیم ابوالحسن عبیدالرحمٰن کشمیری (جو کسی زمانے میں کشمیر میں طبیہ کالج کے پروفیسر ہوا کرتے تھے اس لیے کشمیری بھی لکھے جاتے ہیں) نے ان کے دو واقعے اپنی کتاب ''اسلام کا اجتماعی نظام'' میں درج کیے ہیں، جن کی فوٹو کاپی آپ تک پہنچا رہا ہوں۔ اُمید ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں شامل اشاعت ہو سکیں گے۔ یہ کتاب جامعہ رحمانیہ بمبئی سے اگست ۱۹۹۴ء میں چھپی ہے، جس کے صدر جناب قاری نجم الحسن فیضی ہیں۔

دعا ہے اللہ ربّ العزت آپ کو مزید خدمتِ دین کی توفیق بخشے۔

والسلام

عبدالکریم السّلفی الدمام

''اب وہ دو واقعے ملاحظہ فرمایے:

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

(۱) ابھی چند ہی برسوں کی بات ہے کہ جناب صوفی نذیر احمد صاحب کاشمیریؒ اپنے ایک درجن کاشمیری درویشوں کے ساتھ جگت گرو شنکر آچاریہ کی مٹھ ❶ پر، اسلام کے عقیدۂ توحید کی دعوت کے لیے پہنچے تھے۔ شری شنکر آف پوری نے ان کا اور ان کے رفقا کا پرتپاک خیر مقدم کیا تھا۔ اپنے مٹھ میں معزز مہمانوں کو ٹھہرایا۔ ان کے کھانے، پینے کا انتظام کیا اور نماز کے لیے بتوں اور تصویروں سے پاک صاف جگہ کا انتظام کیا۔ نیز اپنے رابطے کے لوگوں کو مدعو کیا اور اعلان کرایا کہ آپ کے یہاں ایک مہاپرش ایشور بھگت کی آمد ہوئی ہے۔ وہ تمھیں ایشور بھگتی کے سلسلے میں کچھ سنانے اور سمجھانے آئے ہیں، لہٰذا آپ لوگ جس طرح میری باتوں کو سننے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، اس سے دس گنا زیادہ دھیان سے جناب صوفی صاحب کی باتیں سننے اور سمجھنے کی کوشش کریں۔ صوفی صاحب نے اسلامی توحید پر ایک مدلل اور جامع تقریر کی۔ جگت گرو نے اس کے جواب میں ''وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت'' والا سناتنی فلسفہ دہرایا اور کہا کہ صرف راستے جدا جدا ہیں لیکن سب کی منزل ایک ہی ہے۔ ہمارے ہندوؤں میں کچھ لوگ صوفی صاحب کے ہم خیال و ہم نوا موجود ہیں جس طرح مسلمانوں میں ایک خاصی تعداد ہمارے سناتنی فلسفے سے متفق ہے، لہٰذا ہندوؤں اور مسلمانوں میں کچھ زیادہ بھید بھاؤ کی گنجائش نہیں ہے۔ اس طرح کا بیان دے کر جگت گرو نے اپنے دھرم کا دفاع بھی کیا اور صوفی صاحب کا خیر مقدم بھی کیا۔ یہ باتیں خود میں نے صوفی صاحب کی زبانی سنی ہیں، جن سے ملک بھر کے قریباً تمام مذہبی تعلیم یافتہ لوگ واقف ہوں گے۔''

(۲) ''اس واقعہ سے چند برس پہلے پنڈت سندر لال الٰہ آبادی اور منی سوشیل کمار جینی نے اور ان کے چند رفقا نے شہر دہلی میں، ایک عالمی بین المذاہب کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ کیا تھا۔ اس وقت ملک کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو تھے۔ طے یہ پایا کہ پنڈت جواہر لال نہرو کو کانفرنس کی صدارت کے لیے رضامند کیا جائے۔ ورنہ ہمہ شما کی

❶ مٹھ کے معنے ہیں ڈیرہ، مذہبی مرکز، عبادت خانہ۔ ہندوؤں کا صنم کدہ، دھرم شالہ وغیرہ۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

صدارت میں کانفرنس کی کامیابی کی اُمید کم ہے۔ اب سوال تھا بلی کی گردن میں گھنٹی باندھنے کا۔ کیوں کہ پنڈت نہرو تو پکے ناستک اور بے دھرم تھے۔ وہ مذہب کا نام سننا بھی برداشت نہیں کرتے تھے، مذہبی کانفرنس کی صدارت کیسے قبول کرتے۔ اس کے لیے تو ضرورت تھی کسی ''دمادم مست قلندر'' کی جو پنڈت جی سے صرف درخواست ہی نہیں بلکہ بہ وقت ضرورت جھگڑ بھی سکے اور انھیں لوہا منوا کر ہی دم لے۔ چناں چہ سب نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ آج پنڈت جی سے صوفی صاحب کو بھڑا دیا جائے۔

''صوفی صاحب اس وقت جامعہ ملیہ میں مقیم تھے اور کسی ضرورت سے مدرسہ ریاض العلوم مچھلی والان آئے تھے۔ چناں چہ پہلے یہ حضرات جامعہ ملیہ پہنچے۔ پھر انھیں وہاں نہ پا کر مدرسہ ریاض العلوم جا دھمکے۔ وہاں صوفی صاحب مسجد میں ایک اینٹ کا تکیہ بنائے ہوئے مسجد کے پنکھے تلے آرام فرما رہے تھے۔ وہ فوراً وہاں سے صوفی صاحب کو لے کر نہرو جی کی کوٹھی پر پہنچے۔ صوفی صاحب کو پنڈت جی کی مسند پر بٹھا کر ان کے سامنے آسن مار کر بشکل نصف دائرہ بیٹھ گئے۔ پندرہ بیس منٹ بعد پنڈت جی ملاقات کے کمرے میں داخل ہوئے تو صوفی صاحب کو ان کی بے ہنگم ڈاڑھی اور ڈنڈے کے ساتھ اپنی مسند پر براجمان پا کر مسکرائے۔ ہاتھ ہلا کر کہا: ''صوفی صاحب آداب عرض۔'' صوفی صاحب نے ایک ہاتھ کی انگلی اور ابرو کے اشارے سے جواب دیا۔ پھر انہی کی بغل میں بیٹھ کر پنڈت جی نے تشریف آوری کی وجہ دریافت کی۔ صوفی صاحب نے پنڈت سندر لال اور منی جی کی طرف اشارہ کیا، یعنی آمد کی وجہ ان سے دریافت کیجیے۔ پنڈت جی نے طنزیہ لہجے میں منی سوشیل کمار سے کہا: '' کیوں منی جی کوئی دھارمک سمیلن ہونے جا رہا ہے؟'' کہا: جی ہاں اور سب کی یہ خواہش ہے کہ آپ اس کی صدارت قبول کریں۔

''پنڈت جی نے کہا کہ آپ سبھی حضرات کو معلوم ہے کہ میں نے آج تک کسی مذہبی جلسے میں شرکت تک نہیں کی تو صدارت کی بات تو دور کی رہی۔ اب صوفی صاحب پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہو کر بولے پنڈت جی آپ صریح جھوٹ بول رہے ہیں۔ فلاں مہینے کی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

فلاں تاریخ میں آپ اسی پالم ہوائی اڈے سے مہاتما بودھ کی سرونمی میں شرکت کے لیے تشریف لے گئے تھے اور وہ یقیناً ایک مذہبی تقریب تھی۔ اسی طرح ایک اور حوالہ مذہبی تقریب میں شرکت کے لیے دیا۔ بس پھر کیا تھا، نہرو جی کا توازن بگڑ گیا۔ نہایت غصے اور تیز و تند لہجے میں بولے: ارے اس دھرم و مذہب کو تو ہم اس کی بنیادوں کے ساتھ اس سیکولر ملک سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں۔ اب صوفی صاحب کی باری آئی۔ وہ بھی اپنے بھاری بھرکم جسم وقد اور بڑی ہیبت ناک ڈاڑھی، سرخ آنکھوں اور موٹے ڈنڈے کے ساتھ چیخ کر اچھل کھڑے ہوئے اور کہا کہ ہم نے بھی یہ پکا تہیہ کر لیا ہے کہ آپ جیسے نام نہاد ناستک اور دھرم دشمن وزیراعظم کو اس کرسی سے اکھاڑ کر پھینک دیں۔ پانچ سات منٹ تک پوزیشن سنبھالے صوفی صاحب اسی طرح کھڑے رہے۔ اس کے بعد واک آوٹ کر گئے۔ بس کام ہو گیا تھا اور پنڈت جی کا اندازِ گفتگو بالکل بدل چکا تھا۔ بڑے ناصحانہ انداز سے بولے: ارے آپ لوگ یہ کیا تماشہ کرتے ہیں۔ جلسے کی صدارت کی بات تھی تو ایسے آدم خور کو ساتھ لانے کی کیا ضرورت تھی؟ ایک میٹر کی ڈاڑھی چڑھائے ہوئے، سر پر ڈنڈا تان کر کھڑے ہو گئے اور مفت میں، ہمارا موڈ خراب کر گئے۔ ایسے ملنگوں کا وزیراعظم کی کوٹھی پر کیا کام؟ مذہب کے ایسے جنونی کسی وقت کچھ بھی کر گزریں، ان کا کیا ٹھیک ہے؟ لو، وزیراعظم کے سر پر ڈنڈا تان کر کھڑے ہو گئے۔ اور مفت میں ہمارا موڈ بھی خراب کر گئے۔ آپ لوگ ان کے بغیر بھی آ سکتے تھے۔

''اچھا یہ بتاؤ کانفرنس کس تاریخ کو ہو رہی ہے؟ پنڈت جی نے ڈائری میں تاریخ نوٹ کر لی اور صدارت قبول کر لی۔ یہ لوگ خوش ہو کر وہاں سے نکلے تو صوفی صاحب کو باہر نہ پا کر فکر مند ہوئے کہ آخر صوفی صاحب گئے کہاں؟ ایک لڑکے سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ جن سنگھ کے اس آفس کے کمرہ نمبر ۹ میں گئے ہیں۔ پنڈت سندر لال دبے پیروں سیڑھی سے اوپر چڑھے تو دیکھا کہ نہرو کے خلاف ایک آتش بار مضمون لکھ کر جن سنگھ کے آفس سیکرٹری کو سنا رہے تھے۔ اس انگریزی مضمون میں صوفی صاحب نے پنڈت نہرو کو گاندھی جی کی بنیادی سیاست سے کھلا انحراف کرنے والا، دین دھرم کا کھلا دشمن اور ملک وقوم کو دھرم دشمنی کی سمت

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

میں رہنمائی کرنے والا سیاسی رہبر قرار دیتے ہوئے پوری قوم سے اپیل کی تھی کہ ایسے وزارتِ عظمیٰ کی کرسی سے اکھاڑ پھینکنا قوم و ملک کی عظیم ترین خدمت ہوگی۔ آفس سیکریٹری کے اس مضمون کو سن رہا تھا اور واہ واہ کرتا جا رہا تھا۔ پنڈت سندر لال الٹے پیروں سیڑھی نیچے آئے اور منی جی سے کہا کہ میں اور آپ دونوں آگے پیچھے اوپر چڑھیں گے۔ میں صوفی صاحب کو ہاتھوں سمیت کمر سے پکڑلوں گا اور تم فوراً باز کی طرح جھپٹ کر ان کے ہاتھ سے کاغذ چھین کر منھ میں ڈال کر چبا لینا۔ پھر ہم دونوں پر جتنے بھی گھونسے، مکے برسیں انھیں گوارا کرلیں گے۔ ورنہ اگر مضمون آفس سیکرٹری کے ہاتھ میں چلا گیا تو وہ اسے ضرور شائع کر دے گا اور پھر سارا بنا بنایا کام بگڑ جائے گا۔ چناں چہ ان دونوں نے یہی کیا اور صوفی صاحب نے بھی نہرو کا غصہ ان دونوں پر اتار دیا۔ پھر ان دونوں حضرات نے صوفی صاحب کو کسی صورت منا کر نیچے اتارا اور کار میں بٹھا کر سیدھے اشوکا ہوٹل پہنچے۔

"پنڈت سندر لال نے پوچھا: صوفی صاحب: مشروب حار چاہیے یا مشروب بارد؟"

"صوفی صاحب بپھر کر بولے: کچھ نہیں چاہیے۔ کم بخت نے میرا انتہائی بیش قیمت مضمون بکری کی طرح چبا ڈالا۔"

"پنڈت سندر لال نے کہا: ارے صوفی صاحب! ایسے ایسے کتنے ہی مضامین تو آپ خواب میں بھی مرتب کر ڈالتے ہوں گے۔ مضمون لکھ ڈالنا آپ کے لیے کون سی بڑی بات ہے۔ اصل قابل قدر اور قابل ذکر تو آپ کا وہ ڈرامہ ہے جسے آپ کے علاوہ کوئی مائی کا لال اسٹیج نہیں کرسکتا۔ ہم لوگوں کا تو پاخانہ خطا ہوتے ہوتے رہ گیا اور نہرو جی کا پائجامہ میں پیشاب نکل گیا۔ قریباً نصف گھنٹے تک آپ کے باہر نکل جانے کے بعد "ہاہا" اور "رام رام" کہتے رہے۔ فوراً ڈائری نکال کر تاریخ اور وقت نوٹ کیا اور قبولِ صدارت کے ساتھ کانفرنس میں شرکت کا وعدہ کیا اور ساتھ ہی آپ کو "آدم خور" کا خطاب بھی دے دیا اور ہمیں انتہائی خیراندیشانہ نصیحت کی کہ ایسے آدم خور، بے ہنگام ملنگ کو آئندہ کبھی ہمارے یہاں لے کر نہ آنا۔ گو وہ آپ کو دیکھنے سے لرزتے ہیں، لیکن دل مضبوط کر کے کانفرنس میں ایک بار پھر آپ

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کے جلال کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ اب ان حالات میں ہمارے سامنے صرف دو ہی راستے تھے۔ ایک یہ کہ بنے بنائے کام کو خود اپنے ہی ہاتھوں بگاڑ دیں۔ دوسرے یہ کہ آپ کے انتہائی قابل قدر مضمون پر ڈاکہ ڈال کر بکری کی طرح چبا جائیں۔ ہم نے دوسرے ہی کام کو مناسب جانا اور آپ کے گھونسوں اور مکوں کی بارش اپنے کمزور جسموں پر برداشت کی۔

"صوفی صاحب کا غیظ وغضب بڑی حد تک فرو ہو چکا تھا۔ ان کے لیے لسّی کے ایک درجن بڑے گلاس منگوائے گئے اور وہ ایک ایک کر کے غٹا غٹ پیتے چلے گئے۔ پھر انھیں ان کی جائے قیام پر پہنچا دیا گیا۔"

صوفی نذیر احمد کاشمیری سے متعلق دونوں واقعات قارئین نے پڑھ لیے۔ کیا اس دل گردے کا کوئی مبلغ اسلام ہمارے ہاں بھی موجود ہے جو غیر مسلموں کے کسی مرکز میں جا کر دھڑلے سے اسلام کی تبلیغ کر سکے؟ کیا کسی مسلمان یا غیر مسلم وزیر اعظم یا کسی وزیر یا چھوٹے بڑے مشیر یا ادنیٰ سے ادنیٰ حکومتی رکن کے سامنے اس قدر جرأت سے بات کرنے والا کوئی بڑے سے بڑا سیاسی یا سماجی رہنما کہیں نظر آتا ہے؟ ہمارے ہاں اگر کوئی اس قسم کی بات نرم سے نرم الفاظ میں بھی کسی حاکم کے سامنے کرے تو اسے فوراً دہشت گرد قرار دے دیا جائے اور اسے اور اس کے کنبے قبیلے کے تمام افراد کو گرفتار کر کے ایسی جگہ پہنچا دیا جائے جہاں اس کے نام ونشان کا بھی پتا نہ چل سکے۔ اس کے ملنے والوں اور دوستوں کی پکڑ دھکڑ کا سلسلہ بھی شروع ہو جائے اور سب کو بلیک لسٹ میں شامل کر لیا جائے۔

صوفی صاحب کی جرأتِ رندانہ کے علاوہ ہندوستان کے وزیر اعظم کا تحمل بھی قابل داد ہے۔ صوفی صاحب ان کی مسند پر براجمان ہیں۔ وہ آتے ہیں، صوفی صاحب کو دیکھتے ہیں اور مسکراتے ہوئے انھیں سلام کرتے ہیں۔ صوفی صاحب کھڑے ہو کر ان کے سلام کا جواب نہیں دیتے۔ بیٹھے بیٹھے انگلی کے اشارے سے جواب دیتے ہیں۔ وہ صوفی صاحب کے سامنے کھل کر بات بھی نہیں کر پاتے۔ کوئی بات کرتے بھی ہیں تو ان کے جانے کے بعد کرتے ہیں۔ اور اس وقت بھی ان کے لہجے میں خوف کا غلبہ ہے۔ صوفی صاحب جیسے اوصاف کے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

حامل لوگوں کو ہی کہا جاتا ہے مردانِ حق!

ہمارے زمانۂ تدریس میں مولانا محمد علی لکھوی تو مدینہ منورہ میں مقیم تھے، لیکن ان کے دونوں صاحب زادے مولانا محی الدین اور معین الدین اپنے افرادِ خانہ کے ساتھ مرکز الاسلام میں اقامت گزیں تھے۔ مختلف مقامات سے ان سے تعویذ لینے والے بے شمار لوگ آتے تھے۔ مولانا محی الدین تعویذ نہیں دیتے تھے۔ وہ نمک پر دم کر کے ضرورت مند کو دیتے تھے اور اللہ شفا عطا فرماتا تھا۔ میں انھیں کہا کرتا تھا کہ آپ کسی وقت تکلیف کر کے کوہستان نمک تشریف لے جائیں اور اس پر پھونک ماردیں تاکہ اس نمک کو استعمال کرنے والے تمام لوگ تکلیفوں اور بیماریوں سے محفوظ رہیں۔

مرکز الاسلام سے قریب کے بعض دیہات میں سکھوں کی اکثریت تھی اور بعض دیہات میں مسلمان زیادہ تعداد میں تھے، بلکہ صرف مسلمان ہی آباد تھے، سکھوں یا ہندوؤں کا ایک گھر بھی نہیں تھا۔ لیکن مرکز الاسلام سے سب لوگ مرعوب تھے۔ سکھ بھی اور مسلمان بھی۔ انھیں شبہ تھا کہ یہاں خطرناک اسلحہ ہوگا۔ اس اعتبار سے ''لکھوکے'' گاؤں میں رہنے والے لوگوں کا اتنا رعب نہیں تھا جتنا کہ مرکز الاسلام (جنگل) میں رہنے والے مولانا محمد علی لکھوی کے ایک گھر کا رُعب تھا۔

مولانا محمد علی لکھوی بڑے جی دار عالم دین تھے۔ ان کے پڑدادا حافظ بارک اللہ لکھوی کے زمانے میں ان کا گاؤں ''لکھوکے'' ریاست ممدوٹ میں شامل تھا۔ ایک مرتبہ اس زمانے کی ریاست ممدوٹ کا حکمران نواب قطب الدین خاں اپنے بعض وزیروں اور مصاحبوں کے ساتھ حافظ بارک اللہ سے ملاقات کے لیے لکھوکے آیا۔ اس نے حافظ صاحب کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھائے تو حافظ صاحب نے دیکھا کہ اس نے سونے کے کنگن پہنے ہوئے ہیں۔ حافظ صاحب نے ہاتھ پیچھے کو کھینچتے ہوئے فرمایا، یہ لوگ ایسی چیزیں پہن کر جن کا مردوں کے لیے پہننا حرام ہے، مسجد میں بیٹھے درویشوں کو پریشان کرتے ہیں۔

نواب کا پندارِ حکمرانی اپنے ماتحت گاؤں کی مسجد کے ایک درویش کا یہ اندازِ کلام

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

برداشت نہ کرسکا اور حکم دیا کہ اس گستاخ کو میری ریاست سے نکال دیا جائے۔نواب صاحب کے وزیروں نے ان کو یہ حکم واپس لینے کے لیے عرض کیا اور کہا کہ یہ عالم دین ہیں اور بہت بڑے بزرگ ہیں، انھیں ریاست سے نہ نکالا جائے۔لیکن نواب نے حافظ صاحب کو اور ان کے عقیدت مندوں کو گاؤں ''لکھوکے'' سے نکال دیا۔ وہ وہاں سے نکل کر ضلع بہاول نگر کے ایک مقام موجودہ ہیڈ سلیمان کی کے قریب موضع ''حاصل ساڈو'' پہنچے تو دریائے ستلج میں یکا یک سیلاب آیا اور ممدوٹ شہر اس کی زد میں آ گیا۔لوگ سخت پریشان ہوئے اور نواب نے گھڑ سواروں کو بھیج کر حافظ صاحب سے معافی مانگی اور انھیں لکھوکے واپس لایا گیا۔ یہ ۱۸۳۰ء (۱۲۴۵ھ) کا واقعہ ہے۔

یہ واقعہ مجھے مولانا محمد علی لکھوی نے سنایا تھا۔ اس سے بہت سال بعد میں نے یہ واقعہ ایک قلمی کتاب ''منظورۃ السعداء فی احوال الغزاۃ والشہداء'' میں پڑھا۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ہے اور سید جعفر علی نقوی کی تصنیف ہے جو تیرہ سو صفحات پر مشتمل ہے اور جماعت مجاہدین کے حالات میں ہے۔کتاب کے مصنف سیّد جعفر علی نقوی کی ملاقات حافظ بارک اللہ لکھوی سے حاصل ساڈو کے مقام پر ہوئی تھی اور ان کے بقول حافظ صاحب اور ان کے عقیدت مند ان سے بے حد احترام سے پیش آئے تھے۔ اس وقت سیّد جعفر علی نقوی مجاہدین کی ایک جماعت کے ساتھ ریاست ممدوٹ سے گزرتے ہوئے براستہ تونسہ انگریزی حکومت سے جہاد کے لیے آزاد قبائل کی طرف جارہے تھے۔لیکن یہ کتاب انھوں نے اس واقعہ سے ستائیس برس بعد ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۷ء) میں لکھی۔ حافظ بارک اللہ سے ملاقات کا ذکر انھوں نے کتاب کے ورق ۶۳۴ پر کیا ہے۔ان کے اصل لفظ ملاحظہ فرمایے:

دراں ایام میاں بارک اللہ بزرگے بودند کہ از خان مذکور ناخوشنود شدہ از عمل او بیروں رفتہ بودند، از ایشاں ملاقات نمودم، تلطف بسیار نمودند مریدانِ شاں محبت بسیار نمودند۔

(یعنی ان دنوں ایک بزرگ میاں بارک اللہ سے ملاقات ہوئی جو خان مذکور

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

(نواب قطب الدین خاں) سے ناخوش تھے اور ریاست بدر کردیے گئے تھے۔ وہ بہت ہی شفقت اور مہربانی سے پیش آئے۔ ان کے ارادت مند بھی نہایت محبت کا برتاؤ کرتے تھے۔)

مولانا محمد علی لکھوی کی ولادت سے ساٹھ سال پیشتر یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ لیکن اس کا اثر ان کے ذہن پر رہا۔ وہ ممدوٹ کے نوابوں کا ذکر ہمیشہ حریفانہ لہجے سے کرتے تھے۔ ۱۹۴۵ء کے انتخابات کا زمانہ آیا تو انھوں نے اپنے بیٹوں (محی الدین اور معین الدین) کو خط لکھا کہ مسلم لیگ کی طرف سے نواب ممدوٹ (افتخار حسین) انتخاب لڑیں گے، تمھیں ان کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ چناں چہ مولانا محی الدین نے مجلس احرار کے ٹکٹ پر نواب صاحب کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اور مولانا معین الدین لکھوی نے چند روز اس حلقے کا چکر بھی لگایا۔ یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر نواب صاحب کے مقابلے میں سردار محمد سرور بودلہ میدان میں اُترے تھے اور وہ اپنے سرکردہ لوگوں کے ساتھ مرکز الاسلام بھی آئے تھے۔ اس علاقے میں چوں کہ لکھوی علماء کافی اثر و رسوخ رکھتے تھے، اس لیے نواب صاحب ان سے پریشان تھے۔ لیکن اس اثنا میں مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی کی طرف سے پیغام آ گیا کہ نواب صاحب کا مقابلہ نہ کیا جائے۔ اس پیغام کی بنا پر مولانا محی الدین لکھوی نے مقابلے کا ارادہ ترک کردیا تھا۔ مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی اس وقت جماعت مجاہدین کے امیر تھے۔ انگریز اس جماعت کے مخالف تھے۔ اس لیے مولانا ممدوح روپوش تھے۔ مولانا محمد اسماعیل سلفی مرحوم نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ روپوشی کے زمانے میں مولانا فضل الٰہی کا مولانا ابوالکلام آزاد کے پاس آنا جانا رہتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ملک کے سیاسی رہنماؤں کی آزادی کے سلسلے میں انگریزی حکومت سے گفتگو ہو رہی تھی اور مولانا آزاد نے وائسرائے سے کہہ کر مولانا فضل الٰہی کی روپوشی کا سلسلہ ختم کرایا تھا۔

وہ ملک کی تقسیم کے سلسلے میں فیصلہ کن انتخابات تھے۔ انھیں ۱۹۴۵ء کے انتخابات بھی کہا جاتا ہے اور ۱۹۴۶ء کے بھی۔ ۱۹۴۵ء کے اس لیے کہ نومبر ۱۹۴۵ء میں شروع ہوئے تھے اور ۱۹۴۶ء کے اس لیے کہ فروری ۱۹۴۶ء میں ختم ہوئے تھے۔ تقریباً تین مہینے جاری رہے تھے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

انتخابات کے زمانے میں ایک دن دوپہر کے وقت مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی کے چھوٹے بھائی مولانا عبدالغفار غزنوی مرکز الاسلام تشریف لائے۔ مولانا عبدالرحیم کوٹلوی اور فیروز پور کے مولانا عبیداللہ احرار اور خان عبدالعظیم خاں ان کے ساتھ تھے۔ مولانا عبدالغفار غزنوی چونیاں (ضلع قصور) کے علاقے میں کانگرس کے ٹکٹ پر انتخاب لڑ رہے تھے۔ ان کے مقابلے میں میاں افتخار الدین تھے جو کچھ عرصہ پیشتر پنجاب کانگرس کی صدارت سے استعفا دے کر مسلم لیگ میں شامل ہوئے تھے۔ اس علاقے میں مولانا محمد علی لکھوی کا بہت اثر تھا، لیکن انتخاب کے زمانے میں وہ مدینہ منورہ میں مقیم تھے۔ مولانا عبدالغفار غزنوی چاہتے تھے کہ مولانا محی الدین اور مولانا معین الدین اس علاقے میں ان کی مدد کریں۔ چناں چہ میں اور مولانا محی الدین ان کے ساتھ گئے اور چند روز ان کے حلقے کے مختلف مقامات میں ان کے حق میں تقریریں کیں اور بہت سے لوگوں سے گفتگو کی۔ لیکن وہ مسلم لیگ کا دور تھا اس لیے لوگوں نے مسلم لیگ کو ووٹ دیے اور اسی کے اُمیدوار کامیاب ہوئے۔ پورے پنجاب میں کانگرس کے ٹکٹ پر صرف مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی کامیاب ہوئے تھے۔

کچھ عرصہ پیشتر جماعت اہل حدیث کے ایک ہفت روزہ اخبار میں کسی صاحب کا مضمون شائع ہوا تھا، جس میں بتایا گیا تھا کہ ۱۹۴۵ء کے انتخاب میں مولانا معین الدین لکھوی نے مسلم لیگی اُمیدواروں کی مدد کی تھی اور اس سلسلے میں ان کا تعلق نواب افتخار حسین خاں آف ممدوٹ سے رہا تھا۔ معلوم نہیں انھوں نے یہ بات کس سے سنی جو بالکل غلط ہے۔ مولانا محی الدین اور مولانا معین الدین دونوں بھائیوں میں سے نہ کوئی صاحب مسلم لیگ میں شامل ہوئے، نہ کسی مسلم لیگی کے حلقۂ انتخاب میں گئے اور نہ کسی کا نواب ممدوٹ سے کوئی سیاسی تعلق رہا۔ بلکہ ان میں سے کسی کی نواب ممدوٹ سے کبھی ملاقات بھی نہیں ہوئی۔ ۱۹۴۵ء کے انتخاب کے زمانے میں مَیں مرکز الاسلام میں خدمت تدریس پر مامور تھا۔ اس لیے مجھے لکھوی برادران کی تمام علمی، دینی اور سیاسی سرگرمیوں کا علم ہے۔

یہاں یہ یاد رہے کہ ضلع فیروز پور میں دو مسلمان بہت بڑے زمیندار اور دور تک پھیلے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ہوئے رقبوں کے مالک تھے۔ ایک نواب ممدوٹ افتخار حسین خاں جو ۸۴ دیہات کے مالک تھے اور ممدوٹ کی پوری ریاست پر ان کا قبضہ تھا۔ ملک میں مسلم لیگ کا زور ہوا تو یہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے، جب کہ ان کے والد شاہ نواز خاں پنجاب کے دیگر زمینداروں کی طرح یونینسٹ پارٹی میں شامل تھے۔

ضلع فیروز پور کے دوسرے زمیندار محمد سرور بودلہ تھے جو بارہ دیہات کے مالک تھے۔ وہ ذاتی طور پر بھی لکھوی حضرات سے عقیدت مندانہ تعلق رکھتے تھے اور ان کے مملوکہ دیہات میں رہنے والے لوگ بھی لکھویوں کے معتقد تھے۔ اس کے برعکس ممدوٹ کے نواب خاندان کا لکھویوں سے عقیدت و ارادت کا کوئی تعلق نہ تھا، البتہ وہ اس علاقے میں ان کے اثر و رسوخ سے خوف زدہ ضرور تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ ریاست ممدوٹ کے تمام دیہات کے لوگ لکھویوں کے ارادت مند ہیں۔

محمد سرور بودلہ چاہتے تھے کہ لکھوی حضرات انتخاب میں حصہ نہ لیں۔ نواب ممدوٹ کا مقابلہ انہی کو کرنے دیں۔ پہلے تو انھوں نے اس کے لیے اپنے بعض دوستوں کو مولانا محی الدین اور مولانا معین الدین لکھوی کے پاس بھیجا۔ پھر ایک دن چار پانچ گاڑیوں میں پندرہ بیس آدمیوں کے ساتھ وہ خود آئے۔ ان کے دو ملازموں (یا مزارعوں) نے اپنی کمروں پر چمڑے کی دو پیٹیاں باندھی ہوئی تھیں۔ ایک شخص نے پیٹی کے بڑے بڑے چار پانچ سوراخوں میں شیشے کے گلاس ڈال رکھے تھے۔ ایک کی پیٹی میں حقے کی چلم اور چھوٹا سا حقہ تھا۔ ایک اور شخص تھا، جس نے پانی کا مشکیزہ کندھے پر لٹکایا ہوا تھا۔ میں نے یہ رئیسانہ اور زمیندارانہ کلچر پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ ان کے حقہ بردار اور تمبا کو بردار مرکز الاسلام کی چار دیوار کے اندر نہیں آئے، باہر ہی کھڑے رہے۔ دوسرے لوگ اندر آئے اور انھوں نے لکھوی برادران سے باتیں کیں۔

ایک دفعہ میں اور مولانا عبیداللہ احرار کسی گاؤں میں محمد سرور بودلہ کے حلقے میں گئے تھے اور ہم نے ایک جلسے میں ان کے حق میں تقریریں کی تھیں۔

مولانا محی الدین لکھوی صرف مولانا عبدالغفار غزنوی کے حلقے میں گئے، جس کا ذکر

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

گزشتہ سطور میں ہوا۔ اس وقت میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ اس کے علاوہ کہیں نہیں گئے۔ مولانا معین الدین لکھوی انتخابات کے پورے زمانے میں کسی سیاسی جماعت کے کسی حلقۂ انتخاب میں نہیں گئے۔

اب کسی وقت ذہن الٹی جست لگا کر ۶۴۔۶۵ سال قبل کے دور میں جاتا اور مرکز الاسلام میں قیام کا دور یاد آتا ہے تو عجیب قسم کے تاثرات ذہن میں گردش کرنے لگتے ہیں۔ وہ آبادی سے دور ایک جنگل تھا۔ لیکن اس جنگل میں بہت سی آبادیاں مضمر تھیں۔ وہاں کوئی دکان نہ تھی، لیکن معلوم ہوتا تھا کہ ہر طرف دکانیں ہی دکانیں اور بازار ہی بازار ہیں۔ یعنی صالحیت کی دکانیں اور شرافت کے بازار۔ نہ کسی سے جھگڑا، نہ کوئی ہنگامہ۔ وہ صحت افزا مقام تھا۔ سایہ دار درختوں میں گھرا ہوا۔ ورزش کی کئی صورتیں وہاں موجود تھیں۔ اس کی مٹی میں اتنی کشش تھی کہ وہاں آنے والے بعض لوگوں کے لیے واپس جانا مشکل ہو جاتا تھا۔ ایک مرتبہ میرے دو ماموں عبدالرزاق اور عبدالوہاب وہاں گئے تو وہاں کی فضا سے بہت خوش ہوئے، دو تین دن وہاں رہے۔

مرکز الاسلام سے میل ڈیڑھ میل کے فاصلے پر اکالیوں کا ایک گاؤں ٹہل سنگھ تھا۔ مسلمانوں کے خلاف اکالی بے حد متعصّبانہ ذہن رکھتے تھے۔ مولانا محمد علی لکھوی سے بھی ان کے دلوں میں عناد بھرا ہوا تھا۔ لیکن مرکز الاسلام میں رہنے والے چھوٹے بڑے جس شخص سے ان میں سے کسی کا آمنا سامنا ہوتا، وہ اپنے مذہب کے مطابق اسے ہاتھ جوڑ کر سلام کرتا اور خیر و عافیت پوچھتا۔ ان کے بچے بیمار ہو جاتے تو تعویذ اور دم کے لیے ان کی عورتیں مرکز الاسلام آتیں اور تعویذ لے کر اور دم کرا کے انھیں یقین ہو جاتا کہ بچہ اب تندرست ہو جائے گا۔ تندرستی اور بیماری کا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے لیکن کسی کے یقین پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی۔

تعویذ اور دم کرانے کے لیے وہاں بہت لوگ آتے تھے، عورتیں بھی، مرد بھی، مسلمان بھی، غیر مسلم بھی۔ ۱۹۴۵ء کے اکتوبر کی بات ہے کہ ایک سکھ اپنی بیوی کو لے کر آیا۔ اس

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

خاتون کو جن کا عارضہ لاحق تھا۔ لیکن جنّ حاضر نہیں ہوا۔ ان میاں بیوی کے لیے یہاں ٹھہرنا مشکل تھا۔ یہ لوگ رام پورہ پھول سے آئے ہیں اور واپس جا رہے تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ دو چار روز میں اس کام کے لیے مولانا معین الدین ان کے ہاں پہنچیں۔ چنانچہ مولانا نے وہاں جانے کا وعدہ کر لیا اور مجھے بھی اپنے ساتھ جانے کے لیے کہا۔ اس وقت دن کے تین بجے کے قریب ایک ٹرین لاہور سے دہلی کے لیے روانہ ہوتی تھی جو پانچ بجے کے پس و پیش۔ فیروز پور پہنچتی تھی۔ ہم اس ٹرین پر سوار ہوئے اور تقریباً نو بجے بھٹنڈہ ریلوے اسٹیشن پر اُترے۔ بھٹنڈہ سے چوتھا ریلوے اسٹیشن رام پورہ پھول تھا جو انبالہ بھٹنڈہ ریلوے لائن پر واقع تھا۔ رات کے دس بجے ہم بھٹنڈے سے انبالہ جانے والی ٹرین پر سوار ہوئے اور سوا گیارہ بجے رام پورہ پھول پہنچے۔

رام پورہ اور پھول الگ الگ دو قصبے ہیں جو ایک دوسرے سے متصل ہیں۔ جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں، اس زمانے میں رام پورہ ریاست پٹیالہ میں تھا اور پھول ریاست نابھہ میں۔ دونوں قصبے اس طرح باہم ملے ہوئے اور ایک دوسرے سے قریب تر تھے کہ ایک قصبے کے مکان کی دیوار ریاست پٹیالہ کی حد میں ہے تو چولھا ریاست نابھہ کی حد میں۔ اس قرب و اتصال کی وجہ سے دونوں قصبے الگ الگ ناموں کے باوجود صوتی اعتبار سے ایک ہی مقام کی آہنگ اختیار کر گئے تھے۔ یعنی ''رام پورہ پھول'' ......!

ہم ریلوے اسٹیشن پر اُترے تو میزبان وہاں موجود تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص تھا۔ وہ ہمیں نہایت اعزاز کے ساتھ مہمان خانے میں لے گئے جو دوسری منزل میں تین چار کمروں پر مشتمل تھا۔ سونے کے کمرے کے ساتھ اٹیچڈ باتھ اور پانی کا نلکا تھا۔ نماز کے لیے الگ کمرے میں نیا کپڑا اچھایا گیا تھا۔ سکھ میزبان کے بقول نماز روزے کے پابند مسلمان کے گھر میں ہمارا کھانا تیار کیا گیا تھا۔ مٹھائی بھی مسلمان سے بنوائی گئی تھی۔

کھانا کھا چکے تو میزبان نے باتیں شروع کر دیں اور گزشتہ دور کی کہانی سنانے لگا۔ اس نے بتایا کہ ایک میرا بڑا بھائی تھا جو بیمار تھا۔ جس کمرے میں ہم اس وقت بیٹھے ہیں، اس میں

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ایک دن وہ لیٹا ہوا تھا۔ اس کی بیوی اس کے پاس بیٹھی تھی۔ اسے بیماری کا اتنا سخت دورا پڑا کہ وہ مر گیا۔ اس کی بیوی نے اس کی موت کی کسی کو اطلاع نہیں دی۔ چپکے سے ایک شخص کو بلایا، اس سے کاغذ پر لکھوایا کہ میں نے اتنی زمین اپنی بیوی کو دی اور پھر اس کاغذ پر میرے مردہ بھائی کا انگوٹھا لگوایا۔ بعدازاں اس شخص کو گھر سے نکال کر بیوی نے رونا پیٹنا شروع کر دیا......!
وہ شخص ہمیں یہ باتیں بتا رہا تھا اور ساتھ ساتھ باقاعدہ جگہ کی نشان دہی کر رہا تھا کہ یہاں میرا بھائی مرا تھا۔ یہاں اس کی لاش پڑی تھی اور یہاں اس کا انگوٹھا لگوایا گیا تھا اور یہاں اس کی بیوی بیٹھی تھی۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹا سکھ میزبان ہمیں یہ کتھا سناتا رہا اور ساتھ ساتھ موقعۂ واردات کی نشان دہی کرتا رہا۔ سامنے تھوڑی دور مرگھٹ تھا۔ اس نے اشارہ کر کے بتایا کہ یہاں سے اس کی ارتھی اٹھائی گئی اور وہاں اسے جلایا گیا۔

ایک تو گئے جن نکالنے، دوسرے جگہ اجنبی، تیسرے پوری نشان دہی کے ساتھ بتانے والا ہر بات کا تعین کر رہا ہے، چوتھے گھر غیر مسلم کا...... میں تو سچی بات ہے ڈر گیا۔ بار بار جی چاہا کہ اس سے کہوں کہ یا تو آپ یہاں سے تشریف لے جایئے یا یہ رام کہانی بند کیجیے...... سنتے سنتے برا حال ہو گیا اور دل دہلنے لگا۔

خدا خدا کر کے وہ اُٹھا تو معین الدین سے میں نے کہا: مجھے سخت پیشاب لگ رہا ہے۔
حضرت نے نہایت آرام سے فرمایا: غسل خانہ ساتھ ہی تو ہے، اُٹھو اور پیشاب کر لو۔
عرض کیا: میرا سارا جسم مارے ڈر کے کانپ رہا ہے......موت سامنے کھڑی صاف نظر آ رہی ہے...... اگر یہی حالت رہی تو میں تھوڑی دیر تک مر جاؤں گا...... مجھے اُٹھا کر اور ہاتھ سے پکڑ کر پیشاب کرنے والی جگہ پر بٹھاؤ۔

وہ مجھ بے حال کا مذاق اُڑاتے ہوئے اُٹھے اور پیشاب کرایا......اب اندھے کی طرح مجھے بازوؤں سے پکڑ کر چارپائی پر بٹھانے لگے تو میں نے کہا: میں تو اکیلا نہیں لیٹوں گا۔ آپ کے ساتھ ہی لیٹوں گا۔ چناں چہ میں ان کے ساتھ ہی لیٹا اور دو تین گھنٹوں کی جو رات رہ گئی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

تھی، وہ جنّ بھوتوں کے تصور میں کٹی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے سامنے جن ناچ رہا ہے اور ادھر بھوت دوڑا آ رہا ہے۔

صبح ہوئی تو ناشتہ آ گیا اور میزبان نے ہمیں پھر تسلی کرائی کہ ناشتہ مسلمان کے گھر سے تیار کرایا گیا ہے۔

اب ہم نے مہمان خانے کی بالکونی پر کھڑے ہو کر دیکھا تو نیچے دور تک پھیلے ہوئے دالان میں کتنے ہی کچے مکان اور جھونپڑیاں سی تھیں۔ میزبان نے بتایا کہ یہ اس کے مزارعوں کے گھر ہیں۔ نو بجے کے قریب وہ بیوی کا جن نکالنے کے لیے ہمیں اپنے گھر لے گیا۔ آیے اب دیکھتے ہیں کہ معین الدین جن کیسے نکالتے ہیں۔

مہمان خانے سے چند قدم کے فاصلے پر ہم میزبان کے مکان پر تھے۔ ایک صاف ستھرے کمرے میں چارپائی پر وہ خاتون لیٹی ہوئی تھی۔ تین کرسیاں رکھی گئی تھیں۔ ایک پر خاتون کا شوہر بیٹھ گیا اور دو پر ہم بیٹھ گئے۔ معین الدین نے اس کے شوہر سے کہا:

بی بی پر بڑی سی چادر ڈال دو...... چادر ڈال دی گئی تو انھوں نے کچھ پڑھنا شروع کیا۔ اتنے مُیں بھاری بھرکم سی آواز خاتون کے حلق سے بلند ہوئی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جن حاضر ہو گیا ہے۔ خاتون کے پاؤں سے گھبراہٹ کی وجہ سے چادر سرک گئی۔ مولانا نے اس کے شوہر سے کہا:

بی بی کے پاؤں پر چادر ڈال دو۔

یہ آج سے ۶۷، ۶۸ برس پہلے (اکتوبر ۱۹۴۵ء) کی بات ہے۔ مولانا معین الدین اور جن کا جو مکالمہ مجھے یاد ہے، وہ عرض کرتا ہوں۔ خاتون کی آواز عجیب طرح کی ہو گئی تھی اور وہ دراصل جن کی آواز تھی۔ دونوں کے درمیان مکالمہ پنجابی میں ہوا تھا۔ میں اس کا اُردو ترجمہ کر رہا ہوں۔

مولانا: تمھارا نام کیا ہے؟

جن: نور محمد۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

مولانا: کہاں کے رہنے والے ہو؟

جن: ضلع حصار کا۔

مولانا: اس بے چاری عورت ذات کو کیوں پریشان کرتے ہو؟

جن: اس نے میرا نقصان کیا ہے۔

مولانا: کیا نقصان کیا ہے؟

جن: میں ایک درخت کے سائے میں بیٹھا روٹی پکا رہا تھا۔ یہ وہاں سے گزری، میرے آٹے کو پاؤں کی ٹھوکر ماری اور وہ مٹی میں مل گیا۔

مولانا: اس نے تمھیں روٹی پکاتے اور آٹا لیے بیٹھا دیکھا تھا؟

جن: نہیں۔

مولانا: تم نے اسے اپنی طرف اور اپنے آٹے کی طرف آتے ہوئے دیکھا تھا؟

جن: جی ہاں دیکھا تھا۔

مولانا: اس نے تمھیں نہیں دیکھا تھا...... اگر تم نے اسے دیکھ لیا تھا تو آٹا اُٹھا کر اس کے راستے سے دُور کیوں نہیں کیا؟

اس پر وہ خاموش ہو گیا۔ اب مولانا نے کھڑے ہو کر دونوں کانوں میں انگلیاں ڈالیں اور اونچی آواز سے اذان دینا شروع کر دی...... ادھر اذان کا پہلا کلمہ بلند ہوا اور اُدھر سے آواز آنے لگی، ہائے جل گیا، ہائے مر گیا...... اس اثنا میں چادر پھر خاتون کے پاؤں سے سرک گئی اور اس کی پنڈلیاں نظر آنے لگیں...... مولانا نے اس کے شوہر سے کہا: بی بی کے پاؤں اور ٹانگوں پر اچھی طرح چادر ڈال دو اور اسے ہاتھوں سے دبائے رکھو، اترنے نہ دو۔

مولانا جن سے مخاطب ہوئے اور کہا: تم صحیح صحیح بتاؤ کون ہو؟

جن: میں آپ کے پڑدادے حافظ محمد کا شاگرد ہوں۔

مولانا: ان کے حلقۂ شاگردی میں کہاں رہے؟

جن: لکھو کے میں۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

مولانا: کیا تم نے میرے پڑدادے سے یہ تعلیم حاصل کی ہے کہ عورتوں کو پریشان کرو؟ یہ تعلیم اسلام کے خلاف ہے، میرے پڑدادے نے ہرگز کسی کو یہ تعلیم نہیں دی۔ تم اس عورت کو پریشان نہ کرو اور چلے جاؤ۔

جن: میں آپ کا احترام کرتا ہوں اور آپ کے حکم سے چلا جاتا ہوں۔

مولانا: کوئی نشانی دے جاؤ۔

اس نے مکان کی پختہ دیوار سے ایک اینٹ نیچے گرائی اور بھاری سی آواز میں السلام علیکم کہہ کر چلا گیا۔

کہتے ہیں، جن جاتے ہوئے اگر اس طرح کی کوئی نشانی دے جائے تو دوبارہ نہیں آتا۔ اب وہ خاتون نڈھال ہوگئی تھی۔ اس نے تمام جسم پر اپنے ہاتھوں سے اچھی طرح چادر لپیٹی اور کروٹ لے کر دوسری طرف منہ کر کے لیٹ گئی۔

مولانا نے فرمایا: اب ان شاء اللہ بی بی کو یہ شکایت نہیں ہوگی ...... اور ہم اسی دن دوپہر کے وقت بھٹنڈہ آنے والی ٹرین پر سوار ہوئے اور ایک گاؤں میں آگئے، جس کا نام ''جھنبا'' تھا۔ یہاں ہمارے دو دوست رہتے تھے۔ ایک کا نام حکیم محمد یاسین تھا اور دوسرے ان کے عزیز تھے، محمد جمیل، جو ان سے علم طب پڑھتے تھے۔ ایک رات ہم وہاں رہے۔

رام پورہ پھول کے ہمارے اس سکھ میزبان کے گھر میں کوئی بچہ یا چھوٹا بڑا کوئی فرد نہ تھا۔ صرف دونوں میاں بیوی تھے اور تیسرا ان کا ملازم تھا۔ میں نے اس سے پوچھا آپ کے بچے کہاں ہیں؟ اس نے بتایا ایک بیٹی ہے اور ایک بیٹا۔ دونوں امرتسر کے ایک کالج میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

سکھ مرد کے مقابلے میں سکھ عورت بہت خوب صورت تھی۔ دونوں کو دیکھ کر ایسا لگا جیسے پری دیو کا ساتھ ہو، اس کی پنڈلیاں اس کی سفید چادر سے ہم رنگ تھیں ......

اس سے کچھ عرصہ بعد ۱۹۴۵ء کے انتخابات ہونے والے تھے اور مولانا محی الدین لکھوی نے مجلس احرار کے ٹکٹ پر مسلم لیگ کے امیدوار نواب افتخار حسین خاں آف ممدوٹ کے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

مقابلے میں انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا تھا، اس لیے وہاں سے میں اور مولانا معین الدین انتخابی مہم پر چلے گئے اور مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے مرکز الاسلام پہنچے۔

انھی دنوں مجھے جمعیت علمائے ہند کے مرکزی دفتر (گلی قاسم جان بلی ماراں دہلی) سے ایک میٹنگ میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔ اس دعوت پر مجھے بے حد خوشی ہوئی اور میں تاریخ مقررہ پر اس میٹنگ میں حاضر ہوا۔ پتا چلا کہ جمعیت علمائے ہند نے ان مسلمان جماعتوں کے نمائندوں کو بلایا ہے جو مسلم لیگ کی سیاست سے اختلاف رکھتے تھے، لیکن میں تو کسی ایسی جماعت کا نمائندہ نہ تھا۔ معلوم نہیں میرا پتا جمعیت علمائے ہند کے دفتر کو کس نے دیا۔ بہرکیف ہمیں اس میٹنگ میں شرکت کا فائدہ یہ ہوا کہ مختلف جماعتوں کے متعدد رہنماؤں کو دیکھنے اور ان کی باتیں سننے کا موقع ملا۔ مثلاً مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی، مولانا حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید دہلوی، مولوی فضل الحق شیر بنگال، خواجہ عبدالمجید علی گڑھی، مولانا عبدالمجید سوہدروی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، پروفیسر ہمایوں کبیر اور بہت سے دوسرے حضرات کے ارشادات سننے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس میٹنگ میں مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی بھی شامل تھے۔ مولانا ممدوح کے ساتھ دہلی کے بعض تاجران و ناشران کتب سے بھی ملاقات ہوئی جو مولانا سے بہت مدت سے تعلق رکھتے تھے۔ نیز بعض دینی مدارس میں جانے کا موقع ملا۔ دہلی کی مشہور درس گاہ دارالحدیث رحمانیہ میں بھی ان کے ساتھ گیا۔ وہاں مولانا عبیداللہ رحمانی مبارک پوری اور مولانا نذیر احمد رحمانی املوی کی زیارت کی۔

پہلے بتا چکا ہوں کہ چودھری غلام حسین تہاڑیہ بھی مرکز الاسلام میں فریضۂ تدریس انجام دیتے تھے۔ ہم دونوں نے مرکز الاسلام کے ماحول اور وہاں کی فضا سے دلی دوستی قائم کر لی تھی اور ہم وہاں بہت خوش تھے۔ ۳۵۔ ۳۵ روپے ہماری ماہانہ تنخواہ تھی جو اس دور میں معقول تنخواہ تھی۔ اردگرد کے بہت سے لوگوں سے ہمارے مراسم پیدا ہو گئے تھے۔ ہفتے میں ایک مرتبہ ہم کسی نہ کسی گاؤں کا تبلیغی دورہ کیا کرتے تھے۔ تبلیغ کا مجھ سے زیادہ چودھری غلام حسین تہاڑیہ کو شوق تھا۔

اندھیری رات کو مرکز الاسلام میں اور ہی قسم کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ آسمان کی طرف

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

نگاہ ڈالو تو معلوم ہوتا تھا کہ تاروں کا راج ہے اور کہکشاؤں کی بادشاہت ...... چاندنی رات میں ہر سو نور کی بہار۔

ان دنوں میرے ایک قریبی رشتے دار اور دوست عبدالقیوم بھٹی ریلوے کے محکمے میں ملازم تھے اور فاضلکا بنگلہ میں متعین تھے۔ وہ خوب صورت اور طویل قامت جوان تھے۔ مرکز الاسلام سے فاضلکا بنگلہ چوتھا ریلوے اسٹیشن تھا۔ عبدالقیوم کبھی کبھی میرے پاس مرکز الاسلام آ جاتے تھے۔ ان کی تعلیم میٹرک تک تھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ لاہور آئے، یہاں انھوں نے منشی فاضل کا امتحان دیا۔ پھر بی۔ اے پاس کر کے لا کالج میں داخلہ لیا اور کامیابی کے بعد وکالت کرنے لگے۔ افسوس ہے ۴۔ اپریل ۲۰۰۵ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ میں نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔

پہلے بتا چکا ہوں کہ مرکز الاسلام میں مہمانوں کی بہ کثرت آمد و رفت رہتی تھی۔ ایک مرتبہ رات کے آٹھ بجے کے پس و پیش میں اور چودھری غلام حسین تہاڑیہ اپنے کمرے میں مطالعہ میں مصروف تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ شدید سردی کا موسم اور اندھیری شب! جنگل کی کھلی فضا میں ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے نصف رات بیت چکی ہے۔ میں نے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ ایک نوجوان مرد اور ایک نوجوان لڑکی کھڑے ہیں۔ مرد کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی گٹھڑی ہے۔ بولا:

ہم مسافر ہیں اور یہاں رات رہنا چاہتے ہیں۔

میں نے پوچھا: اس وقت کہاں سے آئے؟

جواب دیا: ریل سے اُترے ہیں۔

میں نے کہا: ریل کو گزرے ڈیڑھ گھنٹا ہو گیا، اب تک کہاں رہے؟

کہا: راستہ بھول گئے تھے۔

میں نے آسمان کی طرف دیکھا تو وہاں ستاروں کی حکمرانی تھی اور کہکشاؤں کا راج! بڑے چھوٹے لاکھوں ستارے ایک دوسرے میں گھسے ہوئے عجب منظر پیش کر رہے تھے۔

میں نے اس سے کہا: بی بی کو عورتوں میں مولانا کے گھر بھیج دیتے ہیں، تم مہمان خانے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

میں لیٹ جاؤ۔

اس نے کہا: یہ گھر نہیں جائے گی، میرے پاس ہی رہے گی۔ عورت نے بھی یہی کہا کہ میں اسی کے پاس رہوں گی، گھر نہیں جاؤں گی۔

وہ دونوں مہمان خانے میں چلے گئے تو میں نے چودھری غلام حسین سے کہا: یہ شخص اس عورت کو اغوا کر کے لایا ہے۔

انھوں نے کہا: تمھیں کیسے پتا چلا؟

میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا: ولی را ولی می شناسد۔

تھوڑی دیر بعد میں نے مولانا معین الدین کو بلا لیا۔ وہ ہمارے کمرے میں بیٹھ گئے۔ میں نے جا کر مہمان خانے کا دروازہ کھٹکھٹایا مگر کوئی جواب نہ آیا۔ پھر کھٹکھٹایا تو اب بھی خاموشی رہی۔ تیسری دفعہ دروازہ کھٹکھٹا کر میں نے سختی سے کہا: دروازہ کھولتے ہو یا نہیں۔ ایسے مواقع پر خطرہ بھی ہوتا ہے کہ اس کے پاس کوئی اسلحہ وغیرہ نہ ہو۔

دروازہ کھلا تو میں نے پوچھا: سچ بتاؤ، تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو، اور تمھارا آپس میں کیا رشتہ ہے؟

مرد نے کہا: یہ میری بیوی ہے۔ عورت نے بھی یہی جواب دیا۔ میں نے چند سوالات کیے تو مرد کے قدم اُکھڑ گئے۔ لیکن عورت اپنے موقف پر قائم رہی۔ پھر دو چار سوال اس سے اور پوچھے تو وہ بھی اپنی جگہ سے ہل گئی۔ میں نے کہا: اگر کھوج لگاتے ہوئے تمھارے وارث یہاں آ گئے تو کیا ہوگا؟

نمازِ فجر سے پہلے ہی وہ مہمان خانہ چھوڑ کر چلے گئے۔

تقسیم ملک (اگست ۱۹۴۷ء) تک ہم مرکز الاسلام کی کھلی فضا میں رہے۔

۱۵ر جنوری ۲۰۰۸ء　　　　بہاول نگر

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

نواں باب:

سیاست اور قید و بند

ہر شخص کوئی نہ کوئی سیاسی ذہن رکھتا ہے اور اپنے علم و مطالعہ کی رُو سے سیاسیات میں کسی جماعت یا کسی شخصیت سے متاثر بھی ہوتا ہے اور کسی موقعے پر یہ تاثر اس کی زبان پر بھی آ جاتا ہے اور پھر عملی شکل بھی اختیار کر لیتا ہے۔ میں بھی سیاسیات میں اپنے علم و مطالعہ کی روشنی میں کسی سے متاثر تھا اور پھر اس تاثر کا اظہار زبان سے بھی ہوا اور اس نے عملی شکل بھی اختیار کی۔

شرح اس متن کی یہ ہے کہ ہم لوگ ایک ریاست کے رہنے والے تھے اور برصغیر میں چھوٹی بڑی ساڑھے پانچ سو سے زیادہ ریاستیں تھیں۔ بعض ریاستوں کے حکمران مسلمان تھے، بعض کے راجپوت غیر مسلم، بعض کے ہندو، بعض کے سکھ۔ پنجاب کی آٹھ ریاستوں میں صرف ایک ریاست مالیر کوٹلہ کا حکمران مسلمان تھا، باقی ریاستوں کے حکمران سکھ مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔

برصغیر کی ریاستوں کے باشندوں کو اس طرح سیاسی آزادی حاصل نہ تھی، جس طرح انگریزی علاقوں کے لوگوں کو حاصل تھی۔ وہ لوگ اپنی اپنی ریاست میں مذہبی جلسے تو کر سکتے تھے۔ مذہبی نوعیت کے مباحثوں اور مناظروں کی بھی انھیں اجازت تھی، لیکن سیاسی جلسے جلوس کی اجازت نہ تھی۔ مذہب کی تبلیغ کے لیے مذہبی انجمنیں قائم کی جا سکتی تھیں، ان انجمنوں کے ماتحت مذہبی ادارے اور مدرسے بھی جاری کیے جا سکتے تھے اور کیے جاتے تھے، لیکن سیاسی جماعتوں کا قیام ممنوع تھا۔

ریاستوں کے لوگ دوہری محکومی میں زندگی بسر کرتے تھے۔ ایک انگریزوں کی محکومی اور ایک راجوں اور نوابوں کی محکومی ......! راجے اور نواب اپنی ریاستوں کے مالک تھے اور جو جی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

چاہے کرتے تھے۔ انگریزی حکومت کے سوا کوئی انھیں کسی کام سے روک نہیں سکتا تھا۔ ہر معاملے میں انھیں آزادی حاصل تھی۔ یعنی ان کا اندازِ حکمرانی، انگریزوں کے اندازِ حکمرانی سے سخت تھا۔ اور اپنی رعایا پر ان کی گرفت بہت مضبوط تھی۔

ہماری ریاست فرید کوٹ میں بھی یہی صورتِ حال تھی۔ سکھوں اور مسلمانوں میں کچھ ایسے افراد ضرور تھے جو سیاسی ذہن رکھتے اور ریاست میں تحریر و تقریر کی آزادی کے خواہاں تھے اور اس کے لیے کوشاں بھی تھے، لیکن ابتدا میں ان کی تعداد بہت محدود تھی۔ پھر آہستہ آہستہ حالات بدلتے گئے اور ان کی تعداد بڑھتی گئی۔ لوگ دیکھتے اور سوچتے تھے کہ جب ہمارے ہمسائے انگریزی علاقے میں بہت حد تک تحریر و تقریر کی آزادی حاصل ہے اور وہاں کے باشندے اپنے بنیادی مطالبات منوانے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں تو ہمیں بھی جدوجہد کرنی چاہیے اور ریاستی حکمران سے مطالبہ کرنا چاہیے کہ جب تک ملک آزاد نہیں ہو جاتا، ہمیں وہ حقوق حاصل ہونے چاہئیں جو انگریزی علاقوں کے باشندوں کو حاصل ہیں۔

۱۹۳۳ء میں کوٹ کپورہ میں خطابت و تدریسی خدمات سرانجام دینے کے لیے مولانا عطاء اللہ حنیف تشریف لے گئے تھے۔ وہ سیاسی نقطۂ نظر سے مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی، مولانا محمد اسماعیل سلفی، مولانا ابوالقاسم بنارسی، مولانا محمد علی لکھوی، مولانا عبدالقادر قصوری اور اس ذہن کے دیگر حضرات سے متاثر تھے اور انھی افکار کے حامل تھے، جن افکار کے یہ بزرگانِ دین حامل تھے۔ ریاستی ماحول کے مطابق اگرچہ وہ ان افکار کے اظہار میں بہت محتاط تھے، مگر پھر بھی کسی نہ کسی انداز میں اندر کی بات زبان پر آجاتی تھی۔ لوگ اخبار بھی پڑھتے تھے اور اشاروں کنایوں کی زبان بھی خوب سمجھتے تھے۔ غرض وہاں کے مسلمانوں پر مولانا ممدوح کے سیاسی زاویۂ فکر نے بہت اثر ڈالا۔ وہ ۱۹۳۶ء کے آخر تک وہاں رہے۔

کشمیر کے شیخ عبداللہ نے اپنے ساتھیوں کے مشورے سے ایک سیاسی جماعت آل انڈیا سٹیٹس پیپلز کانفرنس بنائی تھی۔ یہ جماعت اگرچہ زیادہ عرصہ قائم نہ رہی، لیکن ریاستوں میں

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

اس کے اثرات ضرور پھیلے جو جلد ہی ایک تحریک کی صورت اختیار کر گئے۔ ریاست فرید کوٹ کے لوگ بھی اس سے متاثر ہوئے۔ اس تاثر کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۳۹ء میں وہاں کے دس بارہ افراد کو ریاستی حکومت نے گرفتار کر کے تین تین سال کی قید اور تین تین سو روپے جرمانہ کر دیا۔ جرمانہ ادا نہ کرنے کی صورت میں چھ چھ مہینے مزید سزا کا حکم سنایا گیا۔ چناں چہ یہ لوگ ساڑھے تین تین سال جیل میں رہے۔ ان میں پانچ مسلمان تھے مولوی محمد سلیمان، قاضی عبیداللہ، حاجی خیرالدین، محمد حسین اور غلام محمد ...... چار پانچ سکھ تھے اور وہ تھے گیانی ذیل سنگھ (جو آزادیٔ وطن کے کئی سال بعد ہندوستان کے منصب صدارت پر فائز ہوئے) بھائی دیال سنگھ، لہنا سنگھ اور رام سنگھ۔ ہندو قیدیوں میں ایک کا نام جگدیش تھا اور ایک کا بہاری لال دیوانہ۔

ان لوگوں کی رہائی کے بعد حالات تبدیل ہوئے اور ریاستی حکومت کی مخالفت میں تیزی آ گئی۔ اس سلسلے میں مختلف مقامات میں جو میٹنگیں ہوتی تھیں، چھوٹی عمر کے باوجود میں بھی ان میں شریک ہوتا تھا۔ پولیس ان میٹنگوں کا خیال رکھتی تھی۔ بعض دفعہ موقعے پر پکڑے بھی جاتے تھے۔ بعض دفعہ پولیس کی پہنچ سے پہلے اِدھر اُدھر ہو جاتے تھے۔

سیاست نہایت دلچسپ مشغلہ ہے۔ جو لوگ یہ مشغلہ اختیار کر لیں، ان کے لیے اسے ترک کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اگر اس میں عملی حصہ لینا چھوڑ بھی دیں تو اس سے کسی نہ کسی سطح کا تعلق بہر حال رہتا ہے۔

پنجابی محاورے کے مطابق چور چوریوں جاندا اے ہیرا پھیریوں نہیں جاندا۔ یعنی چور چوری کرنا تو چھوڑ دیتا ہے لیکن ہیرا پھیری نہیں چھوڑتا۔

پنجاب کی آٹھ ریاستیں تھیں۔ پٹیالہ، نابھہ، کپورتھلہ، فرید کوٹ، جیند، مالیر کوٹلہ۔ کلسیہ اور نالا گڑھ۔

ان ریاستوں میں سیاسی جماعت ریاستی پرجا منڈل کے نام سے بنائی گئی تھی۔ یہ جماعت الگ الگ پنجاب کی تمام ریاستوں میں قائم تھی۔ ریاست پٹیالہ پنجاب کی سب سے بڑی ریاست تھی۔ وہاں کی پرجا منڈل کے صدر خواجہ عبدالرب تھے۔ نابھہ کی پرجا منڈل کے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

عبدالرشید، مالیر کوٹلہ کے خواجہ نور الدین اور ریاست فرید کوٹ کی پرجا منڈل کے صدر گیانی ذیل سنگھ تھے۔ جنرل سیکرٹری پہلے قاضی عبید اللہ کو بنایا گیا تھا۔ پھر مجھے بنایا گیا۔ پرجا منڈل پنجاب کی ریاستوں میں کانگرس کا بدل تھی۔ پرجا کے معنے عوام، رعایا اور منڈل کے معنے ہیں پارٹی، یعنی عوام کی پارٹی۔ اسے آپ پیپلز پارٹی بھی کہہ سکتے ہیں۔

ریاست فرید کوٹ میں تحریک آزادی شروع کی گئی تو آہستہ آہستہ اس کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا۔ کئی دفعہ کئی لوگ گرفتار ہوئے اور کئی دفعہ انھیں رہا کیا گیا۔ ایک دن کوٹ کپورہ کے دس بارہ آدمیوں کو گرفتار کر کے تھانے لایا گیا۔ ان میں چھ سات مسلمان تھے، جن میں مَیں بھی شامل تھا۔ وہیں نماز کا وقت ہو گیا۔ پولیس میں سکھ بھی تھے اور مسلمان بھی۔ ہم نے کہا: ہمارے لیے نماز کا انتظام کیا جائے۔ چناں چہ وضو کے لیے پانی دیا گیا اور نماز کے لیے تھانے کے گودام سے دھوبی کے دھلے ہوئے سفید کھیس دیے گئے۔ ہم نے باجماعت نمازیں پڑھیں۔ امامت ایک شخص عبدالغنی نے کرائی جو ہمارے نزدیک سب سے نیک آدمی تھے۔ مسلمان پولیس والوں نے بھی ہمارے ساتھ نمازیں پڑھیں۔ شام کے بعد ہمیں گھر جانے کی اجازت دے دی گئی اور صبح کو دوبارہ آنے کو کہا گیا۔ چند روز یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔

پھر ریاست میں دفعہ ۱۴۴ لگا دیا گیا اور جلسے جلوس کی ممانعت کر دی گئی۔ اس اثنا میں ہم نے فیروز پور جانے کا فیصلہ کیا اور وہاں کے گوکھلے ہال کو اپنا مسکن بنالیا۔

گوکھلے ہال جس سیاسی رہنما کی طرف منسوب تھا، اس کا پورا نام گوپال کرشنا گوکھلے تھا۔ اس نے ۱۹۰۵ء کے کانگرس کے بنارس اجلاس کی صدارت کی تھی۔ اس وقت وہ بغیر چھت کے اوپن ہال تھا۔ چاروں طرف بڑی بڑی دیواریں تھیں۔ صرف ایک کمرہ تھا، جس میں چند کرسیاں دو ایک میزیں اور پانچ چھ دریاں رکھی ہوئی تھیں۔

فیروز پور میں اس وقت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی قیام فرماتے تھے، وہ عام طور سے شام کو ہمارے ہاں تشریف لے آتے تھے۔ شہر کی مجلس احرار کے ارکان تعداد میں کم ہونے کے باوجود بہت بااثر اور جی دار لوگ تھے، ان کی بھی آمد و رفت رہتی تھی۔ پھر شہر کی کانگرس کمیٹی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کے عہدے دار اور اس کے ارکان کا آنا جانا بھی رہتا تھا۔ مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی شہر کی کانگرس کمیٹی کے نائب صدر تھے۔ جامع مسجد اہل حدیث گنبداں والی کے خطیب و مدرس ہونے کی وجہ سے وہاں کے مذہبی حلقوں کی وہ مؤثر شخصیت تھے اور شہر کی کانگرس کمیٹی کی نائب صدارت کی بنا پر اس نواح کے سیاسی دائروں میں ان کا اثر تھا۔

ریاست فرید کوٹ کے سرکاری حلقے ہماری ان سرگرمیوں سے باخبر تھے اور اس سے خوف زدہ بھی تھے۔ کیوں کہ اس سے ریاست کے سیاسی کارکنوں کی آواز ریاست کے اردگرد دور تک پھیل رہی تھی۔ ریاست کی جغرافیائی حد ضلع فیروز پور سے ملحق تھی اور شہر فرید کوٹ جو ریاست کا دارالحکومت تھا، فیروز پور شہر سے صرف اکیس میل کے فاصلے پر تھا۔ آج کل کے حساب سے زیادہ سے زیادہ تیس کیلومیٹر کی مسافت پر۔

فیروز پور کے گوکھلے ہال میں تقریباً دو مہینے ہمارا قیام رہا۔ اس اثنا میں لاہور کے روزنامہ اخبارات میں ہمارے متعلق خبریں شائع ہونے لگی تھیں۔

اب باقاعدہ منصوبے کے تحت ہم فرید کوٹ کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچے۔ یہ انگریزی علاقہ تھا اور ریاستی حکومت کی پہنچ سے باہر۔ گیانی ذیل سنگھ ہمارے ساتھ تھے۔ وہاں بہت بڑا مجمع اکٹھا ہوگیا۔ ریلوے کے انگریزی علاقے سے باہر ریاستی پولیس کثیر تعداد میں اپنی گاڑیاں لیے ہمیں گرفتار کرنے کے لیے کھڑی تھی۔ جون کا مہینا، سخت گرمی۔ ہم پلیٹ فارم سے نکل کر شیشم کے درختوں کے نیچے آ گئے۔ اس سے چند قدم پر ریاست کی حد تھی۔ ہم نے ایک جتھا بنا کر دفعہ ۱۴۴ توڑنے کے لیے ریاستی حد میں داخل ہونا تھا۔ ہمارا یہ پہلا جتھا تھا۔ اس کے بعد دفعہ ۱۴۴ توڑنے کے لیے مزید جتھے تیار کھڑے تھے۔

جب لوگوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ ریلوے اسٹیشن پر بھی بے شمار آدمی جمع ہوگئے اور ریاست کی حد میں بھی ۱۴۴ کے باوجود کثیر تعداد میں لوگ اکٹھے ہوگئے تو پروگرام کے مطابق ہمارا پانچ آدمیوں کا جتھا جو قاضی عبیداللہ، بھائی دیال سنگھ، چیتن دیو، لہنا سنگھ اور ان سطور کے راقم پر مشتمل تھا، حرکت میں آیا اور ہم انقلاب زندہ باد...... مولانا ابوالکلام آزاد زندہ باد......

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

آزاد ہندوستان زندہ باد ...... ریاستی پرجا منڈل زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے آگے بڑھے۔ اُدھر ریلوے اسٹیشن میں اور ریاست کی حد میں جو لوگ کھڑے تھے وہ بھی گرم جوشی سے ہمارے نعروں کے جواب دینے لگے۔ یہ بے حد پُرجوش ماحول اور ہنگامہ خیز وقت تھا۔ ہمارے استاذِ محترم مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی ان دنوں فیروز پور کی مسجد گنبداں والی کے منصب خطابت و تدریس پر فائز تھے، وہ بھی اس وقت فرید کوٹ کے ریلوے اسٹیشن میں کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

ہم نے جوں ہی ریلوے اسٹیشن کے انگریزی علاقے کی حد سے نکل کر ریاست فرید کوٹ کی حد میں قدم رکھا، ریاست کی پولیس نے گرفتار کر کے ہمیں اپنی گاڑی میں بٹھالیا۔ ہم گاڑی کی جالی سے باہر دیکھ رہے تھے، لوگ سڑک کے دونوں طرف کھڑے نعرے لگا رہے تھے۔ ہم بھی اندر سے ہاتھ ہلا کر ان کے نعروں کے جواب دے رہے تھے۔ پولیس بھی کثیر تعداد میں کھڑی تھی۔ ہمیں گرفتار کر کے فرید کوٹ کے تھانے لایا گیا اور ہمارے نام پتے وغیرہ لکھ کر اسی گاڑی میں جیل پہنچا دیا گیا۔ تھانے سے جیل تک بے شمار لوگ سڑک کے دونوں طرف کھڑے تھے۔

اب ہمارے سامنے جیل کی ہیبت ناک ڈیوڑھی تھی۔ اس کے دیو ہیکل پھاٹک کھول کر ہمیں جیل کے اندر کر دیا گیا اور پیچھے سے پھاٹک بند کر دیا گیا۔ ڈیوڑھی کے باہر اور دائیں بائیں، جیل کی پولیس، جیل کا سپرنٹنڈنٹ اور چھوٹے بڑے بہت سے اہل کار موجود تھے۔ وہاں ہمارے نام اور ولدیت وغیرہ پورے کوائف لکھے گئے، تلاشی لی گئی اور گھڑیاں، نقدی اور قلم وغیرہ چیزیں ایک رجسٹر میں لکھ کر قبضے میں کر لی گئیں۔ کہا گیا کہ تم جیل سے رہا ہو کر باہر آؤ گے تو یہ چیزیں تمھیں واپس کر دی جائیں گی۔ حکم ہوا کہ ان لوگوں کو بارک نمبر ۱۴ میں بند کر دیا جائے۔ ہمیں بارک نمبر ۱۴ میں لے جایا گیا جو بالکل خالی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اور لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس طرح شام تک بہت سے لوگ جیل میں آ گئے۔ رات ہنستے کھیلتے بسر کی۔ رات کو جیل کے برج پر کھڑے آدمی کی طرف سے آواز آتی رہی: بارک نمبر ایک۔ بارک

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

نمبر دو۔ بارک نمبر تین اور جیل کے چاروں طرف گھومتے ہوئے ٹھیکری پہرے دار کی طرف سے جواب ملتا گیا ''سب اچھا''!!

صبح ہوئی تو جیل کے دس بارہ اہل کار آئے اور کھڑے کھڑے ایک رجسٹر میں کچھ لکھنے لگے۔ اس کے بعد قدرے بلند آواز سے ایک ایک آدمی کا نام پکارا گیا اور اس طرح تیرہ آدمیوں کو الگ کرلیا گیا، جن میں میرا نام بھی تھا۔ ہم تیرہ آدمیوں کو انھوں نے بارک نمبر ۱۴ سے نکالا۔ جیل کے ایک اہل کار نے ہاتھ میں چابیوں کا گچھا پکڑا۔ جیل کی پولیس نے ہم تیرہ آدمیوں کو گھیرے میں لیا اور کہا: چلو ہمارے ساتھ۔!

تقریباً پچاس قدم کے فاصلے پر ایک دروازے کے سامنے ہمیں کھڑا کر دیا گیا۔ پھر اس کا تالا کھول کر ایک صحن میں لایا گیا اور چھ آدمیوں کو سامنے کی تنگ سی چھ کوٹھڑیوں میں ایک ایک کو بند کر کے سب کو تالے لگا دیے گئے اور ایک وارڈن ہم پر مقرر کر دیا گیا، جس کا نام بھاگ سنگھ تھا۔ چھ آدمیوں کو اس سے پچھلی کوٹھڑیوں میں بند کر دیا گیا۔ تیرھویں کو کسی اور جگہ لے گئے۔ ان کوٹھڑیوں کو جیل کی بولی میں ''سنگین کوٹھڑیاں'' کہا جاتا تھا، جو ایک دوسری کے برابر برابر تھیں۔ ہمارے آنے سے پہلے ان میں مرچیں بھری ہوئی تھیں اور خالی کرانے کے باوجود ان میں سے مرچوں کی سخت بو آ رہی تھی۔ جو ناک اور حلق میں گھس رہی تھی۔ کالے رنگ کا ایک ایک پرانا کمبل اور لوہے کی ایک ایک تھالی جسے وہ اپنی اصطلاح میں باٹی کہتے ہیں، ہمیں دے دی گئی اور ایک چھوٹا سا پانی کا مٹکا رکھ دیا گیا۔ یہ ہماری کل جائیداد تھی۔ کوٹھڑیوں کے اندر دروازوں میں بیٹھ کر ہم ایک دوسرے سے باتیں تو کر لیتے تھے، لیکن کسی کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ وارڈن کو ہدایت کر دی گئی کہ ہمیں کسی وقت بھی کوٹھڑیوں سے باہر نہ نکالا جائے۔ لیکن وہ باہر کا دروازہ بند کر کے تھوڑی دیر کے لیے ہمیں کوٹھڑیوں سے نکال دیتا تھا اور ہم آپس میں مل لیتے تھے۔

ہمارے بالکل سامنے کی دیوار سے اس پار تین پھانسی گھاٹ تھے، جنھیں ہم ایڑیاں اٹھا کر دیکھ سکتے تھے۔ ہمارے زمانۂ قید میں کچھ لوگوں کو پھانسی بھی دی گئی تھی جو سکھ مذہب سے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

تعلق رکھتے تھے اور وہ اپنے مذہب کے مطابق عبادت کرتے رہتے تھے۔ جس صبح کو انھیں پھانسی دینا تھی، اس پوری رات وہ بلند آواز سے مصروفِ عبادت رہے۔

اب ان سنگین کوٹھڑیوں میں پہلی رات آئی تو برج پر کھڑے پہرے دار کی طرف سے پھر وہی آوازیں آنے لگیں: بارک نمبر ایک۔ بارک نمبر دو۔ جواب وہی ''سب اچھا۔'' لیکن بارک نمبر چودہ کی آواز نہیں آئی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ بارک قیدیوں سے خالی ہوگئی ہے اور ہماری گرفتاری کے بعد جلوس نکالنے والے جن لوگوں کو گزشتہ رات اس بارک میں بند کیا گیا تھا، انھیں یا تو ہماری طرح کہیں اور منتقل کر دیا گیا ہے یا جیل سے نکال دیا گیا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جب ہم تیرہ آدمیوں کو سنگین کوٹھڑیوں میں لایا گیا تو باقی لوگوں کو جیل سے رہا کر دیا گیا تھا۔ ریاستی حکومت کے نزدیک خطرناک صرف ہم تیرہ آدمی تھے، جنھیں سنگین کوٹھڑیوں میں بند کرنا ضروری سمجھا گیا تھا۔

تیرہ میں سے چار مسلمان تھے، میں، قاضی عبیداللہ، صوفی خوشی محمد اور دوست محمد خاں۔ دو ہندو تھے اور سات سکھ۔ دو ہندوؤں میں سے ایک نے چند روز کے بعد معافی مانگ لی تھی اور اسے رہا کر دیا گیا تھا۔

اس وقت ریاست میں دو افسر عجائب سنگھ نام کے تھے، جن سے ہمیں واسطہ پڑا۔ ایک عجائب سنگھ انسپکٹر پولیس تھا، نہایت سخت گیر۔ ایک عجائب سنگھ داروغہ جیل بے حد شریف اور رحم دل۔ جیل کے قریب اونچے اونچے ریت کے ٹیلے تھے۔ آندھی آتی تو ریت کا تیز ریلا ہماری کوٹھڑیوں پر ہلہ بول دیتا۔ ایک رات سخت آندھی چل رہی تھی اور ہم اپنی کوٹھڑیوں میں منہ سر لپیٹ کر لیٹے ہوئے تھے کہ چار پانچ آدمی آئے۔ مختلف کوٹھڑیوں میں گئے، ان سے کچھ باتیں کیں۔ میری کوٹھڑی کے ساتھ قاضی عبیداللہ کی کوٹھڑی تھی۔ ان سے کچھ باتیں کیں، اس کے بعد میری کوٹھڑی کے دروازے پر آکر بیٹھ گئے۔ بتایا گیا کہ یہ پولیس انسپکٹر عجائب سنگھ ہیں اور تم سے کوئی بات کرنا چاہتے ہیں۔ انسپکٹر صاحب نے بات یہ کی کہ تم کم عمر ہو، اپنی زندگی خراب نہ کرو۔ معلوم نہیں جیل میں کتنا عرصہ رہنا پڑے۔ پرجا منڈل کو چھوڑ دو، جو کچھ اب تک

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کیا ہے، اس کی معافی مانگو اور جیل سے رہا ہو کر گھر جاؤ۔ تمھیں اچھی سی سرکاری ملازمت بھی مل جائے گی۔ میں نے کہا میں معافی نہیں مانگ سکتا۔ معافی مانگنے کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ اب تک کیا ہے، وہ سب غلط تھا، حالاں کہ وہ سب صحیح ہے۔ انھوں نے کہا: مسلم لیگ میں شامل ہو جاؤ۔ یہ مسلمانوں کی جماعت ہے اور ریاست میں قائم ہے۔ میں نے کہا: ریاست میں اگر کوئی سیاسی جماعت بنانا ممنوع ہے تو مسلم لیگ کیوں بنائی گئی ہے؟ یہ بھی تو سیاسی جماعت ہے۔

مسلمانوں کو پرجامنڈل سے الگ کرنے کے لیے چند سرکاری لوگوں نے مسلم لیگ بنائی تھی، جسے وہاں سرکاری مسلم لیگ کہا جاتا تھا۔ ایسے مواقع پر مسلم لیگ ہی سے کام لیا جاتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد ایوب خان نے کنونشن مسلم لیگ بنائی۔ ضیاء الحق نے جونیجو مسلم لیگ قائم فرمائی اور پرویز مشرف نے قائداعظم مسلم لیگ سے کام چلایا۔ سبحان تیری قدرت۔

انسپکٹر عجائب سنگھ نے آخر میں یہ دھمکی دی کہ تم پرجامنڈل نہیں چھوڑو گے تو تمھاری جائداد ضبط کر لی جائے گی۔ میں نے کہا: بے شک میری جائداد ضبط کر لیجیے۔ میری کوئی جائداد نہ تھی۔ جو کچھ تھا میرے والد کے نام تھا۔

آزادی کے بعد سنا تھا کہ انسپکٹر عجائب سنگھ کو کوئی ایسی بیماری لاحق ہو گئی تھی کہ اس نے نہر میں چھلانگ لگائی اور ڈوب کر مر گیا۔

ہماری گرفتاری پر پچیس چھبیس دن گزرے تھے کہ ایک دن دس بجے کے قریب داروغۂ جیل عجائب سنگھ آیا۔ وارڈن بھاگ سنگھ کو ہماری کوٹھڑیوں کے تالے کھولنے کا حکم دیا اور بڑے نرم الفاظ میں ہمیں کہا کہ آج سے جیل ہی میں آپ کے خلاف مقدمہ شروع ہو رہا ہے۔ مجسٹریٹ صاحب آ گئے ہیں۔ مَیں آپ لوگوں کو لینے آیا ہوں۔ جس جرم میں آپ کو گرفتار کیا گیا ہے، مجسٹریٹ صاحب اس کی تفصیل بتائیں گے۔

ہم گئے تو مجسٹریٹ صاحب کرسی پر تشریف فرما تھے۔ چند پولیس والے بھی موجود تھے۔ مجسٹریٹ نے ہمیں وہ دفعات بتائیں جن کے تحت ہم پر مقدمہ قائم کیا گیا تھا اور ہر دفعہ کے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

تحت جو سزا دی جا سکتی تھی، اس کا ذکر کیا۔ عدالت میں ہماری یہ پہلی پیشی تھی۔ ایک گھنٹا ہم مجسٹریٹ کی عدالت میں رہے ہوں گے۔ اس کے بعد جیل کے عملے کے ساتھ داروغہ جیل عجائب سنگھ ہمیں ہماری کوٹھڑیوں میں بند کر کے چلے گئے۔

پھر پیشیوں کا ایک سلسلہ چلا جو کئی دن جاری رہا۔ جیل میں ہمیں نہ کوئی مل سکتا تھا اور نہ اخبار یا کتاب پڑھنے کی اجازت تھی۔ ہم باہر کی دنیا سے بالکل بے خبر تھے۔ صبح شام روٹی دینے کے لیے جولانگری آتے تھے۔ وہ دراصل کئی کئی سال پرانے قیدی ہوتے تھے، جن کا چال چلن اچھا ہوتا، انھیں قیدیوں کے نمبر دار بنا دیا جاتا تھا اور انھیں نمبر دار قیدی کہا جاتا تھا۔ ہم سے وہ بہت عزت کا برتاؤ کرتے تھے اور نرم الفاظ میں کہا کرتے تھے کہ عام قیدیوں کو دو دو روٹیاں دی جاتی ہیں، سبزی یا بھاجی بھی اس کے مطابق دی جاتی ہے، لیکن آپ قومی قیدی ہیں اور ملک اور قوم کی خدمت کر رہے ہیں، اسی خدمت کی وجہ سے آپ لوگوں کو جیل میں بند کیا گیا ہے، آپ جتنی روٹیاں اور جتنی سبزی چاہیں لے سکتے ہیں۔ آپ ہم سے یہ خدمت لیں گے تو ہمیں خوشی ہوگی اور ہم آپ کی یہی خدمت کر سکتے ہیں۔

جیل میں ہماری پیشیوں کا سلسلہ جاری تھا اور مقدمہ چل رہا تھا کہ ایک دن داروغہ جیل عجائب سنگھ آیا اور کہا کہ مَیں کپڑے دھونے کا صابن بھجوا رہا ہوں، آپ مہربانی کر کے آج کپڑے دھولیں۔ کل دس بجے کے قریب میں آپ لوگوں کے پاس آؤں گا۔ وہ کپڑے دھونے اور صابن ملنے کا دن نہیں تھا۔ ہم حیران ہوئے کہ کپڑے دھونے کو کیوں کہا گیا ہے۔ وقت مقررہ پر دوسرے دن وہ آئے اور ہمیں ہماری کوٹھڑیوں سے نکالا اور کہا کہ ریاست کے چیف سیکرٹری سردار رام سنگھ کے ساتھ لاہور سے ایک لیڈر آپ سے ملاقات کے لیے آئے ہیں۔

ہم ڈیوڑھی میں گئے تو پتا چلا کہ وہ پنجاب کانگرس کے صدر ڈاکٹر سیف الدین کچلو ہیں۔ ہماری گرفتاری کے وقت پنجاب کانگرس کے صدر مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی تھے۔ چناں چہ میں نے ان سے کہا کہ پنجاب کانگرس کے صدر تو مولانا داؤد غزنوی تھے۔ انھوں نے بتایا کہ چند روز پہلے مجھے صدر منتخب کیا گیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ باہر تحریک بڑے زور سے چل

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

رہی ہے۔ مہاراجا فرید کوٹ کی گفتگو پہلے مولانا ابوالکلام آزاد سے ہوئی تھی، اب پنڈت جواہر لال نہرو سے ہو رہی ہے۔ تحریک کی شدت سے ریاستی حکومت بہت پریشان ہے۔ چند روز میں آپ لوگوں کو رہا کر دیا جائے گا۔ جب یہ باتیں انھوں نے ہم سے کیں، اس وقت چیف سیکرٹری رام سنگھ وہاں موجود نہیں تھے۔ انھیں پنجاب کانگرس کمیٹی کے صدر ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے باہر بھیج دیا تھا۔

ڈاکٹر سیف الدین کچلو امرتسر کے رہنے والے تھے۔ مسلکاً اہل حدیث تھے اور مولانا ثناء اللہ امرتسری کے سخت معتقد تھے۔ آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کے بعض جلسوں میں شامل ہوئے اور ان میں تقریریں کی تھیں جو اخبار ''اہل حدیث'' (امرتسر) میں شائع ہوئی تھیں۔ کشمیری برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ ''کچلو'' کشمیریوں کی ایک گوت کا نام ہے۔ جیسے بٹ، ڈار، وائیں اور میر وغیرہ۔ ڈاکٹر کچلو نے ہندوؤں کی شدھی کی تحریک کے خلاف امرتسر سے ایک روزنامہ اخبار ''تبلیغ'' جاری کیا تھا، جس کے عملہ ادارت میں ہمارے مرحوم بزرگ عالم دین ملک حسن علی جامعی شرق پوری بھی شامل تھے۔ ایک روزنامہ انھوں نے ''تنظیم'' بھی جاری کیا تھا۔

اس سے کچھ دن بعد مجھے بھاگ سنگھ وارڈن نے کہا کہ سنا ہے آپ لوگوں کی رہائی کے لیے مہاراجا سے بات چیت ہو رہی ہے۔

جیل کا چیف وارڈن بہرام خاں تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں اور بارعب شخص۔ لیکن پیار سے بولتا اور نرم لہجے میں بات کرتا تھا۔ ہمارے ساتھ اس کا سلوک بہت اچھا تھا۔ اس کی باتوں سے بھی کچھ ایسے ہی اشارے ملے۔

چند روز کے بعد واقعی پنڈت جواہر لال نہرو فرید کوٹ آ گئے۔ مہاراجا سے بات کی۔ مجمع عام میں ان کی تقریر ہوئی اور ہمیں رہا کر دیا گیا۔ کچھ لوگوں کی معرفت ہمیں ان کا پیغام پہنچا کہ ہم انھیں بھٹنڈہ ریلوے اسٹیشن پر ملیں۔ ہم جیل سے نکلے تو بے شمار لوگ ہمارے استقبال کے لیے جیل کے باہر کھڑے تھے۔ اور کچھ ہماری طرف بھاگے آ رہے تھے۔ ہم اپنے گھر جانے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کے بجائے فرید کوٹ کے ریلوے اسٹیشن پر آئے اور ٹرین کے ذریعے بھٹنڈہ پہنچے۔ جواہر لال نہرو دہلی جانے والی گاڑی میں بیٹھ چکے تھے، لیکن اس کی روانگی میں ابھی چند منٹ باقی تھے۔ ہم ان کی خواہش کے مطابق ملے اور کچھ باتیں کیں۔ انھوں نے ہمیں رہائی کی مبارک باد دی اور مہاراجا سے ان کی جو گفتگو ہوئی تھی چند الفاظ میں اس کا تذکرہ کیا۔ وہ دھیمے انداز میں خوبصورت اُردو میں بات کرتے تھے۔ درمیان گفتگو میں گاڑی نے وسل دیا اور گارڈ نے روانگی کے لیے جھنڈی لہرائی تو ہم گاڑی سے نیچے اتر آئے۔ انھوں نے ہم سے جاتے وقت بھی سیٹ سے اُٹھ کر مصافحہ کیا اور رخصت ہوتے وقت بھی۔

یہاں میں اپنے دو مرحوم بزرگوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، جن کا طرزِ عمل مجھے آج تک یاد ہے۔ وہ قریب کی رشتے داری میں ہمارے ماموں تھے اور ہم انھیں ماموں ہی کہا کرتے تھے۔ ایک کا نام محمد شفیع تھا اور ایک کا دین محمد۔ یہ دونوں آپس میں چچا زاد تھے۔

جیل سے ہم رہا ہوئے تو دیکھا کہ بے شمار لوگ ملاقات (یا استقبال) کے لیے ہماری طرف دوڑے چلے آرہے ہیں۔ ان میں سے ہر شخص کی خواہش ملنے میں سبقت کرنے کی تھی۔ محمد شفیع کو ہم نے دیکھا کہ بھاگنے میں ان کا تہبند رکاوٹ بنا تو انھوں نے تہبند اُتار کر کندھے پر رکھ لیا۔ یہ عجیب منظر تھا جسے دیکھ کر سب رہا شدگان خوشی سے ہنسنے لگے اور پھر پہلے انھی سے ملے۔ محمد شفیع نے قیام پاکستان کے تھوڑا عرصہ بعد ہمارے موجودہ گاؤں میں وفات پائی۔ ان کے دو بیٹے ہیں اور دونوں لاہور رہتے ہیں۔ ایک کا نام محمد اکرم ہے اور ایک کا محمد اصغر۔

دین محمد صاحب بھی ان لوگوں میں شامل تھے جو ہمیں ملنے کے لیے بے تاب تھے۔ وہ ہمارے ساتھ ہی ریل پر بھٹنڈہ گئے۔ فرید کوٹ سے بھٹنڈہ تیس میل (یعنی تقریباً پینتالیس کلو میٹر) کی مسافت پر ہے۔ وہ راستے میں مجھ سے جیل کی باتیں پوچھتے رہے۔ رات ہمارے ساتھ ہی رہے۔ ہم نے رات کا کھانا اکٹھے کھایا۔ صبح کو حلوہ پوری کا ناشتہ کیا۔ پھر ہمارے ساتھ ہی وہ بھٹنڈہ سے کوٹ کپورہ آئے۔ وہاں شہر میں قیدیوں کا استقبالی جلوس نکالا گیا تو

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

وہ جلوس میں شامل رہے۔ انھوں نے جڑاں والا میں وفات پائی۔ ان کی نرینہ اولاد چار بیٹے جڑاں والا میں ہیں۔ پھر آگے ماشاءاللہ بیٹوں کی اولاد کا سلسلہ چلتا ہے، جن کی صحیح تعداد بتاتا شاید اصحابِ خانہ کے لیے بھی مشکل ہوگا۔ یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے۔ ہم کوٹ کپورہ میں چندروز دین محمد کے مکان میں رہے تھے۔

رہائی کے بعد ریاست میں جلسے جلوس کا طویل سلسلہ شروع ہوگیا۔ ہم نے کوٹ کپورہ کی غلہ منڈی میں ریاست کی پرجامنڈل کا دفتر قائم کرلیا تھا۔ میں مرکز الاسلام میں خدمت تدریس انجام دیتا تھا اور چھٹی کے دن پرجامنڈل کے دفتر حاضری دیتا تھا۔ ہمارے آفس سیکرٹری حاجی محمد رفیق زبیدی تھے جو حضرت مولانا احمد اللہ پرتاب گڑھی دہلوی اور مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی کے شاگرد تھے۔ انھوں نے دہلی کے مدرسہ زبیدیہ میں مولانا احمد اللہ دہلوی سے سند حدیث لی تھی۔ ارائیں برادری سے ان کا تعلق تھا۔ میرے مخلص دوست تھے۔ ان کے والد حاجی خیرالدین ساڑھے تین سال فریدکوٹ جیل میں قید رہے تھے۔ ان دنوں بہت لوگوں سے ملنے اور ان سے گفتگو کے مواقع ملے۔ یہ ہماری سیاست کا عملی دور تھا جو کافی عرصہ جاری رہا۔ تقریری صورت میں بھی اور قید و بند کی صورت میں بھی۔

اب جیل کے سلسلے کی چند اور باتیں:

۱۔ فریدکوٹ جیل کا پانی کھاری تھا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے اس میں نمک گھول دیا گیا ہو۔ لیکن ہمیں پینے کے لیے میٹھا پانی دیا جاتا تھا۔ کھاری پانی سے وضو کے وقت کلی کرتے تو منہ کڑوا ہو جاتا۔ نہانے سے بال جھڑتے تھے۔

۲۔ پہلے دن ہمیں سنگین کوٹھڑیوں میں بند کیا گیا تو تھوڑی دیر کے بعد ماشکی پانی کی مشک لے کر آیا۔ لوہے کی سلاخوں کے باہر کھڑے ہو کر کہا میں تمھارے جسم پر پانی ڈالتا ہوں، تم نہالو۔ ہم نے اس طرح نہانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ نہانے کے لیے ہمیں ایک ایک بالٹی دی جائے، ہم خود نہائیں گے۔ چنانچہ یہ مطالبہ مان لیا گیا۔

۳۔ جیل میں روزانہ تین بجے بھنے ہوئے چنے اور گڑ دیا جاتا تھا۔ پیر کے روز حلوہ دیا جاتا تھا

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

جسے وہ کڑاہ پرشاد کہتے تھے۔

۴۔ ایک دن کولھو احاطے سے، جہاں مشقتی قیدی کولھو چلا کر سرسوں کا تیل نکالتے تھے، دو مشقتی قیدیوں نے کسی طرح بڑا سا بانس باہر نکالا، پھر آدھی رات کے وقت خدا جانے وہ کس طرح اپنی بارک سے نکلے اور بانس کو سیڑھی بنا کر جیل کے اندر سے دیوار پھلانگ کر باہر نکلنے کی کوشش کی۔ ایک قیدی باہر نکل گیا اور بھاگ گیا، لیکن دوسرے کا ٹھیکری پہرے داروں کو پتا چل گیا اور اسے پکڑ لیا گیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد دوسرا بھی پکڑا گیا۔

۵۔ جو چیز بلا اجازت کسی طرح جیل میں لائی جائے، وہ روپیہ پیسا ہو یا کوئی اور چیز، جیل کی بولی میں اسے بدمعاشی کہا جاتا ہے۔ جیل میں طویل مدتی قیدی بدمعاشی کے عجیب و غریب طریقے ایجاد کر لیتے ہیں۔ ایک قیدی کے متعلق معلوم ہوا کہ اس نے زبان کے نیچے حلق میں ایسا گڑھا سا بنا لیا تھا جس میں وہ چاندی کے پانچ روپے آسانی سے رکھ لیتا تھا اور اسے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ اس گڑھے کو وہ لوگ ''کھرجی'' کہتے تھے۔ اسی طرح افیون کھانے والے سکھ قیدی ملاقاتیوں کے ذریعے افیون منگواتے اور اسے اپنے سر کے بالوں (کیسوں) میں چھپا لیتے۔

۶۔ جیل میں پڑھنے پڑھانے کے لیے ہمیں کچھ نہیں ملتا تھا۔ نہ کسی باہر کے آدمی سے ملاقات کی اجازت تھی، اس لیے کہ ہمیں سرکار کے باغی قرار دیا گیا تھا۔

۷۔ میرے دائیں جانب کی کوٹھڑی میں بھائی دیال سنگھ تھے، جو اس وقت ساٹھ سال کے پس و پیش میں ہوں گے۔ وہ معاملہ فہم اور شریف آدمی تھے۔ ۱۹۱۹ء کی اکالی لہر میں بھی قید کاٹ چکے تھے۔ پرجا منڈل کے سلسلے میں بھی فرید کوٹ جیل میں ساڑھے تین سال قید رہے۔ ان کا علم گورمکھی زبان تک محدود تھا۔ کسی اور زبان سے واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ مجھے وہ ''ساک ممد'' کہا کرتے تھے۔ ''محمد'' اور ''اسحاق'' کا تلفظ نہیں کر سکتے تھے۔ انھیں نمازوں کے اوقات کا پتا تھا۔ کسی نماز کا وقت ہو جاتا تو مجھے آواز دیتے، ''ساک

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ممدا'' نما جداویلا ہو گیا۔ نماج پڑھ لا'' (محمد اسحاق نماز کا وقت ہو گیا ہے، نماز پڑھ لے) مجھ سے وہ حضرت یوسف علیہ السلام اور اصحابِ کہف کے واقعات خاص طور پر سنتے۔ آواز دیتے ''حجرت جوسب دی گل سنا جو کران چ لکھی اے'' (حضرت یوسف کا واقعہ سناؤ جو قرآن میں لکھا ہے) پھر آواز آتی ''ہن کاف آلیاں دی گل بات سنا'' (اب اصحابِ کہف کے بارے میں بتاؤ۔)

یہ واقعات سناتے وقت درمیان میں کوئی بول پڑتا تو وہ سخت خفگی کا اظہار کرتے کہ تم قرآن کی باتیں توجہ سے نہیں سنتے۔ یہ مجھے معلوم نہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام اور اصحاب کہف کے متعلق انہیں کیسے پتا چلا کہ قرآن میں ان کا ذکر کیا گیا ہے۔

وہ اپنے مذہب کے مطابق عبادت اور دعا کرتے تھے۔ کچھا سکھوں کا مذہبی شعار ہے۔ بھائی دیال سنگھ اس پر عامل تھے۔ وہ کچھا پہن کر گھٹنے زمین پر لگاتے اور دونوں پاؤں کی انگلیوں کے سہارے قبلہ رُخ ہو کر بیٹھ جاتے۔ دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں جوڑ کر سر سے اوپر کر لیتے اور واہگرو واہگرو کہنا شروع کر دیتے۔ اس طرح وہ اللہ سے اپنے الفاظ میں مانگتے بھی تھے اور التجا بھی کرتے تھے۔ وہ مخلص آدمی تھے اور ان کا ذہن تعصب سے پاک تھا۔

ہم ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ آپس میں باتیں کرنا ہوتیں تو کوٹھڑی کے دروازے میں بیٹھ جاتے اور اونچی آواز سے ایک دوسرے سے بات کرتے۔ ہمارا پہرے دار سرکاری آدمی باہر بیٹھا ہوتا، وہ بھی ہمارے ساتھ گفتگو میں شریک ہو جاتا۔ وہ باہر بیٹھا ہمیں دیکھتا اور ہم اندر بیٹھے اسے دیکھتے۔

وہ پہرے دار (وارڈن) عام طور سے میرے دروازے پر سلاخوں کے ساتھ بیٹھ کر اُردو اور پنجابی کا ملا جلا سا یہ لوگ گیت مجھے سناتا:

میرے چلتے چلتے پاؤں میں چھالے پڑ گئے،
اجے کتنیک دور بابا تیری کاشی

اس کا نام بھاگ سنگھ تھا۔ ساٹھ سال سے زیادہ عمر کا ہوگا۔ وہ کہا کرتا تھا، مجھے ''ساک''

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کہنا نہیں آتا، میں تمھیں ''بھاگ'' کہہ کر ہی بلاؤں گا۔ (یعنی میں اسحاق نہیں کہہ سکتا) میرے سامنے اور مجھے سنا کر اس کا لوگ گیت یا شبد پڑھنے کا مقصد یہ تھا کہ مجھے اتنی مدت جیل کی قید کاٹتے ہوئے گزر گئی ہے، اب رہائی کب ہوگی۔ بابا تیری کاشی (بنارس) ابھی کتنی دور ہے، جہاں جا کر مجھے اشنان کرنا ہے۔ چلتے چلتے میرے پاؤں میں چھالے پڑ گئے ہیں اور میں بے حال ہو گیا ہوں۔

۸۔ میرے بائیں جانب قاضی عبیداللہ تھے اور آخر میں ایک ہندو نوجوان تھا۔ ایک دن تین سکھ قیدیوں کو پھانسی دیا گیا تھا، اس دن وہ ڈر گیا۔ معلوم نہیں کب چپکے سے معافی مانگ کر باہر آ گیا۔

۹۔ میرے دائیں جانب کی آخری کوٹھڑی میں دوست محمد خاں تھے۔ پچاس پچپن سال کے ہوں گے۔ کسی زمانے میں خاکسار تحریک سے ان کا تعلق رہا تھا۔ جیل میں قران مجید ساتھ لے کر گئے تھے۔ جیل کا کوئی افسر آتا تو قرآن پڑھنا شروع کر دیتے اور بیٹھے رہتے۔ نہ جیل کا اہل کاران سے کوئی بات کرتا اور نہ وہ اس سے ہم کلام ہوتے۔ وہ چلا جاتا تو قرآن بند کر کے ہم سے اونچی آواز میں باتیں کرنے لگتے۔

۔ ایک ہندو قیدی کا نام چیتن دیو تھا۔ اچھی اُردو بولتا تھا اور بڑا باتونی تھا۔ ایک عرصے کے بعد ہم رہا ہوئے تو اس کی نوجوان بہن سوچیتا دیوی نے رہا شدگان کے ماتھے پر تلک لگانا شروع کیا۔ میرے پاس آئی تو میں نے روک دیا اور کہا کہ میرے مذہب میں تلک لگانا جائز نہیں۔ وہ شکریہ ادا کر کے پیچھے ہٹ گئی۔

۔ جیل میں انسان کا اصل چہرہ سامنے آ جاتا ہے اور اس کی اندرونی کیفیت کا پتا چل جاتا ہے۔ اپنے ساتھی قیدیوں سے متعلق پوری طرح علم ہو جاتا ہے کہ کون کس قسم کی عادات کا مالک ہے۔ کس کے دل میں دوسرے کے لیے خیر خواہی کا جذبہ کارفرما ہے اور کون دوسرے پر اپنی ذات کو ترجیح دیتا ہے۔ اور کتنے دل گردے کا مالک ہے۔ تکالیف برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے یا نہیں۔ ہم تیرہ قیدیوں میں ہندو صرف دو تھے۔ ایک

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

معافی مانگ کر جیل سے رہا ہو گیا تھا، ایک ہمارے ساتھ رہا۔ اس کا نام چتین دیو تھا۔ اس کے متعلق سب کو معلوم تھا کہ یہ سرکاری آدمی ہے۔ باقی گیارہ میں سے ہم چار مسلمان تھے۔ میں، دوست محمد خاں، صوفی خوشی محمد اور قاضی عبیداللہ (اس سے قبل قاضی عبیداللہ کم وبیش چار سال فرید کوٹ جیل میں قید کاٹ چکے تھے) سات سکھ تھے۔ رہائی کے بعد قیامِ پاکستان تک ہمارے باہم بہت اچھے تعلقات رہے۔ پاکستان آنے کے بعد میں ہندوستان نہیں گیا۔ دوست محمد خاں قصور آ گئے تھے۔ ان سے صرف ایک دفعہ ملاقات ہوئی۔ تھوڑے عرصے بعد ایک حادثے میں وفات پا گئے تھے۔ صوفی خوشی محمد منٹگمری (ساہی وال) چلے گئے تھے۔ وہ دو مرتبہ لاہور آ کر مجھے ملے۔ میری ان سے خط وکتابت بھی رہی۔ قاضی عبیداللہ سے بے شمار مرتبہ ملاقات ہوئی۔

فرید کوٹ جیل کے سلسلے کی بعض اور باتیں بھی ہیں جو اگلے مختلف ابواب میں بیان کی گئی ہیں۔

۱۸۔ جنوری ۲۰۰۸ — بہاول نگر

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

سواں باب:

آبائی وطن سے کوچ اور پاکستان میں ورود

آیئے اب قیامِ پاکستان اور اس میں اپنی آمد کے متعلق چند باتیں کرتے ہیں، لیکن پہلے تھوڑی سی تمہید۔

جون ۱۹۴۵ء میں جنگ ختم ہوئی تو برطانوی حکومت نے برصغیر کی مختلف سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کو رہا کر دیا تھا۔ وہ سیاسی جماعتیں تھیں آل انڈیا کانگرس کمیٹی، مجلس احرار اسلام، جمعیت علماے ہند اور سوشلسٹ پارٹی وغیرہ۔ مسلم لیگ کا کوئی شخص جنگ کے زمانے میں گرفتار نہیں ہوا تھا، لیکن برصغیر کے مسلمانوں کی سب سے بڑی سیاسی جماعت یہی تھی۔ رہائی کے بعد انگریزوں نے برصغیر کی آزادی کے سلسلے میں متعدد جماعتوں کے رہنماؤں سے مذاکرات کا سلسلہ شروع کیا۔ مذاکرات کے کئی دور ہوئے جو بہت سے مراحل سے گزرے۔

جنگ کے چھ سالہ طویل زمانے میں چوں کہ ملک کی سیاسی جماعتوں کے چھوٹے بڑے قائدین جیلوں میں قید رہے تھے، صرف مسلم لیگ سے تعلق رکھنے والے لوگ جیلوں سے باہر تھے، اس لیے مسلم لیگ کو ملک میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کا موقع ملا اور وہ انتخابات میں کامیاب ہوئی اور اس کامیابی نے اس کے تقسیم ملک کے موقف کو تقویت پہنچائی۔ بالآخر تقسیم ملک کا فیصلہ کر لیا گیا۔

مسلم لیگ نے ابتدا میں مسلم اکثریت کے تمام صوبوں یعنی پورے پنجاب، پورے بنگال، پورے آسام کا مطالبہ کیا تھا۔ لیکن بعد میں صوبوں کے بجائے مسلم اکثریت کے علاقوں پر معاملہ طے ہو گیا، یعنی پنجاب، بنگال اور آسام کے جن علاقوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں، وہ علاقے پاکستان میں شامل ہوں گے اور جن علاقوں میں غیر مسلمان زیادہ ہیں وہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

علاقے ہندوستان کے حصے میں آئیں گے۔ صوبہ سندھ، سرحد اور بلوچستان میں تو مسلمان بہت بڑی اکثریت میں تھے، لیکن پنجاب اور بنگال میں یہ صورتِ حال نہ تھی۔ ان دونوں صوبوں میں مجموعی طور پر مسلمانوں کی اکثریت تو بے شک تھی لیکن اس کا تناسب کم تھا۔

اس زمانے میں انیٹرم گورنمنٹ (عبوری حکومت) قائم ہوئی تھی، جسے سکھ صاحبان ''ڈنگ ٹپاؤ راج'' کہا کرتے تھے۔ ۱۵؍جنوری ۱۹۴۷ء کو مولانا ابوالکلام آزاد اس میں وزیر تعلیم مقرر کیے گئے تھے۔ اسی زمانے میں اپنے بعض ریاستی مسائل کے سلسلے میں مَیں نے اور قاضی عبیداللہ نے مولانا کی خدمت میں حاضر ہونے کا پروگرام بنایا۔ اس کا ذکر مولانا معین الدین لکھوی سے ہوا تو وہ بھی ہمارے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوگئے۔ ان کی شادی دہلی میں مولانا محمد جونا گڑھی دہلوی کی صاحب زادی سے ہوئی تھی۔ ہم تینوں (مَیں، مولانا معین الدین اور قاضی عبیداللہ) ۲۰؍جون ۱۹۴۷ء کو دہلی پہنچے اور مولانا محمد جونا گڑھی کے مکان پر ٹھہرے۔ مولانا جونا گڑھی تو اس سے بہت عرصہ پہلے (مارچ ۱۹۴۱ء میں) وفات پا گئے تھے، اب ان کے بیٹے محمد محمود میمن ہمارے میزبان تھے۔ افسوس ہے ان کا بھی کئی سال ہوئے کراچی میں انتقال ہوگیا۔ وہ میرے بے تکلف دوست تھے اور کچھ عرصہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں بہ طور منیجر کام کرتے رہے تھے، جب کہ میں اس اخبار کا ایڈیٹر تھا۔ خوش مزاج، اور باہمت آدمی تھے۔ دلجمعی اور محنت سے کام کرتے تھے۔

۲۱ جون ۱۹۴۷ء کو ہم نے جمعیت علمائے ہند کے دفتر میں جمعیت کے جنرل سیکرٹری مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی سے ملاقات کی اور اس سے دوسرے روز ۲۲ جون کی صبح کو مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں حاضری دی۔ اس وقت مولانا آزاد انیٹرم گورنمنٹ کے وزیر کی حیثیت سے نئی دہلی کی کوٹھی نمبر ۲۲ پرتھوی راج روڈ میں مقیم تھے۔ مولانا سے ملاقات کے وقت مولانا محمد عبدہ الفلاح بھی ہمارے ساتھ تھے جو ان دنوں دہلی کے دارالحدیث رحمانیہ میں فریضہ تدریس سرانجام دیتے تھے۔

ہم پینتالیس منٹ مولانا آزاد کی خدمت میں حاضر رہے۔ اس اثنا میں انھوں نے بہت

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

باتیں ارشاد فرمائیں۔ مولانا نے فرمایا کہ میں نے لیاقت علی سے کہا تھا کہ آدھا پنجاب، آدھا بنگال، ایک سلہٹ کا ضلع اور سندھ اور سرحد کے دو صوبے جو مالی لحاظ سے پہلے سے مرکز کے رحم وکرم پر زندہ ہیں، لے کر کیا کرو گے، اسی مطالبے پر قائم رہو جو پہلے کیا تھا (یعنی پورے پنجاب، پورے بنگال اور پورے آسام کے مطالبے پر) اگر یہ مطالبہ پورا نہ ہو تو تحریک چلاؤ، جس کا رُخ برٹش گورنمنٹ کی طرف بھی ہو اور کانگرس کی طرف بھی۔ انگریز کسی ایک جماعت کو حکومت دے کر نہیں جائے گا۔ مولانا نے فرمایا لیاقت علی مان گئے تھے، لیکن آگے منوانہ سکے۔ "آگے منوانہ سکے" کی تفصیل مولانا نے تو بیان نہیں کی، لیکن اسے ہر وہ شخص سمجھ سکتا ہے جو اس دور کے سیاسی حالات اور سیاسی شخصیات سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتا ہے۔

مولانا نے گروپنگ سکیم کا ذکر بھی کیا اور فرمایا: "یہ سکیم میں نے ہی کرپس کے حلق میں ڈالی تھی اور میں نے کہا تھا کہ موجودہ حالات تقسیم ملک کے لیے سازگار نہیں ہیں۔ اس وقت دونوں فریق (مسلمان اور ہندو) جذباتی کیفیت کا شکار ہیں، اس سے مسلمانوں کو خاص طور سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ گروپنگ سکیم کو دس سال تک آزمایا جائے، اگر یہ سکیم کامیاب نہ ہوئی تو ملک تقسیم کر دیا جائے۔ اس وقت تک جذبات اعتدال میں آجائیں گے۔

مولانا نے اور بھی بہت کچھ ارشاد فرمایا، جس کا تذکرہ میں اپنی کتاب "بزمِ ارجمنداں" کے اس مضمون میں کر چکا ہوں، جو مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق لکھا گیا ہے۔

مولانا آزاد سے ہماری یہ ملاقات ۲۲ رجون ۱۹۴۷ء کو ہوئی تھی۔ اس سے دو مہینے بعد ملک میں فسادات کا ہولناک سلسلہ شروع ہوگیا۔ ریاست فرید کوٹ میں راولپنڈی وغیرہ علاقوں سے اوڑے سکھ کافی تعداد میں آگئے تھے، جن کی وجہ سے فساد کا خطرہ پیدا ہوگیا تھا۔ چناں چہ کچھ ہندو اور سکھ دوستوں کے کہنے سے میں اور قاضی عبیداللہ دہلی گئے اور ۱۲ راگست کو مولانا ابوالکلام آزاد سے ملے۔ مولانا خود بھی اس وقت بہت پریشان تھے۔ مہاراجا فرید کوٹ ان دنوں دہلی میں تھے۔ مولانا نے ان کو ٹیلی فون کیا اور مسلمانوں کو ریاست میں جو خطرات لاحق تھے، ان کا تذکرہ کیا اور فرمایا کہ ان کی حفاظت کا انتظام کیا جائے۔ مہاراجا نے یقین

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

دلایا کہ پوری کوشش کی جائے گی کہ ان کی ریاست فسادات سے محفوظ رہے اور مسلمانوں کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچے۔ چناں چہ وہ اپنے اس وعدے پر قائم رہا اور ریاست کی حدود میں مسلمانوں کو کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ البتہ جب یہی مسلمان قافلے کی صورت میں انگریزی علاقے میں پہنچے تو ان پر اکالیوں نے حملے کیے اور بہت جانی نقصان ہوا۔ لیکن اس کی ذمہ داری مہاراجا فرید کوٹ پر عائد نہیں ہوتی۔

قیام دہلی کے دوران میں ہم وزیر داخلہ سردار پٹیل سے بھی ملے۔ انھوں نے ہماری بات توجہ سے سنی اور کہا کہ میں آج رات کے آٹھ بجے رام لیلا گراؤنڈ میں تقریر کروں گا، جس میں حکومت کی اس پالیسی سے لوگوں کو مطلع کیا جائے گا کہ ہم آزاد ہندوستان میں راجوں مہاراجوں اور نوابوں کو ختم کر دیں گے۔ آپ ایک ریاست سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا میری تقریر ضرور سنیں، لیکن ہم ان کی تقریر سننے نہیں گئے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حکومت ہند نے بہت جلد ریاستیں ختم کر دی تھیں اور راجوں مہاراجوں، اور نوابوں کو حق حکمرانی سے محروم کر دیا تھا۔

اتفاقاً ہماری ملاقات دہلی میں فرید کوٹ کے ایک مسلم لیگی دوست سے بھی ہوئی۔ ان کے ساتھ ہم انٹرم گورنمنٹ کے مسلم لیگی وزیر سردار عبدالرب نشتر سے ملے۔ ان سے اپنے خدشات کا اظہار کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ میں تو کل کراچی جا رہا ہوں، مجھے وہاں پاکستان کی مرکزی وزارت کا حلف اُٹھانا ہے۔ پورے ملک کے حالات خراب ہو رہے ہیں، دُعا کریں اللہ مسلمانوں کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ یعنی سردار عبدالرب نشتر نے ہمیں مسلمانوں کی حفاظت کے لیے دعا کا نسخہ کیمیا استعمال کرنے کا مشورہ دیا۔

ان دنوں دہلی کے عربک کالج میں ہندوستان کی ریاستی مسلم لیگ کا اجلاس گوالیار کے مسٹر منظر عالم کی زیر صدارت ہو رہا تھا۔ اس میں ہمیں شرکت کی دعوت دی گئی تھی اور میں نے اور قاضی عبیداللہ نے اس اجلاس میں شرکت کی تھی۔ یہ بھی عجیب اجلاس تھا۔ ایک ریاست کے ایک نمائندے کے یہ الفاظ مجھے اچھی طرح یاد ہیں کہ گزشتہ دور کے معاملے کو ختم کر کے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

نئے حالات کے مطابق ہمیں اپنے گھروں پر ترنگا لہرا دینا چاہیے۔(یعنی کانگرس کا جھنڈا) میں نے عرض کیا: اب ترنگا لہرانے کی کیا ضرورت ہے۔ اب ترنگے کی کوئی پروا نہیں کرے گا، آپ بے شک ہر گھر میں ایک کے بجائے دس ترنگے لہرا دیں۔

بہر حال چار دن کے بعد ہم ۱۴/ اگست کی صبح کو ٹرین کے ذریعے کوٹ کپورہ پہنچے تو پتا چلا کہ کل ریلوے اسٹیشن پر بم دھماکا ہوا تھا، لیکن کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ کوٹ کپورہ میں اس وقت امن تھا۔ ہم نے پرجا منڈل سے تعلق رکھنے والے چند سکھوں اور ہندوؤں کو دہلی کے سفر کی رُوداد سنائی تو ان میں سے بعض نے ہمیں دہلی جانے اور بعض نے لاہور کی طرف جانے کا مشورہ دیا۔ ان کا خیال تھا کہ دہلی ہندوستان کا دارالحکومت ہے، وہاں امن رہے گا۔ جب حالات ٹھیک ہو جائیں گے تو واپس آ جانا۔ لاہور کی طرف جانے کا مشورہ دینے والوں کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ یہ علاقہ پاکستان میں شامل ہوگا اور مسلمان اس میں محفوظ رہیں گے۔ اس وقت یہ تو کسی کو بھی خیال نہیں تھا کہ حالات اس طرح بگڑ جائیں گے کہ دوبارہ واپسی کا راستہ قطعی طور سے بند ہو جائے گا۔ یہاں یہ بھی سنتے جایے کہ یہ آخری ٹرین تھی، جس سے دہلی سے سوار ہو کر ہم خیریت سے اپنے گھر پہنچے۔ اس میں مسافر بہت کم تھے۔ ہمارے ڈبے میں صرف چار آدمی تھے۔ اس کے بعد ٹرینوں میں قتل و غارت کا ہولناک سلسلہ شروع ہو گیا۔

ہم نے حاجی نور الدین کی مسجد میں مسلمانوں کی میٹنگ بلائی اور ان کو صورتِ حال سے مطلع کیا اور مشورہ دیا کہ اب یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ اگر حالات ٹھیک ہوئے تو پھر واپس آ جائیں گے۔ مگر اکثر لوگوں نے ہماری بات نہیں مانی اور کہا کہ ہم صدیوں سے یہاں رہ رہے ہیں اور زمین جائداد کے مالک ہیں، ہمیں کوئی یہاں سے نکال نہیں سکتا، ہم یہیں رہیں گے۔ خود ہمارے بہت سے رشتے داروں اور ہمارے والد نے ہماری بات نہیں مانی۔ صرف یہ کہا کہ چند روز کے لیے تم عورتوں کو یہاں سے لے جاؤ۔ اسی دن ایک شخص نے جسے میں نہیں جانتا تھا، مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کا رقعہ دیا، جس میں لکھا تھا کہ حالات بہت خراب ہیں۔ میں قصور سے یہ رقعہ لکھ رہا ہوں۔ فیروز پور مسلمانوں سے خالی ہو گیا ہے، تم فوراً نکلنے کی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کوشش کرو اور کسی طرح قصور پہنچو۔

دوسرے دن جمعہ تھا جو شہر کے تمام مسلمانوں نے میتلیاں والی مسجد میں پڑھا۔ جمعہ میں نے پڑھایا اور یہ آخری جمعہ تھا جو میں نے اپنے آبائی شہر میں پڑھا اور پڑھایا۔ مسجد کے باہر چوک میں بہت بڑی تعداد میں سکھ بھی کھڑے تھے جو میری تقریر سن رہے تھے۔ وہ لوگ ہماری سیاسی اور مذہبی سرگرمیوں سے آگاہ تھے۔ چوں کہ سب ایک ہی جگہ کے رہنے والے تھے اور ہماری آپس میں خوب جان پہچان تھی، اس لیے کسی طرف سے کوئی ہنگامہ نہیں ہوا۔

رات کو پرجا منڈل کے دفتر کے سامنے غلہ منڈی میں گیانی ذیل سنگھ کے زیر صدارت جلسہ ہوا، جس میں قاضی عبیداللہ نے، مولوی محمد سلیمان نے، مَیں نے اور ہمارے بعض ہندو اور سکھ ساتھیوں نے تقریریں کیں۔ مجھے اب بھی محسوس ہو رہا ہے کہ اس دور کے حالات کی رو سے میرے خطبہ جمعہ کے بعض الفاظ بھی سخت تھے اور غلہ منڈی والی تقریر میں بھی احتیاط کو ملحوظِ خاطر نہیں رکھا گیا تھا۔ لیکن گیانی ذیل سنگھ اور بھائی دیال سنگھ کی تقریریں بہت متوازن تھیں۔ گیانی جی نے کہا کہ ریاست فرید کوٹ کی تحریک آزادی کے سلسلے میں عبیداللہ، محمد اسحاق، مولوی محمد سلیمان اور دوسرے دوستوں کی قربانیوں کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ یہ میری اپنے وطن میں آخری تقریر تھی۔ جلسے کے بعد میں سب سے ملا اور کہا کہ میں صبح یہاں سے چلا جاؤں گا۔ گیانی ذیل سنگھ اور دوسرے بہت سے دوستوں کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے اور ان کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ وہ لوگ نہایت افسوس کے ساتھ مجھے مل رہے تھے۔ انھوں نے بار بار کہا کہ لمبے عرصے سے ہم اکٹھے رہ رہے ہیں، اکٹھے سیاسی کام کیے ہیں اور جیل رہے ہیں۔ اس اثنا میں ہم سے بہت سی غلطیاں ہوئی ہوں گی، ہم آپ سے معافی کے خواست گار ہیں۔

ہماری ستھ (چوک) میں تین چار بسیں کھڑی تھیں۔ دوسرے دن (۲۰/اگست کی صبح کو) ہمارے بعض رشتے داران بسوں میں بیٹھے اور بھٹنڈہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس سے چند روز قبل یہ بسیں بہاول نگر سے ہارون آباد، چشتیاں اور فورٹ عباس وغیرہ کو چلتی تھیں۔ اس زمانے میں یہ کچے روٹ تھے۔ ان بسوں کے ڈرائیوروں میں ہمارے ماموں عبداللہ بھی شامل تھے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ان لوگوں کا خیال یہ تھا کہ بھٹنڈہ سے ریل کے ذریعے بہاول نگر چلے جائیں گے۔ ان کے ساتھ بچے اور عورتیں بھی تھیں۔ ہم نے بھی اسی طرف سے جانے کا پروگرام بنایا، لیکن کسی وجہ سے اس پر عمل نہ ہو سکا۔

دوسرے دن ۲۱/اگست کی صبح کو ہم چھوٹے بڑے ایک سو تیس افراد ٹرک پر بیٹھے اور قصور کو روانہ ہوئے۔ میرے والد اور دوسرے بہت سے لوگ ہمارے ساتھ نہیں آئے۔ کوٹ کپورہ سے فرید کوٹ سات میل ہے۔ اس سے آٹھ دس میل آگے ضلع فیروز پور کی حد شروع ہو جاتی تھی۔ وہاں ریاست کی پولیس کے چار پانچ آدمی کھڑے تھے، جنھوں نے ہمیں روکا۔ وہ لوگ ہمیں جانتے تھے۔ کسی قدر مسکراتے ہوئے کہا پاکستان کی تیاری ہے۔ ہم نے ہاں میں جواب دیا تو انھوں نے اِدھر اُدھر سے گاڑی دیکھی کہ کوئی اسلحہ وغیرہ نہ ہو۔ یہ رسمی سی کارروائی تھی۔ وہاں سے چلے تو ایک گاؤں ''رکنے والا'' آیا۔ یہ مسلمانوں کا گاؤں تھا۔ لوگ اطمینان سے چار پائیوں پر بیٹھے تھے اور ان میں بعض لوگ ہمیں جانتے تھے۔ بولے کدھر جا رہے ہو اور کیوں جا رہے ہو؟ ہمارے پاس رہو، تمھیں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔

ہم فیروز پور سے ہوتے ہوئے قصور جانا چاہتے تھے۔ لیکن رکنے والا سے تھوڑا سا آگے گئے تو ایک نوجوان نے ہمیں روکا، وہ فوجی وردی میں تھا۔ اس نے بتایا میں فوجی ہوں اور بڑی مشکل سے فیروز پور سے نکلا ہوں۔ میں بھی قصور جانا چاہتا ہوں۔ تم سڑک چھوڑ دو، کچے راستے سے فیروز پور کے قلعے کے قریب والی سڑک سے ہیڈ حسینی والا کی طرف جاؤ۔ یہ آسان اور محفوظ راستہ ہے۔ وہ ہمارے ساتھ ٹرک پر بیٹھا اور ہم کچے راستے سے قلعے کے قریب سے گزرتے ہوئے دریائے ستلج کے ہیڈ حسینی والا پہنچے۔ وہاں بے شمار لوگ موجود تھے، جو مختلف مقامات سے آئے تھے اور ہیڈ حسینی والا کو عبور کر کے پاکستان کی سرحد میں داخل ہونا چاہتے تھے۔ ہیڈ حسینی والا ہندوستان میں تھا اور اس سے آگے پاکستان کا علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ ہیڈ عبور کرنے والے بہت سے لوگ ڈھور ڈنگر بھی لے جا رہے تھے۔ تقریباً ڈیڑھ میل کا یہ فاصلہ ہم نے سات گھنٹوں میں طے کیا۔ آگے بلوچ رجمنٹ کے فوجی کھڑے تھے اور پاکستانی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

دیہاتوں کے لوگ بھی کثیر تعداد میں موجود تھے، جو ہندوستان سے آنے والے لوگوں میں کھانے پینے کی چیزیں تقسیم کر رہے تھے۔

رات کو آٹھ بجے ہم قصور پہنچے اور یہ رات ایک سرائے میں بسر کی۔ کوٹ کپورہ سے قصور پینتالیس میل کے فاصلے پر ہے۔ پینتالیس میل کا یہ سفر ہم نے چودہ گھنٹوں میں طے کیا۔ ہمارے پاس نہ کوئی برتن تھا اور نہ کوئی اور چیز۔ صرف وہ کپڑے تھے جو پہن رکھے تھے۔ دوسرے دن ۲۲/اگست کو میں اور میرے ایک عزیز میاں محمد زکریا، مولانا محمد علی قصوری ایم اے کینٹب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کے پاس مختلف مقامات کے بہت سے لوگ جمع تھے اور اپنی تکلیفیں اور ضرورتیں بیان کر رہے تھے۔ مولانا ممدوح بے حد تحمل سے سب کی باتیں سن رہے تھے۔ میں نے گزارش کی کہ ہم ایک سوتیں افراد ہیں، جن میں زیادہ تعداد عورتوں اور بچوں کی ہے۔ ہمارے لیے عارضی طور پر کہیں قیام کا انتظام کیا جائے۔ مولانا اسی وقت اُٹھے اور ہمیں شہباز روڈ پر ''کھوہی والی حویلی'' میں لے گئے۔ یہ بارہ تیرہ کمروں کی دو منزلہ حویلی تھی، جس میں چھوٹا سا کنواں بھی تھا۔ انھیں جب یہ معلوم ہوا کہ ہمارے پاس ایک ٹرک ہے تو فرمایا یہ ٹرک چند روز کے لیے ہماری انجمن کو دے دو جو مختلف مقامات سے پناہ گزینوں کو قصور لا رہی ہے اور ان کے لیے خوراک اور زخمیوں کے لیے طبی امداد فراہم کر رہی ہے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا اجر ملے گا اور انجمن کی طرف سے آپ لوگوں کی ضرورت کے مطابق آٹا، دالیں اور اچار وغیرہ چیزیں روزانہ ملتی رہیں گی۔ اگر اپنی ضرورت کے لیے ٹرک کہیں لے جانا چاہیں تو لے جا سکتے ہیں۔ چناں چہ ہم نے ٹرک ان کے حوالے کیا اور ایک شخص جس کا نام ٹھیکے دار محمد صدیق تھا آیا اور ہمیں چار پانچ بوریاں آٹے کی، کچھ لکڑیاں، ایک کنستر اچار کا اور دالیں وغیرہ دے گیا۔ جب تک ہم وہاں رہے، ہمارا تعلق ٹھیکے دار محمد صدیق سے رہا اور ہمیں ضرورت کے مطابق کھانے پینے کی چیزیں مہیا ہوتی رہیں۔

قیامِ قصور کے زمانے میں ایک مرتبہ کسی کے ہاتھ پیغام بھجوا کر سرحد پر کوٹ کپورہ سے پرجا منڈل کے بعض ارکان ہمیں ملنے کے لیے آئے۔ ان میں بھائی دیال سنگھ، لہنا سنگھ، چنن

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

سنگھ ڈوڈ اور رام لال شامل تھے۔ان لوگوں سے ہماری یہ آخری ملاقات تھی۔اس کے بعد ان سے ملاقات تو کیا ہوئی تھی، کسی کو میں نے خط بھی نہیں لکھا۔ نہ ان میں سے کسی کا خط آیا۔ انھیں یہ بھی معلوم نہیں ہوا کہ ہم پاکستان کے کس علاقے میں آباد ہیں۔

اب ہمارے ان رشتے داروں کے بارے میں سنیے جو ۲۰/اگست کو بسوں کے ذریعے کوٹ کپورہ سے بھٹنڈہ چلے گئے تھے اور ان کا مقصد بھٹنڈہ سے بذریعہ ریل بہاول نگر پہنچنا تھا، جہاں اس سے قبل کچے روٹوں پر وہ بسیں چلاتے رہے تھے۔ ان میں سے بعض لوگ تو بھٹنڈہ اور اس کے گرد و نواح میں سکھوں کے ہاتھوں قتل ہوگئے اور بعض ادھر اُدھر کے قافلوں کے ساتھ مل کر نہایت مشکل سے بہاول نگر پہنچے۔ ہمارے یہ رشتے دار ہماری طرف سے فکر مند تھے اور ہم ان کی طرف سے پریشان۔ کچھ عرصے کے بعد جب انھیں معلوم ہوا کہ ہم جڑاں والا چلے گئے ہیں تو وہاں آگئے۔

ان دنوں تارکین وطن شدید پریشانیوں میں محصور تھے اور ہر شخص مبتلائے مصائب تھا۔ پنجاب کے وزیر مہاجرین میاں افتخار الدین تھے جو حکومت سے اختلاف کی بنا پر تھوڑے عرصے بعد مستعفی ہوگئے تھے اور مرکزی وزیر مہاجرین راجا غضنفر علی خان تھے۔ بھٹنڈہ سے بہاول نگر جانے والے اپنے رشتے داروں کے بارے میں ہم سخت پریشان تھے۔ان کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ اس سلسلے میں مَیں ایک دن ایک دوست کے ساتھ قصور سے لاہور آیا اور سیکرٹری ایٹ پہنچا۔ وہاں صحن میں راجا غضنفر علی خان کھڑے تھے۔ وہ ضلع جہلم کے موضوع پنڈ دادن خان کے رہنے والے تھے۔ میں نے ان سے اپنے ان رشتے داروں کے متعلق بات کی تو انھوں نے جھک کر دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر رکھے اور ہمدردانہ اور دردمندانہ لہجے میں کہا: وہ بڑا قافلہ ہے۔ ہم اس کے لیے فکر مند ہیں اور انھیں پاکستان لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اب تک جو جانی نقصان ان لوگوں کو پہنچا، وہ تو پہنچا آئندہ کوئی جانی نقصان نہیں ہوگا اور وہ چند روز تک ملٹری کے ذریعے پاکستان پہنچ جائیں گے۔ چنانچہ وہ پاکستان پہنچ گئے۔

قصور کے دورانِ قیام کا یہ واقعہ بھی سنتے جایے۔ میں اپنے استاذ محترم مولانا عطاء اللہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

حنیف بھوجیانی کا تذکرہ پہلے کر چکا ہوں۔ وہ فیروز پور سے پاکستان پہنچے تھے اور ان کا کتب خانہ فیروز پور میں رہ گیا تھا۔ ایک دن میں نے قصور کے ڈی ایس پی (ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس) سے ان کے کتب خانے کا ذکر کیا اور کہا کہ کسی دن وقت نکال کر اس کا پتا کرنا چاہیے، ممکن ہے ابھی تک پورا کتب خانہ یا اس کا کچھ حصہ محفوظ ہو۔ اس وقت ہمیں قصور آئے پندرہ سولہ دن ہو گئے تھے۔ ڈی ایس پی نے کہا: آپ کو ان کے مکان کے محل وقوع کا پتا ہے؟ میں نے کہا: پتا ہے۔ اس وقت دونوں ملکوں میں آنے جانے کی اجازت تھی۔

ایک دن شام کے کچھ دیر بعد ڈی ایس پی نے دو تین فوج کے اور تین چار پولیس کے آدمیوں کو تیار کیا اور فیروز پور کو روانہ ہو گئے۔ ٹرک ہمارا اپنا تھا۔ قصور سے فیروز پور پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ ہم وہاں پہنچے تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے شہر اجڑ گیا ہے یا اس میں دیو پھر گیا ہے اور اس نے سب لوگوں کو کھا لیا ہے۔ بالکل سناٹا اور خاموشی۔ نہ کہیں بندہ نظر آیا نہ پرندہ۔ ملتانی دروازے میں ہندوستان اور پاکستان کے چند فوجی بیٹھے تھے۔ ان سے آمد کا مقصد بیان کر کے ہم آگے نکل گئے۔ کسی کسی مکان میں روشنی دکھائی دیتی تھی۔ ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی۔ گلیوں میں کاغذ اور چیتھڑے بکھرے پڑے تھے۔ ڈی ایس پی کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور پولیس اور فوجیوں کے پاس بندوقیں۔ مجھے انھوں نے اپنے درمیان میں رکھا۔ محمد زکریا اور محمد علی بھی ساتھ تھے۔ ٹرک ہم نے سڑک پر کھڑا کیا۔ گلیوں میں سے گزرتے ہوئے محلّہ ''باولی رام دیال'' میں مولانا عطاء اللہ صاحب کے مکان کے دروازے پر جا کھڑے ہوئے۔ دوازہ کھٹکھٹایا، لیکن اندر سے بند تھا۔ دو تین دفعہ دستک دی، دروازہ نہ کھلا تو ڈی ایس پی نے دھکا دے کر دروازہ توڑ دیا۔ مکان کے اندر گئے، مکان خالی تھا اور کاغذ بکھرے ہوئے تھے، لیکن کتابیں نہیں تھیں، نہ الماریاں تھیں۔ نہ کوئی اور چیز۔ چھت پر گئے، وہاں بھی کچھ نہ تھا۔ پھر ہم گنبداں والی مسجد میں گئے، جہاں مولانا ممدوح نے مدرسہ قائم کیا تھا اور طلباء کو پڑھاتے تھے، وہاں بھی کچھ نہ تھا۔ لوگ مسجد کے پنکھے اتار کر لے گئے تھے۔ رات کے بارہ بجے کے قریب ہم خالی ہاتھ واپس قصور آ گئے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ہم ایک مہینے سے زیادہ دن قصور رہے۔ اس اثنا میں بہت سے لوگ فوت بھی ہو گئے۔ ہم اپنے ان رشتے داروں اور اہل وطن کے بارے میں بے حد پریشان تھے جو اپنا وطن چھوڑ کر کہیں جانا نہیں چاہتے تھے۔ یہ لوگ بہت بڑے قافلے کے ساتھ ایک مہینے کے بعد پاکستان کی سرحد میں داخل ہوئے۔ ہیضہ پھوٹ پڑا تھا، بے شمار لوگ ہیضے سے مر گئے۔

قصور میں ایک بات سے ایک دن مجھے نہایت خوشی ہوئی بلکہ تمام دکھ قلبی مسرت میں بدل گئے۔ ہوا یہ کہ ٹھیکے دار محمد صدیق نے جس کی تحویل میں مولانا محمد علی قصوری ایم اے کینٹب نے ہمارا ٹرک دیا تھا، مجھے کہا کہ آج ایک ضروری کام کے لیے لاہور جانے کا پروگرام ہے۔ چنانچہ شام سے کچھ دیر پہلے ہم لاہور کو روانہ ہوئے۔ شام کے بعد ماڈل ٹاؤن پہنچے تو سڑک پر دس پندرہ لڑکیاں ہنستی کھیلتی ننگے سر گھوم رہی تھیں۔ محمد صدیق نے ٹرک رکوایا اور نیچے اُتر کر ان لڑکیوں کو ڈانٹتے ہوئے کہا: تمھیں معلوم نہیں کہ اب پاکستان بن گیا ہے اور یہ مسلمانوں کا اسلامی ملک ہے۔ آئندہ یہاں جو کچھ ہو گا، اسلام کے مطابق ہو گا اور ملک کے تمام معاملات اسلامی احکام کی روشنی میں چلیں گے۔ اس طرح عورتوں کا بے پردہ گھومنا اور ننگے سر چلنا پھرنا برداشت نہیں کیا جائے گا۔ یہ الفاظ سن کر ان لڑکیوں نے سروں پر دوپٹے ڈال لیے اور سڑک سے دُور ہو گئیں۔

مجھے محمد صدیق کی اس بات سے بڑی خوشی ہوئی اور ذہن میں آیا کہ واقعتاً ہم اسلامی ملک میں آ گئے ہیں اور یہاں صحابہ کرام کے زمانے کی خالص اسلامی فضا لوٹ آئے گی، ہر طرف اسلام ہی اسلام نظر آئے گا اور کفر و شرک کے سلسلے ختم ہو جائیں گے۔ لیکن یہاں کیا ہوا اور کیا ہو رہا ہے، یہ ہم سب کے سامنے ہے۔ نہ اسلام آیا، نہ خالص جمہوریت آئی۔ نہ برائیاں ختم ہوئیں اور نہ ان کے ختم ہونے کے آثار اُبھرے۔ قتل و غارت، لوٹ کھسوٹ، غصب و نہب، دھوکا دہی، فریب کاری، رشوت خوری اور مار دھاڑ کا سلسلہ جاری ہے۔ اس ملک اور یہاں کے عوام کا اللہ ہی حافظ و نگہبان ہے۔

اپنے گھر (کوٹ کپورہ) سے رخصت ہونے کے بعد ہمارے رشتے داروں اور اہل وطن

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

پر کیا بیتی؟ اس کی تھوڑی سی تفصیل ملاحظہ ہو!

ہم ابھی وہیں تھے کہ ہمارے شہر میں اردگرد کے دیہات کے لوگ آنا شروع ہو گئے تھے، اس لیے کہ یہ مرکزی مقام تھا اور یہاں مسلمان اچھی خاصی تعداد میں آباد تھے اور بااثر بھی تھے۔ ہمارے بعد تو دور و نزدیک کے مسلمانوں کا ایک جم غفیر جمع ہو گیا تھا، جسے خود والیٔ ریاست ہراندر سنگھ بھی ایک یا دو مرتبہ دیکھنے آیا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کی ریاست میں مسلمانوں کو کوئی تکلیف نہ پہنچے اور وہ خیر و عافیت سے یہاں سے پاکستان کو روانہ ہوں۔ چناں چہ اس نے اس بہت بڑے قافلے کو براستہ مکتسر بنگلا فاضلکا کی طرف جانے اور وہاں سے ہیڈ سلیمان کی عبور کر کے پاکستان میں داخل ہونے کا مشورہ دیا۔ کوٹ کپورہ سے آٹھویں میل (یعنی بارہ تیرہ کلومیٹر) پر ضلع فیروز پور شروع ہو جاتا تھا۔ ریاست فرید کوٹ کی حد سے آگے جب قافلہ فیروز پور کی حد میں داخل ہوا تو سکھوں نے مختلف اطراف سے اس پر حملہ کر دیا۔ بم بھی پھینکے گئے۔ کچھ لوگ مارے گئے اور بہت سے زخمی ہو گئے۔ بم کے چند ذرات چودہ پندرہ سال کی ایک لڑکی کے پاؤں میں بھی گھس گئے۔ یہ میرے ماموں کی بیٹی تھی، جس سے کچھ عرصہ بعد میری شادی ہوئی۔ اس کا نشان ہمیشہ اس کے پاؤں پر موجود رہا۔

قافلہ آگے جاتا تو حملے کا مزید خطرہ تھا۔ لیکن اسے واپس لایا گیا اور پھر ایک دوسرے راستے سے ہیڈ حسینی والا کی طرف سے پاکستان کی حد میں داخل کیا گیا۔ ہمیں قصور میں مختلف ذرائع سے اس قسم کی خبریں پہنچ رہی تھیں، جنھیں سن کر بے حد تشویش ہوتی تھی۔ ہم دوسرے تیسرے دن اس قافلے کے لیے گنڈا سنگھ والا آتے اور واپس چلے جاتے۔ ایک دن ایک معتبر ذریعے سے معلوم ہوا کہ تمھارا قافلہ کل ضرور پاکستان کی حد میں داخل ہو جائے گا۔ چناں چہ ہم گئے تو واقعی قافلہ آ رہا تھا۔ میرے والد اور تمام رشتے دار اور دوست احباب قافلے میں موجود تھے اور بالکل خیریت سے تھے۔ ہمیں ایک دوسرے کو دیکھ کر نہایت خوشی ہوئی۔

اس سے چند روز بعد ہم قصور سے لاہور آ گئے۔ یہاں چار پانچ روز ٹھہرے۔ پھر جڑاں والا کا قصد کیا۔ یہاں کی موجودہ لکڑ منڈی میں اس وقت غیر مسلم کیمپ کی صورت میں

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

موجود تھے۔ بعض لوگ اپنے گھروں میں بھی بیٹھے تھے۔ بعض دیہات میں سکھ خاصی تعداد میں مقیم تھے۔ جڑاں والا کے قریب ہی ہم لوگ چک نمبر ۵۳ گ ب منصور پور ڈھیسیاں آ گئے۔ جڑاں والا کے قرب و جوار میں ریاست فرید کوٹ کے لوگوں کے لیے بارہ دیہات الاٹ ہوئے تھے۔ لیکن ہمارے لوگ سات آٹھ روز بعد میں پہنچے اور ان دیہات میں مختلف مقامات کے لوگ آباد ہو گئے۔

قافلے میں ہمارے ہاں کے جو لوگ یہاں آئے، ان میں ایک شخص مہر کریم بخش تھے۔ ارائیں برادری سے ان کا تعلق تھا۔ وہ اپنے گڈے پر کچھ ضروری سامان بھی لاد کر لے آئے تھے۔ ان کے اونچے قد کے بیل تھے جو گڈے میں جتے ہوئے تھے۔ ہمارے موجودہ گھر کے سامنے انھوں نے گڈے سے بیل کھولے تو مجھے پنجابی میں کہا: ''چودھری ان بے زبانوں کے لیے کہیں سے تھوڑی بہت توڑی (بھوسے) کا انتظام ہو سکے تو بڑی مہربانی ہوگی۔ یہ بھوکے ہیں۔''

میں نے دیکھا کہ ایک کچے مکان میں توڑی پڑی تھی۔ میں نے کہا: ''مہر جی، وہ توڑی پڑی ہے، مجھے ٹوکرا دو، میں بیلوں کے لیے توڑی لاتا ہوں۔''

مہر کریم بخش نے مجھے ٹوکرا دیا اور وہ خود زمین پر بیٹھ گئے۔ مجھے احساس ہوا کہ یہ تھکے ہوئے ہیں۔ میں توڑی ٹوکرے میں ڈالنے لگا تو ایک نوجوان آیا۔ سر پر کلف لگی ہوئی سفید پگڑی، سفید قمیص اور سفید ہی تہبند۔ پاؤں میں تازہ پالش کیے کالے پمپ۔ بڑے رعب سے کہا: یہ توڑی کیوں ٹوکرے میں ڈال رہے ہو؟ میں توڑی نہیں لینے دوں گا۔ میں نے نرمی سے کہا: یہ توڑی آپ کی ہے؟ تلخی سے جواب دیا: ہاں میری ہے۔ میں نے کہا: پھر تو بہت اچھی بات ہے کہ یہ توڑی آپ کی ہے۔ میں ان بے زبان بھوکے بیلوں کے لیے توڑی لینا چاہتا ہوں، آپ مہربانی کر کے توڑی دے دیجیے۔ اس نے کہا: میں توڑی نہیں دوں گا۔ میں نے سوچا کہ اب توڑی لینے کی ضرور کوشش کرنی چاہیے۔ اگر توڑی کا مالک یہی شخص ہوا تو آگے بڑھ کر مجھے ہاتھ سے روکے گا۔ میں نے پھر نرم لہجے میں توڑی مانگی۔ اس نے اب بھی اسی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

طرح انکار کیا تو میں نے ٹوکرا آگے کیا، اسے گھٹنے لگائے اور دونوں ہاتھوں سے ٹوکرے میں توڑی ڈالتے ہوئے کہا: میں بیلوں کے لیے توڑی ٹوکرے میں ڈال رہا ہوں۔ اگر یہ توڑی تمھاری ہے تو آگے بڑھ کر مجھے روکو۔ وہ بولتا ہوا پیچھے ہٹ گیا اور میں نے توڑی کا بھرا ہوا ٹوکرا مہر کریم بخش کو دیا۔ انھوں نے ٹوکرا بیلوں کے آگے رکھا۔ اتنے میں مَیں دوسرا ٹوکرا بھر لایا۔

توڑی سے روکنے والا وہیں کا رہنے والا مسلمان تھا اور سکھوں کا کارندہ تھا۔ اس کا مکان وہیں تھا۔ اللہ مغفرت کرے وہ فوت ہو گیا ہے۔

ہم اپنے وطن سے چل کر تقریباً ڈھائی مہینے کے بعد اس گاؤں میں پہنچے تھے۔ ایک دن ایک شخص جان محمد نے (جو بعد میں حاجی جان محمد ہوئے) مجھے سنجیدگی سے کہا: ''ایتھوں مکہ مدینہ نیڑے ای ہوناں اے'' (یہاں سے مکہ مدینہ نزدیک ہی ہوگا۔) اس کا مطلب یہ تھا کہ دو ڈھائی مہینے میں حاجی حج کر کے واپس آ جاتے ہیں۔ ہمیں بھی گھر سے نکلے اتنا ہی عرصہ ہو گیا ہے۔ اس زمانے میں لوگ بحری جہازوں پر حج کرتے تھے اور دیہات میں ''مکہ مدینہ'' اکٹھا ہی بولا جاتا تھا۔ اب بھی بعض لوگ یہی تلفظ کرتے ہیں۔

کوٹ کپورہ میں ہمارے مکان کے قریب چند گھر سکھوں کے تھے۔ ان لوگوں سے ہمارے اچھے تعلقات تھے۔ ان میں ایک شخص ہرنام سنگھ تھا۔ میرے والد قافلے کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوئے تو گھر کا تمام سامان صندوق، ٹرنک، رضائیاں، چارپائیاں، برتن وغیرہ ہرنام سنگھ کے گھر رکھ آئے تھے۔ میری دو سو کے قریب کتابیں تھیں۔ حدیث کی کتابوں میں بلوغ المرام مع سبل السلام، مشکوۃ شریف، سنن نسائی، جامع ترمذی مع تحفۃ الاحوذی، ابن ماجہ، ابوداؤد مع عون المعبود، صحیح مسلم، صحیح بخاری شامل تھیں۔ علاوہ ازیں تمام درسی کتابیں۔ تفسیر بیضاوی، تفسیر جامع البیان اور تفسیر جلالین۔ عربی کی بعض کتابیں۔ قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی رحمۃ للعالمین، سیرۃ النبی کی پانچ جلدیں، شبلی کی الفاروق، اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کی تاریخ اسلام، بعض اور چھوٹی بڑی سیرت کی کتابیں، چند سیاسی موضوع سے متعلق کتابیں۔ اقبال کی بالِ جبریل اور بانگ درا وغیرہ۔ یہ کتابیں والد محترم نے ہرنام سنگھ کے حوالے کر دی تھیں۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

میں تو کوٹ کپورہ سے آنے کے بعد وہاں نہیں جاسکا، البتہ میرے بعض عزیز گئے تھے۔ انھوں نے ہرنام سنگھ سے گھریلو سامان کی بات نہیں کی، لیکن کتابوں کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا کہ تم لوگوں کے یہاں سے جانے کے بعد سرکاری آدمی آئے تھے، وہ تمام کتابیں اور سامان ہم سے لے گئے۔

یہاں یہ بھی بتادیں کہ جب ہم لوگ لاہور سے جڑاں والا کے لیے روانہ ہونے لگے تو میرے والد کے پاس پانچ سو روپے تھے اور میرے پاس بیس روپے۔ میں اپنے موجودہ گاؤں میں پہلے چلا گیا تھا اور والد دوسرے لوگوں کے ساتھ بعد میں آئے۔ لاہور ریلوے اسٹیشن پر میرے والد کی جیب سے پانچ سو روپے کسی نے نکال لیے۔ یہ اس زمانے میں بہت بڑی رقم تھی۔ بیس روپے کی (جو میرے پاس تھے) میں نے کھانے پینے کی ضروری چیزیں خریدیں اور مٹی کے دو چار برتن لیے۔ پھر ہمارے ساتھ کیا بیتی؟ اس کے متعلق کچھ نہ پوچھیے۔ تکلیف کے دن تو تھوڑے ہی تھے، لیکن کتنے بھاری تھے، یہ ہم ہی جانتے ہیں۔

کسی سے ادھار لینا یا کسی کو ادھار دینا بڑی بات نہیں، یہ سلسلہ دنیا میں ہمیشہ چلتا آیا ہے اور چلتا رہے گا۔ لیکن ان حالات میں جن میں ہم اس وقت گزر رہے تھے، کسی کو ادھار دینا یا کسی سے ادھار لینا بہت بڑی بات تھی۔ پھر کسی کے پاس کچھ تھا بھی نہیں۔ بہر حال اس وقت پانچ سو روپے کا ضائع ہونا ہمارے لیے ایک آزمائش سے کم نہ تھا۔

اس دور کی ایک اور بات سنیے جو مجھے ہمیشہ یاد رہی۔ ہمارے موجودہ گاؤں میں ہم ایک ہی جگہ (کوٹ کپورہ) کے لوگ آباد ہوئے تھے اور ان میں سے زیادہ لوگوں کا تعلق تین برادریوں سے تھا، ایک ہماری برادری تھی، دوسری ارائیں برادری اور تیسری ملک برادری۔ ان کے علاوہ دوسری برادریوں کے چند گھر تھے۔ اس وقت وہاں جمعہ میں پڑھایا کرتا تھا۔ میرے والد کی جیب کٹنے کا واقعہ گاؤں کے سب لوگوں کے علم میں آچکا تھا۔ ایک روز جمعے کے بعد ایک شخص عبداللہ (نہر والے جو ارائیں برادری سے تعلق رکھتے تھے) مجھے اپنے کھیت لے گئے۔ وہ بیلنے سے گڑ بنا رہے تھے۔ انھوں نے مجھے چپکے سے پانچ روپے دیے۔ میں نے لینے سے انکار کیا تو

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کہا، چپ رہو، تمھارا بہت نقصان ہو گیا ہے، یہ تو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔

اس گاؤں میں ہم نے جس گھر میں بسیرا کیا وہ کچا گھر تھا۔ ایک اینٹ بھی پکی نہ تھی۔ اس کے کئی کوٹھے یا کمرے تھے اور نیا بنا تھا۔ باہر کے دروازے پر سرخ دھاگا بندھا ہوا تھا جو اس کی تازہ تعمیر کی علامت تھا۔ اس کے سکھ مالک کی جو متروکہ چیزیں ہمیں ملیں وہ پانچ تھیں، (۱) لکڑی کی ایک بڑی الماری (۲) لکڑی کا ایک صندوق (۳) لکڑی ہی کی ایک کھرلی (۴) گڑ بنانے والا بیلنا اور (۵) لوہے کا بڑا کڑاہا۔

کڑاہے میں تین چیزیں پڑی تھیں۔ ایک کتاب ہیر وارث شاہ، دوسری کتاب تھی، ''چپ جی اور سکھ منی صاحب۔'' یہ دراصل بابا گرونانک کی بانیاں (یا ان کی مناجات) ہیں جو سکھ صاحبان صبح کے وقت خاص لہجے میں پڑھتے ہیں۔ یہ منظوم کتاب ہے، جس کا اُردو نظم میں ترجمہ پرنسپل خواجہ دل محمد نے کیا۔ گرونانک صاحب کے شعر کے ساتھ ہی خواجہ صاحب کے شعر درج ہیں۔ ان دو کتابوں کے علاوہ تیسری چیز تھی ایک کالے رنگ کے کپڑے کی باریک سی کچھ لمبی پٹی جو سکھ صاحبان داڑھی اور کیسوں پر باندھتے ہیں۔ کتابیں دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ اس مکان کا مالک کوئی پڑھا لکھا سکھ ہے۔ کڑاہے سے برآمد شدہ مالِ متروکہ کو میں نے بہت حفاظت سے رکھا۔ دونوں کتابیں تو میرے پاس اب تک محفوظ ہیں، لیکن کپڑے کی وہ پٹی کہیں گم ہو گئی۔ اس سال بہت بارشیں ہوئی تھیں اور وہ علاقہ سیم زدہ تھا۔ سیم اور بارشوں کی وجہ سے تھوڑے عرصے بعد ہمارے سب کچے کوٹھے گر گئے تھے۔ لیکن شہتیر بالے اور دروازے وغیرہ مضبوط لکڑی کے تھے جو محفوظ رہے۔ ہم نے کسی نہ کسی طرح کچی پکی اینٹوں کے تین کمرے دوبارہ تعمیر کرائے۔ اب ہمارا یہ گاؤں ایک قصبے کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ دکانوں میں ہر قسم کی چیزیں ملتی ہیں۔ گاؤں میں کوئی مکان کچا نہیں ہوگا بلکہ شاید کسی مکان کی ایک آدھ دیوار بھی کچی نہیں ہوگی۔ سیم کا بھی کہیں نام ونشان نہیں ہے۔

تقسیم ملک کے زمانے میں مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کو زیادہ تکلیف سکھوں سے پہنچی۔ یہ کھلی ڈلی قوم ہے۔ ہمارے ایک سکھ پڑوسی کا نام کشن سنگھ تھا۔ اس کی دو بیٹیاں تھیں اور

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ایک بیٹا۔ بیٹے کا نام سنت سنگھ تھا اور وہ جوئے باز تھا۔ سب کی عزت کرتا تھا اور بول بچن میں بہت نرم تھا۔ کشن سنگھ کی دو بیٹیوں میں سے ایک جوان بیٹی شادی سے پہلے مرگئی تھی اور دوسری کی کوٹ کپورہ سے چھ سات میل کی مسافت پر ایک گاؤں ''کھارا'' میں شادی ہوئی۔ اس کا نام بلبیر کور تھا، لیکن اسے ''بلبیرو'' کہا جاتا تھا۔ شریف ماں باپ کی لجپا والی بیٹی۔ شادی کے بعد وہ رُخصت ہوئی تو اس کے باپ نے کہا: ''اسیں کہنے آں کڑی ٹرگئی، کڑی ٹرگئی۔ سوہریاں دے جائے گی تاں اوہ کہن گے ووہٹی آ گئی، ووہٹی آ گئی۔ اوہ بھی سچے تے اسیں بھی سچے۔'' یعنی ہم کہتے ہیں کہ لڑکی رُخصت ہوگئی، لڑکی رُخصت ہوگئی۔ سسرال میں جائے گی تو وہ کہیں گے دولھن آ گئی، دولھن آ گئی۔ وہ بھی سچے اور ہم بھی سچے۔''

بلبیرو ہماری والدہ کی سہیلی تھی۔ آزادی کے بہت سال بعد ہمارے بہنوئی حاجی محمد ارشاد مرحوم کوٹ کپورے گئے تو ہماری والدہ نے ان سے کہا کہ بلبیرو سے ضرور ملنا اور اسے میرا سلام پہنچانا۔ چناں چہ وہ اس کے گاؤں گئے اور اسے ملے تو بے حد خوش ہوئی اور اپنے بچوں سے اور دوسرے لوگوں سے کہا کہ پاکستان سے میرا داماد آیا ہے۔ لوگوں نے پوچھا پاکستان میں تمھارا داماد کون ہے۔ ہماری والدہ کا نام لے کر کہا کہ اس کا داماد ہوا تو میرا ہی داماد ہوا۔

اس گاؤں (چک نمبر ۵۳ گ ب) میں اگرچہ ہم سب ایک ہی شہر سے آئے تھے اور ایک دوسرے سے اچھی طرح متعارف تھے اور بعض سے میرے بچپن سے مراسم قائم تھے، لیکن میرا وہاں جی نہیں لگ رہا تھا۔ ہر وقت بے چینی کی کیفیت اور اُداسی کا سماں۔ ایک دن معلوم ہوا کہ مولانا معین الدین لکھوی اپنے خاندان سمیت اوکاڑہ آ گئے ہیں۔ میں وہاں چلا گیا۔ انھیں اور دوسرے دوستوں کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ چار پانچ روز کے بعد چودھری غلام حسین تہاڑیہ بھی آ گئے۔ انھیں مل کر مزید مسرت ہوئی۔ کچھ دن وہاں رہا۔ پھر گاؤں واپس آ گیا۔

اب میں نے اس زرعی زمین میں جھگی (کٹیا) بنالی تھی جو ہمیں حکومت کی طرف سے الاٹ ہوئی تھی۔ ایک چارپائی، ایک بستر، قرآنِ مجید اور ہیر وارث شاہ کتاب۔ یہ میری اس جھگی میں کل کائنات تھی۔ صبح اُٹھ کر سب سے پہلے قرآنِ مجید پڑھتا۔ یہ میرا پرانا معمول تھا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

پھر تھوڑا بہت کھیت میں کام کرتا۔ تھک جاتا تو ہیر وارث شاہ پڑھنا شروع کر دیتا۔ گھر سے دو وقت روٹی آ جاتی تھی۔

ایک دن جڑاں والا سے (جسے ہم شہر کہا کرتے تھے) دو آنے کا ''امروز'' اخبار منگواتا تھا اور اسے دو دن پڑھتا تھا۔ مطالعۂ کتب کا ابتدائی زندگی ہی سے شوق تھا، لیکن یہاں کوئی کتاب نہ تھی۔ قیمتاً کتاب منگوانے کی سکت نہ تھی۔ دن کو بھی اور رات کو بھی بعض پرانے ملنے والے آ جاتے تھے اور ان سے ادھر اُدھر کی باتیں ہو جاتی تھیں۔ کبھی کبھی شہر یعنی جڑاں والا کا چکر بھی لگا آتا تھا۔

میری جھگی یا کٹیا اس راستے پر تھی جو جڑاں والا کو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی پانی کا کھال چلتا تھا۔ ایک روز عشا کی نماز کے بعد میں اکیلا جھگی سے باہر چارپائی پر بیٹھا تھا کہ ایک نوجوان آیا اور السلام علیکم کہہ کر بولا ''بھرا میں تیری منجی تے بہہ جاں'' (بھائی میں تیری چارپائی پر بیٹھ جاؤں؟) میں نے کہا بیٹھ جاؤ۔ پوچھا تمھارے پاس حقہ ہے؟

میں نے کہا: میں حقہ نہیں پیتا۔

کہا: پناہئیں ہو، ہندوستان سے آئے ہو؟

جواب دیا: ہاں پناہ گیر ہوں۔

اب اس نے اپنی تعارفی کہانی سنانا شروع کی۔ کہا پاکستان تو اب سے صرف تین مہینے پہلے بنا ہے۔ ہمارا اس علاقے میں چوروں کا گروہ تھا، جس میں مسلمان بھی شامل تھے اور سکھ بھی۔ ہم لوٹ مار کرتے تھے اور پولیس کو اس کا حصہ دیتے تھے۔ کوئی ہمیں پکڑتا نہیں تھا۔ اس طرح اس نے ایک لمبی کہانی سنائی۔ یہ بھی کہا کہ اب میں نے یہ کام چھوڑ دیا ہے۔ میرے ساتھیوں نے بھی اس سے توبہ کر لی ہے۔ لیکن تمھیں کوئی کام ہو تو مجھے بتاؤ۔

وہ باتیں کر رہا تھا اور میں گھبرا رہا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ معلوم نہیں یہ کب یہاں سے جائے گا۔ آدھ پون گھنٹا وہ میرے پاس رہا، جاتے ہوئے کہا کہ چار پانچ روز کے بعد پھر تمھیں سلام کرنے آؤں گا۔ لیکن اس کے بعد نہیں آیا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

پاکستان آ کر ہمیں ایسے مرحلوں سے گزرنا پڑا، جن کا کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا اور ایسے ایسے کام کرنا پڑے، جن سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔

سب لوگوں کی میں بات نہیں کرتا، اپنے گھر اور اپنے گاؤں کے لوگوں کے بارے میں عرض کرتا ہوں کہ اس وقت ہمارے ہاں اناج کی شدید قلت پیدا ہوگئی تھی۔ لوگ گندم کو ترس گئے تھے۔ بالآخر کہیں سے قیمتاً گندم ملی، لیکن وہ کئی سال کی پرانی گندم تھی اور بھیگی ہوئی تھی۔ اس کا رنگ بالکل بدل چکا تھا اور اس سے بو آتی تھی۔ اب یہ تو یاد نہیں رہا کہ وہ کس بھاؤ ملی تھی، لیکن اتنا معلوم ہے کہ کافی مہنگی ملی تھی۔ خراس سے پسوا کر بڑی مشکل سے اس کا آٹا گوندھا جاتا تھا۔ پھر توے پر ڈالنے سے پہلے پیڑا بار بار ٹوٹتا تھا۔ توے پر ڈال کر اسے اتھلنا اس سے مشکل مرحلہ تھا۔ پھر اس کی روٹی کھانا اور نوالہ حلق سے نیچے اتارنا مشکل ترین کام تھا۔ یہ گندم کھانے کی وجہ سے کئی لوگ بیمار ہوگئے۔ پیٹ میں درد ہونے لگا اور معدے کی حالت بدل گئی۔

آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ بڑے بڑے پھنے خاں یہاں آ کر سخت پریشانی میں مبتلا ہوگئے تھے۔ میں اور میرا پھوپھی زاد عزیز احمد (جو اپنے وطن میں آسودہ حال تھا) ہم دونوں جڑاں والا سے برف لا کر گاؤں میں فروخت کرنے لگے تھے۔ میں سائیکل پر ایک من برف جڑاں والا سے گاؤں لاتا تھا۔ وہ پگھل بھی جاتی تھی۔ بیس پچیس روز ہم دونوں یہ کام کرتے رہے۔ گاؤں کے سب لوگ ایک دوسرے سے اچھی طرح متعارف تھے۔ تکلیف کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنسی مذاق کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا اور پہلے دور کے آرام کے دنوں کی باتیں بھی کی جاتی تھیں۔

کوٹ کپورہ میں ہمارے محلے کا ایک شخص عبدالوہاب کمہار تھا۔ اس کے سات آٹھ گدھے تھے۔ اتفاق سے وہ گدھے یہاں لے آیا تھا، عبدالوہاب اب بھی موجود ہے۔ میں گاؤں جاتا ہوں تو مجھے ضرور ملتا ہے۔ اس وقت نوجوان تھا، اب بوڑھا ہوگیا ہے۔ اس نے مشورہ دیا کہ کسی طرح کچھ رقم اکٹھی کر کے مقامی لوگوں کے دیہات سے (جنھیں جانگلی کہا جاتا

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ہے) گدھوں پر گندم لاکر گاؤں میں فروخت کی جائے تو یہ کام فائدہ مند رہے گا۔ سردیوں کا موسم آ گیا تھا۔ ہم چار آدمیوں نے کسی طرح پانچ چھ سو روپے کا انتظام کیا اور محدود پیمانے پر گندم کی خرید و فروخت میں مصروف ہو گئے۔ وہ چار آدمی تھے، میں، عبدالشکور (نمبردار) محمد دکان دار اور جان محمد۔ نمازِ فجر سے پہلے عبدالوہاب ہمیں گھروں سے جگاتا، وضو کر کے ہم گدھوں پر بیٹھ جاتے اور ہنستے کھیلتے چل پڑتے۔ جہاں اذان کی آواز سنتے، نماز پڑھ لیتے۔ کسی گاؤں میں پہنچ کر گندم خریدتے۔ لوگ پوچھتے تو: ''پنائیں او؟'' (پناہ گیر ہو؟) عورتیں ایک دوسری سے کہتیں: ''شوہدے پنائیں نیں'' (بے چارے پناہ گزین ہیں) ''شوہدے'' کا لفظ ہمارے ہاں معنیٰ مذموم میں بولا جاتا تھا۔ گھٹیا، بدقماش اور کمینے آدمی کو ''شوہدا'' کہا جاتا تھا۔ فلاں آدمی بڑا شوہدا ہے۔ لیکن یہاں آ کر ہم ''شوہدا'' کے نئے معنوں سے متعارف ہوئے۔ یہ معنے پہلے معنوں سے بالکل الٹ ہیں اور کسی کی بے چارگی، غربت اور مظلومیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ فلاں آدمی بڑا شوہدا ہے، یعنی مظلوم ہے، غریب ہے، قابل رحم ہے، اس کی مدد کرنی چاہیے۔ اس معنے کی رو سے جانگلی عورتیں ازخود ہی ہمیں روٹی اور لسی وغیرہ دے دیتی تھیں اور بسا اوقات گندم بھی کچھ سستی مل جاتی تھی۔ ہم اپنے گاؤں میں گندم لے کر آتے تو فوراً بک جاتی۔ ہم زیادہ منافع نہیں لیتے تھے۔ بس اتنا ہی جس سے ہمارے کھانے پینے کا سلسلہ چل جاتا تھا، یعنی قوت لا یموت۔ گاؤں کے لوگ ہمارے اس کام سے بہت خوش تھے۔ انھیں گھر بیٹھے اچھی گندم مل جاتی تھی۔ لیکن یہ سلسلہ تھوڑے دن ہی چلا۔

کچھ عرصے کے بعد گندم کی کٹائی کا موسم آیا تو ہم چار آدمیوں نے بھوسہ خرید کر بذریعہ مال گاڑی لاہور لاکر بیچنے کا پروگرام بنایا، لیکن اس میں گھاٹا پڑا۔ پھر ہم بھوسہ، راولپنڈی لے کر گئے۔ اس سے لاہور والا گھاٹا بھی پورا ہو گیا اور ہمیں کچھ بچت بھی ہو گئی۔ اس کے بعد یہ کام بھی ختم ہو گیا۔ اب ہمیں اپنی اس زمین سے کافی گندم آ گئی تھی جو یہاں آنے کے بعد اپنی متروکہ زمین کے بدلے میں الاٹ ہوئی تھی۔ ہم نے اپنی ضرورت کے مطابق گندم رکھ لی تھی، باقی جڑاں والا کی غلہ منڈی میں فروخت کر دی تھی۔ اللہ کی مہربانی سے اب حالات روز بروز

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

بہتر ہونے لگے تھے اور بَعْدَ عُسْرٍ یُسْرًا کی صورتِ حال پیدا ہوگئی تھی۔

ہم جس گاؤں میں آئے، یہ سکھوں کا گاؤں تھا۔ یہاں کوئی مسجد نہ تھی۔ البتہ گوردوارہ تھا، ہم نے اس میں جمعہ جماعت کا انتظام کرلیا۔ جمعہ میں پڑھاتا تھا۔ اس گاؤں میں جو پہلا جمعہ آیا اس سے دو روز پیشتر فلسطین میں برطانیہ اور امریکہ نے یہودی حکومت قائم کی تھی۔ میں نے خطبے میں اسی کا تذکرہ کیا۔ چوں کہ ہم خود لٹے پٹے آئے تھے، اس لیے لوگ فلسطینی مسلمانوں کی مظلومیت سے متاثر ہوئے اور بعض رونے لگے۔ پھر گاؤں کے وسط میں کسی کا مکان تھا جو خالی ہوگیا تھا۔ ہم نے وہاں مسجد بنالی۔ اس میں بھی ابتدا میں جمعہ و جماعت کا فریضہ میں انجام دیتا تھا۔ پھر میرے ایک دوست حافظ علی محمد وہاں آگئے۔ جو کوٹ کپورہ میں ایک مسجد کے امام تھے۔ پھر ہم نے یہ سلسلہ ختم کردیا تھا۔ جب ہم پہلے دن گدھوں پر سوار ہوکر گندم خریدنے کے لیے ایک گاؤں کی طرف روانہ ہوئے تو مجھے ایک پنجابی لوگ گیت یاد آگیا جو میں نے اپنے ساتھیوں کو سنایا۔

جنج کمہیاروں دی گدھے ہنگلا ے اوندے

یعنی کمہاروں کی بارات گدھوں پر سوار ہے اور ان کے گدھے ہینگتے ہوئے آرہے ہیں۔

بہر حال چند روز گدھوں پر ہماری بارات کی آمدورفت جاری رہی۔ لاہور آگیا تو جمعہ و جماعت کا سلسلہ حافظ علی محمد کے سپرد کردیا۔ اب وہ ماشاء اللہ بہت بڑی مسجد ہے۔ اس کے علاوہ بھی گاؤں میں چار پانچ مسجدیں تعمیر ہوگئی ہیں۔ گاؤں کی آبادی بہت بڑھ گئی ہے۔ اب وہ گاؤں نہیں رہا، قصبہ ہوگیا ہے۔

ہم اپنے موجودہ پاکستانی گاؤں میں نئے نئے آئے تھے اور ظاہر ہے اس زمانے میں پریشانی کے سوا کوئی چیز ہمارے پاس نہ تھی۔ نہ پیسا، نہ آٹا، نہ بستر، نہ کپڑا، نہ چارپائی، نہ برتن۔ اگر برتن ہوں بھی تو خالی برتنوں کو کیا کرنا تھا۔ حکومت کا کوئی چھوٹا بڑا ذمہ دار آدمی ہمارے گاؤں نہیں آیا۔ نہ پاکستان قائم کرنے کی دعوے دار جماعت مسلم لیگ کے کسی عہدے دار یا رکن نے ادھر کا رُخ کیا۔ ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں دوسرے علاقوں کی طرح اس علاقے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

میں مسلم لیگ ہی کا کوئی شخص کامیاب ہوا ہوگا، لیکن نہ وہ خود کسی گاؤں میں لوگوں کو تسلی دینے گیا، نہ اس کے کسی نمائندے نے کسی کا پتا لیا۔ کسی کی مالی امداد کرنا تو بہت بڑی بات ہے، کسی کے پاس آنا اور کسی سے بات کرنا بھی کسی مسلم لیگی نے مناسب نہیں سمجھا۔ اب اس جماعت کے پندرہ سولہ گروہ ہیں اور ہر گروہ اقتدار کا بھوکا اور حکومت کا حریص ہے۔

پاکستان میں جو زمین ہمیں الاٹ ہوئی، اس میں کماد کی فصل تھی۔ ہم بیلنے سے گڑ بناتے اور گنے کا رس پیتے۔ اس کی جسے پنجابی میں ''روہ'' کہا جاتا ہے، ہم کھیر بھی پکاتے تھے۔ گنے کے رس کی بنی ہوئی کھیر ہم نے پہلی مرتبہ یہاں آ کر کھائی۔ رس بھی پہلی مرتبہ پیا۔

قیامِ پاکستان کے زمانے میں سرکردہ مقامی لوگوں نے یا مسلم لیگی ارکان نے مہاجروں کی کوئی مدد نہیں کی۔ بلکہ بہت سے مقامی لوگوں نے مہاجروں کی امداد کے بجائے غیر مسلموں کے گھروں میں گھس کر لوٹ کھسوٹ کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ لاہور کے ایک نوجوان نے مجھے بتایا کہ ایک دفعہ ایک رات میں اس نے اپنے چند دوستوں کے ساتھ اتنی لوٹ کھسوٹ کی کہ صبح کو ہم نے سونا تقسیم کیا تو ہر ایک کو ڈھائی ڈھائی سیر سونا ملا۔ اس کا بیان ہے کہ میں گھر آیا تو والد سخت پریشان تھے کہ معلوم نہیں میں کہاں ہوں اور کس حال میں ہوں۔ صبح کو انھیں ملا تو وہ بے حد خفا ہوئے اور کہا تمھیں شرم نہیں آتی، مشرقی پنجاب سے مسلمان کس حال میں آ رہے ہیں اور تم یہاں لوٹ کھسوٹ میں مصروف ہو۔ اس نے بتایا کہ اس کے بعد اس نے یہ کام نہیں کیا...... میں نے کہا اس کے بعد ضرورت ہی کیا تھی؟ ڈھائی سیر سونا تو ایک رات میں لوٹا۔ معلوم نہیں کتنی راتوں میں کتنا کچھ لوٹا ہوگا۔

چلتے چلتے ۱۹۴۸ء کا اکتوبر آ گیا۔ ہمیں پاکستان آئے ہوئے چودہ مہینے ہو گئے تھے۔ ایک روز معمول کے مطابق میں نے تانگے والے کے ہاتھ جڑاں والا سے اخبار ''امروز'' منگوایا، جسے میں نے دو دن پڑھنا تھا۔ پہلے دن کے حصے کا اخبار پڑھا۔ پھر ایک شخص آ گیا، اسے اخبار کی کچھ خبریں بتائیں۔ بعد ازاں ہیر وارث شاہ کتاب پڑھی۔ اب سوچ رہا تھا کہ تھوڑی دیر کماد کو گوڈی دی جائے۔ سامنے دیکھا تو استاذِ محترم مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

تشریف لا رہے تھے۔ میں انھیں دیکھ کر حیران اور وہ مجھے دیکھ کر متعجب۔ پہلے وہ ہمارے گھر گئے۔ گھر سے میرے بارے میں انھیں بتایا گیا کہ وہ تو بن باس (یا کھیت مقیم) ہو گیا ہے۔ کھانے پینے کے لیے جو کچھ میسر تھا، میرے والدین نے ان کی خدمت میں پیش کیا اور پھر وہ کسی کے ساتھ میرے پاس تشریف لائے۔ اس سے قبل ۲۴؍ جولائی ۱۹۴۸ء کو لاہور میں مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کے نام سے مغربی پاکستان کی جماعت اہل حدیث کی تنظیم قائم کی گئی تھی، جس کے صدر مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی کو اور ناظم اعلیٰ پروفیسر عبدالقیوم کو بنایا گیا تھا۔

مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی نے مجھے فرمایا کہ انھیں مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی اور مولانا محمد اسماعیل سلفی نے بھیجا ہے کہ مغربی پاکستان کے مختلف مقامات کی جماعتوں سے خط و کتابت کے ذریعے سے رابطہ رکھنے کے لیے مرکزی جمعیت کے دفتر میں سیکرٹری کی ضرورت ہے یعنی آفس سیکرٹری کی۔ اس سے جماعت کا نظم مضبوط ہوگا۔ تم میرے ساتھ لاہور چلو۔ مولانا غزنوی اس سلسلے میں تم سے بات کریں گے۔ اس پر میں نے ان کا انتہائی شکریہ ادا کیا اور عرض کیا کہ آج تو میرا آپ کے ساتھ لاہور جانا مشکل ہے۔ ان شاء اللہ پرسوں حاضر خدمت ہو جاؤں گا۔

۲۰؍ جنوری ۲۰۰۸ء — بہاول نگر

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

گیارھواں باب:

نئی منزل......نئی راہیں

اب میرا کاروانِ حیات نئی منزل کی طرف گام زن ہوتا ہے اور میں گاؤں سے نکل کر لاہور کی طرف روانہ ہوتا ہوں۔

اس وقت میرے ایک دوست اور قریبی رشتے دار میاں محمد زکریا (جن کا ذکر گزشتہ صفحات کے مختلف مقامات میں ہوا) ٹرک چلاتے تھے اور وہ زیادہ تر جڑاں والا سے راولپنڈی اور لاہور جاتے تھے۔ ٹرک عام طور سے رات کو آٹھ نو بجے کے پس و پیش جڑاں والا سے نکلتے تھے۔ میں نے محمد زکریا کو پیغام بھجوایا کہ کل رات وہ لاہور جائیں تو مجھے اپنے ساتھ لیتے جائیں۔ چناں چہ وقت مقررہ پر وہ ٹرک لے کر گاؤں آئے اور میں ان کے ساتھ لاہور کو روانہ ہو گیا۔ شب کو دو بجے کے لگ بھگ ہم شیش محل روڈ پہنچے اور مجھے یہیں آنا تھا۔ مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی نے جس طرح بتایا تھا، ہم نے دارالعلوم تقویۃ الاسلام کے پھاٹک پر دستک دی اور مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی کے ملازم محمد عمر تبّتی نے دروازہ کھولا۔ اسے میرے نام اور میری آمد کے متعلق مولانا عطاء اللہ صاحب نے مطلع فرما دیا تھا۔ محمد عمر اپنے خاص لہجے میں اُردو بولتا تھا۔ عام طور سے صیغۂ جمع کو صیغۂ واحد میں بدل دیتا تھا۔ نہایت مخلص آدمی تھا۔ محمد زکریا مجھے چھوڑ کر چلے گئے تھے اور مَیں اب محمد عمر کی تحویل میں تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا:

آپ کا نام اسحاق ہے؟

میں نے اثبات میں جواب دیا تو کہا: آپ کو مولانا صاحب نے بلایا ہے؟ (مولانا داؤد غزنوی مراد تھے)

میں نے کہا: ہاں انھی نے بلایا ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

مولانا عطاء اللہ آپ کو لینے کے لیے گاؤں گیا تھا؟

میں نے کہا: ہاں گئے تھے۔

مولانا صاحب تو آپ کو صبح ملے گا، جب وہ دفتر میں بیٹھے گا۔ اب گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا سو جاؤ۔ ادھر چار پائی بھی پڑا ہے اور بستر بھی پڑا ہے، آؤ سو جاؤ۔ جب اذان ہوگا، اُٹھ جانا۔

اس سے قبل مجھے پانچ مرتبہ مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی کی زیارت کا شرف حاصل ہوا تھا۔ پہلی دفعہ فیروز پور میں جب کہ انھوں نے وہاں کی جماعت اہل حدیث کے ایک جلسے کی صدارت فرمائی تھی اور اس میں صدارتی خطبہ پڑھا تھا۔ اس وقت میں بہت کم عمر تھا لیکن اس قسم کے اجتماعات میں شرکت کا شوق عمر کے تناسب سے بہت زیادہ تھا۔

دوسری مرتبہ فروری ۱۹۳۹ء میں جب مولانا ابوالکلام آزاد لاہور تشریف لائے تھے اور انھوں نے موچی دروازے کے باہر تقریر ارشاد فرمائی تھی۔ میرا یہ طالب علمی کا زمانہ تھا اور میں ان کی تقریر سننے کے لیے فیروز پور سے لاہور آیا تھا۔ اس وقت مولانا غزنوی سٹیج پر تشریف فرما تھے اور مولانا آزاد کی تقریر سے پہلے انھوں نے چند باتیں کی تھیں۔ بہت بڑا مجمع تھا۔ اس کی تفصیل مَیں اپنی ایک کتاب ''بزمِ ارجمنداں'' کے اس مضمون میں بیان کر چکا ہوں جو مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق لکھا گیا ہے۔

اور یہ مضمون ہندوستان کے اخبارات میں بھی چھپا۔ خدا بخش پٹنہ لائبریری (ہندوستان) نے اسے کتابی شکل میں بھی چھاپ دیا ہے۔

تیسری مرتبہ مولانا غزنوی کی زیارت کا شرف ۲۶ راگست ۱۹۴۱ء کو حاصل ہوا تھا۔ اسی تاریخ کو لاہور کے علاقہ اسلامیہ پارک میں جماعت اسلامی کی تاسیس عمل میں آئی تھی اور مَیں اس جماعت کے تاسیسی اجلاس میں شامل تھا۔ مولانا کی زیارت لاہور کی مسجد چینیاں والی میں ہوئی تھی۔

چوتھی دفعہ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو دہلی میں جمعیت علمائے ہند کی اس میٹنگ میں مولانا کو دیکھا جس میں جمعیت کی دعوت پر اس کے مرکزی دفتر گلی قاسم جان (محلّہ بلی ماراں) میں (مسلم

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

لیگ کے سوا) ہندوستان کے مسلمانوں کی تمام سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں نے شرکت کی تھی۔ اس وقت مولانا جمعیت علماے ہند کے نائب صدر تھے۔

پانچویں مرتبہ قیامِ پاکستان سے گیارہ مہینے بعد ۲۴ر جولائی ۱۹۴۸ء کو مولانا ممدوح کے دیدار ہوئے، جب ان کے آبائی مدرسے دارالعلوم تقویۃ الاسلام (لاہور) میں مغربی پاکستان کی جماعت اہل حدیث کے علما وزعما کا اجلاس انہی کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ اس اجلاس میں مختلف مقامات سے جماعت کے تقریباً ڈھائی سو سرکردہ حضرات نے شرکت فرمائی تھی اور جماعت کی تنظیم کا نام ''مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان'' رکھا گیا تھا۔ اسی تنظیم کا نام اب ''مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان'' ہے۔ مشرقی پاکستان ہماری فوجی حکومتوں کی کرم فرمائیوں اور جرنیلوں کی مارشلائی برکتوں سے بنگلہ دیش کے قالب میں ڈھل کر پاکستان کی تاریخ کا الم انگیز حصہ بن چکا ہے۔ قیامِ پاکستان سے قبل ۱۹۴۶ء میں مشرقی پاکستان کی جماعت اہل حدیث کی تنظیم ''جمعیت اہل حدیث مشرقی بنگال و آسام'' کے نام سے معرضِ قیام میں آئی تھی اور اس کے صدر مولانا عبداللہ الکافی تھے۔ اب اس کا نام ''جمعیت اہل حدیث بنگلہ دیش'' ہے۔

اکتوبر ۱۹۴۸ء میں یہ فقیر چھٹی مرتبہ مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی کی زیارت سے مفتخر ہوا۔ اس سے قبل پانچوں مرتبہ محض مولانا کو دیکھا تھا اور ان کے ارشادات سنے تھے۔ اب چھٹی مرتبہ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر میں ان کے ارشادات کے جواب دے رہا تھا۔ کہنا چاہیے کہ یہ انٹرویو تھا جو مولانا مجھ سے لے رہے تھے۔

اس وقت مولانا کا قافلۂ حیات پچاس کی منزل سے چند قدم آگے نکل چکا تھا۔ انھیں دیکھ کر اور ان کی باتیں سن کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جوانی قیامت ڈھاتی ہوگی۔ سرخ گورا رنگ، تیکھے نقوش، معتدل جسم، نہایت متناسب اعضا، کشادہ پیشانی، چمکتی آنکھیں، رعب دار مگر سنجیدگی کے حسین ترین زیروبم میں تیرتی ہوئی آواز۔ قدرت کے دست حسن آفرین نے نہایت پیار سے ان کا ہیولا تیار کیا تھا۔ وہ بولتے تھے تو زبان سے پھول جھڑتے تھے اور

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

خاموش ہوتے تھے تو چہرے پر پُر وقار متانت کی روشنی نمودار ہو جاتی تھی۔ انھوں نے بہ صورتِ انٹرویو مجھ سے چند باتیں پوچھیں۔ میری تعلیم کے متعلق سوال کیا، میرے آبائی وطن کے بارے میں دریافت فرمایا اور میرے موجودہ پتے ٹھکانے اور کام کاج کے سلسلے میں پوچھا۔ پھر فرمایا: سیکریٹری شپ کا آپ کو کچھ تجربہ ہے اور یہ کام کرنے کا کبھی موقع ملا ہے؟

میں نے عرض کیا: سیکریٹری شپ کا تھوڑا بہت تجربہ بھی ہے اور یہ کام میں کرتا بھی رہا ہوں۔

ارشاد ہوا: کس جماعت کے سیکریٹری رہے اور کتنا عرصہ رہے؟

عرض کیا: ریاست فرید کوٹ کی پرجا منڈل کا جنرل سیکریٹری رہا ہوں اور کافی عرصہ یہ خدمت سرانجام دی ہے۔

پرجا منڈل کا نام سن کر مولانا کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری اور فرمایا: یہ تو سیاسی جماعت تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا سیاست سے تعلق رہا ہے۔

عرض کیا: یہ جماعت پنجاب کی ریاستوں میں کانگرس کا بدل تھی۔

سوال ہوا: پھر اس کے کچھ نتائج بھی بھگتے؟

عرض کیا: وہ تو بھگتنا ہی تھے۔ ایک عرصے تک فرید کوٹ جیل میں نتائج سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

مولانا خوش گوار موڈ میں تھے۔ مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی بھی اس وقت تشریف فرما تھے۔ میں اجازت لے کر ان کے کمرے سے باہر نکلنے لگا تو ان کے یہ الفاظ میرے کان میں پڑے جو انھوں نے مولانا عطاء اللہ صاحب سے فرمائے:

''معقول نوجوان ہے، محنت سے کام کرے گا۔ اسے بہ طور آفس سیکرٹری رکھ لینا چاہیے۔''

اب مولانا کے فرمان کے مطابق مولانا عطاء اللہ حنیف مجھے مرکزی جمعیت کے ناظم اعلیٰ پروفیسر عبدالقیوم کے پاس لے گئے۔ وہ اس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

تھے اور برانڈرتھ روڈ پر عظیم سٹریٹ میں مسجد مبارک کے قریب ان کا مکان تھا۔ پروفیسر صاحب سے دو چار باتیں ہوئیں۔ انھوں نے فرمایا میں ایک بجے کالج سے فارغ ہو کر آپ کے پاس جمعیت کے دفتر پہنچوں گا۔ چناں چہ وہ ایک بجے دفتر تشریف لائے۔

کشیدہ قامت، گول چہرہ، سرخی مائل گندمی رنگ، داڑھی منڈی ہوئی، نتھنوں کے نیچے انور پاشا جیسی مونچھیں۔ آنکھوں پر نظر کی عینک، شان دار انگریزی سوٹ پہنے اور ٹائی باندھے ہوئے۔ انگریزی کٹ کے سیاہ بالوں میں سیدھی مانگ۔ یہ تھے ۱۹۴۸ء کے پروفیسر عبدالقیوم مرکزی جمعیت اہل حدیث کے ناظم اعلیٰ۔ آتے ہی علیک سلیک اور خیر و عافیت پوچھنے کے بعد ایک رجسٹر پکڑا، جسے سٹاک رجسٹر کہا جاتا تھا اور اس میں رکھی ہوئی جمعیت کی چیزیں میرے حوالے کرنا شروع کیں۔ میں رجسٹر میں مرقوم چیزوں کے نام پڑھتا تھا اور وہ اس کی نشان دہی کرتے تھے۔ مثلاً دو میزیں، چار کرسیاں، ایک رجسٹر کارروائی مجلس عاملہ، ایک رجسٹر کارروائی مجلس شوریٰ، تین پنسلیں، ایک قلم دان۔ اس طرح روانی سے پڑھتے پڑھتے میں نے کہا پانچ فائل کور (File Core) ابھی میں نے یہ پورا لفظ نہیں بولا تھا کہ فوراً کہا فائل کور (File cover)۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا آپ کا تعلق کس علاقے سے ہے؟ میں نے کہا ریاست فرید کوٹ سے۔ بولے یہ سکھ ریاست ہے؟ میں نے ہاں میں جواب دیا۔ اس سے ان کا مطلب یہ تھا کہ جس طرح سکھ عورتوں کے نام بسنت کور، مہنت کور، راجندر کور وغیرہ ہوتے ہیں، اسی طرح میں سمجھا ہوں کہ فائل کور بھی کسی سکھ عورت کا نام ہے۔ ان کی طبع متانت پسند نے یہ الفاظ تو ان کی زبان سے ادا نہیں ہونے دیے، لیکن ان کا اشارہ اسی طرف تھا اور لطیفہ آمیز خوب صورت اشارہ تھا۔

پروفیسر صاحب تو یہ بھول گئے تھے، لیکن مجھے آج سے ساٹھ برس قبل کا یہ واقعہ اس کی تمام جزئیات کے ساتھ یاد ہے۔ وہ میرے مشفق تھے۔ میں نے اپنی کئی کتابوں میں مختلف سیاق سے ان کا ذکر کیا ہے اور ان کے متعلق تین مستقل مضمون لکھے ہیں۔ انھوں نے ۸ ستمبر ۱۹۸۹ء کو وفات پائی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

۹۰ روپے میری تنخواہ مقرر ہوئی جو اس زمانے میں بہت مناسب تنخواہ تھی۔ اس وقت تو میں گھر چلا گیا، لیکن چند روز کے بعد واپس آ کر باقاعدہ کام شروع کر دیا۔ پروفیسر صاحب کالج سے ایک بجے دفتر آتے اور کچھ دیر بیٹھتے لیکن ہر روز تشریف نہیں لاتے تھے۔ میرا زیادہ تر واسطہ مولانا غزنوی سے رہتا تھا۔

تنخواہ کے متعلق ایک واقعہ سنیے۔ میرے ایک رشتے دار ایک مرتبہ جڑاں والا سے میرے پاس کسی کام سے آئے۔ مجھ سے انھوں نے تنخواہ کے بارے میں پوچھا تو ان کے اصرار پر میں نے بتایا کہ نوے (۹۰) روپے تنخواہ ملتی ہے۔ بولے تمھارے جیسا کون ہے جو بیٹھے بٹھائے شام تک تین روپے کما لیتا ہے۔ یعنی نوے روپے اس زمانے میں بہت بڑی تنخواہ تھی۔

مَیں محنت اور انہماک سے کام کرتا تھا۔ تمام ذیلی جمعیتوں سے بذریعہ خط و کتابت مرکزی جمعیت کا رابطہ قائم تھا اور سب لوگ میرے طریق کار سے مطمئن تھے۔ جمعیت کے دفتر میں اور مولانا کے پاس ہر قسم کے لوگ آتے تھے۔ سیاسی بھی، غیر سیاسی بھی۔ علماء بھی، مدرسین بھی، اخبارات کے ایڈیٹر بھی، مختلف محکموں کے چھوٹے بڑے اہل کار بھی۔ مولانا پنجاب اسمبلی کے رکن تھے اور اسمبلی کے رکن کو اس وقت ممبر لیجسلیٹو اسمبلی (ایم ایل اے) کہا جاتا تھا۔ بعض ارکانِ اسمبلی کی ضروری مشوروں کے لیے مولانا کے پاس آمد و رفت رہتی تھی۔ پاکستان کے قیام پر تھوڑا عرصہ ہی گزرا تھا اور لوگ ایک دوسرے سے ہمدردی سے پیش آتے تھے۔ مختلف مقامات کے بے شمار پناہ گزیں اپنے کاموں کے لیے مولانا کے پاس آتے اور مولانا ہر شخص کا کام کرانے کی کوشش فرماتے۔ کسی کے ساتھ خود کسی اہل کار کے دفتر تشریف لے جاتے اور کسی کے لیے ٹیلی فون کر دیتے۔ ہر شخص کا کام اللہ کی مہربانی سے ہو جاتا تھا۔ اس زمانے میں میرے بھی بہت سے لوگوں سے مراسم پیدا ہو گئے تھے۔

ریاست فرید کوٹ سے جو لوگ پاکستان آئے تھے، ان میں سے جن لوگوں کو میرے متعلق پتا چلتا کہ میں لاہور آ گیا ہوں، وہ خاص طور سے زمینوں کی الاٹ منٹ کے سلسلے میں

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

میرے پاس آتے اور میں ان کی مدد کی پوری کوشش کرتا۔ پھر جہاں میں رہتا تھا، وہ کھلی جگہ تھی، آنے والوں کی رہائش کا انتظام آسانی سے ہو جاتا تھا۔ اور یہ لاہور میں اس وقت بھی بہت بڑی بات تھی، اب بھی بہت بڑی بات ہے۔

متروکہ زمینوں کی الاٹ منٹ وغیرہ کے کاغذات جس دفتر میں آتے تھے، اس کا نام سنٹرل ریکارڈ آفس تھا اور یہ دفتر دیوسماج روڈ پر سنت نگر میں تھا۔ قیامِ پاکستان سے قبل یہ لڑکیوں کا ہائی سکول تھا۔ الاٹ منٹ کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد اسے پھر لڑکیوں کا ہائی سکول بنا دیا گیا تھا۔ اب بھی ہائی سکول ہے۔

ایک دن میرے گاؤں سے چند میل آگے (چک نمبر ۷۰ گ ب) کے ایک دوست آئے جو کوٹ کپورہ میں ہمارے پڑوس میں رہتے تھے اور ارائیں برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا نام اسماعیل تھا اور ان کا زمین کی الاٹ منٹ کا کام تھا۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ اس دفتر کا افسر اعلیٰ شیعہ ہے۔ اس سے ملا جائے تو کام آسانی سے ہو جائے گا۔ میں نے ان سے پوچھا: آپ کو کیسے پتا چلا کہ وہ شیعہ ہے؟

جواب دیا کہ وہ دفتر سے پیدل باہر نکلے تو مَیں ان کے پیچھے چل پڑا کہ دیکھوں یہ کدھر جاتے ہیں۔ وہ کربلا گامے شاہ گئے تھے۔ اس لیے میں نے خیال کیا کہ یہ شیعہ ہیں۔ ان کا نام بھی انھوں نے بتایا تھا جو میرے ذہن میں نہیں رہا...... میں انھیں اسی وقت نسبت روڈ پر مظفر علی شمسی کے پاس لے گیا، جو پرانے احراری تھے اور قیامِ پاکستان کے بعد مجلس تحفظ حقوقِ شیعہ پاکستان کے سیکریٹری جنرل بنائے گئے تھے۔

مظفر علی شمسی حسب معمول خندہ پیشانی سے پیش آئے اور چائے پلائی۔ ہم نے آمد کا مقصد بیان کیا تو اسی وقت ٹیکسی منگوائی اور ہمارے ساتھ چل پڑے۔ سنٹرل ریکارڈ آفس کے افسر سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ میں آپ کا پیر ہوں اور یہ میرے پیر ہیں۔ ان کے کام میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔ چناں چہ انھوں نے متعلقہ کلرک کو بلایا اور دوسرے دن کام ہو گیا۔ اس فقیر کی تھوڑی سی کوشش سے اللہ تعالیٰ نے مہربانی فرمائی۔ اس طرح بہت سے لوگوں کے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کام تکمیل کو پہنچے۔

مَیں کئی سال مرکزی جمعیت اہل حدیث کا ناظم دفتر رہا۔ دفتری خط و کتابت وغیرہ امور کی انجام دہی میرے ذمے تھی اور میں نے اپنی دانست میں تمام مفوضہ فرائض بڑی محنت سے ادا کیے۔ جمعیت کے صدر مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی، ناظم اعلیٰ پروفیسر عبدالقیوم اور مجلس عاملہ کے تمام ارکان بحمداللہ اس فقیر کی دفتری خدمات پر ہمیشہ مطمئن رہے۔

پروفیسر عبدالقیوم کا دورِ نظامت آخر مئی ۱۹۴۹ء تک چلتا ہے جو تقریباً دس مہینوں پر محیط ہے۔ پروفیسر صاحب چوں کہ سرکاری ملازم تھے اور حکومت نے ایک حکم کے ذریعے سرکاری ملازموں کو کسی سیاسی جماعت کے عہدے پر فائز رہنے سے روک دیا تھا، اس لیے انھوں نے نظامت سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ ان کے بعد مئی ۱۹۴۹ء کے آخر میں مولانا محمد اسماعیل سلفی کو ناظم اعلیٰ منتخب کر لیا گیا تھا، لیکن مولانا سلفی کے لیے حکومت نے گوجراں والا کی میونسپل حدود سے باہر نکلنے پر پابندی عائد کر دی تھی، اس لیے عارضی طور پر نظامت علیا کی ذمہ داری مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے سپرد کر دی گئی تھی۔ تین مہینوں کے بعد یہ پابندی ختم ہوئی تو مولانا محمد اسماعیل سلفی حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔ تقریباً تین مہینے اس طرح گزر گئے۔ پھر انھوں نے یہ منصب سنبھالا۔ میں ان تینوں حضرات کے دورِ نظامت میں ناظم دفتر رہا، بلکہ کہنا چاہیے کہ عملاً نظامت علیا کے فرائض کی انجام دہی بھی بہت حد تک میرے سپرد رہی۔ مولانا محمد اسماعیل سلفی کا دورِ نظامت کئی سال پر محیط ہے۔ اس کے ابتدائی چار سال دفتر کا ناظم میں ہی تھا۔

۱۹۴۹ء کے مئی کے آخر میں مرکزی جمعیت کی پہلی کانفرنس لاہور میں ہوئی۔ اس کے لیے میں نے بے حد بھاگ دوڑ کی۔ اس کانفرنس کے صدر مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی اور صدر استقبالیہ مولانا محمد حنیف ندوی تھے۔

اس سے کچھ مدت بعد جمعیت کی رکن سازی کا دور آیا۔ اس کے انتظامات اور نشر و اشاعت میں مجھے بڑی تگ و دو کرنا پڑی اور یہ خدمت میں نے نہایت مسرت کے ساتھ سرانجام دی۔

اس زمانے میں مختلف مقامات کی انجمنوں اور جمعیتوں سے مرکز کی طرف سے رابطہ رکھا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

میں ہمیشہ مصروفیت میں خوش رہا۔ اب بھی اللہ کی مہربانی سے یہی عادت ہے۔ جتنی مصروفیت زیادہ ہو، اتنی ہی مسرت محسوس کرتا ہوں۔ بعض لوگ کام میں سستی کرتے ہیں، آج کریں گے، کل کریں گے۔ اس قسم کے لوگوں سے مجھے ہمیشہ اختلاف رہا۔ سستی کا نتیجہ بالعموم یہ ہوتا ہے کہ کام ہو ہی نہیں پاتا۔

مرکزی جمعیت کے ابتدائی دور میں کام کی کثرت بھی تھی اور جمعیت کے سربراہ بھی اونچے مرتبے کے حامل تھے۔ کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے، جس سے کارکنوں میں قوتِ کار کا جذبہ بڑھتا تھا۔ اس زمانے میں پیسے کی بہت کمی تھی، میری ۹۰ روپے تنخواہ ادا کرنا بسا اوقات مشکل ہو جاتا، لیکن مولانا غزنوی کے حوصلہ افزا الفاظ اور مولانا محمد اسماعیل سلفی کے مزاحیہ ارشادات سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم بہت سے خزانوں کے مالک ہو گئے ہیں۔ اس وقت کار یا موٹر سائیکل کا کوئی تصور نہ تھا، چھوٹے کارکن سے لے کر ناظم اعلیٰ اور صدر تک پیدل یا تانگے پر چلتے تھے۔ لمبا سفر بس یا ریل پر کیا جاتا تھا اور ہنسی خوشی سے ہر مرحلہ طے ہوتا تھا۔

ایک دن مولانا غزنوی نے مسکراتے ہوئے فرمایا: ''آپ میرے ساتھ ہمارے مریدوں کے ہاں جائیں گے؟''

عرض کیا: ''آپ حکم دیں گے تو آپ کی خدمت کا اعزاز حاصل کر کے اس فقیر کو مسرت ہوگی۔''

فرمایا: ''کپڑوں کے دو جوڑے ساتھ لے لیجیے۔''

ہمارے پاس دو جوڑے اس وقت کہاں تھے؟ مولانا ضلع شیخوپورہ کے ایک قصبے فیروز وٹواں جانا چاہتے تھے۔ وہاں کی وٹو برادری کے بزرگ مولانا کے والدِ عالی قدر حضرت سیّد امام عبدالجبار غزنوی کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے۔ ہم پروگرام کے مطابق پہلے منڈی وار برٹن گئے۔ ایک رات وہاں رہے۔ پھر فیروز وٹواں آ گئے۔

اب تو جگہ جگہ سڑکوں کے جال بچھ گئے ہیں، منڈی وار برٹن سے فیروز وٹواں تک بھی عرصہ ہوا، سڑک بن چکی ہے۔ اس زمانے میں یہ صورتِ حال نہ تھی۔ چار میل کا یہ کچا راستہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

لوگ پیدل یا گھوڑوں پر طے کرتے تھے۔ چنانچہ دوسرے دن فیروز وٹواں کے لوگ گھوڑے لے کر آ گئے۔ گھوڑوں پر سوار ہونے لگے تو مولانا نے فرمایا: ''ہمارے سیکرٹری صاحب جوان ہیں، ان کو اچھے گھوڑے پر سوار کرائیں۔'' گاؤں پہنچے تو وہاں بھی میرا خیال رکھا۔ میرے متعلق مولانا کی مشفقانہ باتوں کی بنا پر لوگ مجھ سے اس طرح احترام سے پیش آتے کہ مجھے شرم محسوس ہونے لگی۔

فیروز وٹواں میں ہمارے اصل میزبان ملک احمد خاں نمبردار تھے، جو وٹو برادری سے تعلق رکھتے تھے اور وہاں کے اچھے خاصے زمیندار تھے۔ وہ خود تو بہت سال ہوئے وفات پا گئے ہیں، لیکن ان کے خاندان کے لوگ مولانا داؤد غزنوی کے خانداں سے انھی کی طرح عقیدت و احترام کے جذبات رکھتے ہیں۔

ملک احمد خاں بوڑھے آدمی تھے۔ دراز قامت اور وجیہہ۔ بہت متقی بزرگ تھے۔ مولانا داؤد غزنوی کے والد محترم مولانا عبدالجبار غزنوی کے ارادت مند تھے۔ جلد ہی مجھ سے مانوس ہو گئے تھے۔ میں نے باتوں باتوں میں ان سے پوچھا کہ آپ غزنوی خاندان کے حلقہ ارادت میں کیسے شامل ہوئے اور ان کی کون سی ادا آپ کو پسند آئی؟ اس کا انھوں نے جو جواب دیا، وہ انھی کے الفاظ میں عرض کرتا ہوں۔ فرق صرف یہ ہے کہ انھوں نے یہ باتیں پنجابی میں بیان کی تھیں، میں اُردو میں ان کا ترجمہ کر رہا ہوں۔

بولے:

۱۸۹۷ء یا ۱۸۹۸ء کی بات ہے۔ میں اٹھارہ سال کی عمر کا تھا کہ گنٹھیا کے موذی مرض میں مبتلا ہو گیا۔ والد نے بہت علاج کرائے، مگر آرام نہ آیا۔ وہ حضرت امام سیّد عبدالجبار غزنوی کے عقیدت مند تھے۔ انھیں یقین تھا کہ ان کی دعا کو اللہ شرفِ قبولیت سے نوازتا ہے اور وہ بیمار کے لیے دعا کریں تو اللہ اسے صحت عطا فرماتا ہے۔

اس زمانے میں گھوڑے کے سوا ہمارے گاؤں سے امرتسر جانے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ شام کے وقت میرے والد نے گٹھڑی کی شکل میں مجھے گھوڑی پر رکھا اور امرتسر کو چل پڑے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ہم امرتسر مسجد غزنویہ میں پہنچے تو فجر کی جماعت ہو رہی تھی۔ والد نے مجھے گھوڑی کی پیٹھ سے اُٹھایا اور مسجد کے صحن میں رکھ دیا۔ گھوڑی باہر باندھی اور خود وضو کر کے جماعت میں شریک ہو گئے۔ جو بزرگ جماعت کرا رہے تھے، وہ اس قدر درد و سوز سے قران مجید پڑھتے تھے کہ دل ان کی طرف کھنچا جاتا تھا۔ نماز کے بعد اس بزرگ نے میری طرف دیکھا تو پوچھا یہ کون شخص ہے؟ والد نے سلام عرض کرنے کے بعد تمام صورتِ حال بیان کی اور نہایت ادب سے دعا کے لیے درخواست کی۔ پاک باز بزرگ نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے۔ جیسے جیسے وہ دعا مانگ رہے تھے، مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ جوڑوں کی بندش کھل رہی ہے۔ تین دن اور تین راتیں ہم وہاں رہے۔ ہمارا کھانا ان کے گھر سے آتا تھا۔ گھوڑی کے لیے چارے کا انتظام بھی وہی کرتے تھے۔ تین دن کے بعد میں اللہ کے فضل سے بالکل تندرست تھا۔ گھوڑی پر سوار ہو کر امرتسر سے اپنے گاؤں فیروز وٹواں آیا۔ دعا کرنے والے بزرگ مولانا سیّد داؤد غزنوی کے صاحب تقویٰ والد مولانا سیّد عبدالجبار غزنوی تھے، جنھیں لوگ امام صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔ اس کے بعد اللہ کے بے پایاں فضل اور امام صاحب کی دعا سے جسمانی حالت کے ساتھ ساتھ ہماری روحانی دنیا بھی بدل چکی تھی۔ ہم ان کے مرید ہیں اور یہ ہمارے مرشد......!

مولانا داؤد غزنوی مجھ پر بہت شفقت فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ میری درخواست پر ہمارے موجودہ گاؤں کے ایک تبلیغی جلسے میں بھی تشریف لے گئے تھے، رات وہیں گاؤں میں رہے۔ جلسے میں میرا نام لے کر فرمایا کہ میں اپنے سیکرٹری صاحب کے کہنے پر یہاں آیا ہوں۔

۲۸ر جنوری ۲۰۰۸ء — بہاول نگر

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

بارھواں باب:

ہفت روزہ ''الاعتصام'' سے وابستگی

۱۹ / اگست ۱۹۴۹ء کو گوجراں والا سے ہفت روزہ ''الاعتصام'' جاری ہوا۔ اس اخبار کا ڈیکلریشن مولانا عطاء اللہ حنیف نے لیا تھا۔ اس کے مدیر مولانا محمد حنیف ندوی کو مقرر کیا گیا تھا اور اخراجات کی ذمہ داری گوجراں والا کی انجمن اہل حدیث نے قبول کی تھی۔ مولانا ندوی ہر منگل کو اخبار چھپوانے کے لیے لاہور تشریف لاتے تھے۔ اخبار بدھ کے روز گوجراں والا سے حوالۂ ڈاک کیا جاتا تھا۔ میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کا ناظم دفتر تھا اور کبھی کبھی اخبار کے لیے مضمون بھی لکھتا تھا۔ درحقیقت اخبار مرکزی جمعیت ہی کا ترجمان تھا۔

اخبار کے اجرا پر چار پانچ مہینے گزرے تھے کہ مجھے اس کا معاون مدیر بنا دیا گیا اور میں فروری ۱۹۵۰ء میں گوجراں والا چلا گیا۔ اب میں مرکزی جمعیت کا ناظم دفتر بھی تھا اور ''الاعتصام'' کا مدیر معاون بھی۔ اس طرح میں دو فرائض انجام دیتا تھا۔ چار دن گوجراں والا میں اخبار کا کام کرتا اور تین دن لاہور میں مرکزی جمعیت کے دفتر میں رہ کر نظامت دفتر کے فرائض سرانجام دیتا۔ یہاں یہ لطیفہ (بلکہ واقعہ) بھی سنتے جایئے کہ میری ۹۰ روپے تنخواہ دو ادارے مل کر ادا کرتے تھے۔ پینتالیس روپے مرکزی جمعیت دیتی تھی اور پینتالیس روپے اخبار ''الاعتصام'' کی ادارت کے گوجراں والا کی انجمن اہل حدیث دیتی تھی۔ لیکن کبھی پینتالیس روپے مرکزی جمعیت کے پاس نہیں ہوتے تھے اور کبھی انجمن اہل حدیث گوجراں والا کے لیے اتنی رقم کی ادائی مشکل ہو جاتی تھی۔ مولانا محمد حنیف ندوی کی تنخواہ سو روپے تھی۔ وہ انجمن اہل حدیث گوجراں والا دیتی تھی۔ سو روپے میں سے مولانا محمد حنیف ندوی سولہ روپے ماہانہ مکان کا کرایہ ادا کرتے تھے۔ اس مکان میں بجلی نہیں تھی۔ بجلی والے مکان کا کرایہ بیس روپے تھا جو

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ایڈیٹر الاعتصام کے لیے ادا کرنا ممکن نہ تھا۔ یہ تھی اس زمانے میں مرکزی جمعیت اور اخبار الاعتصام کی مالی حالت اور اس میں کام کرنے والوں کی اوقات۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بڑی ہنسی خوشی سے وقت گزر رہا تھا اور ہم نے حالات سے مکمل صلح کر لی تھی۔ کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں آیا اور کسی موقعے پر بھی مایوسی کا اظہار نہیں کیا۔ گوجراں والا میں بھی ہمارے بہت سے لوگوں سے مراسم قائم ہو گئے تھے اور لاہور میں بھی تعلق داروں کا ایک حلقہ پیدا ہو گیا تھا۔ ہم عمر ہمارے مخلص ترین دوست تھے اور بڑے ہم پر شفقت کا اظہار کرتے تھے۔ سب سے اہم بات یہ کہ مرکزی جمعیت کے تمام اکابر اور علماء و زعما ہم پر مشفقانہ نظر رکھتے تھے۔ کام میں ہم نے اللہ کے فضل سے کبھی کوتاہی نہیں کی اور کبھی سستی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ وہ تو جوانی کا زمانہ تھا، اب بھی بحمداللہ جذبہ عمل جوان ہے اور رفتار کار اللہ کے فضل سے بالکل ٹھیک ہے۔ اس فقیر پر اللہ کا یہ خاص کرم اور بے حد احسان ہے۔ بے شمار بزرگوں سے میں نے دعاؤں کی درخواست کی اور مجھے یقین ہے کہ بارگاہِ خداوندی میں ان دعاؤں کو شرفِ قبول حاصل ہوا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ فقیر اپنے محدود علم کے مطابق تحریری صورت میں خدمت دین میں مصروف ہے اور یہی اس کا اوڑھنا بچھونا اور شب و روز کا مشغلہ ہے۔

بات ہفت روزہ ''الاعتصام'' سے وابستگی کے متعلق ہو رہی تھی۔ مجھے اخباری معاملات کا قطعاً کوئی تجربہ نہ تھا۔ مرکزی عہدے داروں کے حکم کے مطابق اخبار کے دفتر پہنچا تو نہ خریداروں کا کوئی خاص رجسٹر تھا۔ نہ اخبارات سے تبادلوں اور اعزازی طور سے بھیجے جانے والوں کا کوئی رجسٹر تھا۔ لیکن کام کسی نہ کسی طرح چل رہا تھا۔ اخبار کی آمدنی اور خرچ کا حساب وہاں کے معروف عالم دین قاضی عبدالرحیم کے پاس تھا، وہ بالکل صحیح تھا اور مجھے اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔

میں نے وہاں جاتے ہی ''اجتہاد'' سے کام لیا اور تین الگ الگ رجسٹر بنائے۔ ایک خریداروں کا، دوسرا اخبارات و جرائد سے تبادلوں کا اور تیسرا ان حضرات کا جنھیں اعزازی طور پر اخبار بھیجا جاتا تھا۔ میں نے الگ الگ ان تینوں رجسٹروں میں دن رات لگا کر چار پانچ روز

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

میں سب کے نام اور پتے وغیرہ لکھے اور انھیں اخبار کے ایڈیٹر مولانا محمد حنیف ندوی کو دکھایا، پھر مولانا محمد اسماعیل سلفی کی خدمت میں پیش کیا اور بعدازاں قاضی عبدالرحیم کے ملاحظۂ گرامی میں لایا تو ازراہِ کرم ان تینوں حضرات نے میری اس خدمت کی تحسین فرمائی اور انسانی فطرت کے مطابق مجھے اس سے مسرت ہوئی۔ مولانا محمد اسماعیل سلفی پر مَیں اپنی کتاب ''نقوشِ عظمت رفتہ'' میں تفصیلی مضمون لکھ چکا ہوں۔ اس کے علاوہ بھی بعض مقامات میں ان کے متعلق بعض باتیں سپردِ قلم کی ہیں۔ مولانا محمد حنیف ندوی پر مَیں نے ایک مستقل کتاب تالیف کی ہے، جس کا نام ''ارمغانِ حنیف'' ہے۔ پھر ''قافلۂ حدیث'' میں بھی ان کے بارے میں ایک طویل مضمون لکھا ہے۔ قاضی عبدالرحیم سے میں بہت متاثر ہوں۔ افسوس ہے اس گم نام مگر بلند مقام عالم و فاضل پر کچھ نہیں لکھ سکا، جس کا مجھے بہت احساس ہے، ان شاء اللہ جلد لکھنے کی کوشش کروں گا۔

دفتر ''الاعتصام'' جامع مسجد اہل حدیث کے متصل تھا۔ نہ اس میں کوئی چپڑاسی تھا، نہ کلرک۔ کاتب بھی دفتر میں نہیں بیٹھتا تھا، گھنٹا گھر کے قریب کہیں اس کا مکان تھا۔ مضمون لے جاتا تھا اور گھر میں کتابت کرتا تھا۔ دفتر میں دو کرسیاں تھیں اور ایک میز۔ مولانا داؤد غزنوی اور مولانا محمد حنیف ندوی کا مزاج اور تھا۔ وہ دفتر کو دفتر کی حیثیت دینے کے حق میں تھے، یعنی دفتر میں باقاعدہ میز بھی ہو اور چار پانچ کرسیاں بھی ہونی چاہئیں، لیکن مولانا اسماعیل سلفی اس قسم کے معاملات کو تکلف قرار دیتے تھے۔ بہرحال کوشش کرکے ہم نے تین کرسیاں اور منگوالیں، دو پہلے سے تھیں۔ اسی اثنا میں خریداری نمبر وغیرہ کے ساتھ ان لوگوں کے پتے شائع کیے، جنھیں اخبار بھیجا جاتا تھا۔ خریداری نمبر میں نے ۵۰۱ سے شروع کیا تھا۔ ایسے کاتب کا انتظام کیا جو دفتر میں بیٹھ کر کتابت کرے۔

خاکروب، چپڑاسی، کلرک، منیجر اور نائبؒ مدیر بلکہ بعض اوقات مدیر تک تمام عہدے میرے پاس تھے۔ اسے یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ فردِ واحد پورے دفتر پر قابض تھا۔ صبح دفتر میں جھاڑو دینا، میز کرسیاں صاف کرنا، کاغذات اور رجسٹروں کو ترتیب سے رکھنا، رجسٹر میں

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

خریداروں کا اندراج، ان سے خط و کتابت، مضمون نگاروں کے مضامین پڑھنا اور انھیں قابل اشاعت بنانا، پروف ریڈنگ وغیرہ سب امور کی انجام دہی میں نے اپنے فرائض میں شامل کر رکھی تھی۔ بدھ کے روز ڈاک خانے جا کر اخبار پر ٹکٹ لگانا اور اسے پوسٹ کرنا بھی میری ذمہ داری تھی اور یہ تمام کام میرے لیے نہایت خوشی کا باعث تھے۔ نہ میں کام سے گھبراتا تھا، نہ اُکتاتا تھا، نہ تھکاوٹ کا احساس ہوتا تھا۔ مجھے کچھ سیکھنے کا لالچ تھا اور اس لالچ کا مجھ پر اتنا غلبہ تھا کہ جی چاہتا تھا میرے ایڈیٹر مولانا محمد حنیف ندوی اخبار کے چھوٹے بڑے ہر کام کی ذمہ داری مجھ پر ڈال دیں، خود کچھ نہ کریں۔ مجھے ہدایات دیتے رہیں اور ان کی ہدایات کے مطابق میں کام کرتا رہوں۔

اس وقت گوجراں والا کے بیری والا چوک میں وہاں کے نوجوانوں کی ایک تنظیم نے مولانا ابوالکلام آزاد کے نام سے ''آزاد لائبریری'' قائم کی تھی۔ اس کے صدر میرے دوست جناب اسماعیل ضیا تھے، جو مولانا آزاد کے انتہائی معتقد تھے اور انھوں نے کسی زمانے میں نوجوانوں کی ایک تنظیم حزب اللہ کے نام سے بنائی تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی ۱۹۱۴ء میں ''حزب اللہ'' نام کی جماعت بنائی تھی۔ گوجراں والا کی آزاد لائبریری کے ایک کمرے میں میری رہائش تھی اور یہاں رات کو عام طور سے آزاد لائبریری کے ارکان آجاتے تھے اور مختلف موضوعات پر ان سے سلسلۂ کلام جاری رہتا تھا۔

دوستوں کی فہرست میں ایک میرے ہم عمر خواجہ محمد یوسف تھے، ان کی اکثر آمدورفت میرے دفتر رہتی تھی۔ وہ اب بھی لاہور آئیں تو مجھے ملتے ہیں۔

ایک دن مولانا ندوی نے فرمایا کہ اخبار کے رجسٹروں کے سلسلے میں ملک نصر اللہ خاں عزیز سے بھی مشورہ کرنا چاہیے۔ اس وقت ملک صاحب مرحوم اخبار ''کوثر'' کے مالک و مدیر تھے اور اس کا دفتر لاہور کے علاقہ گوالمنڈی میں تھا۔ ملک صاحب سے مولانا ندوی کے دوستانہ مراسم تھے۔ چناں چہ ایک دن ہم لاہور آکر ملک صاحب سے ملے اور اپنے رجسٹروں کے متعلق بتایا تو انھوں نے اس میں تھوڑی سی تبدیلی کا مشورہ دیا۔ اخبار ''کوثر'' کے منیجر محمد شریف

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

قریشی (مرحوم) سے بات کی تو انھوں نے بھی بعض ضروری باتیں بتائیں۔

مولانا محمد حنیف ندوی نے تحریری معاملے میں میری بہت رہنمائی کی اور میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ ان کے فرمان کے مطابق میں نے حضرت نواب صدیق حسن خاں مرحوم کی فارسی کتاب ''اتحاف النبلاء'' سے متعدد محدثین وفقہا اور ائمہ کرام کے حالات اُردو میں منتقل کیے جو الاعتصام میں شائع ہوئے۔ بہت سے علماے کرام پر بھی الاعتصام کے ابتدائی دور میں میرے مضامین مسلسل چھپتے رہے۔ ادارتی شذرات بھی (کبھی میرے نام سے اور کبھی میرے نام کے بغیر) الاعتصام کے مختلف شماروں میں چھپے۔ چھپنے سے پہلے مولانا ندوی میرا ہر چھوٹا بڑا مضمون دیکھتے اور ضروری ہدایات دیتے تھے۔ ان کو اللہ نے فراوانیٔ علم سے نوازا اور الفاظ کا بے پناہ ذخیرہ عطا فرمایا تھا اور الفاظ کے محلِ استعمال سے خوب آگاہی بخشی تھی، جو شخص ان سے کچھ سیکھنا چاہتا، اس کے ساتھ وہ نہایت ہمدردی کا سلوک فرماتے تھے۔

میں اخبار ''الاعتصام'' کے لیے مضامین تو لکھتا تھا جو اس میں چھپتے تھے، لیکن کبھی کسی کتاب یا رسالے پر تبصرہ نہیں کیا تھا۔ تبصرے یا تنقید کا سلسلہ مضمون سے الگ ہے۔ ایک مرتبہ ہندوستان کے صوبہ بہار کے شہر دربھنگا سے ایک ہفت روزہ (یا پندرہ روزہ) اخبار ''الہدیٰ'' آیا جو مسلک اہلِ حدیث کا ترجمان تھا۔ ساتھ ہی مولانا محمد اسماعیل صاحب کے نام اس کے ایڈیٹر کا خط موصول ہوا، جس میں لکھا تھا کہ اس پر ''الاعتصام'' میں تبصرہ کیا جائے۔ مضامین کے اعتبار سے الہدیٰ اچھا جریدہ تھا۔ مولانا ممدوح نے یہ اخبار مجھے دیا اور فرمایا کہ اس پر تبصرہ کردو۔ رات کو میں نے وہ رسالہ پڑھا، لیکن یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ اس پر تبصرہ کس طرح کیا جائے۔ اپنی سوچ کے مطابق چند سطریں لکھیں اور پھاڑ دیں۔ پھر لکھیں، پھر پھاڑ دیں۔ پورے چار گھنٹے اس الجھن میں رہا کہ تبصرہ کس طرح لکھا جائے۔ بڑی مشکل سے چار گھنٹوں میں پندرہ سولہ سطریں لکھیں۔ صبح کو وہ سطریں مولانا اسماعیل صاحب کی خدمت میں پیش کیں۔ انھوں نے پڑھ کر فرمایا ٹھیک ہے، چھاپ دو۔ پھر وہ سطریں مولانا محمد حنیف ندوی کو دکھائیں۔ انھوں نے بھی اس تبصرے کو صحیح قرار دیا تو میں نے اسے کاتب کے حوالے کیا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

یہاں ایک اور تبصرے کا ذکر بھی کر دیں ...... جن دنوں اخبار ''الاعتصام'' گوجراں والا سے شائع ہوتا تھا، ان دنوں مولانا مسعود عالم ندوی نے گوجراں والا میں ''دار العروبہ'' کے نام سے عربی پڑھانے کا ایک ادارہ قائم کر رکھا تھا۔ وہ مولانا محمد حنیف ندوی کے دیرینہ دوست تھے۔ ظہر اور عصر کی نمازیں عام طور سے جامع مسجد اہل حدیث میں پڑھتے تھے اور مجھ پر بزرگانہ شفقت کا اظہار فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ اسلامی ممالک کے دورے پر گئے تو اپنے دورے کے تاثرات اور جن لوگوں سے وہ ملے تھے، ان کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار ایک کتاب میں کیا، جس کا نام انھوں نے ''دیارِ عرب میں'' رکھا۔ بہت اچھا نام اور بہت اچھی کتاب۔ یہ کتاب انھوں نے مولانا محمد اسماعیل سلفی کو ''الاعتصام'' میں تبصرے کے لیے دی۔ مولانا نے فرمایا میں تو اسے صرف پڑھوں گا، تبصرہ نہیں کروں گا۔ تبصرہ اسحاق کرے گا۔ میں پڑھ کر تبصرے کے لیے اسے دے دوں گا۔

مولانا کی رفتارِ مطالعہ بہت تیز تھی۔ انھوں نے مطالعے کے بعد کتاب مجھے دے دی۔ میں نے کتاب پڑھی۔ مشہور مصنف کی دلچسپ کتاب۔ خوب صورت زبان، بہت سی معلومات کا خزینہ۔ جن جن مقامات کا تبصرے میں ذکر کرنا میرے نزدیک ضروری تھا، ان پر دورانِ مطالعہ پینسل سے نشان لگاتا گیا۔ دیارِ عرب کے طویل سفر میں مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کی سب سے زیادہ پذیرائی سعودی عرب میں ہوئی۔ اہل علم کے علاوہ وہاں کے حکمران طبقے نے بھی ان کو احترام کے مستحق گردانا، لیکن انھوں نے سعودی عرب اور وہاں کی حکومت کو ہی تنقید کا نشانہ بنایا۔

کتاب پڑھ کر میں نے مولانا مسعود عالم ندوی سے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے فرمایا کہ تبصرے میں اس کی ضرور نشان دہی کرو۔ میں نے تبصرے میں فاضل مصنف کے حسنِ تحریر کا تذکرہ کیا، ان کی تصنیفی خدمات کو اجاگر کیا اور ان کی علمی سرگرمیوں کی تفصیل بیان کی۔ زیرِ تبصرہ کتاب کے مشمولات کی وضاحت کی، اس کے بعد سعودی عرب کی حکومت کے بارے میں انھوں نے جو کچھ تحریر فرمایا تھا، اس کی نشان دہی کی۔ میں نے اس ضمن میں مولانا کے خلاف

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کچھ نہیں لکھا، نہ ان پر تنقید کی۔ نہ یہ میرا منصب تھا۔ صرف یہ عرض کیا کہ جن لوگوں نے ان کی سب سے زیادہ پذیرائی کی اور ان کو احترام دیا، انھوں نے انھی کو ہدفِ تنقید ٹھہرایا۔ مصنف شہیر میرا یہ تبصرہ پڑھ کر خوش ہوئے اور فرمایا کہ تم نے جو کچھ لکھا ہے، صحیح لکھا ہے۔ اس کے بعد وہ لاہور چلے گئے اور چار پانچ دن کے بعد واپس تشریف لائے تو میں نے حسب معمول ان کو سلام کیا، مگر انھوں نے میرے سلام کا اس طرح جواب نہیں دیا، جس طرح پہلے دیا کرتے تھے۔ بے رُخی سے وعلیکم السلام کہا اور جلدی سے تشریف لے گئے۔ اس کے بعد میں نے جب بھی انھیں السلام علیکم کہا، جواب میں ان کا یہی رویہ رہا۔ میں حیران تھا کہ اچانک یہ بے رُخی اور عدم توجہی کا مظاہرہ کیوں ہونے لگا ہے۔

اسی اثنا میں اخبار چھپوانے کے لیے میں لاہور آیا اور استاذِ محترم مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے مولانا مسعود عالم ندوی کے اپنے متعلق بدلے ہوئے رویے کا ذکر کیا تو انھوں نے فرمایا کہ چند روز پیشتر وہ لاہور تشریف لائے تھے۔ جماعت اسلامی کے دفتر اچھرہ گئے تو جماعت کے ایک عہدے دار نے ان سے کہا کہ آپ کی کتاب ”دیارِ عرب میں“ پر تبصرہ مولانا محمد اسماعیل سلفی یا مولانا محمد حنیف ندوی کو کرنا چاہیے تھا، لیکن انھوں نے تبصرے کے لیے کتاب کل کے لونڈے اسحاق بھٹی کو دے دی۔ اسے اہل علم کی قدر و منزلت اور مصنفین کے مقام و مرتبہ کا کیا علم؟ یہ ۱۹۵۰ء کی بات ہے۔ مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی نے جماعت اسلامی کے ان عہدے دار کا نام بھی مجھے بتایا تھا، جنھوں نے مولانا مسعود عالم ندوی سے یہ الفاظ کہے تھے۔ وہ صاحب وفات پا چکے ہیں، میں ان کا نام نہیں لکھنا چاہتا۔

اب مولانا مسعود عالم ندوی نماز کے لیے مسجد میں تشریف لائے تو میں نے حسب معمول انھیں سلام کیا۔ لیکن وہ اسی پہلی سی بے دلی سے سلام کا جواب دے کر آگے بڑھنے لگے تو میں نے کہا: میں آپ سے ایک عرض کرنا چاہتا ہوں۔ وہ رُک تو گئے، مگر بادل نخواستہ۔ نہایت ادب سے میں نے عرض کیا کہ مجھے مصنفوں اور مقالہ نگاروں کی نفسیات کا علم نہیں۔ مجھے معتبر ترین ذریعے سے پتا چلا ہے کہ آپ مجھ فقیر پر کیوں خفا ہیں؟ میرے خیال میں مصنف کی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کتاب جب چھپ کر قاری تک پہنچ جاتی ہے تو اس کے متعلق قاری کو اپنی رائے ظاہر کرنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ پھر اگر خود مصنف کسی کو تبصرے کے لیے کتاب دے تو تبصرہ نگار کو اس پر مصنف کی طرف سے اظہار رائے کی باقاعدہ سند مل جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ اگر مصنف کسی پر تنقید اور اظہارِ رائے کا حق رکھتا ہے تو اسے بھی اپنی کسی تحریر اور تحقیق پر کسی طرف سے اظہارِ رائے کا خوش دلی سے سامنا کرنا چاہیے۔ یہ تو انصاف نہیں کہ مصنف خود تو جس پر جی چاہے اور جس انداز سے چاہے تنقید کرے، لیکن کسی سلسلے میں اس کے متعلق کچھ کہا جائے تو خفگی کا اظہار کرنے لگے۔ یہ لینے اور دینے کے دو پیمانے آخر کیوں ہیں؟ میں نے یہ بھی عرض کیا کہ مصنف کو کمزور دل نہیں ہونا چاہیے۔ اس میں قوتِ برداشت ہونی چاہیے۔ اس قسم کی میں نے دو چار اور باتیں بھی کیں۔ اس کے بعد مولانا مسکرائے اور مجھ سے بغل گیر ہوتے ہوئے۔ فرمایا: تم نے بالکل ٹھیک بات کی۔ پھر میرے ساتھ ان کا وہی رویہ ہو گیا جو پہلے تھا۔

اخبار الاعتصام کے لیے میں نے بے حد محنت کی۔ جون ۱۹۵۰ء میں مولانا محمد اسماعیل سلفی اور مولانا محمد حنیف ندوی نے اس کی توسیع اشاعت کے لیے مجھے جنوبی پنجاب کی طرف جانے کا حکم دیا۔ چناں چہ میں گوجراں والا سے اوکاڑہ، ساہیوال، میاں چنوں، بورے والا، وہاڑی، خانیوال، ملتان، احمد پور شرقیہ اور رحیم یار خاں وغیرہ متعدد مقامات میں گیا اور وہاں کی ان مؤثر شخصیات سے جنھیں میں جانتا تھا بات کر کے، کئی سو سالانہ خریدار بنائے۔ جون کے مہینے میں وہ علاقہ گرمی کی شدت سے تپ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گرمی کا اصلی مرکز یہی علاقہ ہے اور مختلف مقامات کو یہی علاقہ گرمی سپلائی کرتا ہے۔ ان علاقوں کے بہت سے مقامی حضرات سے بھی مرکزی جمعیت کا ناظم دفتر اور اخبار کا معاون مدیر ہونے کی وجہ سے میرے مراسم قائم ہو گئے تھے اور ان مہاجروں میں سے بھی بے شمار حضرات سے میری پہلے سے واقفیت تھی جو ضلع فیروز پور اور ریاست فرید کوٹ سے آ کر اس نواح میں آباد ہوئے تھے۔

اس علاقے کے جن حضرات نے اس ضمن میں میرے ساتھ تعاون کیا، ان میں اوکاڑہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کے مولانا معین الدین لکھوی، ساہیوال کے مرحوم مولانا عبدالجلیل اور چودھری عبدالقادر۔ میاں چنوں کے مولانا عبدالقادر زیروی اور مولانا محمد داؤد ارشد۔ بورے والا کے مولانا محمد افضل، مولانا عبداللہ گورداس پوری اور میاں محمد اکبر۔ وہاڑی کے قاری عبداللطیف۔ خانیوال کے خان عبدالعظیم خاں، چودھری محمد حسن اور حاجی اللہ بخش تمباکو والے۔ ملتان کے شیخ عبدالرشید صدیقی، مولانا شرف الحق اور مولانا شمس الحق۔ احمد پور شرقیہ کے مولانا عبدالرزاق اور رحیم یار خاں (چک نمبر ۵۵) کے مولانا عبدالعزیز سعیدی کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات میں سے اب (ان سطور کی تحریر تک) مولانا معین الدین لکھوی اور مولانا عبداللہ گورداس پوری زندہ ہیں، باقی تمام حضرات اس دنیائے فانی سے عالم جاودانی کو کوچ کر گئے ہیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ مرحومین کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور موجودین کی خیر و عافیت کے ساتھ زندگی دراز فرمائے۔ آمین یا ربّ العالمین!

سخت گرمیوں میں اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ فریضہ سرانجام دینے کی توفیق بخشی۔

یہاں یہ یاد رہے کہ یہ آج سے ۵۸ برس پہلے کی بات ہے، یعنی قیامِ پاکستان سے صرف دو ڈھائی سال بعد کی۔ گزشتہ دور کو موجودہ دور پر قیاس نہ کیجیے۔ اس وقت سڑکوں کا دور دور تک نام ونشان نہ تھا، بلکہ تصور بھی نہ تھا۔ اب تو مین روڈ سے جگہ جگہ ذیلی سڑکیں نکالی گئی ہیں جو دور دراز دیہات تک پہنچتی ہیں اور ان پر بہ کثرت بسیں، ویگنیں چلتی ہیں۔ موٹر سائیکل رکشے بھی عام ہیں۔ سفر بہت آسان ہوگیا ہے۔ اُس وقت کچے راستے تھے اور پیدل چلنا پڑتا تھا۔ میں بہت سے مقامات میں پیدل گیا اور جہاں گیا اللہ نے کامیابی سے نوازا۔ سچی بات ہے کہ اب دل بھی صاف نہیں رہا اور معلوم ہوتا ہے کہ نیت میں بھی فتور آ گیا ہے۔ اس وقت دل بھی کسی حد تک صاف تھا اور نیت بھی کچھ نہ کچھ نیک تھی۔ یہی وجہ ہے کہ نہ زمین کی حدت کا پتا چلتا تھا اور نہ سورج کی شدتِ حرارت کا۔ میں چھتری لگانے کا کبھی شائق نہیں رہا۔ بارش ہو، گرمی ہو بغیر چھتری کے چلتا ہوں۔ جنوبی پنجاب کے ان مقامات کے علاوہ اس زمانے میں الاعتصام کے لیے راولپنڈی، جہلم، قصور، فیصل آباد (سابق لائل پور) وغیرہ مختلف شہروں کے بھی سفر کیے اور کئی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

بار کیے۔

یہ کہانی یہیں چھوڑ کر اب آگے چلتے ہیں۔

۱۹۵۱ء کے مئی کی دس یا گیارہ تاریخ تھی اور دن کے دس بجے کا وقت ہوگا۔ میں دفتر میں اکیلا بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا کہ ایک صاحب تشریف لائے۔ لمبا قد، گندمی رنگ، گداز جسم، ننگا سر، چوڑا چہرہ، داڑھی منڈی ہوئی۔ نتھنوں کے نیچے ترکی کے انور پاشا ٹائپ کی مونچھیں۔ کھلی موری کا لٹھے کا پاجامہ، قمیص اور شیروانی پہنے ہوئے۔ السلام علیکم کے بعد پوچھا: حنیف صاحب کہاں ہیں؟ میں نے کہا: وہ گھر میں ہیں۔ تھوڑی دیر تک آئیں گے۔ بولے: میرا نام رشید اختر ندوی ہے۔ لاہور سے آیا ہوں۔ مہربانی کر کے انھیں میرے آنے کی اطلاع دیجیے۔ میں انھیں ملنا چاہتا ہوں۔

میں مولانا کے گھر گیا، انھیں اطلاع دی اور وہ تشریف لائے۔

رشید اختر ندوی صاحب نے مولانا سے کہا کہ حکومت کی اعانت سے ایک صاحب علم ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے لاہور میں کلب روڈ پر ادارہ ثقافت اسلامیہ کے نام سے ایک تحقیقی ادارہ قائم کیا ہے، جس میں بعض حضرات تصنیفی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ میں بھی وہاں کام کرتا ہوں۔ خلیفہ صاحب سے آپ کا ذکر ہوا تو انھوں نے میری ڈیوٹی لگائی کہ آپ سے عرض کروں کہ وہ آپ سے ملاقات کے متمنی ہیں۔ آپ دو ایک روز میں ان سے ضرور ملیے۔

اس قسم کی چند باتیں کر کے رشید اختر ندوی صاحب چلے گئے۔ اب مولانا نے مجھ سے مشورہ کیا کہ خلیفہ صاحب سے کیا بات کی جائے۔ میں نے عرض کیا: آپ ان سے ضرور ملیے اور معلوم کیجیے کہ ادارہ ثقافت اسلامیہ میں کون کون لوگ کام کرتے ہیں اور کام کی نوعیت کیا ہے۔ اگر تصنیف و تالیف کا کام ہو تو ضرور کرنا چاہیے۔ اہل علم کا فرض ہے کہ علمی معاملات میں حصہ لیں۔

تیسرے دن مولانا گوجراں والا سے لاہور آئے۔ خلیفہ صاحب سے ملے اور ان سے گفتگو کر کے ۱۵ رمئی ۱۹۵۱ء کو ریسرچ فیلو کی حیثیت سے ادارۂ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ ہوگئے۔ تین سو روپے ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ ان سے قبل جو لوگ وہاں تصنیفی کام کرتے تھے،

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ان کی یہی تنخواہ تھی، اور اس دور میں یہ معقول تنخواہ تھی۔ ابتدا میں مولانا روزانہ صبح کو گوجراں والا سے لاہور آتے اور شام کو واپس چلے جاتے تھے۔ ادارے سے وابستگی کے بعد الاعتصام کی ادارت بھی کچھ عرصہ انہی کے سپرد رہی، لیکن اس کی وہ تنخواہ نہیں لیتے تھے۔ پھر مستقل طور پر لاہور آ گئے۔ الاعتصام کا ڈیکلریشن بھی گوجراں والا سے ختم کر کے لاہور کا لے لیا گیا اور اسے لاہور منتقل کر دیا گیا اور مجھے اس کا ایڈیٹر بنا دیا گیا۔

ادارۂ ثقافت اسلامیہ میں مولانا محمد حنیف ندوی نے بے حد تحقیقی اور تصنیفی خدمات سرانجام دیں۔ ۱۵؍ مئی ۱۹۵۱ء سے تادمِ وفات ۱۲ جولائی ۱۹۸۷ء تک (چھتیس سال) وہ ادارے سے منسلک رہے۔ الاعتصام کی ادارت سے علیحدگی کے بعد بھی انھوں نے اس اخبار میں بے شمار مضامین لکھے۔ اس کی تفصیل میں نے ''ارمغانِ حنیف'' میں بیان کی ہے، جوان کے حالات میں معرضِ تالیف میں لائی گئی ہے۔

الاعتصام کے معاون مدیر کی حیثیت سے میں اپنی خدمات کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں اختصار کے ساتھ کر چکا ہوں، لیکن مولانا محمد حنیف ندوی کے بعد جب مجھے اس کا مدیر مقرر کر دیا گیا تو میری خدمات کا دائرہ مزید وسیع ہو گیا اور میری ذمہ داریاں بڑھ گئیں۔ مضامین کے لیے اہل علم سے رابطہ رکھنا، اشاعت کے لیے اخبار کی پالیسی کے مطابق ان میں ردّ و بدل کرنا اور زبان کی تصحیح کرنا، اداریہ لکھنا، ادارتی شذرات لکھنا، کتابوں پر تبصرے کرنا، سیاسی نقطۂ نظر سے جماعت کی پالیسی کی وضاحت کرنا، اپنے مسلک کی اشاعت کے لیے کوشاں رہنا اور کسی سلسلے میں دوسروں سے اختلاف یا اتفاق کے دائرے کا تعین کرنا اور قلم کو ان حدود کے اندر رکھنا، یہ نہایت اہم امور تھے، جن کو پیش نگاہ رکھنا ضروری تھا۔

بارہا ایسا ہوتا کہ میں صبح صبح دفتر آ جاتا اور ناشتہ دفتر آ کر کرتا۔ دوپہر کو کھانا کھا کر پھر دفتر آ جاتا اور شام کے بعد گھر جاتا۔ اخبار میں میرا کوئی معاون نہ تھا۔ اکیلا تمام فرائض انجام دیتا تھا اور کام کی کثرت میرے لیے مسرت کا باعث ہوتی تھی۔ اب میری تنخواہ دو سو روپے ہو گئی تھی اور اس زمانے میں ایک ہفت روزہ اخبار کے ایڈیٹر کی یہ مناسب تنخواہ تھی۔ ۹۰ روپے سے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

تنخواہ کا آغاز ہوا۔ پہلے ایک سو پچیس روپے ہوئے۔ پھر دو سو تک پہنچا اور یہاں آ کر معاملہ رُک گیا۔ تنخواہ کے یہ تینوں دور اس زمانے میں ٹھیک ٹھاک تھے۔ میں نے تنخواہ کے متعلق نہ کبھی کسی سے شکایت کی اور نہ کسی قسم کا کبھی مطالبہ کیا۔ اخبار ایک مدت سے مرکزی جمعیت اہل حدیث کی تحویل میں چلا گیا تھا اور میں مرکزی جمعیت کی مالی حالت سے آگاہ تھا۔ اس لیے شکایت یا مطالبے کا کبھی سوال پیدا نہیں ہوا۔ علاوہ ازیں مجھے کچھ سیکھنے کا شوق بھی تھا، لہٰذا ہمیشہ صابر وشاکر رہا اور قناعت وایثار سے کام لیا۔ وقت بہت اچھی طرح گزرتا رہا۔ اللہ تعالیٰ نے کبھی کسی کا محتاج نہیں کیا۔ میں نے کبھی کسی سے ایک پیسا ادھار نہیں لیا۔ نہ کبھی دکان سے ادھار سودا لیا۔ یہ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔

اس زمانے میں میرا زیادہ قریبی رابطہ مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی سے رہتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مولانا جمعیت کے صدر تھے اور ان کا زیادہ وقت دفتر میں گزرتا تھا۔ پندرہ سال سے کچھ زیادہ عرصہ میں الاعتصام کی ادارت سے وابستہ رہا۔ اس اثنا میں ہر فقہی مسلک اور ہر نقطۂ نظر کے اصحاب علم سے ملنے کے مواقع میسر آئے اور بہت لوگوں سے مسلکی اور سیاسی بحثیں ہوئیں۔ لیکن بحث میں میں نے ہمیشہ اعتدال کی راہ اختیار کرنے کی کوشش کی۔

مجھ پر اللہ کا یہ بہت بڑا فضل ہے کہ تحریر کے ابتدائی دور ہی سے میرے قلم کی تربیت کچھ اس قسم کی ہوئی اور ذہن وفکر کا رجحان کچھ ایسا رہا کہ اخبار میں جس سے بھی کوئی بحث ہوئی، میں نے اس کا احترام کے الفاظ میں ذکر کیا اور اسے عالم ثابت کرنے کی کوشش کی۔ مجھے اپنے اساتذہ سے یہ سبق ملا کہ حریف اگر صاحب علم نہیں ہے، جاہل ہے تو اس سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ اپنے حریف کی علمیت کا اعتراف کرو (بلکہ اسے عالم ثابت کرو) تاکہ قاری کو پتا چلے کہ تمھارا مدمقابل معمولی آدمی نہیں ہے، بڑا آدمی ہے۔ چناں چہ ہمارے بزرگ اہل علم نے جن میں ماضی قریب کے مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی، مولانا محمد اسماعیل سلفی، مولانا محمد حنیف ندوی، مولانا عطاء اللہ حنیف اور دوسرے حضرات شامل ہیں، کسی صاحب کے متعلق جب بھی اظہارِ رائے کیا، اس کے مقام ومرتبے کو ملحوظِ خاطر رکھا۔ اس میں اپنے مخاطب اور اس کے حلقے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کا احترام بھی پایا جاتا ہے اور خود اپنے متعلق بھی پڑھنے والوں کو احساس ہوتا ہے کہ یہ شائستہ آدمی ہے اور دوسرے کی تکریم کرتا ہے۔

اونچے درجے کے اہل سیاست بھی باہمی اختلاف کے باوصف ایک دوسرے کی تکریم کو ضروری قرار دیتے تھے۔ آزادیٔ برصغیر سے قبل بعض سیاسی معاملات کے بارے میں گاندھی جناح خط و کتابت ہوئی تھی۔ گاندھی جی نے جناح صاحب کو ایک خط میں لکھا تھا کہ مجھے معلوم ہوا ہے آپ کو قائداعظم کہا جاتا ہے، میں بھی آئندہ آپ کو مسٹر جناح کے بجائے قائداعظم لکھا کروں گا۔ جب اپنے سے اختلاف کرنے والوں کے متعلق سیاست دانوں کا یہ نقطۂ نظر ہے تو مذہبی اصحابِ علم کو تو بالخصوص اس پر عمل کرنا چاہیے اور ایک دوسرے سے تکریم کے الفاظ سے مخاطب ہونا چاہیے۔ لیکن رسائل و جرائد میں ہم دیکھتے ہیں کہ نہ موجودہ دور کے سیاست دان اپنے سے اختلاف کرنے والوں کا احترام کرتے ہیں اور نہ بعض دینی اور مذہبی علمائے کرام اسے کوئی اہمیت دیتے ہیں۔ زبان اور قلم کا اس بے رحمی سے استعمال کرتے ہیں کہ جی چاہتا ہے ان کے خلاف انسداد بے رحمی کا مقدمہ قائم کیا جائے۔

بہرکیف میں عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ اخبار ''الاعتصام'' کے ابتدائی دور سے لے کر اپنے زمانۂ ادارت کے اختتام تک میں نے اس کے لیے بہت تگ و دو کی۔ اس سے مستعفی ہونے کے بعد بھی یہ اخبار میرے دل کی گہرائیوں میں راسخ رہا، اس لیے کہ میں نے اسی اخبار میں قلم پکڑنا سیکھا۔ یہ میری اوّلیں تحریری درس گاہ ہے اور میرا سب سے بڑا محسن ہے۔ میں اسے ہرگز نظر انداز نہیں کرسکتا۔ مَیں اس کی موجودہ سیاسی پالیسی کے بعض پہلوؤں سے اتفاق نہیں رکھتا۔ لیکن یہ اتفاق و عدم اتفاق کوئی دینی مسئلہ نہیں ہے اور بارگاہِ الٰہی میں اس کے متعلق نہیں پوچھا جائے گا۔ میں اس کے دینی مندرجات سے استفادہ کرتا ہوں۔ اس کے ارکانِ عملہ سے مجھے محبت ہے اور اسی بنا پر میں ہفتے میں کم از کم ایک مرتبہ اس کے دفتر جاتا ہوں اور اپنی تصنیفی مصروفیات سے وقت نکال کر کبھی کوئی مضمون بھی لکھ دیتا ہوں۔ اگرچہ میرے کسی مضمون میں کوئی علمی بات نہیں ہوتی تاہم ایک جذبہ ہے جو مجھے اس میں لکھنے پر مجبور کرتا ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

''الاعتصام'' مرکزی جمعیت اہل حدیث کا ترجمان تھا اور مرکزی جمعیت کے صدر مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی تھے۔ بحمداللہ وہ اس فقیر پر بہت خوش تھے اور بے حد شفقت فرماتے تھے۔ اس کی تفصیل اس طویل مضمون میں بیان کرچکا ہوں جو مولانا ممدوح سے متعلق میری کتاب ''نقوش عظمت رفتہ'' میں شائع ہوا۔ گزشتہ صفحات میں بھی اس کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔

میرے زمانۂ ادارت میں ''الاعتصام'' کے کئی خاص نمبر چھپے، جن میں ایک ''حجیت حدیث'' نمبر ہے جو بڑے سائز کے ایک سو صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ نمبر تنہا اس فقیر نے ترتیب دیا۔ حجیت حدیث نہایت نازک اور اہم موضوع ہے۔ اس کے لیے میں نے بہت سے اصحابِ علم سے مضامین لیے اور ہر مضمون کے آغاز میں فاضل مضمون نگار کے حالات لکھے۔ یہ نمبر فروری ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا تھا۔ پاکستان اور ہندوستان کے تقریباً تمام مشہور اخبارات و رسائل نے اس پر تبصرے کیے۔

دوسرا نمبر اس سے چودہ مہینے بعد مئی ۱۹۵۷ء میں شائع کیا۔ یہ نمبر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی مناسبت سے ''۱۸۵۷ء نمبر'' تھا۔ یہ بھی خاصا ضخیم نمبر تھا اور تنہا اس فقیر نے مرتب کیا تھا جو برصغیر کے مشہور اہل قلم کے مضامین پر محیط تھا۔ اخبارات نے اپنے تبصروں میں اس نمبر کی تحسین کی۔ وہ تبصرے میں نے اس نمبر سے بعد کے مختلف شماروں میں درج کیے۔ ان نمبروں کے علاوہ بھی متعدد مواقع پر میں نے ''الاعتصام'' کے خاص نمبر شائع کیے۔

دسمبر ۱۹۴۸ء سے لے کر دسمبر ۱۹۶۳ء تک میں مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی کی خدمت میں رہا۔ ۱۶ر دسمبر ۱۹۶۳ء کو ان کا انتقال ہوا تو حالات بدل گئے اور اخبار کی انتظامیہ سے میرے یا یوں کہیے کہ اخبار کی انتظامیہ کے مجھ سے اختلافات پیدا ہوگئے، جن میں کافی شدت آگئی۔ کئی مہینے یہ سلسلہ چلا۔ بالآخر ۳۰ر مئی ۱۹۶۵ء کو میں نے اخبار الاعتصام کی ادارت سے استعفا دے دیا۔ مجموعی طور پر میں تقریباً ۱۷ سال ''الاعتصام'' سے منسلک رہا۔ درمیان میں کچھ وقفہ آیا۔ وہ اس طرح کہ جنوری ۱۹۵۸ء میں چند دوستوں کے ساتھ مل کر میں نے سہ روزہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

''منہاج'' جاری کیا جو بعض وجوہ کی بنا پر اپریل ۱۹۵۹ء میں بند ہو گیا۔ اس طرح تیرہ چودہ مہینے مَیں ''الاعتصام'' کی ادارت سے علیحدہ رہا۔

''منہاج'' کے ڈیکلریشن کے سلسلے کا ایک لطیفہ نما واقعہ سنیے۔

میں نے سہ روزہ ''منہاج'' کے ڈیکلریشن کے لیے ڈی سی آفس (لاہور) میں فارم داخل کرایا تو میرے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے بھاٹی گیٹ تھانے کا سب انسپکٹر شیش محل روڈ آیا۔ میں اخبار الاعتصام کا ایڈیٹر تھا۔ میری اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔ دوسرے دن پھر آیا۔ اب بھی اتفاق سے مَیں دفتر میں موجود نہیں تھا۔ اس طرح وہ مسلسل چار دن آیا لیکن میں اسے نہیں مل سکا۔ چوتھے دن اس نے دفتر کے کلرک کو آمد کی وجہ بتائی اور پیغام دیا کہ میں اتنے بجے تھانے آ کر اسے ملوں۔ میں گیا تو وہ نہایت احترام سے پیش آیا اور مجھے پانی پلایا۔ معذرت کی کہ آپ کو یہاں آنے کی تکلیف اُٹھانا پڑی۔ پھر چند سوال کیے اور سہ روزہ اخبار جاری کرنے کی وجہ پوچھی۔ مَیں اس کے ہر سوال کا جواب دیتا گیا اور وہ ایک رجسٹر میں لکھتا گیا۔ میں نے باتوں باتوں میں کہا کہ آزادیٔ وطن کے لیے میں نے قید بھی کاٹی ہے۔ اس نے یہ الفاظ سن کر میری طرف دیکھا اور کہا: ذرا ٹھہریے۔ اٹھا اور اندر سے ایک بڑا سا رجسٹر لایا، جس میں میری قید کے متعلق تفصیل لکھنا شروع کی۔ اس سے مجھے خیال آیا کہ قید کی بات مجھے نہیں کرنا چاہیے تھی۔ میں نے کہا قید تو نواب ممدوٹ اور ممتاز دولتانہ بھی رہے ہیں۔ بولا ان کے نام بھی اس رجسٹر میں موجود ہیں۔ آپ لاہور اور ضلع لاہور کی جس سیاسی شخصیت کے بارے میں پوچھیں گے، اس کا نام آپ کو اس رجسٹر میں ملے گا۔ اگر وہ سیاسی شخصیت اخبار نویس ہے تو اس کا بھی ذکر ہے۔ ڈیکلریشن آپ کو ملے گا، لیکن آپ کی تحریروں پر نظر رہے گی۔

جولائی ۱۹۶۵ء میں مَیں نے اور مولانا داؤد غزنوی کے صاحب زادۂ گرامی قدر سیّد ابوبکر غزنوی مرحوم نے لاہور سے ہفت روزہ ''توحید'' جاری کیا۔ یہاں معاملات نے کچھ ایسا رُخ اختیار کیا کہ ڈھائی مہینے کے بعد ۱۸ر ستمبر ۱۹۶۵ء کو میں نے اس اخبار سے علیحدگی اختیار کر لی۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

اب آخر میں اخبار ''الاعتصام'' کے دورِ ادارت کی چند اور باتیں:

دسمبر ۱۹۵۳ء میں اخبار ''الاعتصام'' کے منیجر حضرت مولانا محمد جونا گڑھی دہلوی کے فرزند گرامی محمد محمود میمن دہلوی (مرحوم) تھے۔ مولانا معین الدین لکھوی کی اہلیہ مرحومہ کے برادرِ صغیر۔ بڑے سمجھ دار اور خوش گفتار نوجوان۔ دہلی میں ایک ہفت روزہ اخبار کے عملہ ادارت میں شامل رہے تھے۔ تقسیم ملک سے پہلے سے میرے ان سے مراسم تھے۔ آزادئ ملک سے تین چار سال بعد پاکستان آئے اور اوکاڑہ میں مقیم ہوئے۔ مجھے ان کی آمد کا پتا چلا تو مولانا داؤد غزنوی اور مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے مشورے کے بعد انھیں خط لکھ کر لاہور بلایا گیا اور الاعتصام کا منیجر بنا دیا گیا۔

دسمبر ۱۹۵۳ء کے پہلے ہفتے میں چار پانچ روز کے لیے مجھے اپنے گاؤں جانا پڑا۔ جاتے وقت میں نے محمد محمود میمن کو تین چار مضمون دیے کہ میرے بعد کاتب سے ان کی کتابت کرالی جائے۔ ایک نظم تھی جس کا عنوان تھا ''ضبط''۔ یہ نظم ہندوستان کے مشہور شاعر مولانا ابوالبیان حماد نے مدراس سے بھیجی تھی۔ اس سے پہلے بھی وہ اپنا کلام بھیجتے رہے تھے جو ''الاعتصام'' میں شائع کیا جاتا تھا۔ لیکن ان کی تازہ نظم (ضبط) میں شائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ نظم میں نے میز کی دراز میں رکھ دی اور محمود صاحب سے کہا کہ اسے شائع نہ کیا جائے۔ معلوم نہیں وہ میری بات سمجھے یا نہ سمجھے۔ میں گاؤں سے لاہور آیا تو وہ نظم ۱۱ دسمبر ۱۹۵۳ء کے ''الاعتصام'' کے صفحہ اوّل پر چھپ چکی تھی۔ چھپنے کے بعد یہ نظم مولانا داؤد غزنوی اور دیگر تمام حضرات نے پڑھی، لیکن کسی نے کچھ نہیں کہا۔ البتہ مجھے خیال تھا کہ حکومت کی طرف سے اس کا ردّعمل آئے گا۔

اس سے تین مہینے بعد ۸۔ مارچ ۱۹۵۴ء کو رات کے آٹھ بجے کے قریب میں اپنے دفتر میں تنہا بیٹھا کام کر رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو دو آدمی کھڑے تھے۔ میں نے ان کو اندر آ کر بیٹھنے کو کہا۔ علیک سلیک کے بعد انھوں نے ۱۱ دسمبر ۱۹۵۳ء کے ''الاعتصام'' کا وہ شمارہ مجھے دکھایا، جس کے پہلے صفحے پر نظم ''ضبط'' چھپی تھی اور ساتھ ہی ایک اور کاغذ دیا، جس میں لکھا تھا کہ یہ نظم حکومت کے نزدیک قابل اعتراض ہے، لہٰذا حکومت کے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

خزانے میں چار ہزار روپے کی ضمانت جمع کرائی جائے۔ تین ہزار کی ضمانت اخبار کی طرف سے اور ایک ہزار کی اس پریس کی طرف سے جس میں اخبار چھپتا ہے۔ یہ نوٹس تھا جو میں نے وصول کیا اور وہ لوگ چلے گئے۔

''الاعتصام'' کا دفتر دار العلوم تقویۃ الاسلام (شیش محل روڈ، لاہور) کی دوسری منزل میں تھا اور مولانا داؤد غزنوی کا پہلی منزل میں۔ مولانا غزنوی اس وقت اپنے دفتر میں تشریف فرما تھے۔ میں ان کے پاس آیا اور وہ نوٹس دکھایا۔ نظم والا شمارہ بھی ان کی خدمت میں پیش کیا۔ انھوں نے نوٹس پڑھا اور نظم بھی پڑھی۔ مسکراتے ہوئے فرمایا: ''اچھا یہ معاملہ ہے۔ اخباروں میں یہ چلتا رہتا ہے۔''

انھوں نے اسی وقت میاں محمود علی قصوری بار ایٹ لا کو ٹیلی فون کیا، انھیں اس وقت تکلیف دینے کی وجہ بتائی اور فرمایا کہ مولانا محمد علی قصوری اور مولانا محی الدین احمد قصوری کو بھی اپنے ساتھ لیتے آئیں۔ یہ دونوں بزرگ میاں صاحب کے بڑے بھائی تھے۔ مولانا محمد حنیف ندوی کا مکان بھی ٹمپل روڈ پر ان دونوں کے قریب تھا۔ مولانا غزنوی نے انھیں بھی اپنے ساتھ لانے کے لیے کہا۔ اخبار کے پرنٹر پبلشر مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کو بھی بلا لیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد یہ تمام حضرات تشریف لے آئے۔ مولانا محمد علی قصوری ایم اے کینٹب نے آتے ہی مجھے مخاطب کر کے فرمایا: اسحاق صاحب! آج سے آپ پکے ایڈیٹر ہو گئے ہیں۔ میٹنگ میں فیصلہ کیا گیا کہ حکومت کے ضمانت طلبی کے حکم کو ہائی کورٹ میں چیلنج کیا جائے۔ چنانچہ میاں محمود علی نے مجھے دوسرے دن اپنے دفتر آنے کو کہا اور معاملہ عدالت میں چلا گیا۔ میں نے اسی وقت یہ خبر اخبارات کو بھجوا دی جو دوسرے دن شائع ہوئی۔ چار ہزار روپے اس زمانے میں بہت بڑی رقم تھی۔ میں نے ''الاعتصام'' کے صفحہ اوّل پر حسب ذیل سطور لکھیں:

''...... ''الاعتصام'' سے تین ہزار اور پریس سے ایک ہزار روپے کی ضمانت طلب کر لی گئی ہے۔ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْا اَنْ یَّقُوْلُوْا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ (العنکبوت:۱) (کیا لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ہم (زبان سے) کہہ دیں گے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کہ ایمان لائے تو چھوڑ دیے جائیں گے اور وہ آزمائے نہ جائیں گے)

"آپ کو اخبارات سے معلوم ہو چکا ہوگا کہ حکومت نے "الاعتصام" سے تین ہزار اور جس پریس میں "الاعتصام" چھپتا ہے، اس سے ایک ہزار روپے کی ضمانت طلب کر لی ہے (الاعتصام ویسٹ پنجاب پرنٹنگ پریس، موہن لال روڈ [1]، لاہور میں چھپتا ہے) حکومت کے موصولہ نوٹس کے مطابق چار ہزار روپے کی یہ رقم ۱۳۔ مارچ ۱۹۵۴ء تک سرکاری خزانے میں جمع کرا دینا ضروری ہے۔ ضمانت اس بنا پر طلب کی گئی ہے کہ "الاعتصام" کے ۱۱۔ دسمبر ۱۹۵۳ء کے شمارے میں "ضبط" کے عنوان سے ایک نظم شائع ہوئی تھی جو حکومت کے نزدیک قابل اعتراض ہے۔

"ہمیں حکومت کے اس نوٹس سے نہ تعجب ہوا ہے اور نہ کوئی گھبراہٹ پیدا ہوئی ہے، اس لیے کہ ملی اور قومی زندگی کی دوڑ میں اس قسم کے مراحل پیش آیا ہی کرتے ہیں، اور جن لوگوں کے سامنے کوئی متعین منزل ہوتی ہے وہ نہایت وقار اور متانت کے ساتھ ان مراحل سے گزر جایا کرتے ہیں۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ "الاعتصام" راہِ حق کا وہ مسافر ہے کہ اس قسم کے کانٹے اس سے اُلجھ تو سکتے ہیں مگر اس کے دامن کو پکڑ کر اسے منزلِ مقصود تک پہنچنے سے روک نہیں سکتے۔

"ہم چار ہزار کی اس ضمانت طلبی سے حکومت پر کوئی تنقید نہیں کرنا چاہتے، یہ فیصلہ تو ملک کی عدالت عالیہ ہی کرے گی کہ حکومت اس اقدام میں کہاں تک حق بجانب ہے۔ اس سلسلے میں پاکستان کے مشہور ماہر قانون میاں محمود علی قصوری بیرسٹر ایٹ لا کی خدمات حاصل کر لی گئی ہیں۔

"ان سطور کے ذریعے ہم اپنی جماعت سے بالخصوص اور عام قارئین سے بالعموم یہ درخواست کریں گے کہ وہ اپنی زندگی کا ثبوت دیں اور چار ہزار روپے کی یہ رقم ایک ہفتے کے اندر اندر مولانا محمد عطاء اللہ حنیف پرنٹر پبلشر الاعتصام شیش محل روڈ لاہور

---

[1] موہن لال روڈ اس زمانے میں موجودہ اُردو بازار کو کہا جاتا تھا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کے پتے پر ارسال فرما دیں۔ جماعت کی عددی اور مالی حیثیت کے مقابلے میں یہ بالکل معمولی رقم ہے۔ ہمیں اپنی جماعت کے ایسے اکثر مخیرّ حضرات کا علم ہے جو اللہ کے فضل سے اتنی استطاعت رکھتے ہیں کہ ان میں سے ایک ایک بزرگ یہ معمولی رقم ادا کر سکتے ہیں، اور ہم یقین رکھتے ہیں کہ وہ ادا کریں گے، کیوں کہ اس سے قبل ہمیں تجربہ ہے کہ ان کے ہاں سے ہمارا دامن طلب کبھی خالی نہیں لوٹا۔ ان شاء اللہ اب بھی خالی نہیں لوٹے گا۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ ''الاعتصام'' جس مسلک کا ترجمان اور داعی ہے اس میں اس نوع کے معرکوں کا وقوع میں آنا ہر آن ممکن ہے۔ اہل حدیث کی تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ ''الاعتصام'' جماعت کا اخبار ہے۔ جماعت کے تمام حضرات سے درخواست ہے کہ وہ اس کی زیادہ سے زیادہ اعانت فرمائیں اور حکومت کے اس چیلنج کا فوری جواب دیں۔ یہ جماعت کا امتحان ہے اور ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ کا جواب کس طرف سے آتا ہے اور کس طرح آتا ہے؟''

مقدمے کی سماعت ہائی کورٹ کے فل بنچ نے ۳ مئی ۱۹۵۴ء کو کی۔ ''الاعتصام'' کی اپیل مسترد کر دی گئی اور چار ہزار روپے کی ضمانت حکومت کے خزانے میں جمع کرا دی گئی۔

۳۔ مئی کو بحث کے لیے میاں محمود علی قصوری نے پیش ہونا تھا، لیکن اس سے ایک دن پہلے انھیں ایک مقدمے کے سلسلے میں ڈھاکا جانا پڑا۔ ان کی جگہ ان کے جونیئر وکیل شیخ رفیق احمد پیش ہوئے اور انھوں نے عدالت میں بحث کی۔ بنچ میں ایس اے رحمان بھی شامل تھے۔ عدالت میں اس وقت مولانا محمد حنیف ندوی بھی موجود تھے۔ میں بھی حاضر تھا۔ ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ عدالت کا رجحان ہمارے خلاف جا رہا ہے۔ میں نے آہستہ سے اپنے وکیل شیخ رفیق احمد سے کہا کہ چھوٹی سی نظم ہی تو ہے۔ ایس اے رحمان نے میری یہ بات سن لی۔ وہ خود شاعر تھے۔ بولے: نظم کے چند اشعار بسا اوقات ایک بڑی نثر سے زیادہ موثر ثابت ہوتے ہیں۔

اب دوسرا واقعہ سنیے! ۱۹۵۳ء میں مرزائیوں کے خلاف تحریک شروع ہوئی تو حکومت

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

نے لاہور میں مارشل لا نافذ کر دیا اور اس کے ایڈمنسٹریٹر جنرل اعظم خاں کو بنایا گیا۔ اخباروں پر سنسر لگا دیا۔ روزناموں سے لے کر ماہانہ رسالوں تک سب سنسر کی زد میں تھے۔ مجلس احرار کو حکومت نے خلافِ قانون قرار دے دیا تھا۔ اس کے دفاتر سر بمہر کر دیے گئے تھے اور اس کا اخبار (روز نامہ ''آزاد'') بند کر دیا گیا تھا۔ اس کے تمام چھوٹے بڑے رہنما جیلوں میں محبوس تھے۔ ان کے لیے جیلیں کوئی نئی چیز نہ تھی۔ ان کی زندگیوں کا بہت بڑا حصہ اسی طرح جیلوں میں آتے جاتے گزرا تھا۔ اس زمانے میں پریس برانچ کے ڈائریکٹر چودھری نور احمد تھے۔ گرمیوں کا موسم تھا اور وہ شام کے بعد سیکرٹریٹ کے صحن میں اپنے عملے کے ساتھ کرسیاں میز رکھ کر بیٹھ جاتے تھے۔ اس وقت عام طور سے ان کا لباس تہبند اور بنیان ہوتا تھا۔ مضامین، اداریے اور خبریں وغیرہ سنسر کرانے کے لیے بالعموم ایڈیٹر ہی آتے تھے۔ کیوں کہ اخبار کے اصل ذمہ دار وہی ہوتے ہیں اور کوئی بات پوچھنی ہو تو انھی سے پوچھی جاتی ہے۔ اگر ایڈیٹر کسی وجہ سے نہ آسکتا تو کسی اور ذمہ دار آدمی کو بھیج دیتا۔ ان دنوں لیتھو کی کتابت چلتی تھی اور سارا مواد کتابت سے پہلے دکھانا ضروری تھا۔ جو چیز قابل اشاعت ہوتی، ڈائریکٹر صاحب اس پر مہر لگا دیتے تھے۔ بعد میں کتابت شدہ مضامین لانے کی اجازت بھی دے دی گئی تھی۔

ایک دن میں نے ادارتی نوٹ لکھا، جس کا عنوان تھا، ''مجلس احرار''۔ چودھری نور احمد دلچسپ آدمی تھے اور خالص پنجابی بولتے تھے۔ عنوان دیکھا تو کہا: یہ کیا لکھ لائے ہو؟ میں نے کہا پڑھ لیجیے، کیا لکھا ہے۔ دو تین دفعہ پورا نوٹ پڑھا اور کہا یہ حکومت کے خلاف جاتا ہے۔ میں نے کہا کون سے الفاظ حکومت کے خلاف ہیں؟ بولے الفاظ کو چھوڑیے، مجموعی طور پر حکومت کے خلاف ہے۔ پھر کہا: کسی اخبار نے اس موضوع پر نہیں لکھا، آپ کو اس پر لکھنے اور مجلس احرار کی صفائی پیش کرنے کی کیا ضرورت پڑی؟ میں نے کہا اسی لیے کہ کسی نے نہیں لکھا، مجھے لکھنا چاہیے۔ سوچ سوچ کر انھوں نے چند سطریں نکال دیں۔ میں نے کہا جو سطریں آپ نے نکال دی ہیں، وہاں ''سنسر کی نذر'' کے الفاظ لکھ دوں؟ کہا: نہیں۔ یہاں ''لکھو'' کا پی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

اڑ گئی'' عرض کیا: قارئین پوچھیں گے، سارا صفحہ صحیح چھپا ہے، یہاں چند سطروں کی کاپی کیسے اُڑ گئی ؟ کاپی چند سطروں کو تو نہیں کہا جاتا۔ بہر حال ان کے اصرار پر میں نے موٹے موٹے حروف میں کاتب سے لکھوا دیا ''کاپی اڑ گئی''

ایک دن مَیں سنسر کے لیے اخبار لے کر گیا، اس کے تین چار صفحات مسائل پر مشتمل تھے۔ ایک صفحہ مولانا غزنوی کے ایک فتوے کا تھا۔ میرا اداریہ کسی جماعتی معاملے میں تھا۔ ایک مولانا محمد حنیف ندوی کا مضمون تھا، غالباً معراج شریف کے متعلق۔ چودھری نور احمد یہ شمارہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے بس اسی قسم کے مضمون لکھا کرو، جنھیں چار پانچ منٹ میں دیکھ لیا جائے۔ ہمیں بھی سہولت اور آپ بھی فارغ۔! سیاسی اداریے اور مضامین لکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس کے لیے کسی آنے والے وقت کا انتظار کیجیے۔

امریکہ میں پاکستان کے سفیر غالباً اصفہانی صاحب تھے۔ (پورا نام مجھے یاد نہیں آ رہا) پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خاں پہلی دفعہ امریکہ کے دورے پر گئے تو سفارت خانے کی مسجد میں شراب نوشی کی محفل سجائی گئی۔ مولانا محمد حنیف ندوی نے ''الاعتصام'' میں ادارتی شذرہ لکھا، جس کا عنوان تھا، ''صحن مسجد میں بزمِ مَے کا اہتمام''۔ پریس والوں نے شذرہ بہت پسند کیا اور عنوان پر بڑے خوش ہوئے، لیکن چھاپنے سے انکار کر دیا۔ عنوان قائم رہا، لیکن ہم نے لکھ دیا ''پریس چھاپنے سے انکاری ہے'' پورا کالم سفید چھپا۔

ہمیں ''الاعتصام'' کے زمانہ ادارت میں بہت سی مشکل مگر دلچسپ منزلوں سے گزرنا پڑا۔ میں اخباروں کی ایک یونین کا رکن تھا اور سب سے رابطہ رکھتا تھا۔

رسائل و جرائد کی سنسر شپ کا سلسلہ ضیاء الحق کے زمانے میں زیادہ سخت ہو گیا تھا۔ میں اس وقت ادارۂ ثقافت اسلامیہ میں کام کرتا تھا اور اس کے ماہنامہ رسالے ''المعارف'' کا ایڈیٹر تھا۔ ادارے کا تعلق حکومت سے تھا اور ''المعارف'' کو سیاست یا مذہبی جھگڑوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس میں خالص تحقیقی، علمی اور تاریخی مضامین شائع کیے جاتے تھے۔ یعنی ریسرچ

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

آرٹیکل۔ لیکن اس ماہنامے کو بھی سنسر کرانا ضروری تھا۔ چنانچہ میں خود جاتا اور کتابت شدہ ہر رسالہ سنسر کراتا۔ ہر کاپی پر سنسر کی مہر چسپاں ہوتی تو رسالے کی اشاعت کا مرحلہ طے ہوتا۔

اخبار نویسی دلچسپ پیشہ بھی ہے اور مشکل بھی۔ اس میں انسان کو مختلف اوقات میں مختلف منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے، اور ہر منزل میں اپنے آپ کو اعتدال میں رکھنا ضروری ہے۔

۵/فروری ۲۰۰۸ء لاہور

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

تیرھواں باب:

ادارۂ ثقافت اسلامیہ سے انسلاک

۲۰ / اکتوبر ۱۹۶۵ء کی بات ہے کہ تین بجے کے قریب میں نے اپنے چھوٹے بھائی سعید احمد بھٹی سے کہا میں ایک ضروری کام سے کہیں جارہا ہوں۔ کچھ دیر کے بعد واپس آؤں گا۔ اس اثنا میں کوئی صاحب گھر آئیں تو ان سے اچھی طرح ملنا اور انھیں چائے پانی پلانا۔ اس وقت میں لوہاری دروازے کے اندر گمٹی بازار کی ایک گلی میں رہتا تھا۔ بیوی کو چند روز کے لیے گاؤں چھوڑ آیا تھا۔ میرے ساتھ یہی میرا چھوٹا بھائی سعید احمد تھا جو ایک ہائی سکول میں پڑھتا تھا۔ میں واپس آیا تو سعید احمد نے بتایا کہ آپ کے جانے کے بعد مولانا محمد حنیف ندوی، رئیس احمد جعفری اور اسماعیل ضیا (سابق ایم پی اے) آئے تھے۔

میں نے پوچھا: تم نے ان کو چائے پلائی؟

جواب دیا: میں نے ان کو چائے کے لیے بہت اصرار کیا لیکن انھوں نے کہا کہ اسحاق صاحب گھر میں ہوتے تو ضرور چائے پیتے، تم سے چائے نہیں پئیں گے۔ وہ بیٹھے بھی نہیں۔ چند منٹ کھڑے کھڑے بات کی اور چلے گئے۔ بات یہ کی کہ کل سے آپ ادارۂ ثقافت اسلامیہ میں ملازم ہوگئے ہیں۔ رئیس احمد جعفری صاحب نے کہا ہے کہ صبح نو بجے آپ ان کے گھر جائیں۔ وہ آپ کو ملازمت کے متعلق تفصیل سے بتائیں گے۔

میں نے سعید سے کہا: انھوں نے کوئی اور بات کی ہوگی جو تمھاری سمجھ میں نہیں آئی۔ ادارۂ ثقافت اسلامیہ میں ملازمت کے لیے نہ میں نے درخواست دی، نہ کسی سے کہا، نہ اس سلسلے میں کسی نے مجھ سے کبھی بات کی۔ میں وہاں ملازم کیسے ہوگیا؟

اس نے کہا: مَیں ان کی بات اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ انھوں نے اسی طرح کہا تھا، جس

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

طرح میں نے بتایا ہے۔

دوسرے دن نو بجے میں رئیس صاحب کے مکان پر پہنچا۔ وہ میکلوڈ روڈ پر ٹیگور پارک میں وکٹوریا ہوٹل کے عقب میں رہتے تھے۔ اس وقت وہ گھر میں نہیں تھے، ان کی بیگم بیٹھی تھیں، جن کا نام آفتاب بیگم تھا اور وہ واقعی آفتاب تھیں۔ خوب صورت خاتون۔ نسوانی حسن کا پیکر۔ میں نے ان کو سلام کیا تو سلام کا جواب دینے کے بعد انھوں نے مجھے مبارک باد دی کہ آپ ادارۂ ثقافت اسلامیہ میں ملازم ہوگئے ہیں۔ کل اس کی اطلاع دینے کے لیے رئیس صاحب آپ کے گھر گئے، لیکن آپ گھر پر نہیں تھے۔

اتنے میں رئیس صاحب بھی آگئے۔ وہ عام طور پر مجھے ''میری جان'' کہا کرتے تھے۔ اب بھی اسی طرح مخاطب کیا: میری جان! کل کہاں بھاگ گئے تھے؟ ہم آپ کے گھر پہنچے اور آپ غیر حاضر۔ اس طرح کی چند باتیں کرنے کے بعد کہا: آپ دفتر جایئے، میں بھی تھوڑی دیر کو آتا ہوں۔

دفتر کے سب لوگ مجھے جانتے تھے، انھیں معلوم تھا کہ مجھے یہاں ملازمت مل گئی ہے اور وہ اس پر خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔

آدھ پون گھنٹے کے بعد رئیس صاحب آئے۔ اس وقت ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے اکیڈمک ڈائریکٹر ایم ایم شریف (میاں محمد شریف) تھے، جو لاہور ہی کے رہنے والے تھے اور باغ بان پورہ کی ارائیں برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا موضوع فلسفہ تھا اور طویل عرصے تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں فلسفے کے پروفیسر اور صدر شعبہ رہے تھے۔

رئیس صاحب مجھے میاں صاحب کے کمرے میں لے گئے۔ میاں صاحب بے حد شریف آدمی تھے۔ اسم با مسمی۔ مجسمۂ شرافت۔ کھڑے ہو کر ملے اور اپنی نشست سے اُٹھ کر سامنے صوفے پر بیٹھے۔ ایک طرف مجھے اور دوسری طرف رئیس صاحب کو بٹھایا۔

یہ ایوب خاں کا دورِ حکومت تھا اور وزیر قانون ایس ایم ظفر تھے۔ ایس ایم ظفر نے ادارۂ ثقافت اسلامیہ میں ادارے کے ماتحت ایک لیگل کمیٹی بنائی تھی، جس کا مقصد قانونی نوعیت

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کے بعض اسلامی مسائل پر غور کرنا تھا۔ مثلاً نکاح، طلاق، خلع، وراثت، حضانت وغیرہ قسم کے مسائل۔ اس کمیٹی کا قیام میری تقرری سے تھوڑے دن پہلے عمل میں آیا تھا۔ اس کے چیئر مین شاہ محمد جعفر پھلواروی تھے اور ارکان تھے ڈاکٹر سخاء اللہ، دو بیرسٹر عبدالشکور السلام اور چودھری محمد عارف۔

میاں صاحب نے چند الفاظ میں لیگل کمیٹی اور اس کے دائرۂ کار کی وضاحت کی اور بتایا کہ ہمیں اس کمیٹی کے لیے ایک اور رکن کی ضرورت تھی۔ میں نے اس سلسلے میں اپنے رفقائے کار مولانا محمد حنیف ندوی، شاہ محمد جعفر پھلواروی اور رئیس احمد جعفری سے بات کی تو ان سب نے آپ کا نام لیا اور میں نے ان کو آپ سے بات کرنے کے لیے کہا۔

میاں صاحب نے فرمایا آپ اور شاہ صاحب ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے مستقل رکن ہوں گے جو لیگل کمیٹی میں کام کریں گے۔ کمیٹی کی میٹنگ ہفتے میں تین دن نمازِ مغرب کے بعد دفتر میں ہوتی ہے۔ کمیٹی کے ہر رکن کو تین تین سو روپے ماہانہ پیش کیے جاتے ہیں۔ آپ کو بھی تین سو روپے پیش کیے جائیں گے۔

انھوں نے بے حد نرم لہجے میں کہا کہ آپ میری گزارش کا اثبات میں جواب دیں گے تو مَیں آپ کا شکر گزار ہوں گا۔

میں نے عرض کیا: یہ علمی کام ہے اور میرے ذوق کے مطابق ہے۔ مجھے یہ خدمت انجام دینے میں خوشی ہوگی۔

میاں صاحب نے ''شکریہ'' کہہ کر اسی وقت دفتر کے ہیڈ کلرک محمد منیر شیخ کو بلایا اور مجھے اپوائنٹ منٹ لیٹر (پروانۂ تقرری) دے دیا۔ یہ ۲۱/ اکتوبر ۱۹۶۵ء کی بات ہے۔

اب ذیل کی سطور میں لیگل کمیٹی کے ارکان کا مختصر الفاظ میں تعارف۔!

ا۔ سب سے پہلے شاہ محمد جعفر پھلواروی جو اس کمیٹی کے چیئر مین تھے۔ بعض افکار میں بے شک وہ ''آزاد خیال'' تھے، لیکن سب کے ہم درد، خوش مزاج، دل کے سخی، مستحقین پر خرچ کرنے والے عالم دین۔ انھیں بے شمار وظائف یاد تھے جو قرآن و حدیث اور بزرگانِ

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

دین سے منقول ہیں۔ یہ وظائف مختلف اوقات میں وہ پڑھا کرتے تھے اور ان کے فوائد بھی بتایا کرتے تھے۔ بعض مسائل میں ہمیں ان کے نقطۂ نظر سے اتفاق نہیں تھا اور اس کے باوجود وہ سب کا احترام کرتے تھے۔ میں ادارے میں جانے سے پہلے سے انھیں جانتا تھا۔ ان کی وفات اواخر مارچ ۱۹۸۲ء) تک میرا ان سے تعلق رہا۔ [1]

۲۔ لیگل کمیٹی کے دوسرے رکن ڈاکٹر سخاء اللہ تھے۔ یہ عربی کے آدمی تھے اور ان کا تعلق پنجاب یونیورسٹی سے رہا تھا۔ مشہور منکر حدیث خواجہ احمد الدین امرتسری کے بیٹے تھے۔ لیکن ایک اور معروف منکر حدیث غلام احمد پرویز اور ان کے ساتھیوں پر سخت تنقید کرتے تھے اور صاف لفظوں میں انھیں جاہل قرار دیتے تھے۔ انھیں "ماہر قرآن" کی حیثیت سے لیگل کمیٹی کا رکن مقرر کیا گیا تھا، اس لیے کہ منکرین حدیث کا یہ دعویٰ ہے کہ نبی ﷺ کی احادیث کو کوئی اہمیت حاصل نہیں، اسلامی معاملات کا اصل مآخذ قرآنِ مجید ہے۔ حدیث تو کوئی موضوع ہے، کوئی ضعیف ہے، کوئی مرسل ہے، کوئی موقوف ہے، کسی کا راوی مدلس ہے وغیرہ وغیرہ، لیکن قرآنِ مجید میں اس قسم کا کوئی معاملہ نہیں ہے۔

مجھے صحافتی زندگی میں بعض منکرین حدیث سے تحریری بحث و مباحثے کے مواقع تو بہت ملے، لیکن براہِ راست گفتگو اور قریبی تعلق کا موقع ایک ہی منکر حدیث ڈاکٹر سخاء اللہ سے ملا۔ میں نے دیکھا کہ نہ انھیں قرآن سے کوئی تعلق تھا اور نہ وہ حدیث کے راویوں کے صحیح ناموں سے آگاہ تھے۔ اس کی بہت سی مثالوں میں سے ایک مثال دیتا ہوں۔ ایک دن میٹنگ میں عربی کی ایک عبارت پڑھتے ہوئے انھوں نے فرمایا: ((هٰذَا قَوْلُ سَعِيْدِ بْنِ مُسِيْبٍ .)) لفظ "مُسِیْب" سن کر شاہ صاحب بھی مسکرائے اور میں بھی ہنس پڑا۔ میں نے کہا: ڈاکٹر صاحب اگر آپ یہ نام صحیح بتا دیں تو میں ان سب کے سامنے ابھی آپ کا مذہب قبول کرلوں گا۔ نام تو انھوں نے صحیح کیا بتانا تھا، لیکن اس کے بعد ازراہِ کرم وہ یہ فرمانے لگے تھے کہ جس حدیث کو اسحاق بھٹی صحیح قرار دیں گے، میں اسے صحیح مانوں گا۔ بہرکیف ہنسی مذاق

---

[1] ان کے متعلق مفصل معلومات کے لیے دیکھیے راقم کی کتاب "بزمِ ارجمنداں" صفحہ ۳۵۱ تا ۳۹۹۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

میں بات ختم ہوگئی اور اس کے بعد میٹنگ میں انھوں نے کبھی کوئی عربی عبارت نہیں پڑھی۔ نہ کبھی حدیث پر تنقید کی۔

۳۔ بیرسٹر عبدالشکور السلام بہت سنجیدہ آدمی تھے۔ وہ دراصل ہندوستان کے موجودہ صوبہ ہریانہ کے ضلع حصار کے ایک علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک وقت آیا کہ وہ ہائی کورٹ کے جج ہوئے۔ پھر چیف جسٹس بنائے گئے۔ بعدازاں سپریم کورٹ کے جج مقرر کیے گئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انھیں وفاقی محتسب بنادیا گیا تھا۔

۴۔ چودھری محمد عارف دلچسپ آدمی تھے۔ ان کا آبائی تعلق مشرقی پنجاب کے ضلع ہوشیار پور سے تھا۔ اُردو اور فارسی کے بہت سے اشعار انھیں زبانی یاد تھے اور برمحل پڑھتے تھے۔ وہ ہائی کورٹ کے جج ہوئے۔ پھر سپریم کورٹ کے جج بنائے گئے۔ ریٹائرڈ ہوگئے ہیں۔

ان دونوں بیرسٹروں کا کام کمیٹی کی کارروائی کو قانونی زبان میں ڈھالنا تھا۔

ایم ایم شریف کی وفات کے بعد ڈاکٹر شیخ محمد اکرام ڈائریکٹر کی حیثیت سے آئے تو انھوں نے لیگل کمیٹی ختم کردی تھی۔ اب عبدالشکور السلام اور چودھری محمد عارف سے میرا دفتری تعلق تو نہیں رہا تھا، لیکن ان سے میل جول کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا۔ وہ سپریم کورٹ کی ججی کے زمانے میں ملاقات کے لیے کئی دفعہ میرے دفتر ادارۂ ثقافت اسلامیہ بھی آئے۔ میرے گھر بھی تشریف لائے۔ میں بھی ان کے گھر یا دفتری اوقات کے بعد بارہا ان کے چیمبر میں گیا۔ ہر ملاقات میں دورانِ گفتگو گزشتہ دور کی یادیں تازہ کی جاتی تھیں۔

ڈاکٹر سخاء اللہ بھی کئی بار دفتر آئے اور مل کر چلے گئے۔ ڈاکٹر صاحب کی صاحب زادی سلیمہ خانم ریڈیو پاکستان لاہور میں پروڈیوسر تھیں۔ پھر پروگرام منیجر ہوئیں، مجھے بے شمار مرتبہ انھوں نے ریڈیو میں مختلف پروگرام کرنے کی دعوت دی اور میں نے پروگرام کیے۔

شاہ محمد جعفر پھلواروی کے بارے میں یہ عرض کردوں کہ وہ زبانی گفتگو میں شیعہ حضرات کے بعض مسائل سے شدید اختلاف کا اظہار کرتے تھے۔ ادارے سے ریٹائرمنٹ لے کر اپنے عزیزوں کے پاس کراچی چلے گئے تھے اور وہاں انھیں پاکستان سنّی کونسل کے صدر منتخب کرلیا

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

گیا تھا۔ رواتِ حدیث کے صحیح تلفظ میں اللہ نے انھیں بڑی معلومات سے نوازا تھا۔ اہل بیت اور بنواُمیہ کے مشترکہ ناموں سے بھی وہ خوب آگاہ تھے۔ ان کا مطالعہ وسیع تھا اور فن رجال سے انھیں خاص طور پر دلچسپی تھی۔

لیگل کمیٹی کی رکنیت سے مجھے ذاتی طور پر بہت فائدہ ہوا۔ ادارۂ ثقافت اسلامیہ کی لائبریری اس وقت تقریباً چودہ ہزار کتابوں پر مشتمل تھی۔ تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، ادبیات، لغات وغیرہ کی تقریباً تمام کتابیں موجود تھیں۔ میں نے اپنی سمجھ کے مطابق ان سے استفادہ کرنے کی کوشش کی۔ لائبریرین کا نام عبدالسلام تھا۔ تقسیم ملک سے قبل وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی لائبریری میں بہ طور لائبریرین خدمت سرانجام دیتے رہے تھے۔ انھوں نے لائبریری کا باقاعدہ کورس نہیں کیا تھا، لیکن اس فن میں مہارت رکھتے تھے۔ ان کا اُردو، انگریزی اور عربی کا خط بڑا صاف تھا۔ آزادی کے بعد پاکستان آئے تو کچھ عرصہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں کام کیا۔ ان سے کسی موضوع کی ایک کتاب مانگو تو کئی کتابیں سامنے رکھ دیتے تھے۔

مجھے ادارے کی لائبریری سے اس قدر تعلق پیدا ہو گیا تھا کہ اتنی کتابوں میں سے کارڈ دیکھے بغیر اپنی ضرورت کی کتاب الماری سے نکال لیتا۔ اپنی دلچسپی کے موضوع کی ہر کتاب کے متعلق مجھے معلوم تھا کہ کہاں پڑی ہے۔ مولانا محمد حنیف ندوی، رئیس احمد جعفری، شاہ محمد جعفر پھلواروی اور ادارے کے ڈائریکٹر بالعموم مجھے ہی کتاب لانے اور اپنے موضوع کی اصل عبارت نکالنے کے لیے کہتے۔ مجھے اس خدمت کی انجام دہی پر بڑی مسرت ہوتی، کیوں کہ یہ خدمت میرے لیے فائدے کا باعث اور معلومات میں اضافے کا ذریعہ تھی۔ میں چاہتا تھا کہ ادارے کا ہر رفیق مجھ سے یہ خدمت لے تاکہ اس کی وجہ سے میرے علم میں اضافہ ہو۔

اب ہماری زندگی کا ایک اور دور شروع ہوتا ہے جو پہلے تمام ادوار سے مختلف ہے۔ یہ ہے تصنیف و تالیف کا دور......!

۱۔ ترجمہ الفہرست:

ایک دن دس بجے کے قریب، مَیں اپنے کمرے میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ ادارے کے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ہیڈکلرک محمد منیر شیخ نے اطلاع دی کہ آپ کو میاں صاحب فون پر یاد کر رہے ہیں۔ میں نے کہا میاں صاحب تو تھوڑی دیر پہلے یہیں تھے، فون پر یاد کرنے کا کیا مطلب؟ انھوں نے جواب دیا کہ تقریباً آدھا گھنٹا ہوا وہ کہیں چلے گئے تھے، وہیں سے کسی سلسلے میں آپ کو فون کیا ہے۔

میں فون پر گیا تو آواز آئی: میں شریف بول رہا ہوں۔ کارپوریشن کے دفتر میں ایک صاحب کے کمرے میں بیٹھا ہوں۔ (ان کا نام غالباً میاں صاحب نے شیخ عبدالعزیز لیا تھا)

فرمایا: الفہرست کوئی کتاب ہے؟

عرض کیا: ہے۔

پوچھا: اس کے مصنف کا کیا نام ہے؟

میں نے بتایا: مصنف کا نام محمد بن اسحاق ابن ندیم الوراق ہے۔

بولے: کتاب کس زبان میں ہے؟

عرض کیا: عربی زبان میں۔

فرمایا: مصنف کس دور کا آدمی ہے؟

میں نے کہا: چوتھی صدی ہجری کا۔

اب سوال ہوا: اس کتاب کا کسی زبان میں ترجمہ ہوا ہے؟

جواب دیا: میرے خیال میں نہیں ہوا۔

فرمایا: یہ کتاب ہماری لائبریری میں ہے؟

جواب دیا: نہیں۔

فرمایا: کیا اس کا اُردو زبان میں ترجمہ ہوسکتا ہے؟

عرض کیا: اس سوال کا جواب تو کتاب اچھی طرح دیکھ کر ہی دیا جاسکتا ہے۔

بولے: کتاب کہیں سے حاصل کرو۔

دفتر سے چھٹی کے بعد میں لوہاری دروازے کے اندر شیخ مبارک علی کی دکان پر گیا۔ وہاں شیخ احمد علی بیٹھے تھے۔ ان کے پاس "الفہرست" مصر کی چھپی ہوئی موجود تھی۔ قیمت

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

پچیس روپے تھی۔ میں نے پچیس روپے ان کو دیے اور کتاب خرید لی۔ گھر جا کر کتاب ترجمے کے نقطۂ نظر سے دیکھی تو اندازہ ہوا کہ بہت مشکل ہے اور مختصر بھی ہے۔ کوئی بات وضاحت سے بیان نہیں کی گئی۔ دوسرے دن میں نے میاں شریف صاحب کو کتاب دکھائی اور اس کے مندرجات کے متعلق بتایا تو ارشاد ہوا کہ آج ہی سے اس کا اُردو ترجمہ شروع کر دو۔

میاں صاحب نے فرمایا کہ اس کتاب کے متعلق کارپوریشن کے دفتر میں ان سے کارپوریشن کے ایک بڑے اہل کار نے بات کی تھی اور کہا تھا کہ اس کتاب کا اُردو ترجمہ ہونا چاہیے۔

اب ''الفہرست'' کا مختصر الفاظ میں تعارف پڑھیے۔ اس کا مصنف چوتھی صدی ہجری کے اواخر میں ۳۹۰ ہجری کے پس و پیش بغداد میں فوت ہوا۔ کتاب اس کی زندگی تک کے تمام علوم و فنون کا مجموعہ اور اس دور کے تہذیبی و تمدنی سرمایۂ علمی کا آئینہ ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اس دور میں دنیا کے مختلف گوشوں میں کیا زبانیں رائج تھیں۔ ان کے کیا نمونے ہیں، کیا رسم الخط ہے، وہ کیوں کر معرضِ وجود میں آئیں اور قدیم دور کے مشہور خطاط اور کتّاب کون کون لوگ تھے۔

کتاب میں قرآنِ مجید کے نزول، اس کی جمع و تدوین، قراء، اختلاف قرأت، مفسرین اور مشہور کاتبینِ قرآن کے بارے میں بھی معلومات مہیا کی گئی ہیں۔ اسلام سے قبل کی امم و اقوام پر منزّل من اللہ کتب و صحف کے سلسلے کے بھی ضروری امور شامل کتاب ہیں۔ فصاحت و بلاغت، شعر و شاعری، اس کے تمام ادوار کی اہم تفصیلات، شعرائے دورِ جاہلیت اور شعرائے اسلام کے طبقات، دواوین شعرا، ان کے اشعار کی تعداد اور فصحا و بلغا سے متعلق بھی قارئین کو بہرہ مند کیا گیا ہے۔ علم نحو کی ابتدا، اس کی ضرورت و اہمیت، مشہور نحویوں اور اس موضوع سے متعلق کوفہ اور بصرہ کے اصحابِ نحو اور ان کی مصنفات کا بھی تذکرہ ہے۔ متکلمین معتزلہ و مرجئہ، ان کی کتابیں، جبریہ و حشویہ، خوارج اور ان کی کتابیں، زہاد و عباد اور ان کی تصنیفات کا بھی ذکر ہے۔

فقہائے حنفیہ، فقہائے شافعیہ، فقہائے مالکیہ، اصحاب الحدیث، اہل ظواہر، فقہائے شیعہ اور ان کے مختلف فرقے، مثلاً اسماعیلیہ، امامیہ، زیدیہ، فقہائے خوارج اور ان کی تصانیف

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کا بھی تذکرہ ہے۔ علم فلسفہ، اس سے مسلمانوں کی دلچسپیوں کا نقطۂ آغاز، فلاسفۂ یونان اور ان کی تصنیفات سے متعلق امور بھی شامل کتاب ہیں۔ طب کا آغاز، اطبا اور ان کی تصنیفات، جادوگر اور ان کی کتابیں، شعبدہ باز اور ان کی تصانیف، کیمیاگر اور ان کی تالیفات، ریاضی دان و مہندسین اور ان کی کتابیں، غرض تمام علوم وفنون کے متعلق بنیادی اور ضروری معلومات اس کتاب میں مندرج ہیں۔ مختلف مذاہب مثلاً مذاہب مزدک و بابک، مذاہب ہند اور مذاہب چین کے بارے میں بھی دلچسپ اور معلومات افزا تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ پھر ان عنوانات و مضامین سے متعلق جو کتاب کسی زبان سے عربی میں منتقل ہوئی، مصنف نے اس کا ذکر بھی کر دیا ہے اور یہ بھی بتا دیا کہ کس کتاب کا مترجم کون ہے اور کس نے اس کے کس حصے کا کس انداز سے ترجمہ کیا اور کس کی کوشش اور ایما سے کیا۔ نیز یہ کتاب کہاں سے حاصل کی گئی اور کس نے کی۔ یعنی بحث السنہ سے لے کر جادوگری و کیمیاگری اور مذاہب چین و ہند تک کی تفصیلات کتاب کے صفحات میں خوب صورتی کے ساتھ سمودی گئی ہیں اور کتب و مصنّفین کا پوری طرح احاطہ کیا گیا ہے۔ کتاب کی ان خصوصیات اور متنوع معلومات کی بنا پر مستشرقین نے اسے شائستۂ التفات گردانا اور اس کو خاص اہمیت دی۔ چناں چہ مشہور مستشرق فلوگل نے اس کو مرتب کیا اور اس کا یہ مرتب کردہ نسخہ بیروت سے شائع ہوا۔ پھر مصر سے کئی بار یہ کتاب شائع ہوئی۔

کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف وسیع النظر اور بے شمار معلومات کا حامل ہے۔ اس کی یہ کتاب کہنا چاہیے کہ دنیا کا پہلا کیٹلاگ اور فہرست کتب و مصنّفین ہے اور اس کو رجال و تصنیفات کے باب میں اوّلیں ماخذ کا درجہ حاصل ہے۔

مصنف نے استعمالِ الفاظ میں انتہائی اختصار سے کام لیا ہے اور طوالت و تفصیل سے دامن بچا کر رکھا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ متعدد مقامات پر عبارت کے مفہوم کو ذہن کی گرفت میں لانے اور مصنف کے مقصد کو سمجھنے میں سخت دشواری پیش آتی ہے۔

اس کتاب میں جن کتابوں کی تفصیلات دی گئی ہیں، ان کا بڑا حصہ اب نایاب ہے اور ان کے صرف نام باقی رہ گئے ہیں، کیوں کہ عالم اسلامی کئی بار انقلاب و تغیر کی زد میں آیا اور یہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کتابیں اس کی لپیٹ میں آ گئیں۔ بالخصوص فتنۂ تاتار کے دور میں اہل علم کی کاوشِ فکر کا بہت بڑا ذخیرہ دجلہ وفرات کی لہروں کی نذر ہو گیا۔ اگر یہ کتاب معرض تصنیف میں نہ آتی تو ہم اپنے اسلاف کے اس علمی ذخیرے کے ناموں سے بھی آگاہ نہ ہو سکتے۔ ان کے نام کو دوام بخشنے کا ذریعہ یہی کتاب ہے۔

میں نے ترجمے کے علاوہ کتاب کے بے شمار مقامات پر حواشی تحریر کیے ہیں، عربی اشعار کا ترجمہ کیا ہے اور قراء اور بہت سے دیگر حضرات کے (جن کے مصنف نے صرف نام لکھنے پر اکتفا کیا ہے) ضروری حالات لکھ دیے ہیں۔ علاوہ ازیں اشاریہ بھی بنا دیا ہے۔ اشاریہ اسمائے رجال، بلاد وامصار، قبائل اور ملوک ووزرا کا الگ الگ لکھا گیا ہے۔

ترجمے کی تکمیل اور کتابت وغیرہ کے بعد کتاب طباعت کے لیے پریس بھجوائی جا رہی تھی کہ ڈاکٹر جہاں گیر خاں (سابق ڈی پی آئی مغربی پاکستان اور ڈائریکٹر ریسرچ سوسائٹی پاکستان) نے اس کا فارسی ترجمہ عنایت کیا۔ میں نے اس سے کہیں کہیں استفادہ کیا ہے۔ انگریزی ترجمہ اس کے بہت بعد میں ملا جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔

ساڑھے نو سو (۹۵۰) صفحات کی یہ کتاب جون ۱۹۶۹ء میں ادارۂ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے شائع ہوئی۔

۲۔ برصغیر میں علم فقہ:

اس کتاب کی اشاعت کے بعد "برصغیر میں علم فقہ" کے نام سے کتاب لکھی۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ علم فقہ کیا ہے، برصغیر میں یہ علم کیسے پہنچا، برصغیر کے کس عالم دین نے اس موضوع پر سب سے پہلے کون سی کتاب لکھی۔ کس زمانے میں لکھی، کس زبان میں لکھی۔ کتاب میں کن کن معاملات کو کس انداز میں موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ (عبادات کا میں نے ذکر نہیں کیا) صرف معاملات یعنی نکاح، طلاق، تجارت، وکالت، کفالت وغیرہ امور کا تذکرہ کیا ہے۔ فقہ کی یہ گیارہ کتابیں ہیں، جن میں دو مطبوعہ ہیں۔ باقی غیر مطبوعہ ہیں۔ ان میں سے بعض کتابیں عربی زبان میں ہیں اور بعض فارسی میں۔ یہ تمام کتابیں پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

موجود ہیں۔ میں نے لائبریری میں بیٹھ کر اپنی کتاب (برصغیر میں علم فقہ) مکمل کی۔ معاملات سے متعلق جس مسئلے کا ذکر کیا ہے، قلمی کتاب سے اس کی اصل عبارت (عربی یا فارسی) نقل کی ہے اور پھر اس کا اُردو ترجمہ کیا ہے۔

۳۸۴ صفحات کی یہ کتاب جون ۱۹۷۳ء میں ادارۂ ثقافت اسلامیہ نے شائع کی۔

اپنے موضوع کی یہ پہلی کتاب ہے جو اس فقیر نے لکھی۔ چند فقہی مسائل پر بحث کرنا آسان ہے۔ اس قسم کی تاریخی تحقیق کرنا نہایت مشکل ہے۔ یہ ان لوگوں کے بس کا کام نہیں جو حضرت، حضرت کہلانے کے عادی ہیں۔ ان دنوں یہ کتاب اور بہتر اسلوب میں ''کتاب سرائے'' لاہور سے شائع ہو چکی ہے۔

یہ کتاب چھپ چکی تو اس کے بعد سپریم کورٹ آف پاکستان کے چیف جسٹس ایس اے رحمان مرحوم کے مشورے سے (جو ادارۂ ثقافت اسلامیہ کی مجلس منتظمہ کے رکن تھے) فقہائے ہند کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ کتاب ہجری سنین کی ترتیب سے دس جلدوں پر مشتمل ہے اور اس کی تفصیل اس طرح ہے۔

۳۔ فقہائے ہند جلد اوّل: پہلی صدی ہجری سے آٹھویں صدی ہجری تک۔ صفحات ۳۲۸۔ طبع ۱۹۷۴ء۔

۴۔ فقہائے ہند جلد دوم: نویں صدی ہجری۔ صفحات ۲۶۴۔ طبع ۱۹۷۵ء

۵۔ فقہائے ہند جلد سوم: دسویں صدی ہجری۔ صفحات ۴۰۰۔ طبع ۱۹۷۶ء

۶۔ فقہائے ہند جلد چہارم، حصہ اوّل: گیارھویں صدی ہجری۔ صفحات ۲۸۰۔ طبع ۱۹۷۷ء۔

۷۔ فقہائے ہند جلد چہارم، حصہ دوم: گیارھویں صدی ہجری۔ صفحات ۴۱۶۔ طبع ۱۹۷۸ء۔

۸۔ فقہائے ہند جلد پنجم، حصہ اوّل: بارھویں صدی ہجری۔ صفحات ۳۵۲۔ طبع ۱۹۷۹ء۔

۹۔ فقہائے ہند جلد پنجم، حصہ دوم: بارھویں صدی ہجری۔ صفحات ۴۲۸۔ طبع ۱۹۸۱ء۔

۱۰۔ فقہائے پاک و ہند، جلد اوّل: تیرھویں صدی ہجری۔ صفحات ۳۴۴۔ طبع ۱۹۸۲ء۔

۱۱۔ فقہائے پاک و ہند، جلد دوم: تیرھویں صدی ہجری۔ صفحات ۲۷۰۔ طبع ۱۹۸۴ء۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

۱۲۔ فقہائے پاک و ہند، جلد سوم: تیرھویں صدی ہجری۔ صفحات ۴۵۲۔ طبع ۱۹۸۹ء۔

پہلی صدی ہجری سے تیرھویں صدی ہجری تک فقہائے ہند کی یہ دس جلدیں ہوئیں۔ اپنے موضوع کی یہ اوّلیں کتاب ہے جو برصغیر کے علما و فقہا کے حالات میں اُردو میں لکھی گئی۔ ان دنوں یہ عظیم فقہی موسوعہ مکتبہ نشریات، لاہور سے شائع ہو رہا ہے۔

ہر جلد کے مقدمے میں برصغیر کے اس دور کے حکمرانوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، جس دور کے فقہا و علما کے حالات و کوائف پر وہ جلد مشتمل ہے۔ مقدمے میں بتایا گیا ہے کہ یہ حکمران اپنے عہد کے اہل علم سے کس قسم کے تعلقات رکھتے تھے اور ان کے باہمی میل جول اور روابط کا کیا انداز تھا۔ اس طرح برصغیر کے غزنوی، خلجی، تغلق، لودھی، مغل اور سوری وغیرہ حکمران خاندانوں کے ہر حکمران کا الگ الگ ضروری تفصیل سے ذکر آ گیا ہے۔ برصغیر کے علاقائی حکمرانوں کے بارے میں بھی بہت سی تفصیلات بیان کر دی گئی ہیں۔ مثلاً حیدر آباد دکن، موجودہ ہندوستانی گجرات، سندھ، مالوہ، کشمیر اور ملتان وغیرہ کے علاقوں میں مختلف اوقات میں مسلمانوں کی جو حکومتیں رہیں، ان کے متعلق ضروری باتیں ''فقہائے ہند'' کے مقدمات میں مناسب الفاظ میں مرقوم ہیں۔ اس طرح یہ ضخیم کتاب جہاں پہلی صدی ہجری سے لے کر تیرھویں صدی ہجری تک یعنی برصغیر کے بارہ تیرہ سو سال کے اصحابِ علم سے متعارف کراتی ہے، وہاں تقریباً ایک ہزار سال کی مختلف حکومتوں اور ان کے حکمرانوں کے واقعات سے بھی قاری کو باخبر کرنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ دس جلدوں کے یہ طویل مقدمات برصغیر کے مسلمان حکمرانوں کی مستقل تاریخ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر یہ کتاب برصغیر کے اصحابِ علم کی تاریخ بھی ہے اور اہل حکومت کی بھی۔!

۱۳۔ برصغیر میں اسلام کے اوّلیں نقوش:۔ اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ برصغیر میں ۱۵ ہجری میں خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں اسلام آ گیا تھا۔ وہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا زمانہ تھا۔ چناں چہ اس خطۂ ارض میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے لے کر مختلف اوقات میں پچیس صحابہ، بیالیس تابعین اور اٹھارہ تبع تابعین تشریف

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

لائے۔ ۲۲۴ صفحات کی یہ کتاب ۱۹۸۹ء میں ادارۂ ثقافت اسلامیہ نے شائع کی۔

۱۴۔ ارمغانِ حنیف:۔ علم و تحقیق اور زبان و اسلوب کے اعتبار سے مَیں جن حضرات سے بہت متاثر ہوا، ان میں مولانا محمد حنیف ندوی کا اسم گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ مولانا ممدوح ۱۰؍ جون ۱۹۰۸ء کو گوجراں والا میں پیدا ہوئے اور ۱۲؍ جولائی ۱۹۸۷ء کو لاہور میں ان کا انتقال ہوا۔ میں نے ان کے حالات میں مختلف اوقات میں کئی مضامین لکھے جو بعض رسائل و جرائد میں شائع ہوئے۔ ان کے حالات میں ''ارمغانِ حنیف'' کے نام سے ایک مستقل کتاب بھی تالیف کی جو ۱۷۳ صفحات میں پھیلی ہوئی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۸۹ء میں ادارۂ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے معرضِ اشاعت میں آئی۔

سلسلۂ فقہائے ہند کی دس جلدوں کو الگ الگ شمار کیا جائے تو یہ کل چودہ کتابیں ہوئیں، جو مَیں نے ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے لیے لکھیں اور ادارے کی طرف سے شائع ہوئیں۔ ان کتابوں کے یہ ۵۴۶۱ صفحات ہوئے۔ www.KitaboSunnat.com

میں ۲۱ ؍ اکتوبر ۱۹۶۵ء کو جب ادارے سے وابستہ ہوا، اس وقت اس کا ماہنامہ مجلّہ ''ثقافت'' کے نام سے شائع ہوتا تھا۔ اس کے ایڈیٹر رئیس احمد جعفری مرحوم تھے۔ یہ مجلّہ جو جنوری ۱۹۵۵ء میں جاری ہوا تھا، ۱۹۶۷ء کے آخر تک جاری رہا۔ ۱۹۶۷ء میں ادارے کے ڈائریکٹر شیخ محمد اکرام کی تجویز سے اس کا نام ''المعارف'' رکھا گیا۔ المعارف کی ادارت بھی کچھ عرصہ رئیس احمد جعفری کے سپرد رہی۔ پھر اس کے ایڈیٹر شاہد حسین رزاقی کو بنا دیا گیا۔ کچھ مدت انھوں نے یہ خدمت انجام دی۔ دو سال پروفیسر محمد سرور جامعی اس کے ایڈیٹر رہے۔ بعد ازاں مجھے اس کا ایڈیٹر مقرر کر دیا گیا۔ میں ''ثقافت'' میں بھی مضمون لکھتا رہا اور مختلف ایڈیٹروں کے زمانے میں ''المعارف'' میں بھی میرے مضامین کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہا۔ پھر مجھے اس کا ایڈیٹر بنا دیا گیا۔ میری ایڈیٹری کی مدت بائیس سال پر مشتمل ہے۔ اس اثنا میں مَیں اداریے بھی لکھتا رہا، مضامین بھی لکھتا رہا، کتابوں پر تبصرے بھی کرتا رہا اور ''ایک حدیث'' کے عنوان سے بھی ہر شمارے میں میرا مضمون باقاعدگی سے چھپتا رہا۔ اس طرح ''المعارف''

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کے مضامین زیادہ نہیں تو تین ہزار صفحات کے پس و پیش ضرور ہوں گے۔اس میں خالص تحقیقی مقالات (Research Articles) شائع کیے جاتے تھے۔

''المعارف'' جنوری ۱۹۶۸ء کو جاری کیا گیا تھا۔ اس وقت پاکستان کے قیام پر بیس سال گزر چکے تھے اور ''المعارف'' کا پہلا شمارہ بیس سالہ نمبر تھا، جس میں پاکستانی ثقافت، پاکستانی صحافت، پاکستان کے تصنیفی ادارے اور علمی مراکز وغیرہ کا تذکرہ کیا گیا تھا۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ڈائریکٹر شیخ محمد اکرام نے اس کے لیے مضامین جمع کرنے، مقالہ نگاروں سے رابطہ کرنے اور اس شمارے کو مرتب کرنے کی ذمہ داری میرے سپرد کی تھی اور میں نے نہایت محنت سے یہ شمارہ مرتب کیا تھا۔

علاوہ ازیں میں نے مندرجہ ذیل پانچ کتابوں کی ایڈیٹنگ کی جو ادارۂ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے شائع ہوئیں۔ ان میں سے بعض پر مقدمے لکھے۔

۱۔ اُردو نثر کے ارتقا میں علماء کا حصہ: یہ ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے، جس میں شمالی ہند کے علمائے کرام کی ۱۸۵۷ء تک کی ان خدمات کا تذکرہ کیا گیا ہے جو انھوں نے اُردو زبان میں سرانجام دیں۔ ان علماء کے حالات بھی تحریر کیے گئے ہیں۔ یہ مقالہ میں نے ایڈٹ کیا اور اس پر مقدمہ لکھا، اور ادارۂ ثقافت اسلامیہ نے اسے کتابی شکل میں شائع کیا۔ یہ نہایت محنت طلب کام تھا۔ ۶۸۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ۱۹۸۸ء میں طباعت کی منزل سے گزری۔

۲۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور ان کی علمی خدمات: یہ مرحومہ ڈاکٹر ثریا ڈار (سابق چیئر پرسن شعبہ عربی اسلامیہ یونیورسٹی۔ بہاول پور) کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے، جو میں نے ایڈٹ کیا۔ اس کی فارسی اور عربی عبارتوں کا ترجمہ کیا اور اس پر مقدمہ لکھا۔ ۳۶۵ صفحات کا یہ مقالہ ۱۹۹۱ء میں ادارۂ ثقافت اسلامیہ نے شائع کیا۔

۳۔ شروح صحیح بخاری: یہ مرحوم پروفیسر عبدالقیوم (متوفی ۸ر ستمبر ۱۹۸۹ء) کی صاحب زادی محترمہ غزالہ حامد کا ایم اے کا مقالہ ہے، جس کی مَیں نے ایڈیٹنگ کی۔ اس کی فارسی اور

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

عربی عبارتوں کا ترجمہ کیا۔ اس پر مقدمہ لکھا، جس میں ان متعدد شروحِ صحیح بخاری کا تذکرہ کیا، جن کا محترمہ مقالہ نگار نے نہیں کیا تھا۔ ۱۷۵ صفحات کا یہ مقالہ ۱۹۹۱ء میں کتابی صورت میں ادارۂ ثقافت اسلامیہ نے شائع کیا۔

۴۔ پیغمبر انسانیت: نبی کریم ﷺ کی سیرتِ طیبہ پر یہ کتاب شاہ محمد جعفر پھلواروی کی تصنیف ہے۔ اس کی ایڈیٹنگ اور عربی عبارتوں کے ترجمے کی ذمہ داری مجھ پر عائد کی گئی تھی۔ ۵۵۰ صفحات کی یہ کتاب ۱۹۷۳ء میں طبع ہوئی۔

۵۔ فقہ عمر:۔ ملک ابویحییٰ امام خاں نوشہروی کا ترجمہ، نظر ثانی اور ایڈیٹنگ کا کام میرے سپرد ہوا۔ ۴۰۰ سے زائد صفحات کی یہ کتاب ۱۹۷۵ء میں طبع کی گئی۔

یہاں ادارہ ثقافت اسلامیہ کے بارے میں چند باتیں سنیے۔ ادارہ فروری ۱۹۵۰ء میں قائم ہوا تھا۔ اس کے پہلے اور بانی ڈائریکٹر خلیفہ عبدالحکیم تھے۔ میں ان کے زمانے میں ادارے جاتا اور ان کی باتیں سنتا رہا ہوں۔ اس وقت میں ہفت روزہ ''الاعتصام'' کی ادارت کا فریضہ سرانجام دیتا تھا۔ خلیفہ صاحب نے ۳۰ جنوری ۱۹۵۹ء کو وفات پائی۔

ان کے بعد میاں محمد شریف (ایم ایم شریف) کو ڈائریکٹر بنایا گیا۔ ۱۱ دسمبر ۱۹۶۵ء کی درمیانی شب کو ان کا انتقال ہوا۔

پھر یکم جولائی ۱۹۶۶ء کو ڈاکٹر شیخ محمد اکرام نے یہ منصب سنبھالا۔ ان کا سانحہ ارتحال ۱۶ جنوری ۱۹۷۳ء کو پیش آیا۔

۲۷۔ اپریل ۱۹۷۳ء کو پروفیسر محمد سعید شیخ اس کے ڈائریکٹر مقرر کیے گئے۔ مئی ۱۹۸۴ء تک وہ اس کے منصب ڈائریکٹری پر متعین رہے۔ انھوں نے مئی ۲۰۰۲ء میں سفر آخرت اختیار کیا۔

مئی ۱۹۸۴ء میں سراج منیر کو ادارے کا منصب ڈائریکٹری سونپا گیا۔ وہ ۴۔ نومبر ۱۹۵۱ء کو پیدا اور ۲۵۔ ستمبر ۱۹۹۰ء کو راہی ملک بقا ہوئے۔ انھوں نے صرف ۳۹ سال عمر پائی اور تقریباً چھ سال ادارے کے ڈائریکٹر رہے۔

ان کے بعد سہیل عمر صاحب کو ڈائریکٹر بنایا گیا۔ اس سے قبل وہ اقبال اکیڈمی کے ڈپٹی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ڈائریکٹر تھے۔ وہ تھوڑا عرصہ ہی ادارے کے ڈائریکٹر رہے۔ پھر ڈائریکٹر جنرل کی حیثیت سے اقبال اکیڈمی میں چلے گئے۔ اب بھی وہیں ہیں۔

ان کے بعد اس عہدے پر ڈاکٹر رشید احمد جالندھری کو فائز کیا گیا۔

میں نے مذکورہ بالا تمام ڈائریکٹروں کے زمانے میں بطور ریسرچ فیلو تصنیفی خدمات سرانجام دیں اور میرے ان سب کے ساتھ نہایت خوش گوار تعلقات قائم رہے۔ نہ مجھ سے کسی کو شکایت پیدا ہوئی اور نہ میں نے کبھی کسی کا شکوہ کیا۔ میں سب سے خوش رہا اور سب کو دعا دیتا ہوں۔ ادارے کے جن سکالروں اور مصنفوں کے ساتھ مجھے تصنیفی خدمات انجام دینے کا موقع ملا، وہ تھے مولانا محمد حنیف ندوی، شاہ محمد جعفر پھلواروی، رئیس احمد جعفری، بشیر احمد ڈار (بی اے ڈار) پروفیسر محمد سرور جامعی اور شاہد حسین رزاقی۔ ان حضرات سے بھی میرے بہت اچھے مراسم رہے۔

ادارہ ثقافت اسلامیہ کے متصل مجلس ترقی اُردو کا دفتر ہے جس کے ڈائریکٹر احمد ندیم قاسمی تھے۔ وہیں بزم اقبال کا دفتر ہے۔ اس کے ڈائریکٹر ڈاکٹر وحید قریشی تھے۔ ان دونوں سے بھی میرا سلسلہ علائق قائم تھا۔

ڈاکٹر رشید احمد جالندھری اور سہیل عمر صاحب کے سوا تمام حضرات اپنی اپنی باری سے اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے ہیں۔ اِنا للّٰہ و انا الیہ راجعون.

ادارۂ ثقافت اسلامیہ میں مَیں نے اور بھی علمی اور تحقیقی کام کیے۔ بتیس سال خدمات سرانجام دینے کے بعد ۱۶ر مارچ ۱۹۹۶ء کو ادارے سے علیحدگی اختیار کی۔

۸ر مارچ ۲۰۰۸ء — لاہور

❀❀❀❀

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

چودھواں باب:

ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے علاوہ قلمی خدمات

ادارۂ ثقافت اسلامیہ سے علیحدگی کے بعد بھی اللہ کے فضل سے میرا سلسلۂ تصنیف و تالیف جاری رہا اور میں نے کوشش کی کہ میرا قلم متحرک رہے۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے مجھے توفیق بخشی اور میں اپنی تھوڑی بہت علمی استعداد کے مطابق مصروفِ کار رہا اور مصروف کار ہوں۔ جو خدمات میں نے ادارۂ ثقافت اسلامیہ کی ملازمت کے دوران میں یا اس کے بعد کسی ادارے کے لیے سرانجام دیں، ان کی تفصیل ذیل میں ملاحظہ فرمایے۔

ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے علاوہ اُردو دائرۂ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی کے لیے میں نے تیس بتیس مقالے لکھے، جو اس کی مختلف جلدوں میں چھپے۔ ان مقالوں میں مندرجہ ذیل مقالے شامل ہیں۔

۱: جمع و تدوین قرآن ...... طبع ۱۹۷۶ء

۲: فضائل قرآن ...... طبع ۱۹۷۶ء

۳: مضامین قرآن ...... طبع ۱۹۷۶ء

۴: واقعات و قصص قرآن ...... طبع ۱۹۷۶ء

۵: حافظ محمد لکھوی ...... مصنف تفسیر محمدی و شارح ابوداؤد و مشکوٰۃ شریف وغیرہ۔ بہت سی کتابوں کے مصنف۔ وفات ستمبر ۱۸۹۳ء

۶: شیخ محمد بن عبدالوہاب ...... مصنف کتاب التوحید وغیرہ۔ ولادت ۱۱۱۵ھ (۱۷۰۳ء) وفات ماہ شوال یا ذیقعدہ ۱۲۰۶ھ (جون یا جولائی ۱۷۹۲ء)

۷: مولانا ثناء اللہ امرتسری ...... مصنف تفسیر ثنائی و تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن اور دیگر بہت سی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کتابوں کے مصنف۔ وفات ۱۵/ مارچ ۱۹۴۸ء۔

۸: مولانا محمد حنیف ندوی ...... مصنف تفسیر سراج البیان اور متعدد دیگر کتب۔ وفات ۱۲/ جولائی ۱۹۸۷ء۔

۹: سیّد ابوبکر غزنوی ...... متعدد کتابوں کے مصنف۔ وفات ۲۴۔ اپریل ۱۹۷۶ء۔

۱۰: مرتبین فتاویٰ عالم گیری ...... اس موضوع پر ایک مقالہ بزمی انصاری کا اور ایک میرا چھپا۔

۱۱: المنافقون ...... یہ ایک طویل مقالہ ہے۔

۱۲: پہلی مسجد ...... اسلام کے بعد پہلی مسجد جو مکہ مکرمہ میں بنائی گئی۔ یہ مقالہ بھی اُردو دائرۂ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی میں چھپا۔

۱۳: الملائکہ ...... یعنی فرشتوں کے بارے میں مقالہ۔ شائع شدہ اُردو دائرۂ معارف اسلامیہ۔

مندرجہ ذیل کتابوں میں سے ایک کتاب ادارۂ ثقافت اسلامیہ کی ملازمت کے دوران میں لکھی اور باقی ادارے سے علیحدگی کے بعد لکھیں۔

۱۔ قصوری خاندان : ...... اس کتاب کا تعلق شخصیات سے ہے، جس میں مولانا عبدالقادر قصوری اور ان کے فرزندانِ گرامی (مولانا محی الدین احمد قصوری، مولانا محمد علی ایم اے کینٹب قصوری، مولانا احمد علی قصوری، میاں محمود علی قصوری بار ایٹ لا اور دیگر افرادِ خاندان) کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب بہت سے سیاسی اور علمی معاملات پر مشتمل ہے جو ہمارے مرحوم دوست قاضی محمد اسلم سیف نے مکتبہ تعلیمات اسلامیہ (ماموں کانجن، ضلع فیصل آباد) کی طرف سے ۱۹۹۴ء میں شائع کی۔ صفحات ۲۰۸۔ اس کتاب کی طباعت کے وقت میں ادارۂ ثقافت اسلامیہ میں خدمات سرانجام دیتا تھا۔

اس کے بعد ذیل کی تمام کتابیں ادارے سے علیحدگی کے بعد تصنیف کیں۔

۲۔ لسان القرآن (جلد سوم): ...... مولانا محمد حنیف ندوی نے وفات سے کچھ عرصہ قبل حروفِ تہجی کی ترتیب سے قرآن کے توضیحی لغت کے موضوع پر "لسان القرآن" کے نام سے کتاب لکھنا شروع کی تھی۔ کتاب حرفِ الف سے لے کر حرف دال (دین) تک پہنچی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

تھی کہ مولانا وفات پا گئے۔ آٹھ حروف تہجی سے متعلق یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل تھی اور صفحات تقریباً آٹھ سو تھے۔ مولانا کی وفات کے بعد بعض دوستوں کے کہنے پر میں نے اس سے آگے حرفِ ذال سے سلسلہ شروع کیا، جس کے تین حروف (ذال، را، زا) ۳۳۲ صفحات پر محیط ہیں۔ یہ کتاب لسان القرآن جلد سوم کے نام سے مولانا محمد حنیف ندوی کی دو جلدوں کے ساتھ علم و عرفان پبلشرز، اُردو بازار لاہور نے ۱۹۹۶ء میں شائع کی۔

۔ نقوش عظمت رفتہ :...... اس کتاب میں برصغیر کی اکیس مشہور شخصیات کا تفصیل سے تذکرہ کیا گیا ہے۔ ۶۴۰ صفحات کی یہ کتاب مکتبہ قدوسیہ، اُردو بازار لاہور نے ۱۹۹۶ء میں شائع کی۔

ا۔ میاں فضل حق اور ان کی خدمات :...... ۲۴۳ صفحات کی یہ کتاب ۱۹۹۷ء میں چھپی۔

ا۔ چہرۂ نبوت قرآن کے آئینے میں :...... اس خوب صورت عنوان سے مولانا محمد حنیف ندوی نے میرے زمانۂ ادارت میں ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں سلسلۂ مضمون شروع کیا تھا۔ اس کا مطلب عنوان سے ظاہر ہے، یعنی قرآن کی روشنی میں نبی کریم ﷺ کی سیرتِ طیبہ۔ یہ مضمون الاعتصام کی بہت سی قسطوں میں پھیلا ہوا ہے۔ لیکن نامکمل ہے۔ مولانا سے بارہا اس کی تکمیل کے لیے عرض کیا گیا۔ وہ بھی کئی دفعہ اس پر آمادہ ہوئے، لیکن افسوس ہے کوشش اور ارادے کے باوجود یہ مرحلہ طے نہ ہوسکا اور وہ وفات پا گئے۔ جہاں انھوں نے کام چھوڑا تھا، ان کی وفات کے بعد وہاں سے مَیں نے کام کا آغاز کیا۔ ان کے متعلق تو سب کو معلوم ہے کہ قرآن پر ان کی نظر بہت عمیق تھی، تاہم کسی نہ کسی طرح کتاب مکمل ہوگئی، جو علم و عرفان پبلشرز، اُردو بازار لاہور نے ۱۹۹۹ء میں شائع کی۔ کتاب ۳۲۶ صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے، جس میں قرآن کی روشنی میں نبی ﷺ کی سیرت پاک کو معرضِ بیان میں لایا گیا ہے۔

۶۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ :...... حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حالات میں محمد حسین ہیکل مصری کی ضخیم عربی کتاب کا اُردو ترجمہ۔ صفحات ۶۲۰۔ طبع ۱۹۹۸ء۔ ناشر الفیصل، اُردو بازار،

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

لاہور۔

۷۔ بزمِ ارجمنداں :...... یہ برصغیر کی انیس شخصیات کا مجموعہ ہے، جس میں مرحومین کے ساتھ چند موجودین کے حالات بھی بیان کیے گئے ہیں۔ ۶۳۰ صفحات کی یہ کتاب ۱۹۹۹ء میں مکتبہ قدوسیہ، اُردو بازار، لاہور نے شائع کی۔

۸۔ کاروانِ سلف :...... یہ کتاب برصغیر کے بائیس ممتاز اصحابِ علم کے کوائف حیات کا مجموعہ ہے۔ یہ سب حضرات وفات پا چکے ہیں۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔ صفحات ۵۲۷۔ طبع ۱۹۹۹ء۔ ناشر مکتبہ اسلامیہ، فیصل آباد۔ اُردو بازار، لاہور۔

۹۔ اسلام کی بیٹیاں :...... ازواجِ مطہرات، صحابیات، تابعات، ہندوستان کے مغل دور اور مختلف ملکوں کی بہت سی خواتین کے حالات پر مشتمل کتاب۔ صفحات ۶۵۰۔ طبع ۲۰۰۰ء۔ ناشر مکتبہ قدوسیہ، اُردو بازار، لاہور۔

۱۰۔ لشکر اُسامہ کی روانگی :...... ڈاکٹر فضل الٰہی کی عربی کتاب جیش اُسامہ کا اُردو ترجمہ۔ صفحات ۱۲۶۔ طبع ۲۰۰۰ء۔ ناشر مکتبہ قدوسیہ، اُردو بازار، لاہور۔

۱۱۔ قافلۂ حدیث :...... اس میں پاکستان اور ہندوستان کے چھبیس نامور اہل حدیث علمائے کرام کے سوانح حیات بیان کیے گئے ہیں۔ کتاب ۶۴۵ صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ۲۰۰۳ء میں مکتبہ قدوسیہ، اُردو بازار، لاہور نے شائع کی۔ پروفیسر عبدالجبار شاکر نے اس پر نہایت خوب صورت فلیپ لکھا۔

۱۲۔ ریاض الصالحین :...... یہ حدیث کی مشہور کتاب ہے۔ جو دو ضخیم جلدوں پر مشتمل مصنف ہیں امام یحییٰ بن شرف نووی (متوفی ۶۷۶) پہلی جلد کا ترجمہ و حواشی ۴۵۹ صفحات پر اور دوسری جلد کا ۴۱۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ کل صفحات ۸۷۰۔ طبع لاہور۔

۱۳۔ برصغیر میں اہل حدیث کی آمد:...... اس کتاب میں اہل حدیث کی قدامت ثابت کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اہل حدیث ابتدائی دور اسلام ہی میں برصغیر میں آ گئے تھے۔ اس ضمن میں راویانِ حدیث اور کتب رجال کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ فقہی مذاہب کی تاریخ

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

اوران کے عالم وجود میں آنے کے اسباب کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔ تدوین فقہ کی بحث بھی اس میں آ گئی ہے۔ اہل حدیث اور اہل الرائے کے سلسلے کی ضروری باتیں بھی کتاب میں مذکور ہیں۔ مسئلہ تقلید پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور اس باب میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا نقطۂ نظر واضح کیا گیا ہے۔ کتاب میں اور بھی بہت سے مباحث آ گئے ہیں۔ یہ کتاب ۲۰۰۴ء میں مکتبہ قدوسیہ، اُردو بازار، لاہور نے شائع کی۔ صفحات ۳۴۸۔

۔ صوفی محمد عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ :...... اس کتاب میں صوفی محمد عبداللہ مرحوم و مغفور (بانی دارالعلوم اوڈاں والا اور ماموں کانجن) کی ابتدائی زندگی، خاندانی پس منظر، جماعت مجاہدین کی تاریخ اور اس کے مختلف ادوار۔ صوفی صاحب کی اس جماعت میں شمولیت اور جہادی تگ و تاز۔ اس سلسلے میں انھیں انگریزی حکومت کی طرف سے جن مصائب میں مبتلا کیا گیا، اس کی تفصیل۔ ان کے وظائف و اوراد۔ ان کی تقویٰ شعاری، ان کی قبولیت دعا کے حیرت انگیز واقعات۔ ان کے مدارس کے معاونین و اساتذہ کے حالات وغیرہ تمام امور تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہ کتاب ساڑھے تین سو صفحات میں کمپوز ہوگئی تھی اور ں طباعت کے لیے اسے ناشر کے حوالے کرنے والا تھا کہ کمپوز شدہ کتاب مولانا عبدالقادر روی سے گم ہوگئی، میں نے ان کو کتاب اس لیے دی تھی کہ ان کا تعلق اوڈاں والا اور ماموں کانجن کے مدارس سے رہا ہے اور اس سلسلے میں صوفی صاحب کی سرگرمیوں سے وہ مجھ سے یادہ واقفیت رکھتے ہیں، اس لیے چھپنے سے پہلے کتاب دیکھ لیں، تاکہ کہیں حک و اضافہ کی ضرورت ہوتو کرلیا جائے۔ یہ مئی ۲۰۰۳ء کی بات ہے۔ لیکن انھوں نے کتاب کہیں رکھی، پھر بھول گئے اور کتاب نہ ملی۔ کمپیوٹر سے بھی ضائع ہوگئی، جس کا علم مجھے جولائی ۲۰۰۳ء کے آخر میں ہوا۔ یہ صورتِ حال ظاہر ہے میرے لیے سخت پریشانی کا باعث تھی۔ سوچ رہا تھا کہ اب کیا کیا جائے۔ صبح کا وقت تھا۔ اتنے میں روزنامہ ''جنگ'' آیا۔ جنگ میں جناب ہارون الرشید کا

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کالم پڑھا۔ وہ صوفی صاحب کے معتقدین میں سے ہیں۔ انھوں نے اپنے کالم میں اتفاق سے صوفی صاحب کا تذکرہ کیا تھا اور لکھا تھا کہ صوفی صاحب کے مفصل حالات ''ممتاز مصنف'' اسحاق بھٹی صاحب لکھ رہے ہیں، لیکن ''ممتاز مصنف'' کے پاس اس وقت کچھ بھی نہ تھا اور وہ سخت پریشان تھا۔

جناب ہارون الرشید کا یہ کالم پڑھ کر میں نے سوچا کہ پہلی کتاب جو گم ہوگئی ہے، اسے بھول جانا چاہیے اور اب دوبارہ یہ سلسلہ شروع کرنا چاہیے اور اسی سلسلے کو پہلا سلسلہ سمجھنا چاہیے۔ چناں چہ میں اسی وقت قلم اور کاغذ لے کر بیٹھ گیا۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ کتاب بہت جلد مکمل کر لی گئی۔ پہلی کتاب ساڑھے تین سو صفحات کی تھی، دوبارہ لکھنا شروع کی تو ۴۴۶ صفحات میں پھیل گئی۔ یہ کتاب ۲۰۰۶ء میں مکتبہ سلفیہ، شیش محل روڈ، لاہور نے شائع کی۔ اللہ نے کرم فرمایا کہ کتاب کی دوبارہ تصنیف میں تاخیر نہیں ہوئی۔

۱۵۔ برصغیر کے اہل حدیث خدامِ قرآن:...... اس کتاب میں برصغیر پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش کے ان اہل حدیث حضرات کا تذکرہ کیا گیا ہے، جنھوں نے کسی بھی زبان (عربی، انگریزی، ہندی، اُردو، بنگلہ، پشتو، سندھی، بلوچی، پنجابی، سرائیکی) میں قرآنِ مجید کا ترجمہ کیا یا اس کی تفسیر لکھی یا اس موضوع پر کوئی قابل ذکر کام کیا۔ ان بزرگانِ عالی ہمت کی ان تین ملکوں میں تعداد تو بہت ہوگی، لیکن میری معلومات کی رسائی ۱۸۵ حضرات تک ہوسکی ہے۔ یہ بہت مشکل اور اہم خدمت تھی، جس کی انجام دہی کی ہمت اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص کرم سے اس فقیر کو بخشی۔ میں نے اس کتاب میں ہر خادم قرآن کے حالات بھی (مفصل یا مختصر) لکھے ہیں اور ان کی خدمت قرآن کی نوعیت بھی بیان کی ہے۔ یہ کتاب مکتبہ قدوسیہ، اُردو بازار، لاہور نے ۲۰۰۵ء میں شائع کی۔ صفحات ۶۹۶۔

۱۶۔ میاں عبدالعزیز مالواڈہ:...... کسی زمانے کے برصغیر کی معروف اور بڑی شخصیتوں میں سے ایک شخصیت میاں عبدالعزیز بار ایٹ لا مالواڈہ کی تھی، جو عمل وحرکت کے بہت سے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

میدانوں میں قدم زن ہوئے۔ وہ ۱۹/ اگست ۱۸۷۲ء کو پیدا ہوئے اور ۲۸/ جولائی ۱۹۷۱ء کو انھوں نے سفر آخرت اختیار کیا۔ وہ پوری ایک صدی کی سیاسی، قانونی اور سماجی تاریخ تھے۔ مسلکاً اہل حدیث تھے، ان کی سرگرمیوں کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ ان کے حالات میں اس فقیر نے ''میاں عبدالعزیز مالواڈہ'' کے نام سے کتاب لکھی، جو ان کی زندگی کے ہر پہلو کو اپنے دامن اوراق میں لیے ہوئے ہے۔ یہ کتاب ۵۹۲ صفحات پر محیط ہے اور مکتبہ نشریات، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور نے شائع کی ہے۔ مشہور سکالر پروفیسر عبدالجبار شاکر نے اس پر طویل مقدمہ تحریر کیا ہے۔ یہ کتاب ۲۰۰۶ء میں چھپی۔

۱۷۔ تذکرہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری:...... تقریباً بیس برس پہلے کی بات ہے کہ میں نے حضرت علامہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری کے بڑے پوتے قاضی عبدالباقی (مرحوم) سے عرض کیا کہ قاضی صاحب کے حالات میں کتاب لکھنی چاہیے۔ انھوں نے اس سے اتفاق کیا اور میں نے لکھنا شروع کر دیا۔ کمپوز کرنے کے بعد اسے پڑھا تو مجھے اپنا لکھا ہوا پسند نہیں آیا۔ میں نے سوچا کہ یہ کام کسی اور موقعے پر کیا جائے گا۔ میں دوسرے تصنیفی کاموں میں مصروف ہو گیا۔ اس طرح اٹھارہ انیس برس گزر گئے۔ ۲۰۰۶ء میں دل میں ایک جذبہ سا اُبھرا، جس نے چند روز میں شدت اختیار کر لی اور میں نے ایک خاص ترتیب سے ابواب قائم کر کے کام شروع کر دیا اور اللہ کے فضل سے کتاب مکمل ہو گئی۔ اس میں قاضی صاحب کے خاندانی پس منظر سے لے کر ان کی آل اولاد تک کے حالات قلم بند ہو گئے ہیں۔ کتاب تینتیس ابواب پر مشتمل ہے، جن میں ان کی ولادت، حصولِ علم، اساتذہ، ملازمت، ریاست پٹیالہ کی سیشن ججی کا منصب، بعض اہم فیصلے، علمی زندگی، تصنیف و تالیف، آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس اور بعض دیگر جماعتوں کے جلسوں کی صدارت وغیرہ تمام امور کی تفصیلات بیان کر دی گئی ہیں۔ کتاب اشاریے سمیت ۴۹۶ صفحات پر مشتمل ہے جو مکتبہ سلفیہ، شیش محل روڈ، لاہور نے جنوری

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

۲۰۰۷ء میں شائع کی۔ کتاب میں پٹیالہ کی وجہ تسمیہ اور اختصار کے ساتھ اس کے حکمرانوں کی تاریخ بھی بیان کردی گئی ہے۔ ''حرفِ اوّل'' کے عنوان سے پروفیسر عبدالجبار شاکر نے مقدمہ لکھا جو بہت سی معلومات پر محیط ہے۔

۱۸۔ ہفت اقلیم :...... یعنی سات ولایتیں۔ کہا جاتا ہے کہ کل کرۂ ارض کے سات حصے ہیں۔ ہر حصہ ایک سیارے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس اعتبار سے اسے سات ولایتوں سے موسوم کیا جاتا ہے، لیکن یہ جغرافیائی تقسیم نہیں ہے، فلکیاتی تقسیم ہے۔ میں نے اپنی اس کتاب میں سات شخصیات کے کوائف حیات قلم بند کیے ہیں۔ ان میں سے ہر شخصیت کو اپنے اپنے میدانِ عمل میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان شخصیات میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید، حکیم عبداللہ روڑی والے، غازی محمود دھرم پال اور مولانا عبدالقادر رائے پوری شامل ہیں۔ یہ کتاب پانچ سو صفحات پر محیط ہے۔ ۲۰۰۸ء میں اسے مکتبہ قدوسیہ، لاہور نے شائع کیا۔ یہاں یہ یاد رہے کہ ان حضرات کے فکر و عمل کے بعض گوشوں سے مَیں متفق نہیں ہوں، جس کا متعلقہ مضامین میں کہیں صراحتاً اور کہیں اشارتاً میں نے ذکر بھی کیا ہے۔ میری اس کاوش پر بھی پروفیسر عبدالجبار شاکر نے فلیپ لکھا ہے۔

۱۹۔ محفلِ دانشمنداں :...... یہ کتاب متعدد شخصیات کا مجموعہ ہے۔ کتاب ابھی شائع نہیں ہوئی۔ میں نے البتہ مکمل کردی ہے۔

۲۰۔ آثار ماضی :...... یہ بھی شخصیات سے متعلق ہے۔ اس کی اشاعت کا مرحلہ بھی ابھی پیش نہیں آیا۔

۲۱۔ دبستانِ حدیث :...... اس کتاب میں برصغیر (پاک و ہند) کے ان ساٹھ اصحابِ علم کے حالات صفحاتِ قرطاس پر لائے گئے ہیں، جنھوں نے تدریسی یا تصنیفی صورت میں خدمت حدیث کا فریضہ سرانجام دیا۔ ان حضرات کی اس فہرست میں حضرت میاں سیّد نذیر حسین اور ان کے گیارہ تلامذہ کرام شامل ہیں۔ پھر آگے چل کر مرحومین و موجودین

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کا سلسلہ چلتا ہے۔ یہ کتاب بڑے سائز کے ۶۷۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۲۰۰۸ء میں مکتبہ قدوسیہ نے شائع کی۔

۲۲۔ ارمغانِ حدیث: ...... یہ کتاب ان ایک سو احادیث کا مجموعہ ہے، جو اخلاقیات اور معاملات سے تعلق رکھتی ہیں۔ ناشر طارق اکیڈمی، فیصل آباد۔ سالِ اشاعت ۲۰۰۸ء، صفحات ۲۷۲۔

۲۳۔ گلستانِ حدیث: ......خدامِ حدیث سے متعلق یہ کتاب زیرِ طبع ہے۔ کم و بیش چھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔

تیرھویں اور چودھویں ابواب میں جو کچھ عرض کیا گیا، اس کا تعلق میری تصنیفی و تالیفی اور تراجم و حواشی کے سلسلے کی خدمات سے تھا۔ اس کے علاوہ بہت سے مصنّفین کی کتابوں پر مقدمات تحریر کیے، جن کی صحیح تعداد کا تو پتا نہیں، البتہ اندازہ یہ ہے کہ ایک سو کے لگ بھگ ضرور ہوں گے۔ پھر ۱۹۴۹ء سے ۲۰۰۸ء تک ۵۹ سال کے طویل عرصے میں جن کتابوں پر اخبارات و رسائل میں تبصرے کیے، ان کا شمار میں لانا ممکن نہیں۔

مختلف رسائل و اخبارات میں جو مضامین لکھے، ان کی تعداد کا بھی مجھے علم نہیں۔ میری یہ سستی کہیے یا بے پروائی کہ میں نے اس قسم کی چیزیں کبھی سنبھال کر نہیں رکھیں۔

''امروز'' کسی زمانے میں پاکستان کا مشہور روز نامہ اخبار تھا۔ اس کے عملہ ادارت سے میرے دوستانہ مراسم تھے، جن میں حمید اختر اور حمید جہلمی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ''الاعتصام'' کا دفتر شیش محل روڈ پر تھا اور حمید جہلمی کی سکونت اس وقت اس سے تھوڑا آگے بلال گنج میں تھی۔ اس کے بعد انھوں نے ریواز گارڈن میں مکان بنا لیا تھا۔ غالباً ۱۹۶۳ء کی بات ہے کہ ایک روز وہ دفتر ''امروز'' جاتے ہوئے میرے دفتر آئے اور آرام کرسی (Easy Chair) پر بیٹھ گئے۔ کہا امروز کے لیے مضمون دو۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی دفعہ مضمون کے لیے کہہ چکے تھے۔ لیکن میں نہیں لکھ سکا تھا۔ آج انھوں نے کہا کہ میں مضمون لے کر ہی جاؤں گا۔ میں اپنے اخبار کے لیے تو لکھتا ہی تھا، لیکن کسی روز نامے یا کسی رسالے کے لیے کبھی نہیں

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

لکھا تھا۔ یہ بات میں نے ان سے کہی تو بولے جس طرح اپنے لیے لکھتے ہو، اسی طرح ''امروز'' کے لیے لکھ دو۔ میں نے ان سے دوسرے دن مضمون دینے کا وعدہ کیا اور وعدے کے مطابق دوسرے دن مضمون دے دیا۔ اس کے بعد سلسلہ چل نکلا۔ امروز اس دور کا واحد اخبار تھا جو مضمون نگاروں کو معاوضہ دیتا تھا۔ میں کئی سال ہفتے میں دو یا تین مرتبہ اس اخبار میں لکھتا رہا۔ ایک مرتبہ امروز کے چیف ایڈیٹر ظہیر بابر نے مجھے مولانا محمد علی جوہر کے متعلق مضمون کا مطالبہ کیا۔ میں نے معذرت کی لیکن انھوں نے کہا کہ تم ہی سے لکھوانا ہے۔ میں نے مضمون دیا جو امروز میں چھپا۔ پھر وہ مضمون امروز کے حوالے اور میرے نام سے ہندوستان کے کئی اخباروں میں چھپا جن میں سے روز نامہ ''ہند جدید'' (کلکتہ)، روز نامہ ''الجمعیت'' (دہلی)، روز نامہ ''سیاست'' (کان پور)، روز نامہ ''قومی آواز'' (لکھنؤ) اور روز نامہ ''عصر جدید'' شامل تھے۔

''الاعتصام'' کے زمانہ ادارت میں مولانا عبدالماجد دریابادی اپنے ہفت روزہ ''صدیق جدید'' لکھنؤ میں ہر ہفتے میرا کوئی نہ کوئی ادارتی شذرہ شائع کرتے تھے۔

ایک روز مجیب الرحمٰن شامی ادارہ ثقافت اسلامیہ تشریف لے گئے۔ انھوں نے قومی ڈائجسٹ کے لیے شخصیات پر لکھنے کے لیے کہا، چنانچہ ایک عرصے تک میں قومی ڈائجسٹ میں ہر مہینے کسی اہم شخصیت پر باقاعدہ مضمون لکھتا رہا۔ اس وقت ہمارے ملک کے مشہور کالم نگار تنویر قیصر شاہد قومی ڈائجسٹ کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے۔ آج کل روز نامہ ''ایکسپریس'' راولپنڈی کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر ہیں۔ کبھی وہ مضمون لے جاتے تھے اور کبھی میں خود ان کے دفتر چلا جاتا۔ تنویر قیصر شاہد کے ادارتی نوٹ کے ساتھ مضمون شائع ہوتا۔ پھر قومی ڈائجسٹ میں پروفیسر خالد ہمایوں آ گئے۔ انھوں نے بھی میرے کئی مضمون شائع کیے۔

مجیب الرحمٰن شامی کے کہنے پر کچھ عرصہ میں ان کے روز نامہ ''پاکستان'' میں لکھتا رہا۔

۱۹۷۸ء میں پنجاب کا گورنر جنرل سوار خاں تھا۔ اس نے ایک ''سیرت کمیٹی'' بنائی، جس کے چیئر مین ڈاکٹر سیّد عبداللہ (صدر اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی) کو اور سیکرٹری

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

(ڈاکٹر عبدالروٴف ناظم شعبہ تعلیمات پنجاب) کو بنایا گیا تھا۔ اس کے ارکان تھے، پروفیسر عبدالقیوم، بریگیڈیئر گلزار احمد، مفتی محمد حسین نعیمی اور ان سطور کا راقم عاجز۔ سیرت کمیٹی کا کام اس مسئلے پر غور کرنا تھا کہ پہلی جماعت سے لے کر ایم اے تک طلبا کو نبی کریم ﷺ کی سیرتِ طیبہ کی تعلیم کس انداز سے دی جائے۔ اس کمیٹی کا اجلاس اُردو دائرۂ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی کے دفتر میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے زیرِ صدارت منعقد کیا جاتا تھا۔ سیرت کے طریق تعلیم کے متعلق ہر رکن کو تین مہینے میں تحریری طور پر اپنی رائے پیش کرنے کا پابند کیا گیا تھا۔ میں نے وقت مقررہ سے پہلے اپنی رائے ایک رپورٹ کی صورت میں کمیٹی کے صدر ڈاکٹر سیّد عبداللہ کو پیش کر دی۔ بعض معزز ارکان تین مہینے میں بھی پیش نہیں کر سکے تھے۔ کمیٹی کے اجلاس میں مختلف ارکان کی رپورٹوں پر بحث ہوئی تو کمیٹی کے قابل احترام صدر نے اس فقیر کی رپورٹ کا خاص طور سے تذکرہ کیا اور اس سلسلے میں انھوں نے جو الفاظ استعمال کیے، وہ میرے لیے نہایت حوصلہ افزا تھے۔

جس دن گورنر کی طرف سے کمیٹی کے قیام اور اس کے ارکان کا اخبارات میں اعلان ہوا، اس دن میں اپنے گاؤں میں تھا اور وہیں میں نے اخبار میں اعلان پڑھا تھا۔ گاؤں سے واپس آیا اور اپنے دفتر (ادارہ ثقافت اسلامیہ) پہنچا تو بذریعہ ڈاک اس کی اطلاع میرے دفتر آ گئی تھی۔ مجھے گورنر ہاؤس کے ایک اہل کار اور کمیٹی کے صدر نے بتایا کہ کمیٹی کے ارکان کے نام پڑھ کر میرے بعض مہربانوں نے میرے متعلق ان کو خطوط لکھے کہ اس شخص کو کالج اور یونیورسٹی کی سطح کے تدریسی سلسلے کا تجربہ نہیں ہے۔ اسے اس کمیٹی کا رکن کیوں بنایا گیا ہے۔ ان خطوط کا کسی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ لیکن سازشی ذہن نے اپنا کردار ادا کرنے میں کسر نہیں چھوڑی۔ خطوط لکھنے والے مجھ سے ملتے رہتے تھے۔ لیکن میں نے ان سے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا۔

۸۸۔۱۹۸۷ء میں دس گیارہ مہینے میں نے ہفت روزہ اخبار ''اہل حدیث'' (لاہور) کی ادارت کا فریضہ انجام دیا۔ اور اسی زمانے میں میں نے اس اخبار کا ''حرمین شریفین نمبر'' ترتیب دیا۔ تقریباً اڑھائی سو صفحات کا یہ نمبر متعدد مشہور اہل قلم کے مضامین کا مجموعہ ہے، جس

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

میں مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، سعودی حکومت، شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب اور ان کے خاندان کی پوری تاریخ آ گئی ہے۔ یہ ایک ایسی تحقیقی اور تاریخی دستاویز ہے جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ میں اس وقت ادارہ ثقافت اسلامیہ سے منسلک تھا اور ہفت روزہ ''اہل حدیث'' بھی مرتب کرتا تھا۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ کے اکیڈمک ڈائریکٹر ان دنوں سراج منیر مرحوم تھے۔ میں نے انتہائی محنت سے یہ نمبر مرتب کیا۔ ہم سعودی عرب کی حکومت کی تعریف تو کرتے ہیں لیکن کسی اخبار اور کسی جریدے کا عملہ اس قسم کا نمبر پیش نہ کر سکا۔ اللہ نے یہ توفیق اس فقیر کو عطا فرمائی۔

یہ ہے میرے سفر تحریر کی ایک جھلک۔ اس وقت میں اللہ کے فضل سے چار کتابیں لکھ رہا ہوں، جن میں سے دو تکمیل کی منزل کو پہنچ گئی ہیں۔ ان کا ذکر اس فہرست میں نہیں کیا گیا۔

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ تحریر میں میرا اپنا ایک انداز ہے۔ میں نے کبھی کسی اہل قلم کا انداز نہیں اختیار کیا۔ پڑھتا بہت سوں کو ہوں اور ان کی معلومات سے استفادہ کرتا ہوں، لیکن لکھتا اپنے اسلوب سے ہوں۔ پندرہ سال کا عرصہ میں نے مولانا سیّد داؤد غزنوی کی خدمت میں گزارا۔ چالیس برس کی طویل مدت مولانا محمد حنیف ندوی کی رفاقت میں گزری۔ کم و بیش اتنے سال ہی مولانا محمد اسماعیل سلفی کے سایہ عاطفت میں بسر ہوئے۔ پچاس برس سے زیادہ مدت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کی آغوش شفقت میں بیتی۔ پھر ادارہ ثقافت اسلامیہ میں شاہ محمد جعفر پھلواروی، رئیس احمد جعفری، بشیر احمد ڈار، سراج منیر، خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر شیخ محمد اکرام سے سالہا سال میرے قریبی مراسم رہے۔ میں نے ان میں سے کسی کا طرز نگارش نہیں اپنایا۔ لکھنے کی اپنی راہ اختیار کی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس میں میرے خواندگان محترم نے میری حوصلہ افزائی کی۔ اس پر میں ان کا بے حد شکر گزار ہوں۔

۹ مارچ ۲۰۰۸ء — لاہور

❀❀❀❀

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

پندرھوں باب:

ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر تقریروں کا سلسلہ

اب ریڈیو پاکستان اور ٹیلی ویژن پر تقریروں کے سلسلے کی چند باتیں عرض کرتا ہوں۔

ریڈیو پاکستان (لاہور) میں میری پہلی تقریر ۲۵ر دسمبر ۱۹۶۵ء کو ہوئی۔ قمری حساب سے یہ یکم رمضان ۱۳۸۵ ہجری تھا اور سحری پروگرام، جس کا دورانیہ تین منٹ تھا۔ جمعتہ المبارک کا دن تھا۔ اس کا معاوضہ مجھے بہ صورت چیک بیس روپے ملا۔ پروگرام پروڈیوسر عبدالحی قریشی تھے۔ اس کے بعد ریڈیائی تقریروں کا طویل سلسلہ چلا۔ ایک ایک دن میں مختلف پروگراموں میں تین تین تقریریں بھی ہوئیں۔ کبھی پنجابی کا سوھنی دھرتی پروگرام، کبھی صراطِ مستقیم، کبھی آیاتِ بینات، کبھی فوجی بھائیوں کا پروگرام، کبھی کتابوں پر تبصرے، کبھی کسی صحابیٔ رسول ﷺ کے حالات، کبھی کسی مذاکرے میں شمولیت، کبھی کوئی اور پروگرام۔ ان تقریروں کا سلسلہ ۱۹۹۷ء کے آخر تک جاری رہا۔ اس کے بعد میں نے معذرت کر لی۔

۲۷۔ جولائی ۱۹۷۲ء کو ٹیلی ویژن پر پہلا پروگرام کیا۔ یہ بصیرت پروگرام تھا اور اس کا دورانیہ تھا پانچ منٹ۔ اس کے بعد مختلف موضوعات سے متعلق ٹیلی ویژن پر بہت سے پروگرام کیے۔

ریڈیو پروگرام کے بارے میں تین باتیں سنیے!

(۱) ایک مرتبہ ریڈیو پاکستان (لاہور) کی طرف سے ہفتۂ حدیث منایا گیا اور اس کے اربابِ انتظام نے سات مقرروں کا انتخاب کر کے مختلف سات موضوعات پر ان سے سات روز میں سات تقریریں کرائیں۔ ہر تقریر کا دورانیہ ۳۵ منٹ تھا۔ ان میں ایک مقرر یہ فقیر تھا، جسے ''حدیث اور اسماء الرجال'' کا موضوع دیا گیا تھا۔ پروڈیوسر عبدالحی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

قریشی تھے۔ میں نے ان سے کہا میں ۳۵ منٹ میں اپنی بات مکمل نہیں کرسکوں گا۔ انھوں نے کہا: ۳۵ منٹ کی کوئی پابندی نہیں، بے شک اس سے زیادہ وقت لے لیں۔ میں نے اس موضوع پر ایک گھنٹا تقریر کی اور پھر یہ تقریر متعدد مرتبہ ریڈیو سے نشر ہوئی۔

(۲) ایک مرتبہ ربیع الاوّل کے مہینے میں ریڈیو پاکستان لاہور کی فرمائش پر علامہ قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری کی تصنیف ''رحمۃ للعالمین'' کی تین جلدوں کی تلخیص پندرہ روز بیان کی۔ ہر روز کا دورانیہ پندرہ منٹ کا تھا۔ یہ تلخیص ربیع الاوّل کے مہینے میں ریڈیو پر کئی سال نشر ہوتی رہی۔ اس کے پروڈیوسر بھی عبدالحی قریشی تھے۔

اس سے کچھ عرصہ بعد ''رحمۃ للعالمین'' کی اسی طرح کی تلخیص ریڈیو کے پروگرام کے مطابق پنجابی زبان میں بیان کی۔ ریڈیو پاکستان (لاہور) میں نشر شدہ یہ دونوں (اُردو اور پنجابی) تلخیصات میرے پاس محفوظ ہیں۔ پنجابی پروگرام کے پروڈیوسر برکت علی چیمہ تھے۔

(۳) ایک مرتبہ ریڈیو پاکستان سے ''زندہ تابندہ'' کے عنوان سے ایک پروگرام شروع ہوا۔ یعنی ان حضرات کا تذکرہ جو وفات پاچکے ہیں لیکن ان کے علمی، عملی، تدریسی اور تصنیفی کارنامے اتنے زیادہ اور اہم ہیں کہ ان کی وجہ سے وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے اور ان کی موت کے بعد بھی ان کی تصانیف وغیرہ کے ذریعے سے ان سے استفادے کا سلسلہ جاری رہے گا۔ ریڈیو کے اصحابِ انتظام نے مجھ سے کہا کہ میں اس موضوع پر ہر مہینے پندرہ تقریریں کیا کروں، لیکن اپنی تصنیفی مصروفیات کی وجہ سے میں نے معذرت کرلی اور کہا کہ میں وہی تقریریں کروں گا جو معمول کے مطابق کررہا ہوں۔ مزید تقریروں کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے۔ پھر انھوں نے ہر مہینے دس تقریروں کے لیے کہا۔ اس پر بھی میں نے معافی کی درخواست کی، مگر ریڈیو والوں کا اصرار جاری رہا۔ بالآخر میں نے یہ سلسلہ شروع کردیا اور ۴۵ علمائے کرام پر تقریریں لکھیں۔ جن حضرات کے میں نے حالات بیان کیے، ان کا تعلق برصغیر کے علمائے اہل حدیث سے تھا۔ ریڈیو پر

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

دیوبندی، بریلوی اور شیعہ حضرات کے کوائف حیات تو بالعموم بیان ہوتے ہی رہتے ہیں، لیکن اتنی تعداد میں اہل حدیث کا تذکرہ ریڈیو پر پہلی دفعہ ہوا، جو اس فقیر نے کیا اور ریڈیو والوں سے یہ کہہ کر کیا کہ میں ''زندہ تابندہ'' پروگرام میں صرف اہل حدیث اصحابِ علم کا تذکرہ کروں گا۔

میری اب تک کی تحریری خدمات حسب ذیل نوعیت کی ہیں:

① تصانیف وتراجم۔
② اخباری مضامین ومقالات۔
③ اخباری اداریے اور شذرات۔
④ بے شمار کتابوں پر تبصرے۔
⑤ بہت سی کتابوں پر مقدمات۔
⑥ ریڈیائی تقریریں۔

حساب کیا جائے تو یہ خدمات جو چھ اقسام پر منقسم ہیں، تقریباً پچاس ہزار صفحات تک پہنچ جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ بہت بڑا احسان ہے، جو اس نے اس فقیر پر فرمایا۔

میں نے اپنی تحریروں اور ریڈیائی اور ٹیلی ویژنی پروگراموں میں ہمیشہ اپنے مسلک کو ملحوظِ خاطر رکھا اور اس کی خدمت کی۔ بحمد اللہ ایک لمحے کے لیے بھی اس میں لچک نہیں آنے دی۔

اہل حدیث کی مسجدوں اور جلسوں میں تو ماشاء اللہ اپنا مسلک بیان کرنے اور اپنے بزرگوں کے واقعات سنانے والے بہت سے علماے اہل حدیث موجود ہیں، جو ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تقریریں کرتے ہیں، کیا ان میں سے کسی نے یہ خدمت کبھی غیر اہل حدیث کے مجمعے میں بھی انجام دی؟ الحمد للہ اس فقیر نے ہر جگہ دھڑلے سے اپنے مسلک کی حقانیت کو واضح کرنے کی کوشش کی۔ گفتگو اور تحریر میں کبھی کسی سے مرعوب نہیں ہوا۔

یہاں اپنے متعلق یہ بھی عرض کردوں کہ میں ساٹھ سال سے قلم وقرطاس کے شعبے سے وابستہ ہوں۔ پندرہ سال ہفت روزہ الاعتصام میں خدمت ادارت سرانجام دی۔ بتیس سال ادارۂ ثقافت اسلامیہ میں تصنیف وتالیف میں مصروف رہا۔ متعدد جماعتی وغیر جماعتی رسائل وجرائد میں لکھا۔ طویل عرصے تک اپنے دور کے مشہور اخبار روزنامہ ''امروز'' (لاہور) میں کالم نگاری اور مضمون نویسی کی، لیکن اس طویل مدت میں ایک لفظ بھی میں نے جماعت اہل حدیث

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کے کسی عالم یا مصنف کے خلاف نہیں لکھا۔ کبھی کسی صاحب علم اہل حدیث پر تنقید نہیں کی۔ میرے قلم کی تربیت اور طرزِ نگارش کی پرورش اللہ کے فضل سے ایسے ماحول میں ہوئی ہے کہ اپنی جماعت کے کسی عالم اور مصنف کی مخالفت وتنقید کے مکروہ فعل میں نہ وہ کبھی ملوث ہوا اور نہ ان شاء اللہ ہوگا۔ بعض اوقات البتہ لطیفے ہوجاتے ہیں اور لطیفہ بیانی ہر صاحب ذوق کی ذہنی غذا ہے۔ لطیفے کو لطیفہ ہی سمجھنا چاہیے۔ اگر کسی نے کبھی میرے متعلق لکھا تو میں نے اس کا بھی جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ اس نے میری وجہ سے اپنا جی خوش کرلیا تو مجھے خوشی ہوئی ......

ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر کسی غیر اہل حدیث نے میرے مسلک، میری جماعت یا میری جماعت کے کسی عالم کو ہدفِ تنقید ٹھہرایا یا کسی اسلوب میں نشانۂ طنز بنایا تو میں نے اسے ہرگز معاف نہیں کیا۔ ایسے موقعے پر خاموش رہنا میری ذہنی افتاد اور میرے قلم کی فطرت کے خلاف ہے۔ لیکن یہاں بھی میں نے اپنے مخاطب کا پورا احترام کیا اور اس کے علم وتحقیق کے ہر پہلو کو ملحوظِ خاطر رکھا۔ جن اساتذۂ گرامی کے زیرِ نگرانی میرے قلم کے سفر کا آغاز ہوا، انھوں نے پہلے قدم پر ہی مجھے نصیحت فرمادی تھی کہ اپنے مخاطب یا حریف کا اس انداز سے نام لو کہ لوگوں کو پتا چلے کہ وہ صاحب علم ہے۔ تمھارا مقابلہ کسی کم علم یا جاہل سے نہیں ہے، عالم وفاضل شخص سے ہے۔ اگر وہ عالم نہیں ہے تو اس سے جھگڑنے اور مخاطب ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

یہاں یہ بھی سنتے جایے کہ جب میں پہلے دن ریڈیو پر تقریر کے لیے گیا اور تقریر کرنے لگا تو میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ یہ ۲۵۔ دسمبر ۱۹۶۵ء کی بات ہے۔ اس وقت ریڈیو پر تقریر کرنا بہت بڑا اعزاز تھا اور یہی سب سے بڑا ذریعہ ابلاغ تھا۔

میرے کبھی حاشیۂ ذہن میں بھی نہیں آیا تھا کہ مجھے بھی کسی وقت یہ اعزاز حاصل ہوگا۔

اہل حدیث حضرات میں اس وقت صرف مولانا محمد حنیف ندوی تھے جنھیں ریڈیو والے تقریر کے لیے دعوت دیتے تھے اور ان کا وہ لوگ بے حد احترام کرتے تھے۔ دوسرا شخص یہ فقیر تھا جو اہل حدیث مسلک سے تعلق رکھتا تھا اور اسے ریڈیو پر تقریر کے لیے بلایا گیا تھا۔ ریڈیو خریدنا اور گھر میں رکھنا بھی اس وقت ایک اہم مسئلہ تھا اور میرے گھر میں ریڈیو نہیں تھا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

اب ایک اور تقریر کے متعلق سنیے۔

۱۶۔ دسمبر ۱۹۷۱ء کے دس گیارہ بجے کا وقت تھا کہ ریڈیو پاکستان کے ایک پروڈیوسر میرے دفتر (ادارہ ثقافت اسلامیہ پہنچے) وہ ریڈیو کی گاڑی لے کر آئے تھے اور مجھ سے اس موضوع پر تقریر کرانا چاہتے تھے کہ مشرقی پاکستان کی جنگ میں ہماری فوج ہندوستان کی فوج کو پیچھے دھکیل رہی ہے اور ہم وہاں جیت رہے ہیں۔ میں نے ان سے عرض کیا، بی بی سی بتا رہا ہے کہ ہمارا فوجی جرنیل ڈھاکے کے پلٹن میدان میں ہندوستانی جرنیل جگجیت سنگھ اروڑا کے سامنے ہتھیار ڈالنے کی تیاری کر رہا ہے۔ انھوں نے کہا بات یہی ہے لیکن ہم نے لوگوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ ان کے مجبور کرنے پر مجھے جانا پڑا اور وہی کچھ کہنا پڑا جو وہ چاہتے تھے۔ یہ پانچ چھ منٹ کی تقریر تھی جو میں نے نہایت بے دلی کے ساتھ کی۔ تقریر کے بعد میں نے ان سے کہا کہ خدا معاف کرے، آج میں نے زندگی میں سب سے بڑا جھوٹ بولا ہے، اور یہ جھوٹ آپ نے بلوایا ہے۔ وہ ہنس پڑے اور کہا ایک دفعہ ریڈیو پر اس قسم کا جھوٹ اور بول دو۔ یہ بھی پانچ منٹ کا ہوگا۔ میں نے دس منٹ کے جھوٹ کے بعد ان سے کہا کیا میرے اس دس منٹی جھوٹ سے ہم نے مشرقی پاکستان فتح کر لیا؟

کچھ عرصہ میں ریڈیو پاکستان لاہور کا ''سوہنی دھرتی'' پروگرام بھی کرتا رہا۔ اس پروگرام میں میرا ریڈیائی نام میاں صاحب رکھا گیا تھا۔ اس پروگرام کا میں ''پڑھا لکھا'' کردار تھا جو روزانہ کی خبریں بھی سناتا تھا۔ اس میں پہلے سے ریکارڈ شدہ گانے وغیرہ بھی سنائے جاتے تھے۔ اسی اثنا میں میرے گاؤں کے ایک دوست (حاجی محمد رفیق مرحوم) ایک دفعہ لاہور آئے تو انھوں نے بتایا کہ میرے والد اس پروگرام پر مجھ سے خفا ہیں۔ چنانچہ میں نے یہ پروگرام کرنا چھوڑ دیا۔

۲۷۔ جولائی ۱۹۷۲ء کو مجھے پہلی دفعہ ٹیلی ویژن پر ''بصیرت'' پروگرام کرنے کی دعوت دی گئی تھی، جو میں نے ریکارڈ کرانا تھا۔ میرے بعد یہی پروگرام مولانا محمد حنیف ندوی اور بعض دیگر حضرات نے ریکارڈ کرانا تھا، جن میں ایک شیعہ مقرر بھی تھے۔ میں اپنی نشست سے اُٹھ

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کران حضرات کے پاس گیا تو سب سے پہلے مولانا محمد حنیف ندوی میری طرف بڑھے اور انھوں نے بغل گیر ہو کر مجھے مبارک باد دی اور فرمایا تم نے اپنے موضوع کی بہت اچھی طرح وضاحت کی ہے۔ پھر شیعہ مقرر نے بغل گیر ہوتے ہوئے کہا: بھٹی بھائی قسم حسین ہے آپ نے بہت اچھی تقریر کی ہے۔ اسے جاری رکھنا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ ''قسم حسین'' کا لفظ میں نے پہلی دفعہ سنا تھا۔

ریڈیو میں تقریر کا اور سلسلہ ہے، ٹیلی ویژن میں اور...... ٹیلی وژن میں روشنیوں کا ایک سیلاب آیا ہوتا ہے اور کتنے ہی لوگ مقرر کے اردگرد اور آگے پیچھے کھڑے ہوتے ہیں، جو اس کی ہر حرکت پر نگاہ رکھتے ہیں۔ یہ کیفیت دیکھ کر وہ بسا اوقات گھبرا جاتا ہے اور بات کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

ٹیلی ویژن پر بھی ریڈیو کی طرح اہل حدیث میں سب سے پہلے مقرر مولانا محمد حنیف ندوی تھے اور دوسرا یہ فقیر......!

اس وقت صرف ایک ہی ٹیلی ویژن تھا اور وہ تھا سرکاری ٹیلی ویژن۔ پی ٹی وی۔ اب تو بے شمار چینل کھل گئے ہیں اور ان میں ہر قسم کے لوگ ہر موضوع پر آزادی سے گفتگو کرتے ہیں۔ سیاسیات پر بھی بحث ہوتی ہے اور حکومت کی مخالفت اور موافقت میں لوگ ہر چینل پر وضاحت سے اپنا نقطہ نظر بیان کرتے ہیں۔

تصنیف و تالیف اور اخبارات و جرائد کے مضامین و مقالات کے علاوہ میں نے بے شمار طلبا و طالبات کی ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالات لکھنے میں مدد کی۔ اس وسیع فہرست میں جرمنی اور انگلستان کے بعض طلبا بھی شامل ہیں جو پاکستان آئے اور مجھ سے ملے اور اپنے موضوع کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ علاوہ ازیں متعدد سیمیناروں میں شمولیت، اور ان میں مقالے پڑھنے کے مواقع میسر آئے۔

۱۰۔ مارچ ۲۰۰۸ء　　　　لاہور

❀❀❀❀

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

سولھواں باب:

معمولات و عادات

ہر شخص کے دن رات کے کچھ معمولات ہوتے ہیں، میرے بھی چند معمولات ہیں۔ ان معمولات کا یہاں ذکر کر دیا جائے تو میرے خیال میں کوئی حرج نہیں۔

- میں ابھی کم عمر تھا کہ میرے دادا مرحوم مجھے نمازِ فجر سے پہلے جگا دیا کرتے تھے اور پھر نماز کے لیے اپنے ساتھ مسجد میں لے جاتے تھے۔ میرے دادا تو وفات پا گئے، لیکن یہ معمول مستقل طور پر مجھے عطا فرما گئے۔ گرمی ہو یا سردی، سفر ہو یا حضر۔ کیسی بھی حالت اور کیسا بھی موسم ہو، میں بالعموم فجر کی اذان سے پہلے اُٹھ جاتا ہوں۔ پھر دو چار رکعتیں پڑھنے کے بعد قرآنِ مجید کے آدھے پارے کی بالالتزام تلاوت کرتا ہوں۔ حتی الامکان قرآن پڑھے بغیر گھر سے نہیں نکلتا۔ اگر کسی وجہ سے قرآن نہ پڑھا جائے تو اندیشہ رہتا ہے کہ آج صبح قرآن نہیں پڑھا جاسکا، معلوم نہیں دن کیسا گزرے گا۔ صبح کے بجائے اتنا ہی قرآن کسی دوسرے وقت میں پڑھ تو لیتا ہوں، تاہم وہ اطمینانِ قلب نہیں ہوتا، جو نمازِ فجر سے قبل کے وقت کے ساتھ مخصوص ہے۔ قرآنِ مجید روزانہ پڑھنے کا یہ معمول اس وقت سے چلا آ رہا ہے، جب سے میں نے چھوٹی عمر میں ناظرہ قرآن مجید پڑھا ہے۔
- رات کو سونے کا کوئی خاص وقت مقرر نہیں۔ کبھی جلدی سو جاتا ہوں، کبھی دیر سے۔
- گھر میں پڑھتا لکھتا بھی ہوں اور باتیں بھی کرتا ہوں۔ لطیفے بھی سنتا اور سناتا ہوں۔
- قرآن وہ کتاب ہدیٰ ہے جس سے مجھے خاص انس ہے۔ بعض لوگوں نے مجھ سے قرآنِ مجید کا ترجمہ پڑھا، جن میں مرد بھی شامل ہیں اور خواتین بھی۔ انھوں نے مجھ

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

سے پڑھنے کے لیے وقت کے تعین کے بارے میں بات کی تو میں نے کہا قرآن اور حدیث کے لیے کوئی خاص وقت نہیں ہے۔ جب جی چاہے یا جب آپ کے پاس وقت ہو، تشریف لایے اور پڑھیے۔ مردوں نے گھر آ کر پڑھا اور بعض خواتین کو میں نے دفتر (ادارۂ ثقافت اسلامیہ) صبح جاتے ہوئے یا کسی اور وقت خود ان کے گھر جا کر ترجمۂ قرآن پڑھایا۔ پھر ان بی بیوں نے آگے محلے کی بچیوں کو پڑھایا۔ ترجمہ قرآن پڑھنے والے مردوں میں بعض سرکاری محکموں کے اعلیٰ افسر، بعض محکمہ پولیس کے اہل کار اور عدلیہ کے لوگ بھی شامل تھے۔ یہ سلسلہ خالصتاً لوجہ اللہ جاری رہا۔ اس میں ہرگز کوئی دنیوی مفاد نہ تھا۔ میں نے ترجمہ قرآن پڑھنے والوں کے ہاں سے کھانے پینے سے بھی حتی الامکان گریز کیا۔

- میرے گھر سے مسجد اہل حدیث جس کا نام الٰہی مسجد ہے، کم وبیش ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر ہوگی، میں دو نمازیں اس مسجد اہل حدیث میں پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ایک فجر کی نماز، دوسری مغرب کی۔ بعض دفعہ بدقسمتی سے نہیں بھی جا سکتا۔
- جماعت کرانے سے بہت گھبراتا ہوں۔
- کوئی شخص مجھ سے کسی کام کے سلسلے میں مشورہ کرے تو اسے استخارہ کرنے کی تاکید کرتا ہوں۔ اسی طرح خود اپنا کوئی معاملہ ہو تو استخارہ کرتا ہوں۔ کبھی نہیں بھی کیا جاتا۔
- روزانہ اوّل آخر درود شریف پڑھ کر اکتالیس مرتبہ سورہ فاتحہ پڑھتا ہوں۔ صبح کی دو سنتیں پڑھ کر گھر سے نکلتا ہوں۔ بالعموم مسجد تک جاتے ہوئے سورۂ فاتحہ کا یہ عمل مکمل ہو جاتا ہے۔
- فرض نماز کے بعد ہاتھ اُٹھا کر بارگاہِ الٰہی میں دعا مانگتا ہوں۔ اگر کسی وقت کہیں جماعت کرانا پڑ جائے تو بھی جماعت کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دُعا کرتا ہوں۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ آدھی رات (جوف اللیل) اور فرض نماز (صلوٰۃ مکتوبہ) کے بعد اللہ تعالیٰ دُعا قبول فرماتا ہے۔ ((أَوْ كَمَا قَالَ ﷺ .)) اس موضوع کی اور بھی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

احادیث ہیں۔ دعا نماز کا جز نہیں، لیکن بعض لوگوں نے دعا نہ مانگنا عملاً اپنے آپ پر ضروری قرار دے رکھا ہے۔ میں ان سے اتفاق نہیں کرتا۔ ہمارے اکابر علماے کرام میں سے جن حضرات کو اس فقیر نے دیکھا ہے اور جن کی اقتدا میں نمازیں پڑھی ہیں، ان میں حضرت حافظ عبداللہ روپڑی، مولانا محمد علی لکھوی، مولانا عطاء اللہ لکھوی، حضرت حافظ محمد گوندلوی، مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی، مولانا محمد اسماعیل سلفی، مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، حافظ محمد اسحاق حسینوی اور دیگر بہت سے حضرات شامل ہیں۔ ان علماے عالی قدر میں سے بعض حضرات تو نمازِ فرض کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دعا کیا کرتے تھے اور بعض کبھی کرتے اور کبھی نہیں کرتے تھے۔

- دوستوں سے ملاقات کے لیے ہفتے میں ایک دو مرتبہ دفتر الاعتصام جانے کی کوشش کرتا ہوں۔ پھر عصر کی نماز بالعموم وہیں پڑھتا ہوں، بلکہ ان کے کہنے پر پڑھا بھی دیتا ہوں۔ اس اعتبار سے وہ دوست مجھے ''امام العصر'' کہا کرتے ہیں۔ ایک دن نماز عصر کے بعد مَیں وہاں سے چلنے لگا تو حافظ عبدالوحید نے کہا آپ نے کل بھی آنا ہے اور عصر کی نماز پڑھانا ہے۔ میں نے عرض کیا: میں کل نہیں آسکوں گا۔ میرا جواب سن کر میرے دوست عبدالصمد ریالوی نے کہا کل اگر آپ عصر کے وقت نہیں آئیں گے تو نماز تو ہم پڑھ ہی لیں گے، لیکن دُعا کا کیا بنے گا۔ یہ الفاظ انھوں نے لطیفے کے انداز میں کہے جس سے میں محظوظ ہوا۔

- ننگے سر نماز ہو جاتی ہے، لیکن اسے عادت بنالینا میرے نزدیک اچھی بات نہیں۔ مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی ننگے سر نماز پڑھنے والے کو ڈانٹتے اور اسے سختی سے روکتے تھے۔ آج کل بعض علماے کرام، خطباے عظام اور عزیز طلبا کو ہم ننگے سر نماز پڑھتے اور بازاروں اور گلیوں میں گھومتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ یہ بات علما کے وقار کے منافی ہے۔ بعض حضرات نماز پڑھتے وقت کپڑا سر سے اُتار کر آگے رکھ لیتے ہیں اور ننگے سر نماز پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ اچھی عادت نہیں۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

- بعض عالموں اور خطیبوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ جلسوں میں موبائل فون سے مقررین کی تصویریں اُتارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس ''اہم کام'' کے لیے وہ کبھی ٹیڑھے ہوتے ہیں، کبھی گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہیں اور کبھی کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ حرکت کرتے ہوئے وہ بہت بُرے لگتے ہیں۔ یہ بات علماء کی شان کے خلاف ہے۔
- ہر نماز کے بعد دس مرتبہ رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْ لِیْ اَمْرِیْ وَاحْلُلْ عُقْدَۃً مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَھُوْا قَوْلِیْ۔ دس مرتبہ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْم اور دس مرتبہ رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا پڑھتا ہوں۔ یہ عمل مجھے چھوٹی عمر میں ایک بزرگ میاں الحمد للہ نے بتایا تھا، جس پر میں بحمد اللہ قائم ہوں۔
- فضائل اعمال میں متعدد علمائے اہل حدیث جن میں اس فقیر کے بعض اساتذہ اکرام بھی شامل ہیں ضعاف پر عمل کے قائل تھے۔ ان سطور کے گناہ گار راقم کا بھی یہی نقطۂ نظر ہے۔ لیکن اس سلسلے میں، میں کسی سے بحث نہیں کرتا۔
- بے شک ماہرین علوم حدیث نے احادیث کی تخریج کر کے بہت بڑی خدمت سرانجام دی ہے، جس کی اللہ تعالیٰ ہی انھیں جزا دینے والا ہے۔ لیکن موجودہ دور کے بعض اہل علم نے اُردو میں اس باب میں جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے، میرے خیال میں اس پر غور کرنا چاہیے۔ اس سے منکرین حدیث ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور بعض دوسرے لوگوں پر بھی اس کا برا اثر پڑتا ہے۔ اس قسم کی بحثیں احادیث پڑھاتے وقت طلبا کے سامنے تو ضرور کی جائیں، لیکن میرے خیال میں عام مضامین میں اور عام لوگوں کے سامنے اس موضوع پر گفتگو مصلحت کے خلاف ہے۔ اس فقیر نے احادیث کی کتابیں مختلف اوقات میں تین عالی مقام اساتذہ سے پڑھی ہیں، علی الترتیب جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں: مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، حضرت حافظ محمد گوندلوی اور حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی۔ یہ حضرات اسی وقت اس قسم کی گفتگو فرماتے تھے، جب ان سے پوچھا جاتا تھا۔ وہ بھی چند الفاظ میں۔ میں پندرہ سال مولانا داؤد غزنوی کی خدمت میں رہا۔ وہ بھی اس

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

سلسلے میں بات کرنے میں محتاط تھے۔موجودہ دور کے اصحابِ تحقیق سے میری گزارش ہے کہ انھیں بھی اس پر غور فرمانا چاہیے۔ہم ان کے علم وفضل کے معترف ہیں، ان کے محققانہ ذوق کی دل کی گہرائی سے قدر کرتے ہیں اور ان کے لیے دُعا گو ہیں لیکن ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ مصلحت بھی بسا اوقات مسئلہ بن جاتی ہے۔

- کسی مظلوم، کسی ستم رسیدہ اور کسی نادار کو دیکھ کر انتہائی ذہنی تکلیف محسوس کرتا ہوں۔
- وعدہ خلافی کرنے والا بہت برا لگتا ہے۔کوئی شخص مجھ سے کسی سلسلے میں وعدہ کرے کہ مَیں فلاں وقت تمھارے پاس آؤں گا۔ میں اس کا انتظار کرتا ہوں، ضروری کام کے لیے بھی کہیں نہیں جاتا، لیکن وہ وعدے کے مطابق نہ آئے تو بے حد دُکھ ہوتا ہے۔بعض لوگ اتنے بے حس ہوتے ہیں کہ اطلاع بھی نہیں دیتے اور معذرت بھی نہیں کرتے کہ وہ وعدے کے مطابق نہیں آسکیں گے یا نہیں آسکے۔اس قسم کے بے پروا اور بے حس لوگوں سے بعض اوقات بات کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔اس موضوع پر ان سے بات کرتے ہوئے بسا اوقات جذباتی ہوجاتا ہوں اور اسلوبِ کلام ایسا رُخ اختیار کرلیتا ہے، جس پر بعد میں اپنے جی میں نادم بھی ہوتا ہوں۔پھر ان سے گول مول الفاظ میں یا صاف الفاظ میں معذرت بھی کرلیتا ہوں۔حالاں کہ ایسے لوگوں سے معذرت نہیں کرنی چاہیے۔
- وعدہ خلافی بہت بری بات ہے۔اس کا بعض دفعہ بہ ظاہر ثقہ لوگ بھی ارتکاب کرتے ہیں۔مسجدوں کے بعض خطیب و امام اور مذہبی جلسوں میں وعظیں اور تقریریں کرنے والے بھی بسا اوقات ایفائے عہد نہیں کرتے۔ پتا نہیں انھیں اس کا احساس ہے یا نہیں۔
- خط کا جواب ضرور دیتا ہوں۔ جواب طلب امور کے لیے جوابی خط کا مطالبہ بالکل نہیں کرتا۔ایسا مطالبہ کرنے کو اخلاق کے منافی قرار دیتا ہوں۔
- وظائف واوراد کے سلسلے میں یوں تو بہت سے بزرگانِ ذی مرتبت سے متاثر ہوں، لیکن جن حضرات سے سالہا سال میرا بہت قریبی تعلق رہا اور اس باب میں اپنی بے عملی کے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

باوجود ان سے فیض پایا، زمانی ترتیب کی رو سے وہ مندرجہ ذیل پانچ علمائے کرام ہیں:۔

① سب سے پہلے مولانا عطاء اللہ حنیف کا اسم گرامی آتا ہے، جن سے طالب علمی کے ابتدائی دور سے لے کر ان کی وفات ۳ / اکتوبر ۱۹۸۷ء تک کسی نہ کسی صورت میں وابستگی رہی۔

② دوسرے عالی قدر بزرگ حضرت حافظ محمد گوندلوی ہیں۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۱ء کے آخر تک دو سال باقاعدہ ان کے حلقۂ شاگردی میں رہا۔ پھر اخبار الاعتصام سے انسلاک کے زمانے میں ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۲ء کے آخر تک گوجرانوالا میں میرا قیام رہا اور اس اثنا میں حضرت حافظ صاحب سے حصولِ فیض کے مواقع میسر آتے رہے۔ انھوں نے ۴ / جون ۱۹۸۵ء کو وفات پائی۔

③ ۱۹۴۸ء کے آخر میں مرکزی جمعیت کی نظامت کے سلسلے میں حضرت مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے بہت کچھ سمجھنے اور سیکھنے کا موقع ملا۔ انھوں نے ۱۶ / دسمبر ۱۹۶۳ء کو وفات پائی۔ مجھے پندرہ سال ان کا قرب حاصل رہا۔

④ ۱۹۴۸ء میں مولانا محمد حنیف ندوی سے قریبی تعلق کا آغاز ہوا، جو ان کے سفر آخرت ۱۲ / جولائی ۱۹۸۷ء تک قائم رہا۔ یہ تعلق چالیس برس کی طویل مدت تک محیط تھا۔ مجھ پر ان کی شفقتوں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

⑤ ۱۹۵۸ء سے شاہ محمد جعفر پھلواروی سے مراسم کی ابتدا ہوئی، جس کا دورانیہ ان کی وفات ۳۱ / مارچ ۱۹۸۲ء تک چوبیس برس کے لیل ونہار میں پھیلا ہوا ہے۔ شاہ صاحب کے بعض افکار سے ہمیں اتفاق نہیں تھا اور اس سلسلے میں ہم ان سے اختلاف کا اظہار بھی کرتے تھے، لیکن انھیں وظائف بہت یاد تھے اور وہ وظائف پڑھتے بھی تھے۔

ان حضرات میں سے مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی نے تو وظائف کے لیے وقت مقرر کر رکھا تھا۔ وہ باقاعدہ فجر کی نماز کے بعد سے لے کر کافی دیر تک ایک جگہ بیٹھ کر وظائف پڑھنے کا

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

سلسلہ جاری رکھتے تھے اور پھر اس کے بعد ہاتھ اُٹھا کر طویل دُعا مانگتے تھے۔

حضرت حافظ محمد گوندلوی صاحب کے متعلق اس بارے میں مجھے زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کسی خاص وقت میں وظائف پڑھتے تھے یا کیا صورت تھی، لیکن باقی تین حضرات کے متعلق مَیں جانتا ہوں کہ وہ چلتے پھرتے یا کسی وقت بیٹھ کر اپنا ''کوٹہ'' پورا کر لیتے تھے۔

وظائف کے بارے میں جہاں تک اس فقیر کی محدود معلومات کا تعلق ہے، ان کی تین قسمیں ہیں۔

ایک وہ وظائف جو قرآنِ مجید میں مذکور ہیں۔ ان میں دعائیہ آیات بھی شامل ہیں۔

دوسرے وہ جو مختلف حالات و مواقع پر پڑھنے کے لیے احادیث رسول ﷺ میں بیان فرما گئے ہیں۔

تیسرے وہ جو بعض بزرگانِ دین سے منقول ہیں اور ان کے نزدیک مجرب ہیں۔

- میرے پاس کوئی دم کرانے یا تعویذ لکھوانے کے لیے آئے تو دم تو کر دیتا ہوں، معلوم نہیں اسے میرے دم سے فائدہ ہوتا ہے یا نہیں، لیکن تعویذ نہیں لکھتا، تاہم تعویذ نویسی کو صحیح سمجھتا ہوں۔ مگر اس کا معاوضہ نہیں مانگنا چاہیے۔ اگر کوئی اپنی خوشی سے دینا چاہے تو میرا خیال ہے، لینے میں کوئی حرج نہیں۔
- کھانے پینے میں کسی خاص چیز کا عادی نہیں۔ جو مل جائے کھا لیتا ہوں اور اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ اس ضمن میں اپنے سے کمزور کو دیکھتا ہوں، بڑے کی ریس نہیں کرتا۔ روٹی چٹنی کے ساتھ بھی بڑے شوق سے کھاتا ہوں۔
- کسی دوست یا رشتے دار اور بہن بھائی کو کوئی تکلیف پہنچے یا وہ بیمار ہو، تو مجھے اس کا بہت احساس ہوتا ہے۔ اس کی تکلیف رفع ہونے اور صحت کے لیے اللہ سے دُعائیں کرتا ہوں اور میں یہی کر سکتا ہوں۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

- قرض لینے سے بہت گھبراتا ہوں۔ کسی رشتے دار سے کبھی ایک پیسا قرض نہیں لیا۔ الحمدللہ
- دکان دار سے ادھار سودا لینے سے گریز کرتا ہوں۔ یہ بھی اللہ کا بہت بڑا احسان ہے۔
- امیر کی نسبت غریب سے زیادہ تعلق رکھتا ہوں۔
- جنازے میں شامل ہونے کی پوری کوشش کرتا ہوں۔
- رشتے داروں اور ملنے والوں میں کسی کی وفات کی اطلاع مل جائے تو حاضری کی سعی کرتا ہوں۔ کسی عذر کی بنا پر حاضر نہ ہوسکوں تو بڑی ذہنی تکلیف ہوتی ہے۔
- احسان کرنے والے کا احسان یاد رکھتا ہوں اور اس کا بدلہ دینے کی کوشش کرتا ہوں۔
- اپنے لکھنے پڑھنے کے مشاغل کو ہمیشہ ہر کام پر ترجیح دی۔ ایک مرتبہ مجھ سے مشورہ کیے بغیر ہائی کورٹ کے میرے ایک جج دوست نے میرا نام عدالت کے مشیر کے طور پر لکھا دیا۔ مجھے اس تقرری کی دفتر کی طرف سے اطلاع بھی آ گئی اور تھوڑی دیر بعد جج صاحب کا ٹیلی فون بھی آ گیا۔ میں نے اس کرم نوازی پر ان کا شکریہ ادا کیا اور عرض کیا کہ میں تصنیف و تالیف کے جن کاموں میں مصروف ہوں، وہ کسی اور کام کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتے، اس لیے میرے لیے عدالت کی مشیری وغیرہ کے لیے وقت دینا بہت مشکل ہے۔ انھوں نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ یہ بھی کہا کہ یہ آمدنی کا ایک ذریعہ ہے، لیکن میں نے وہی کیا جو میری سمجھ میں آیا اور متعلقہ دفتر میں شکریے کا خط لکھ کر معذرت کر لی۔
- اسی طرح اسلامی نظریاتی کونسل کے مرحوم چیئر مین مولانا کوثر نیازی میرے دیرینہ دوست تھے۔ انھوں نے اس کی رکنیت کے لیے کہا تو میں نے عرض کیا کہ میں آپ کا شکر گزار ہوں، لیکن یہ خدمت میرے اصل کام میں رکاوٹ کا باعث ہو گی۔ مجھے وہی کام کرنا چاہیے جو میں کر رہا ہوں۔ علاوہ ازیں نظریاتی کونسل کے کاروبار سے مجھے زیادہ اتفاق بھی نہیں ہے۔ وہ میری گزارش سن کر مسکرائے اور خاموش ہو گئے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

بائیس تیئس برس کی عمر یعنی قیام پاکستان سے پہلے تک یہ حالت تھی کہ جزا و سزا یا وظائف کے سلسلے کی جو احادیث پڑھی جاتی تھیں، ان کے متعلق یقین ہوتا تھا کہ واقعتاً ایسا ہو رہا ہے۔ اگر کسی کو قرآن یا حدیث کے الفاظ پڑھ کر دَم کیا جاتا تو سچ مچ مریض کو آرام آ جاتا۔ یہ میں نے کئی دفعہ تجربہ کیا تھا۔ حالاں کہ اس وقت گناہوں کا ارتکاب بھی ہوتا تھا اور بعض گناہ اچھے خاصے ''وزنی'' ہوتے تھے۔ پھر توبہ کرتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ واقعی توبہ قبول ہو گئی ہے۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد یہ صورتِ حال نہ رہی۔ معلوم نہیں اس کی کیا وجہ ہے۔ یعنی معمول بدل گیا۔ میں اسے اپنی بدقسمتی قرار دیتا ہوں۔

بس اسی قسم کے ہیں میرے معمولات اور اسی قسم کی ہیں میری عادات۔

اس سے کسی کو اتفاق ہوگا اور کسی کو اختلاف۔ میں سب کا شکر گزار ہوں۔ اب تک کسی عالم دین سے جھگڑا نہیں کیا تو اب اس عمر میں جھگڑنے کی کیا ضرورت ہے۔

۲۷ر اپریل ۲۰۰۸ء　　　　　　لاہور

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

سترھواں باب:

آزادیٔ برصغیر سے قبل کی چند مذہبی اور سیاسی جماعتیں اور تحریکیں

اب میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میری پیدائش سے پہلے یا میری ہوش میں برصغیر میں کون کون سی سیاسی، مذہبی یا دینی جماعتیں قائم ہوئیں اور برصغیر کی آزادی اور قیام پاکستان کے لیے کن کن سیاسی جماعتوں نے تحریکیں چلائیں اور اس کے کیا نتائج نکلے۔ نیز ملک کے دینی معاملات اور سیاسی کوائف میں انھوں نے کیا کردار ادا کیا۔ یہاں تمام تحریکوں یا تمام جماعتوں کا ذکر مقصود نہیں اور یہ ایک مضمون میں ہو بھی نہیں سکتا، چند تحریکوں اور چند جماعتوں کا ذکر کیا جائے گا، وہ بھی نہایت اختصار کے ساتھ۔ یہ وہ جماعتیں ہیں جن سے تھوڑا بہت میرا بھی تعلق رہا۔ کسی سے اتفاق کا اور کسی سے اختلاف کا۔

جماعت اہل حدیث:

میرا مسلکی تعلق چوں کہ اہل حدیث سے ہے، اس لیے میں سب سے پہلے اسی جماعت کا تذکرہ کروں گا اور مختصر الفاظ میں یہ بتاؤں گا کہ اس کے نظم و نسق کے لیے لاہور میں کیا کوششیں ہوئیں اور کس دور میں ہوئیں۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں لاہور شہر میں مسلک اہل حدیث کے حاملین کی تعداد بہت کم تھی اور جو لوگ اس مسلک سے تعلق رکھتے تھے وہ بھی شہر کے مختلف علاقوں اور محلوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ ۱۹۰۱ء میں پروفیسر عبدالقیوم مرحوم کے نانا مولوی سلطان احمد اور والد منشی فضل دین، اور بعض دیگر حضرات نے ان کو جمع کرنے کی کوشش کی۔ اس

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

وقت مولوی سلطان احمد اور منشی فضل دین اندرون موچی دروازہ میں اقامت گزیں تھے۔ انھوں نے اپنے مکان میں کچھ لوگوں کو جمع کیا اور ''حلقہ احباب اہل حدیث'' کے نام سے ان کی چھوٹی سی تنظیم قائم کی۔ اس وقت کے حالات کے مطابق یہ بہت بڑی بات تھی۔

پھر جب باہمی میل جول کا سلسلہ آگے بڑھا اور ان لوگوں کے ذریعے سے توحید و سنت کی نشر و اشاعت کا دائرہ کچھ وسیع ہوا تو ۱۹۰۶ء میں اسی ''حلقہ احباب اہل حدیث'' کو ''مجلس اہل حدیث'' کے نام سے موسوم کر دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی پنجاب کے مختلف علاقوں کے علمائے اہل حدیث سے روابط پیدا کرنے کی مہم شروع ہوگئی اور دائرۂ تعارف نے مزید وسعت اختیار کر لی۔ پھر تبلیغی سرگرمیوں میں بھی اضافہ ہوا اور تنظیمی رفتار میں بھی تیزی آئی۔

اب آہستہ آہستہ حالات ساز گار ہونے لگے اور صدائے حق کی حدود وسیع ہوئیں تو ۱۰۔ اپریل ۱۹۰۹ء کو لاہور کے ارکانِ اہل حدیث کا پھر ایک اجتماع ہوا، جس میں پنجاب کے متعدد علمائے اہل حدیث شریک ہوئے۔ دہلی اور یوپی کے بعض علمائے کرام نے بھی اس اجتماع میں شرکت کی۔ یہ جماعت اہل حدیث کا ایک قسم کا نمائندہ اجتماع تھا۔ اب لاہور کی ''مجلس اہل حدیث'' کا نام ''انجمن اہل حدیث'' رکھ دیا گیا۔ اس ''انجمن اہل حدیث لاہور'' کی پہلی مجلس منتظمہ حسب ذیل ارکان پر مشتمل تھی:

مولوی سلطان احمد، مولوی عبدالکریم، مولوی عبدالرحیم، مولوی سعید الدین، خلیفہ معین الدین، مولوی فضل حق، منشی فضل دین، منشی اللہ داد، منشی وارث علی، مولوی عبداللہ اور مولوی فضل حق ـــــ مجلس منتظمہ میں مولوی فضل حق نام کے دو بزرگ شامل تھے۔

انجمن اہل حدیث لاہور نے ۱۹۱۳ء میں ایک دینی درس گاہ قائم کی، جس کا نام ''مدرسۃ القرآن والحدیث'' رکھا گیا۔ اس کے لیے تین معلموں کی خدمات حاصل کی گئی تھیں، وہ تھے مولوی محمد حسن، مولوی عبداللہ اور مولوی احمد دین۔ اس مدرسے میں کشمیر، جموں، تبت اور بعض دوسرے علاقوں کے طلبا بھی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ طلبا کو ماہانہ وظیفہ دیا جاتا تھا اور ان کے باقاعدہ سالانہ امتحانات ہوتے تھے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

انجمن اہل حدیث پنجاب:

۱۹۲۰ء میں مسجد مبارک اہل حدیث (لاہور) میں انجمن اہل حدیث پنجاب کے نام سے صوبہ پنجاب کی جماعت اہل حدیث کی تنظیم قائم کی گئی، جس کے صدر مولانا عبدالقادر قصوری اور ناظم اعلیٰ مولانا ثناء اللہ امرتسری کو منتخب کیا گیا۔ اس کے بعد ۱۹۲۷ء میں اس انجمن کا دوبارہ انتخاب ہوا تو صدر قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری کو اور ناظم اعلیٰ مولانا عبدالمجید سوہدروی کو بنایا گیا۔ اس انجمن کی کوششوں سے پنجاب میں کتاب وسنت کی بہت تبلیغ ہوئی اور علمائے کرام نے مختلف مقامات میں توحید کی نشر واشاعت کا فریضہ انجام دیا۔

آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس:

۱۹۰۶ء میں مولانا ثناء اللہ امرتسری کی تجویز وتحریک سے آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کا قیام عمل میں آیا۔ دسمبر ۱۹۰۶ء میں ہندوستان کے صوبہ بہار کے شہر آرہ میں جماعت اہل حدیث کا ایک اجلاس منعقد ہوا، جس میں جماعت کے بہت سے علمائے کرام اور سرکردہ حضرات نے شرکت کی۔ اسی اجلاس میں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کی تشکیل کی گئی۔ کانفرنس کے پہلے صدر مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری (وفات ۲۲۔ نومبر ۱۹۱۸ء) اور ناظم اعلیٰ مولانا ثناء اللہ امرتسری (متوفی ۱۵۔ مارچ ۱۹۴۸ء) کو منتخب کیا گیا۔ اور اس کا مرکزی دفتر دہلی میں قائم کیا گیا۔ کانفرنس کے خازن مولانا شمس الحق عظیم آبادی (متوفی ۲۰۔ مارچ ۱۹۱۱ء) بنائے گئے تھے۔

کانفرنس کے تعارف اور اس کو منظم کرنے کی غرض سے پورے ہندوستان کا دورہ کرنے کے لیے ایک وفد بنایا گیا تھا جو مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی (وفات ۱۷۔ مارچ ۱۹۱۸ء) مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی (وفات ۱۲۔ جنوری ۱۹۵۶ء) اور مولانا ثناء اللہ امرتسری پر مشتمل تھا۔

اس کے بعد ملک کے مختلف شہروں اور قصبوں میں کانفرنس کے سالانہ جلسوں کے انعقاد کا سلسلہ چلا۔ قیام پاکستان تک اس کے چوبیس جلسے ہوئے۔ کانفرنس کی طرف سے مبلغین

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

مقرر کیے گئے تھے جو مختلف علاقوں میں جاتے اور لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے تھے۔ کانفرنس کی طرف سے تبلیغی رسائل بھی شائع کیے گئے۔

تقسیم ملک کے بعد مولانا عبدالوہاب آروی کے زیر صدارت ۱۸، ۱۹، ۲۰ جنوری ۱۹۵۷ء کو آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کا ایک اجلاس دہلی میں منعقد ہوا، جس میں اسے "مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند" کے نام سے موسوم کیا گیا۔

جماعت اسلامی:

۲۵، ۲۶۔ اگست ۱۹۴۱ء کو لاہور کے علاقہ اسلامیہ پارک میں جماعت اسلامی کا قیام عمل میں آیا۔ ابتدا میں یہ ۷۵ آدمیوں کا اجتماع تھا۔ یہ حضرات ہندوستان کے مختلف علاقوں سے تشریف لائے تھے، جن میں مولانا محمد منظور نعمانی، سیّد ابوالحسن علی ندوی، حکیم عبداللہ روڑوی، مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی ندوی، مستری محمد صدیق اور میاں طفیل محمد کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ ان سطور کا راقم عاجز بھی اس اجتماع میں شامل تھا۔ یہ اجتماع دو دن جاری رہا۔ دوسرے دن ۲۶۔ اگست کو جماعت کے قیام کا فیصلہ ہوا۔ جس مکان میں یہ اجتماع ہوا تھا، مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم اسی مکان میں قیام فرما تھے۔ انھوں نے ایک طویل مطبوعہ مضمون میں جماعت کے قیام کی ضرورت اور اس کے اغراض و مقاصد کا ذکر فرمایا۔ پھر کچھ بحث و تمحیص کے بعد اس کا نام جماعت اسلامی رکھا گیا اور اس کے پہلے امیر مولانا مودودیؒ کو بنایا گیا۔ اس میں شامل ہونے والوں میں تین درجے بنائے گئے تھے رکن، متفق، ہم درد۔ تینوں درجوں میں شمولیت کے لیے کچھ شرائط مقرر کی گئی تھیں۔ رکن کی شرائط بہت سخت تھیں۔ قیام جماعت کے بعد مولانا محمد منظور نعمانی نے لمبی دُعا فرمائی۔ لیکن اس سے تھوڑے عرصے کے بعد دعا کرنے والے مولانا محمد منظور نعمانی اور ان کے علاوہ سیّد ابوالحسن علی ندوی، شاہ محمد جعفر پھلواروی اور مولانا نذیر الحق میرٹھی جماعت سے علیحدہ ہو گئے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

پھر ۱۹۵۰ء میں حکیم عبداللہ روڑوی نے علیحدگی اختیار کر لی۔ ۱۹۵۷ء میں مولانا امین احسن اصلاحی، حکیم عبدالرحیم اشرف، مولانا عبدالغفار حسن اور دیگر بہت سے حضرات نے اس جماعت سے اپنی وابستگی منقطع کر لی۔ مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی نے اپنا نام متفقین میں اور میں نے ہم دردوں میں لکھوایا تھا۔ ہم دونوں پہلے اجلاس کے علاوہ کسی اجلاس میں شامل نہیں ہوئے۔ نہ ہم نے جماعت کی کسی تحریک میں کبھی حصہ لیا۔ بس وہی پہلا اور آخری اجلاس تھا، جس میں ہم شریک ہوئے۔

مولانا مودودی مرحوم بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ انھوں نے سیاست بھی کی اور کئی سال جیلوں میں رہے۔ قرآنِ مجید کی تفسیر بھی لکھی اور بہت سی کتابیں بھی تصنیف کیں۔ ان کے بعد اس جماعت کو اس مرتبے کا سربراہ نہ مل سکا اور نظر بہ ظاہر ملے گا بھی نہیں۔

جماعت اسلامی مولانا مودودیؒ کا تسلسل قائم نہ رکھ سکی۔ اس نے کلیتاً اپنے آپ کو سیاست کے حوالے کر دیا۔

جمعیت علمائے ہند:

یورپ کی پہلی جنگ عظیم چار سال جاری رہی تھی۔ جولائی ۱۹۱۴ء میں شروع اور اکتوبر ۱۹۱۸ء میں ختم ہوئی۔ اس جنگ کے بعد آزادی وطن کے لیے کئی تحریکیں شروع ہوئیں مثلاً تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون وغیرہ۔ جمعیت علمائے ہند بھی اسی جنگ کے بعد قائم ہوئی۔ برصغیر کی سیاست کا یہ وہ دور تھا جب کہ آزادئ وطن کے لیے کانگرس، مسلم لیگ اور مجلس خلافت وغیرہ باہم متحد تھیں اور سب کی ایک ہی آواز تھی، اور وہ آواز یہ تھی کہ اپنے ملک کو انگریزوں کے اقتدار سے آزاد کرایا جائے۔

انھی دنوں یعنی ۱۹۱۹ء میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی (لکھنوی) کی تحریک سے متحدہ ہندوستان کے علمائے کرام کا ایک اجتماع لکھنؤ میں ہوا، جس میں ہر مسلک فقہی کے اصحاب علم تشریف فرما تھے۔ اس اجتماع میں مولانا ثناءاللہ امرتسری نے تجویز پیش کی کہ ملکی سیاسیات کے مذہبی پہلوؤں پر غور کرنے کے لیے علماء کی ایک مستقل تنظیم قائم کرنی چاہیے۔ مولانا امرتسری

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کی اس تجویز پر دو دن بحث ہوتی رہی لیکن اس کا کوئی مثبت نتیجہ نہ نکلا۔

اس کے بعد نومبر ۱۹۱۹ء میں سب مذہبی جماعتوں کا ایک جلسہ دہلی میں منعقد ہوا، جس میں بہت سے علمائے کرام شریک تھے۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری بھی موجود تھے۔ انھوں نے اس جلسے میں بھی علمائے کرام کی تنظیم کے متعلق وہی تجویز پیش کی جو اس سے کچھ عرصہ پیشتر لکھنؤ میں پیش کی تھی۔ مولانا نے فرمایا کہ ہندوستان میں مختلف گروہوں اور قوموں کی تنظیمیں قائم ہو چکی ہیں اور قائم ہوتی رہتی ہیں جو اپنے اپنے دائرے میں ملک وقوم کی خدمت کر رہی ہیں لیکن علماء کی کوئی ایسی ملک گیر تنظیم نہیں ہے جو متفقہ طور پر ملک اور قوم کی خدمت کر سکے۔ بہتر ہوگا کہ علماء کی ایسی تنظیم قائم کی جائے جو مذہبی اور سیاسی معاملات میں اسلام کی روشنی میں عوام کی رہنمائی کے فرائض سرانجام دے۔ اس سے علماء کا وقار بڑھے گا اور آپس کے مذہبی اور مسلکی جھگڑوں میں کمی آئے گی۔ نیز اس طرح علماء کی وساطت سے اسلام کی آواز زیادہ مؤثر اور ہمہ گیر شکل اختیار کرے گی۔ مولانا کی یہ تقریر سن کر حاضرین کی اکثریت نے ان کی تائید کی اور غور وفکر کے بعد اس تنظیم کا نام ''جمعیت علمائے ہند'' رکھا گیا۔

یہ اواخر نومبر ۱۹۱۹ء کی بات ہے۔ اس سے اگلے مہینے یعنی دسمبر ۱۹۱۹ء کے آخری عشرے میں امرتسر میں آل انڈیا مجلس خلافت اور آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقد ہو رہے تھے، جس میں دیگر مباحث کے علاوہ مسئلہ خلافت اور ترکی کے مسئلے پر بھی بحث ہونے والی تھی اور یہ مسئلے چوں کہ خالص علمی، دینی اور فقہی نوعیت کے تھے، اس لیے ان پر بحث کے لیے ہندوستان کے علمائے کرام بہت بڑی تعداد میں جمع ہو رہے تھے۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی نے دہلی کی اس مجلس علماء کو امرتسر تشریف لانے کی دعوت دی اور فرمایا کہ جمعیت علمائے ہند کے قیام کے سلسلے میں ضروری باتیں وہیں ہوں گی اور اس کا پہلا اجلاس عام بھی وہیں (دسمبر میں) کیا جائے گا۔

اجلاس دہلی کے فیصلے کے مطابق ۲۸۔ دسمبر ۱۹۱۹ء کو امرتسر میں ہندوستان کے بہت سے علمائے کرام کا اجتماع ہوا، اور ان کی تنظیم کے متعلق ''جمعیت علمائے ہند'' کے نام کی توثیق کی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

گئی۔ دہلی کے اجلاس میں مولانا ثناء اللہ امرتسری کی تجویز سے اس کے صدر مفتی کفایت اللہ اور ناظم اعلیٰ مولانا احمد سعید دہلوی کو بنایا گیا۔ امرتسر کے اجتماع میں تیئیس ارکان پر مشتمل جمعیت کی مجلس عاملہ تشکیل دی گئی، جس میں ملک کے تمام صوبوں کو الگ الگ نمائندگی دی گئی۔ پنجاب سے مجلس عاملہ کے تین حضرات لیے گئے تھے، وہ تھے مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی اور مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی۔

امرتسر ہی میں ۳۱۔ دسمبر ۱۹۱۹ء اور یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو جمعیت علمائے ہند کا اجلاس عام بہ صدارت مولانا عبدالباری فرنگی محلی منعقد ہوا۔ اس کا خطبہ استقبالیہ مولانا ثناء اللہ امرتسری نے پڑھا۔ اس سے قبل اسی پنڈال میں آل انڈیا مسلم لیگ کا جلسہ حکیم محمد اجمل خاں کی صدارت میں ہوا تھا، اس کا خطبہ استقبالیہ بھی مولانا ثناء اللہ امرتسری نے پڑھا تھا۔ تمام سیاسی جماعتیں اس وقت انگریزی حکومت کے خلاف متحد تھیں اس لیے اسی پنڈال میں مولانا شوکت علی کی صدارت میں مجلس خلافت کا اور اسی پنڈال میں موتی لال نہرو کے زیر صدارت آل انڈیا کانگرس کا جلسہ منعقد ہوا۔

یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ اس ملک سے انگریزوں کے نکل جانے کے متعلق پہلی آواز جمعیت علمائے ہند کے بانی علمائے دین نے اُٹھائی اور اس موضوع کی اوّلیں قرارداد انہی بوریانشینوں کے پہلے جلسۂ عام میں امرتسر میں منظور کی گئی۔

جماعت اہل حدیث کے بعض دوست اس کا ذکر تو بار بار کرتے ہیں کہ مولانا ثناء اللہ امرتسری نے ۱۹۱۹ء کے مسلم لیگ کے اجلاس میں خطبہ استقبالیہ پڑھا تھا، لیکن اسی پنڈال میں انھوں نے جمعیت علمائے ہند کے اجلاس میں جو خطبہ استقبالیہ ارشاد فرمایا، اس کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ یہ بھی نہیں بتایا جاتا کہ اس وقت سب جماعتیں متحد تھیں جن میں کانگرس اور مسلم لیگ بھی تھیں، اور ان تمام جماعتوں کے اجلاس یکے بعد دیگرے ایک ہی پنڈال، ایک ہی مہینے اور ایک ہی شہر میں منعقد ہوئے تھے۔ اس کا اظہار بھی نہیں کیا جاتا کہ جمعیت علمائے ہند کا قیام مولانا ثناء اللہ امرتسری کی تجویز سے عمل میں آیا تھا۔ اس سیاسی حقیقت کا جماعت اہل حدیث

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کی موجودہ نسل کو شاید علم بھی نہیں ہو گا۔ اس کے بعد حالات نے ایسی کروٹ لی کہ یہ اتحاد ٹوٹ گیا اور پھر مولانا ثناء اللہ امرتسری کا مسلم لیگ سے تعلق قائم نہیں رہا۔ یہاں میرا مقصد صرف جمعیت علمائے ہند کے قیام کے متعلق عرض کرنا تھا۔ اس کے بعض اجلاسوں میں جو تقسیم ہند سے کچھ عرصہ قبل منعقد ہوئے، میں بھی شریک ہوا۔

مجلس احرار اسلام:

۱۹۲۸ء میں مجلس احرار اسلام قائم ہوئی۔ جن حضرات نے یہ جماعت قائم کی وہ تھے مولانا ظفر علی خاں، غازی عبدالرحمٰن امرتسری، چودھری افضل حق، سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی، شیخ حسام الدین، مولانا مظہر علی اظہر، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا عبدالغفار غزنوی اور بعض دیگر حضرات۔

مجلس احرار کے بانی انگریزی حکومت کے شدید مخالف اور زوردار مقرر تھے۔ مولانا ظفر علی خاں جلد ہی اس جماعت سے علیحدہ ہو گئے تھے اور پھر ایک وقت آیا کہ وہ احرار کی سخت مخالفت کرنے لگے تھے۔

مجلس احرار کے قیام کے بعد ۱۹۳۱ء میں جو سب سے پہلی تحریک شروع ہوئی، وہ کشمیر کی تحریک تھی۔ یہ انتہائی ہنگامہ خیز تحریک تھی۔ یہ پہلی تحریک تھی جس نے کشمیری مسلمانوں میں بے داری پیدا کی اور انھیں اپنے وجود کا احساس ہوا۔ چند امیر گھرانوں کے مسلمانوں کے سوا کشمیر کے عام مسلمانوں پر تعلیم اور ترقی کے دروازے تقریباً بند تھے۔ وہ لوگ کسب معاش کے لیے پنجاب کے مختلف شہروں (امرتسر، سیالکوٹ، جہلم، لاہور اور گوجراں والا) میں چلے گئے تھے۔ ریاست کشمیر کے بعض دیہات میں مسلمانوں کو نماز پڑھنے سے روک دیا گیا تھا۔ قرآنِ مجید کی بے حرمتی کے واقعات بھی ہوئے۔ اس قسم کے بہت سے واقعات سے متاثر ہو کر مجلس احرار نے کشمیر کے ڈوگرہ راج کے خلاف تحریک شروع کر دی، جس میں کم وبیش پچاس ہزار لوگوں نے گرفتاریاں دیں اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ جموں اور کشمیر کی جیلوں میں قیدیوں کے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

لیے جگہ نہ رہی۔ کشمیر میں بے داری اور اپنے حقوق کو سمجھنے کی اوّلیں لہر یہی تھی۔

احرار رہنماؤں نے برصغیر کی آزادی کے لیے بے پناہ قربانیاں دیں۔ احرار جیسے پر جوش اور حوصلہ مند نہ کسی سیاسی جماعت میں ورکر پیدا ہوئے اور نہ اس قسم کے بے دھڑک اور بے خوف مقرر کسی جماعت کو نصیب ہوئے۔

یہ درمیانے درجے کے لوگ تھے بلکہ ان میں سے بعض بے حد غریب تھے لیکن کسی قسم کا لالچ کبھی کسی احرار رہنما یا ورکر کو اس کی جگہ سے نہیں ہٹا سکا۔ انگریزی حکومت نے جیلوں میں ان کو بہ درجہ غایت اذیتوں میں مبتلا کیا مگر ان کے پائے استقلال میں کبھی لغزش نہیں آئی۔ تقسیم ملک کے بعد بھی ان میں سے بعض کو مبتلائے اذیت کیا گیا لیکن انھوں نے صبر و تحمل سے کام لیا۔

برصغیر میں بے شمار سیاسی اور مذہبی جماعتیں قائم ہوئیں اور انھوں نے اپنے اپنے دائرے میں خدمات بھی سر انجام دیں، لیکن مجلس احرار کا کچھ اپنا ہی اسلوب کار تھا جو لوگوں کے لیے خاص جاذبیت رکھتا تھا اور سب سے منفرد اسلوب تھا۔

انھوں نے مسلمانوں کی ہر تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھا اور ان کی امداد و اعانت کو اپنا فرض قرار دیا۔ اپنے عہد کی جماعتوں میں مجلس احرار برصغیر کی پہلی جماعت ہے، جس نے برصغیر میں حکومت الٰہیہ کے قیام کو اپنا مقصد قرار دیا۔ آزادی سے پہلے (۱۹۴۶ء میں) صوبہ بہار میں ہندو مسلم فسادات ہوئے تو اس وقت کی مسلمان جماعتوں میں مجلس احرار واحد جماعت تھی، جس نے بہار کے فساد زدہ مسلمانوں کے لیے امداد کی اپیل کی اور لوگوں نے اس کے مرکزی دفتر بیرون دہلی دروازہ میں امدادی رقوم جمع کرائیں۔ میں بھی اپنے وطن سے کچھ رقم لے کر آیا تھا جو اس کے دفتر میں جمع کرائی تھی۔ اس کی وصولی کی رسید مجھے ثناء اللہ بھٹہ نے دی تھی۔

تقسیم ملک کے زمانے میں تمام جماعتوں کے رہنما مشرقی پنجاب سے اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جانیں بچا کر پاکستان آنے کے لیے کوشاں تھے، لیکن لدھیانہ کے احرار رہنما ماسٹر تاج الدین انصاری مسلمانوں کے ایک بڑے قافلے کے ساتھ لاہور آئے۔ انھوں نے اپنی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ذات پر دوسروں کو ترجیح دی۔ تقسیم ملک سے ڈیڑھ سال قبل جو انتخابات ہوئے تھے اس میں مسلم لیگی اُمیدواروں نے قیام پاکستان کے نعرے پر کامیابی حاصل کی تھی، لیکن کوئی مسلم لیگی وزیر یا صوبائی اسمبلی کا ممبر مشرقی پنجاب سے اپنے ووٹروں کو ساتھ لے کر نہیں آیا۔ نہ مغربی پنجاب کے کسی مسلم لیگی رکن اسمبلی نے پناہ گزینوں کی مدد کی۔ صرف مجلس احرار کا ایک غریب رہنما ماسٹر تاج الدین انصاری تھا جو ایک بڑے قافلے کے ساتھ نہایت تکلیف کی حالت میں پاکستان پہنچا۔

مجلس احرار نے قیامِ پاکستان کی شدید مخالفت کی تھی۔ اس کے رہنماؤں کا نقطہ نظر یہ تھا کہ تقسیم ملک کے نتیجے میں ہندو مسلم فسادات شروع ہو جائیں گے جن میں مسلمانوں کا بہت زیادہ نقصان ہو گا۔ پھر آدھے سے زیادہ مسلمان ہندوستان میں رہ جائیں گے جو ہندوؤں کے مظالم کا شکار ہوں گے۔ پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں کے مسلمان آپس میں بٹ جانے کی وجہ سے کم زور ہو جائیں گے۔ لیکن ان کی مخالفت کے باوجود ملک تقسیم ہو گیا اور پاکستان بن گیا۔ احرار اپنی سیاست میں ہار گئے اور مسلم لیگ جیت گئی۔ مگر احراریوں نے نعرہ لگایا کہ اب یہ ملک ہمارا ہے۔ ہم نے برصغیر کی آزادی کے لیے قربانیاں دی ہیں اور جیلوں میں قید رہے ہیں، جس کے نتیجے میں برصغیر آزاد ہوا اور پاکستان بنا۔ اب ہماری تمام ہمدردیاں پاکستان کے لیے وقف ہیں۔ اس کو مضبوط بنانا ہمارے فرائض میں شامل ہے اور اس کی مخالفت کرنے والا ہمارا دشمن ہے۔

کسی سیاسی جماعت کے لیے اس قسم کا اعتراف بہت بڑے دل گردے کی بات ہے۔ بعض جماعتیں ایسی بھی ہیں جنھوں نے قیام پاکستان کی مخالفت کی اور اس سلسلے کے فیصلہ کن انتخابات کا بائی کاٹ کیا، لیکن انھیں اس کا اعتراف کرنے کی ہمت نہیں ہوئی بلکہ وہ لوگ مخالفت کو موافقت قرار دے رہے ہیں۔ مجلس احرار کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ اس کی مکمل تاریخ لکھی گئی جو آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے اور اس کے ایک غریب آدمی غلام نبی جانباز نے لکھی جو کئی سال جیلوں میں رہا۔ اس کتاب میں بعض تاریخی اور واقعاتی غلطیاں بھی ہیں۔ تاہم یہ ایک اہم کتاب ہے۔ اس کے علاوہ کسی جماعت کی اس طرح کی تاریخ نہیں لکھی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

گئی۔نواب زادہ نصر اللہ خاں مجلس احرار کے جنرل سیکرٹری تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ ہر اس تحریک کے سربراہ رہے جو پاکستان کے استحکام اور اس کی تعمیر و ترقی کے لیے معرضِ وجود میں آئی۔ یعنی یہ اعزاز بھی جماعت احرار کے ایک رہنما کے حصے میں آیا۔

جمعیت علمائے اسلام:

۱۹۴۶ء میں جمعیت علمائے ہند کے مقابلے میں جمعیت علمائے اسلام بنائی گئی۔ اس کا پہلا اجلاس جسے تاسیسی اجلاس کہنا چاہیے کلکتہ میں مولانا شبیر احمد عثمانی کے زیر صدارت ہونا قرار پایا تھا، لیکن مولانا ممدوح ناسازیٔ طبع کی بنا پر اس اجلاس میں شامل نہیں ہو سکے تھے، اس کی صدارت مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی نے کی۔ اس جماعت کے صدر مولانا عثمانی اور نائب صدر مولانا سیالکوٹی کو بنایا گیا۔ یہ جماعت دو قومی نظریہ کی مبلغ اور مسلم لیگ کی جاری کردہ تحریک پاکستان کی موید تھی۔ جمعیت علمائے ہند کے نقطہ نظر کے بالکل مخالف۔

مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی نے قیام پاکستان تک اس جماعت کی سرگرمیوں میں حصہ لیا اور مسلم لیگ کی مدد کی لیکن قیامِ پاکستان کے بعد نہ انھوں نے سیاست میں حصہ لیا اور نہ جمعیت علمائے اسلام سے کوئی تعلق رکھا۔ قیامِ پاکستان سے کچھ عرصہ بعد تک جمعیت علمائے اسلام دیو بندی احناف اور اہل حدیث کی مشترکہ جماعت رہی، اس کی مجلس عاملہ میں مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی بھی شامل تھے اور مولانا محمد اسماعیل سلفی بھی!

پھر ایک وقت آیا کہ یہ صرف بعض دیو بندی حضرات کی جماعت ہو کر رہ گئی۔ آہستہ آہستہ اس کے تین حصے ہو گئے۔ ایک حصے پر فضل الرحمن نے قبضہ کر لیا اور اس کا نام جمعیت اسلام (ف) رکھا۔ دوسرا حصہ ہمارے دوست مولانا سمیع الحق کے زیر نگرانی آیا اور اسے جمعیت علمائے اسلام (س) کہا جانے لگا۔ تیسرا حصہ جو بہت ہی مختصر تھا، مولانا احمد علی کے پوتے محمد اجمل قادری نے لے لیا، یہ حصہ جمعیت علمائے اسلام (ق) کہلایا۔ ان تینوں حصوں یعنی (ف، س، ق) کے مجموعے کو ایک بامذاق دیو بندی عالم نے ''فسق'' کے نام سے موسوم کیا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد اجمل قادری صاحب نے اپنی جماعت کو مولانا سمیع الحق کے حوالے کر دیا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

بعض دیو بندی علمائے کرام جمعیت علمائے اسلام کو جمعیت علمائے ہند کا تسلسل قرار دیتے ہیں۔ان کا یہ کہنا واقعات کے بالکل خلاف ہے۔ جمعیت علمائے ہند ایک قومی نظریے کی حامی اور تحریک پاکستان کی مخالف تھی۔ جب کہ جمعیت علمائے اسلام دوقومی نظریہ رکھتی تھی اور پاکستان کی حامی تھی۔اس کا قیام ہی جمعیت علمائے ہند کے خلاف عمل میں آیا تھا۔

جمعیت علمائے اسلام دراصل مولانا شبیر احمد عثمانی کی تحریک سے قائم ہوئی تھی اور اس کے قیام کے زمانے میں یہ بات مشہور ہوئی تھی کہ اس میں مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا حسین احمد مدنی کی معاصرت کا عنصر کارفرما ہے۔مولانا مدنی اصلاً دیو بند کے رہنے والے نہیں تھے، کسی دوسرے علاقے سے تعلق رکھتے تھے،لیکن دیو بند کی وجہ سے ملک کے تدریسی اور سیاسی حلقوں میں انھوں نے جو شہرت پائی وہ مولانا عثمانی کو حاصل نہ ہوئی،جس کی وجہ سے ان کے دل میں رقابت کا جذبہ اُبھر آیا۔ چنانچہ سیاسی میدان میں مقابلے کے لیے انھوں نے جمعیت علمائے اسلام قائم کر لی۔تدریسی سلسلے میں وہ اس سے بہت عرصہ قبل (۱۹۲۸ء میں) دارالعلوم دیوبند سے الگ ہوکر ڈابھیل چلے گئے تھے۔ وہاں انھوں نے تدریسی اور تصنیفی سلسلے میں بہت خدمات انجام دیں۔ان کی سیاست پر ان کی تدریس وتصنیف کو فوقیت حاصل ہے۔

تحریک مسجد شہید گنج:

مسجد شہید گنج کی تحریک ایک مشہور تحریک ہے جو ۱۹۳۵ء میں زیادہ تیزی کے ساتھ شروع ہوئی۔اس وقت میری عمر دس سال کی تھی اور میں اخبار پڑھتا اور اس قسم کی خبروں سے دلچسپی رکھتا تھا۔

مسجد شہید گنج لاہور کے لنڈا بازار میں ۱۶۴۵ء (۱۰۵۵ھ) میں تعمیر ہوئی تھی۔ اس پر سکھوں کا قبضہ ہوا تو وہ اسے گوردوارا شہید گنج کہنے لگے۔مسلمانوں نے ۱۸۵۳ء میں اس کے خلاف مقدمہ دائر کیا۔۱۸۸۵ء میں اس کا فیصلہ مسلمانوں کے خلاف ہوگیا۔

۱۹۲۹ء میں انجمن اسلامیہ پنجاب کی طرف سے حصولِ مسجد کے لیے کوشش کی گئی مگر

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کامیابی نہ ہوئی۔ اس سے چھ سال بعد ۱۹۳۵ء میں پھر کوشش ہوئی، جس میں سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان بہت حد تک ہم آہنگی پیدا ہوگئی تھی اور مصالحت کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ سکھوں کی طرف سے قیمت کا مطالبہ بھی ہوا مگر ابھی رقم کا فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ پھر اختلاف پیدا ہوگیا۔ اس اثنا میں میاں عبدالعزیز مالواڈہ (بار ایٹ لا) نے اپنی طرف سے سکھوں کو پیش کش کی کہ وہ مسجد شہید گنج مسلمانوں کو دے دیں اور اس کے بدلے میں مصری شاہ میں دو گنا یا چار گنا یا جتنی زمین چاہیں ان سے لے لیں۔ اسی دوران میں مسلمانوں کا ایک وفد میاں عبدالعزیز مالواڈہ کی قیادت میں پنجاب کے اس وقت کے گورنر ایمرسن سے ملا۔ میاں صاحب نے گورنر کو مندرجہ ذیل تین تجاویز پیش کیں کہ ان میں سے کسی ایک تجویز پر عمل کیا جائے تو معاملہ سلجھ سکتا ہے۔

۱۔ حکومت دفعہ ۱۴۴ لگا کر مسجد اپنی تحویل میں لے لے۔

۲۔ دوسرے آثارِ قدیمہ کی طرح یہ مسجد بھی آثارِ قدیمہ کے سپرد کر دی جائے۔

۳۔ مسلمانوں سے مسجد کی قیمت وصول کر کے سکھوں کو دے دی جائے اور مسجد کا قبضہ مسلمانوں کو دے دیا جائے۔

تیسری تجویز پر گورنر نے میاں صاحب سے کہا کہ اگر سکھوں نے مسجد کی بہت زیادہ قیمت کا مطالبہ کیا تو پھر کیا ہوگا؟

میاں صاحب نے جواب دیا کہ میں اپنی کوٹھی (واقع بیرونِ یکی گیٹ) سکھوں کو دینے پر تیار ہوں اور اسی وقت اس کا قبضہ دے دیتا ہوں۔ اس کوٹھی کی مالیت کئی لاکھ روپے ہے۔ اس میں جو سامان پڑا ہے، وہ بھی لاکھوں روپے کا ہے۔ میں سامان بھی ان کو دے دیتا ہوں۔ گورنر سے یہ گفتگو سکھ صاحبان کی موجودگی میں ہوئی۔

میاں صاحب کی باتیں سن کر گورنر نے وعدہ کیا کہ فی الحال مسجد اسی حالت میں رہے گی جس حالت میں اب ہے۔ سکھوں نے بھی یہی کہا کہ جب تک دونوں فریق (سکھ اور مسلمان) کسی آخری نتیجے تک نہیں پہنچ جاتے، مسجد موجودہ حالت میں رہے گی۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

اس کے بعد سکھوں کے ایک وفد نے گورنر سے علیحدگی میں بات کی تو گورنر نے ان سے کہا: ''یہ عمارت سالہا سال سے تمھارے قبضے میں ہے، تم جو جی چاہے کرو۔''

سکھوں کو حکومت کی حمایت حاصل تھی۔ اس لیے انھوں نے ۷۔ جولائی ۱۹۳۵ء کو رات کے اندھیرے میں مسجد منہدم کر دی۔ مسلمانوں کی تحریک پر امن تھی۔ انھیں مسجد کے انہدام سے بے حد تکلیف پہنچی۔ مسلمانوں نے اس حادثے پر جلوس نکالنے کی کوشش کی، لیکن حکومت نے وہ تمام راستے بند کر دیے جو لنڈا بازار یا مسجد شہید گنج کی طرف جاتے تھے۔ ۲۰۔ جولائی ۱۹۳۵ء کو مسجد شہید گنج کی تحریک کے سلسلے میں مسلمانوں پر حکومت نے گولی چلا دی، جس میں بے شمار مسلمان شہید ہو گئے۔ شہر میں کرفیو لگا دیا گیا، اور فوری طور پر فوج تعینات کر دی گئی۔

یہ اس دور کی بہت بڑی تحریک تھی جس سے مسلمانوں کو بے حد نقصان پہنچا۔ پھر جلسے ہوئے، جلوس نکلے، کمیٹیاں بنیں۔ اس سے دس گیارہ سال بعد پاکستان بن گیا۔ پھر نہ وہ عمارت گوردوارا شہید گنج کی صورت میں سکھوں کے قبضے میں رہی، نہ مسجد شہید گنج قرار دے کر اس پر مسلمانوں نے قبضہ کیا۔ اب اس کا کوئی نام بھی نہیں لیتا۔ بہت سال ہوئے میں نے ادھر سے گزرتے ہوئے اسے دیکھا۔ دروازے پر تالا لگا ہوا تھا اور چھت پر سکھوں کا پیلا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ اب بھی شاید وہی صورت حال ہو۔

خاکسار تحریک:

میری عمر کے ابتدائی دور کے زمانے کی ایک اور مشہور تحریک کا نام ''خاکسار تحریک'' ہے۔ اس تحریک کے بانی اور قائد کا نام علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی تھا۔ وہ ۲۵۔ اگست ۱۸۸۸ء کو مشرقی پنجاب کے ایک شہر گورداس پور کے کھاتے پیتے گھرانے میں پیدا ہوئے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۳۰ء میں انھوں نے ''خاکسار تحریک'' کا آغاز کیا۔ جو لوگ اس تحریک میں شامل ہوئے، وہ خاکسار کہلائے۔ علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی نے اپنی جماعت کو عسکری اور فوجی سطح پر منظم کیا اور خاکساروں کے نام مندرجہ ذیل احکام جاری کیے:

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

☼ شام کے بعد چپ راست کرتے ہوئے گلیوں اور بازاروں میں پریڈ کرو۔

☼ خاکی وردی پہنو۔

☼ بیلچہ ہاتھ میں رکھو اور اسے اپنا ہتھیار سمجھو۔

☼ بازو پر خدمت کا نشان لگاؤ۔

☼ خدمت خلق کو اپنا معمول بناؤ۔

☼ نہ کسی سے چندہ مانگو نہ چندہ قبول کرو۔

☼ سادہ زندگی بسر کرو۔

☼ کوئی خاکسار روزانہ اپنی خوراک پر اڑھائی آنے سے زیادہ خرچ نہ کرے۔

☼ اخوت اور بھائی چارے کی زندگی بسر کرو۔

☼ اپنے امیر کی اطاعت کرو، اس کا ہر حکم بلا تامل بجا لاؤ۔

☼ اپنا سفر اپنے پیسے سے کرو، کسی پر بوجھ نہ بنو۔

☼ مولوی کی بات نہ مانو نہ اس کا اعتبار کرو۔

علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی کے حکم کے مطابق خاکسار کھلے میدانوں میں اپنے کیمپ لگاتے اور وہاں ہٹلر کی تصویریں کثیر تعداد میں چھپوا کر لوگوں کو دیتے۔ ہٹلر اور علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی کی مشترکہ تصویروں کی نمائش بھی کی جاتی جس کا مطلب لوگوں کے نزدیک یہ تھا کہ علامہ مشرقی اپنی جماعت کو جرمنی کی نازی پارٹی کے طریقے پر منظّم کرنا اور ہٹلر کا سا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہتے ہیں۔

خاکسار تحریک نے تھوڑے عرصے میں بہت ترقی کر لی تھی اور بے شمار نوجوان مسلمان اس میں شامل ہو گئے تھے۔ خاکسار تحریک اگرچہ ہندوستان کے بعض دیگر صوبوں میں بھی تھی مگر ان کی زیادہ تعداد پنجاب میں تھی۔ میں ۱۹۳۸ء میں طلب علم کے لیے فیروز پور آ گیا تو پہلی دفعہ خاکساروں کو خاکی وردی پہنے اور کندھوں پر بیلچے اُٹھائے، بازاروں میں پریڈ کرتے اور اونچی آوازوں میں چپ راست کہتے ہوئے دیکھا۔ یہ سلسلہ زیادہ تر رات کو چلتا تھا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

جہاں اذان کی آواز سنائی دیتی، وہیں جدھر رُخ ہوتا نماز پڑھنا شروع کر دیتے۔ مجھے شبہ پڑتا ہے کہ مختصر یعنی ایک ایک یا دو دو رکعتیں نماز پڑھتے تھے، اس لیے کہ اپنے نقطہ نظر کی رُو سے وہ اپنے آپ کو حالت جنگ میں سمجھتے تھے۔

خاکساروں کی فوجی انداز کی پریڈ اور ان کی چپ راست کی مسلسل اور زوردار آوازوں اور بیلچہ برداری نے غیر مسلموں کو خوف اور تشویش میں مبتلا کر دیا تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر مسلم نوجوان بھی اسی انداز میں سوچنے لگے۔

۱۹۳۷ء کے عام انتخابات میں ہندوستان کے صوبہ یوپی میں کانگرس کی وزارت قائم ہوئی تو علامہ مشرقی نے وہاں جا کر اس کے خلاف تحریک چلائی۔ حکومت نے انھیں گرفتار کر لیا لیکن وہ معافی مانگ کر رہا ہو گئے۔ معافی نامہ اخبارات میں شائع ہوا تو اس کی تردید کر دی۔ دوبارہ یوپی چلے گئے تو پھر گرفتار کر لیے گئے۔ لکھنؤ کی جیل میں تھے کہ ستمبر ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ جیل سے وائسرائے کو تار بھیجا کہ وہ وطن کی حفاظت کے لیے غیر مشروط طور پر حکومت کو پچاس ہزار خاکسار دیں گے۔ یہ بہت بڑی پیش کش تھی جس پر عمل نہیں ہوا۔

بہرحال علامہ مشرقی کی خاکسار تحریک کے ردّعمل کے طور پر پنجاب میں مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کی تیرہ تنظیمیں قائم ہو گئیں جن کے نام یہ تھے: (۱) جیش احرار۔ (۲) اتحاد ملت۔ (۳) اکالی سینا۔ (۴) اکالی فوج۔ (۵) شکتی دل۔ (۶) اگنی دل۔ (۷) راشٹریہ ایکتا دل۔ (۸) گینتی دل۔ (۹) مہابیر دل پنجاب۔ (۱۰) پروونشل مہابیر دل۔ (۱۱) مرکزی مہابیر دل۔ (۱۲) بجرنگ اکھاڑ۔ (۱۳) غازی فوج۔

ان تیرہ عسکری قسم کی فرقہ وارانہ جماعتوں میں مسلمانوں کی صرف تین جماعتیں ہیں، جیش احرار، اتحاد ملت اور غازی فوج۔ باقی سب ہندوؤں اور سکھوں کی ہیں جو خاکسار تحریک کے ردّعمل کے طور پر قائم ہوئیں۔ تصادم کی صورت میں نقصان مسلمانوں ہی کا ہوتا۔

یہ جنگ کا زمانہ تھا اور فرقہ وارانہ کش مکش کے آثار پیدا ہو گئے تھے اس لیے حکومت پنجاب نے ۲۸۔ فروری ۱۹۴۰ء کو ان سب جماعتوں پر پابندی عائد کر دی۔ اس وقت پنجاب

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

میں یونینسٹ پارٹی کی حکومت تھی اور پنجاب کے وزیر اعظم سردار سکندر حیات خاں تھے۔ ہندوستان کی صوبائی حکومتیں چوں کہ ۱۹۳۵ء کے آئین کے تحت قائم ہوئی تھیں اس لیے اس آئین کے مطابق صوبائی وزیر اعلیٰ کو وزیر اعظم کہا جاتا تھا۔

ان دنوں خاکسار تحریک کے قائد علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی دہلی چلے گئے اور حکومت پنجاب اور بعض اہم شخصیتوں کی انتہائی کوشش کے باوجود لاہور نہیں آئے۔ ۲۳۔ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں مسلم لیگ کا جلسہ زیر صدارت قائداعظم محمد علی جناح منعقد ہو رہا تھا اور لاہور میں ان کا جلوس نکالنے کا فیصلہ بھی ہو چکا تھا لیکن خاکساروں نے جلسے سے صرف چار روز پیشتر ۱۹۔ مارچ کو ۳۱۳ خاکساروں کا جیش تیار کیا اور پریڈ کرتے ہوئے بادشاہی مسجد میں جا کر نمازِ ظہر پڑھنے کا منصوبہ بنایا۔

اس منصوبے کے تحت ۱۹۔ مارچ کو دن کے گیارہ بجے ۳۱۳ خاکساروں کا جیش سروں پر کفن باندھے بھاٹی دروازے کے اندر اونچی مسجد کے قریب چپ راست کرتا ہوا نکلا۔ تمام خاکسار خاکی وردی میں تھے اور جوتے خوب پالش کیے ہوئے تھے۔ ان کے بیلچے اس طرح چمک رہے تھے، جیسے ان پر چاندی کا پانی پھیرا گیا ہو۔ جیش مجاہدانہ شان سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کی قیادت ضلع جالندھر کے ایک گاؤں ''بھدم'' کا رہنے والا نوجوان کر رہا تھا، جس کا نام ضیغم تھا۔ بادشاہی مسجد میں جانے کے لیے جیش ہیرا منڈی کی طرف بڑھنے لگا تو پولیس افسروں اور چند سپاہیوں نے جیش کو روکنے کی کوشش کی، لیکن نہیں رُکا۔ سالارِ جیش ضیغم نے بلند آواز سے کہا دنیا کی کوئی طاقت نماز پر پابندی عائد نہیں کر سکتی۔ ہم کسی سے لڑنے نہیں آئے، نماز پڑھنے جا رہے ہیں۔ اب پولیس کی جماعت بھاگ کر تھانہ ٹبی پہنچ گئی۔ خاکساروں کا یہ دستہ جب ٹبی تھانہ کے قریب پہنچا تو آگے راستہ بند تھا اور پولیس کی بہت بڑی جماعت، جس کی رہنمائی گھڑ سوار پولیس کر رہی تھی، راستہ روکے کھڑی تھی۔ سڑک کے دو رویہ ڈنڈا بردار پولیس موجود تھی۔ جیسے ہی خاکسار ان کے درمیان میں پہنچے، پولیس کا ایک دستہ تیزی کے ساتھ ان کے عقب میں پہنچ گیا۔ پھر خاکساروں پر گولی چلنے لگی اور فائرنگ کی آواز

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

نے پوری آبادی کو دہشت زدہ کر دیا۔ سب سے پہلی گولی ضیغم نے کھائی جو خاکساروں کی قیادت کر رہا تھا۔

اس خونی تصادم میں حکومت نے چھبیس خاکساروں کی موت کا اعلان کیا، لیکن اس وقت کے ایک پولیس افسر کے اندازے کے مطابق مرنے والوں کی تعداد پچاس سے کم نہ تھی۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ پولیس کی گولی کا نشانہ بننے والوں کی تعداد سو سے بھی زیادہ تھی۔ پولیس کے صرف دو آدمی ہلاک ہوئے، ایک نیت رام سپاہی، دوسرا انگریز ڈی ایس پی مسٹر بینی۔ لیکن خاکساروں کے ہاتھوں زخمی کئی پولیس والے ہوئے۔

اس حادثے کے بعد خاکسار جماعت کو خلافِ قانون قرار دے دیا گیا اور ان کی گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ خاکساروں کا ہیڈ کوارٹر اچھرہ میں تھا جس کا نام انھوں نے ''ادارہ علیہ'' رکھا تھا۔ وہی علامہ مشرقی کا مسکن تھا۔ وہیں سے ان کا ہفت روزہ اخبار ''الاصلاح'' نکلتا تھا۔ حکومت نے ادارہ علیہ پر قبضہ کر لیا۔ علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی جو اس خونی تصادم سے قبل لاہور سے باہر چلے گئے تھے، گرفتار کر لیے گئے۔

پھر حالات نے ایسا رُخ اختیار کیا کہ خاکساروں نے لاہور کی مسجدوں میں ڈیرے ڈال لیے۔ زیادہ تر خاکسار رنگ محل کے علاقے میں سنہری مسجد میں آ گئے تھے۔ اس مسجد میں ایک آتش بیان مقرر عبدالجبار تمام دن لاؤڈ سپیکر پر حکومت کے خلاف تقریر کرتا رہتا تھا۔ مسجدوں میں محلے کے لوگ خاکساروں کو کھانے پینے کی چیزیں وافر مقدار میں پہنچا دیتے تھے اور انھیں وہاں کوئی تکلیف نہ تھی۔ یہ صورتِ حال حکومت کے لیے قابل برداشت نہ تھی چنانچہ اس نے مسجدوں پر چھاپا مارنے اور وہاں مقیم خاکساروں کو گرفتار کرنے کا فیصلہ کیا۔ آدھی رات کے قریب پولیس مسجد[illegible] میں اشک آور گیس کے گولے پھینکتی۔ جب خاکسار نڈھال ہو جاتے تو انھیں گرفتار کر لیا جاتا۔ بعض مقامات پر مسجدوں کے قریب رہنے والے لوگوں نے مزاحمت بھی کی اور مکانوں کی چھتوں سے پولیس پر روڑے پھینکے گئے۔

اسی اثنا میں معاملے کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی جو چار

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ارکان پر مشتمل تھی ۔ وہ تھے میاں عبدالعزیز مالواڈہ (بار ایٹ لا)، مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی، خالد لطیف گابا اور سیّد حبیب (جو اس وقت لاہور کے ایک روز نامہ اخبار ''سیاست'' کے ایڈیٹر تھے) میاں عبدالعزیز اس کمیٹی کے چیئر مین تھے۔

کمیٹی کے ارکان بہت سے لوگوں سے ملے اور حکومت کی طرف سے خاکساروں پر جو سختیاں کی گئیں اور ان پر جو ظلم ڈھائے گئے، ان کی تحقیقات کی۔ معاملہ عدالت میں گیا اور خاکساروں کے مقدمات میاں عبدالعزیز نے لڑے۔

علامہ مشرقی، مولویوں کے سخت مخالف تھے۔ انھوں نے خاکساروں کو حکم دیا تھا کہ ''مولوی کی بات نہ مانو، نہ اس کا اعتبار کرو۔'' انھوں نے بیس پمفلٹ شائع کیے جن کا عنوان تھا ''مولوی کا غلط مذہب نمبر ۱'' ...... ''مولوی کا غلط مذہب نمبر ۲'' ...... اس سلسلے کا آخری پمفلٹ تھا ''مولوی کا غلط مذہب نمبر ۲۰''۔ لیکن جب حکومت نے خاکساروں پر گولی چلائی، اور وہ مسجدوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے تو ان کی مدد مولویوں نے کی۔ مسجدوں کے امام اور خطیب انھیں کھانے پینے کی چیزیں مہیا کرتے رہے۔ پھر تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے انھوں نے حکومت کے خلاف اور خاکساروں کے حق میں بیانات دیے اور جو مظالم ان پر کیے گئے تھے، اس کی تفصیلات سے کمیٹی کے ارکان کو مطلع کیا۔ اس وقت حکومت کے مقابلے میں خاکساروں کی کسی صورت بھی مدد کرنا بہت مشکل تھا۔ وہ ملک میں انگریزی حکومت کا زمانہ تھا۔ اب جب کہ اپنی حکومت ہے اور جمہوری دور ہے، اس دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر اوقات بڑے بڑے لوگ حکومت کا مقابلہ کرنے اور حقیقت حال کی وضاحت کرنے سے گھبرا جاتے اور گریز کی راہیں تلاش کرنے لگتے ہیں۔

اس موقع پر یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ خاکساروں پر گولی چلنے کے بعد اس جماعت کے بانی علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا تھا۔ بعد ازاں وہ تقریباً تین برس مدراس میں نظر بند رہے۔ جنوری ۱۹۴۳ء کے پہلے ہفتے میں وہ رہا ہو کر لاہور آئے۔ ۸۔ جنوری کو انھوں نے شاہی مسجد میں تقریر کرتے ہوئے کہا: ''ایسے نازک وقت پر، جس میں

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ہندوستان گزر رہا ہے، اس ملک میں فرقہ وارانہ اتحاد کی سخت ضرورت ہے۔"

میں یہاں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تقسیم ملک سے قبل کی جن تحریکوں کو میں نے تھوڑا بہت دیکھا اور ان کے بعض اہم واقعات میرے سامنے رونما ہوئے، ان میں ایک تحریک کا نام خاکسار تحریک ہے، جس کے بانی اور قائد کا نام علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی تھا۔

خاکسار تحریک کا کیا انجام ہوا اور وہ کس طرح منزلِ اختتام کو پہنچی۔ یہ بھی سن لیجیے۔

علامہ مشرقی نے اعلان کیا:

"۳۰۔ جون ۱۹۴۷ء کو تین لاکھ خاکسار جامع مسجد اور لال قلعہ (دہلی) کے سامنے جمع ہو جائیں اور آخری حکم کا انتظار کریں۔ اگر تین لاکھ خاکسار جمع ہو گئے تو آخری پروگرام دیا جائے گا، ورنہ اس کھیل کو ختم کر دیا جائے گا۔"

مقررہ تاریخ کو تین لاکھ خاکسار جمع نہ ہوئے تو علامہ مشرقی نے خاکسار تحریک کو مندرجہ ذیل الفاظ میں ختم کرنے کا اعلان کیا:

"خاکسار تحریک کے ذریعے کئی مختلف طریقوں سے قوم کی انقلابی طاقت کو اُبھارنے کی کوششیں کی گئیں، لیکن قوم میں صرف یہی خاصیت پائی گئی کہ اگر کچھ بغیر محنت ملتا ہے تو لے لیا جائے، ورنہ میدانِ جنگ کا سپاہی بننے کی طاقت نہیں۔ اس حساب سے سترہ برس کے بعد قوم میں یہی چند قطرے ہیں جو نچوڑے جا سکتے تھے۔ ان تلوں میں اب مزید تیل باقی نہیں رہا۔

"میں نے ساڑھے تین ماہ پہلے اعلان کیا تھا کہ اگر تین لاکھ خاکسار دہلی میں جمع نہ ہوئے تو تحریک میں کوئی انقلابی طاقت نہ ہوگی اور اسے منتشر کر دینا لازم ہوگا۔

"ادھر پاکستان لینے کا جادو مسلمان پر غالب ہے، اس لیے مزید انقلابی طاقت کا قوم سے حاصل ہونا ناممکن ہے۔ مسلمان کو اب کسی غلبے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔

۳۔ جون ۱۹۴۷ء کے انگریزی حکومت کے اعلان کے بعد جو ۱۹۴۷ء کو ملک کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کا اعلان کیا گیا تھا، میں نے خاکسار تحریک کے انقلابی منشور کا

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

اعلان اس نیت سے کیا تھا کہ اگر تین لاکھ خاکسار دہلی میں جمع ہو گئے تو آئندہ لائحہ عمل واضح ہو سکے گا۔ یہ نہیں ہوا، اس لیے بہ صد حسرت تحریک کے منتشر ہونے کا اعلان کرتا ہوں۔

''آہ! سترہ برس کی زہرہ گداز محنت کے باوجود جو میں نے پوری دیانت داری سے کی اور اس میں اپنی عمر اور دولت کا بہترین حصہ صرف کیا، قوم میں وہ خاصیت پیدا نہ ہوئی کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کو غالب کر سکے۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔''

بانیٔ جماعت کے اس اعلان کے بعد خاکسار تحریک ختم ہو گئی۔ اب اس کا نام تو بعض لوگ لیتے ہیں مگر عملاً اس کا کہیں وجود نہیں۔ علامہ مشرقی جذباتی آدمی تھے۔ انھوں نے جماعت بنائی مگر اسے سنبھال نہ سکے۔ ان کے جماعتی اور تحریکی معاملات عجیب و غریب قسم کے تھے، جس کی تفصیل ان کی تحریروں میں پڑھی جا سکتی ہے۔ انھوں نے ۷۵ برس عمر پا کر ۲۷۔ اگست ۱۹۶۳ء کو سفر آخرت اختیار کیا۔ نمازِ جنازہ بادشاہی مسجد (لاہور) میں مولانا عبدالستار خان نیازی نے پڑھائی۔ میں ان کی نمازِ جنازہ میں شامل تھا۔ وہ ادارہ علیہ اچھرہ (لاہور) میں مدفون ہیں۔

یکم مئی ۲۰۰۸ء — لاہور

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

اٹھارھواں باب:

جماعت مجاہدین

آج سے تقریباً ایک سو پچاسی (۱۸۵) برس قبل ایک بے نام جماعت عالم وجود میں آئی، جسے بعد میں ''جماعت مجاہدین'' کہا جانے لگا۔ یہ جماعت سیّد احمد شہید بریلوی، مولانا اسماعیل شہید دہلوی اور دیگر بہت سے علمائے کرام پر مشتمل تھی۔ تھوڑے عرصے میں اس جماعت نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ اس جماعت (یا تحریک) کے موٹے موٹے دو مقاصد تھے۔

ایک مقصد یہ تھا کہ مسلمان بدعات کو ترک کر دیں۔ ہندووانہ رسوم سے جو باہمی اختلاط کی بنا پر ان میں رواج پا گئی ہیں، کنارہ کش ہو جائیں۔ جن امور میں شرک کا شائبہ پایا جاتا ہو، اس سے بچیں، اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کریں۔ نماز روزے کی پابندی کریں، عقیدہ وعمل میں احکامِ شریعت کو پیش نگاہ رکھیں اور ہر معاملے میں کتاب وسنت کو مشعل راہ ٹھہرائیں۔

دوسرا مقصد اس ملک سے انگریزی اثر و رسوخ کو ختم کرنا اور اس کے لیے باقاعدہ جہاد کی طرح ڈالنا تھا۔

یہ دونوں مقاصد اس دور میں بے حد اہمیت کے حامل اور بنیادی نوعیت کے تھے۔ چنانچہ ان مقاصد کی تکمیل کے لیے انھوں نے پوری جدو جہد کی اور اس سلسلے میں برصغیر کے مسلمانوں کو اپنا ہم خیال وہم نوا بنانے کے لیے کوشاں ہوئے۔

اس ملک میں احیائے دین کی یہ پہلی تحریک تھی جس کا نقطۂ نظر خالص کتاب وسنت کی ترویج واشاعت اور اس کی روشنی میں مسلمانوں کو دعوتِ جہاد دے کر غیر ملکی اقتدار کو ختم کرنا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس پاک باز گروہ نے اپنے ملک کی سکونت ترک کی اور سرحد پار کے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

علاقے کو جو انگریزوں کی دست رس اور غیر مسلمانوں کی عمل داری سے باہر تھا، اپنا مسکن قرار دیا۔

اس جماعت کا پہلا قافلہ جو سرحد پار کی طرف روانہ ہوا، پانچ اور چھ سو کے درمیان افراد پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ ۷۔ جمادی الاخری ۱۲۴۱ھ (۱۷۔ جنوری ۱۸۲۶ء) کو امیر المجاہدین سیّد احمد رائے بریلوی اور مولانا اسماعیل دہلوی کی قیادت میں روانہ ہوئے۔ ان کے پاس کل پانچ ہزار روپے کی رقم تھی، جسے زادِ راہ کہنا چاہیے۔ پنجاب میں سکھوں کی حکومت تھی، وہاں سے گزرنا مشکل تھا، لہٰذا یہ لوگ راجستھان سے ہوتے ہوئے سندھ پہنچے۔ وہاں سے قندھار اور پھر کابل گئے۔ کابل سے روانہ ہو کر ہندوستان کی شمال مغربی سرحد میں داخل ہوئے اور آزاد قبائل کو اپنی قیام گاہ بنایا۔

مجاہدین کی یہ جماعت طویل سفر کے بعد نومبر ۱۸۲۶ء کے آخر میں پشاور پہنچی۔ ۱۹۔ دسمبر ۱۸۲۶ء کو یہ لوگ نوشہرہ آئے۔ ان کی آمد کی اطلاع پا کر رنجیت سنگھ کی سکھ حکومت کا جرنیل بدھ سنگھ اکوڑہ خٹک میں داخل ہو چکا تھا۔ اسی رات لڑائی کا آغاز ہو گیا۔ اس کے بعد مختلف مقامات میں ساڑھے چار سال یہ سلسلہ جاری رہا۔ ۶۔ مئی ۱۸۳۱ء اس طویل سلسلۂ جہاد کی آخری تاریخ تھی جو سیّد احمد شہید کی کمان میں شروع ہوا تھا۔ اس میں سیّد صاحب اور مولانا شاہ اسماعیل دہلوی سمیت ایک اندازے کے مطابق تین سو کے لگ بھگ مجاہدین شہید ہوئے........اس جماعت کا یہ پہلا دور تھا جو بالا کوٹ کی رزم گاہِ شہادت میں ختم ہو گیا۔

اس کے بعد دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں مجاہدین نہ مایوس ہوئے نہ منتشر ہوئے۔ البتہ انتہائی فکر مند اور بے حد غم واندوہ میں ضرور مبتلا تھے۔ اس دورِ ابتلا میں سب سے بڑا مسئلہ منظّم ہو کر سلسلۂ جہاد کو دوبارہ شروع کرنے کا تھا۔ اس کے لیے سب کی نظر شیخ ولی محمد پھلتی پر پڑتی تھی جو سیّد احمد شہید کے خاص رفقاء میں سے تھے اور معاملہ فہم اور دور اندیش بزرگ تھے۔ لیکن وہ خود انتہائی پریشانی کے عالم میں تھے۔ ان کے سامنے اس وقت ایک اہم مسئلہ کامل احترام وحفاظت کے ساتھ سیّد احمد شہید کی اہلیہ کو سندھ پہنچانے کا تھا۔ چنانچہ انھوں نے تجویز پیش کی کہ مولوی نصیر الدین منگلوری کو امیر مقرر کیا جائے، جن میں علم وصالحیت کے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

اوصاف بھی پائے جاتے ہیں اور وہ سیّد بھی ہیں۔ پھر یہ ہوا کہ جماعت مجاہدین کی امارت کے منصب پر تو شیخ ولی محمد پھلتی کو فائز کیا گیا اور ان کی سالاری مولوی نصیر الدین منگلوری کے حصے میں آئی، لیکن چوں کہ شیخ ولی محمد پھلتی سیّد احمد شہید کے اہل خانہ کو لے کر سندھ روانہ ہو گئے تھے، اس لیے مجاہدین کی سالاری کے ساتھ ان کی امارت کی ذمہ داری بھی مولوی نصیر الدین منگلوری کے سپرد رہی۔

وہ اولوالعزم اور باہمت آدمی تھے۔ انھوں نے مختلف مقامات میں اپنی اولوالعزمی کے جوہر دکھائے اور بہت سے نازک حالات سے دوچار ہونے کے بعد ۱۸۴۰ء کو ان کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔ یہ مجاہدین کی عظیم الشان جماعت کا دوسرا دور تھا جو مولوی نصیر الدین منگلوری کی شہادت کے نتیجے میں اختتام کو پہنچا۔ ان کی شہادت کے وقت صرف ۷۰ یا ۸۰ مجاہدین باقی رہ گئے تھے، جو اپنی جگہ پر نہایت مضبوط تھے اور ان کا انتظام میر اولاد علی عظیم آبادی نے سنبھال رکھا تھا۔ اس وقت ان کا مرکز ستھانہ تھا، لیکن ستھانہ کی حالت بہت کمزور ہو گئی تھی۔

اب تیسرے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ سیّد نصیر الدین دہلوی کا دور ہے۔ مولوی سیّد نصیر الدین دہلوی بہت بڑے عالم بھی تھے اور بہت بڑے مجاہد بھی۔ بے حد دلیر اور شجاع بھی۔ حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی کے داماد۔ دہلی کے رہنے والے۔ وہ ۲۔ اپریل ۱۸۳۵ء (۳۔ ذی الحجہ ۱۲۵۰) کو بغرض جہاد گھر سے نکلے۔ اس وقت سیّد صاحب اور ان کے رفقائے عالی مقام کی شہادت پر چار سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ مختلف مقامات میں سکھوں اور انگریزوں سے جہاد کرتے ہوئے ۱۸۴۰ء میں ستھانہ پہنچے۔ اسی وقت مجاہدین نے ان کو اپنا امیر مقرر کر لیا لیکن تھوڑے عرصے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ ستھانہ ہی میں انھیں دفن کیا گیا۔ ۱۸۴۱ء میں دریائے سندھ میں سیلاب آیا تو اس میں ان کی قبر بہہ گئی۔

ان کے بعد مجاہدین نے اپنی امارت کا منصب حاجی سیّد عبدالرحیم کو سونپا۔ ان کا اصل وطن افغانستان تھا۔ وہ بھی کچھ عرصے کے بعد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کی وفات پر یہ دور بھی ختم ہو گیا۔ یہ دور صرف آٹھ مہینے پر مشتمل تھا، ستمبر ۱۸۴۰ء سے جون ۱۸۴۱ء تک ...... ! امرائے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

مجاہدین کی تقرری کی ترتیب کی رُو سے ہم اسے چوتھے دور سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

اب مجاہدین کے پانچویں امیر کی تقرری عمل میں آتی ہے۔ یہ مولانا عنایت علی عظیم آبادی ہیں جو علمی، خاندانی، ذاتی اور تنظیمی اعتبار سے غیر معمولی شخصیت کے مالک ہیں اور سیّد صاحب کے نزدیک نہایت معتمد علیہ اور ان سے انتہائی قرب و تعلق رکھنے والے۔ انھوں نے اس جماعت کے لیے بے حد محنت کی۔ وہ ۱۶۔ اکتوبر ۱۸۴۶ء (۲۴۔ شوال ۱۲۶۲ھ) تک جماعت مجاہدین کے منصب امارت پر متمکن رہے۔ ان کے بڑے بھائی مولانا ولایت علی عظیم آبادی وہاں پہنچے تو امارت کی باگ ڈور ان کے حوالے کر دی گئی۔

• مولانا ولایت علی اس جماعت کے چھٹے امیر تھے، جنھوں نے ۱۶۔ اکتوبر ۱۸۴۶ء کو یہ منصب سنبھالا۔ ان کی وفات ۵۔ نومبر ۱۸۵۲ء (۲۲۔ محرم ۱۲۶۹ھ) کو ہوئی۔ انھوں نے چونسٹھ سال عمر پائی۔

مولانا ولایت علی کی وفات کے بعد پھر مولانا عنایت علی کو مجاہدین کا امیر بنایا گیا۔ اب یہ منصب دوسری مرتبہ انھیں حاصل ہوا تھا۔ اس سے کئی سال پہلے سکھوں کی حکومت ختم ہو چکی تھی اور مجاہدین کا مقابلہ براہِ راست انگریزی حکومت سے تھا۔ مولانا عنایت علی عظیم آبادی انگریزی حکومت کے شدید مخالف تھے اور اس سے انتہائی دشمنی رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے دورِ امارت میں اپنی طاقت کے مطابق انگریزوں سے خوب جہاد کیا۔ مارچ ۱۸۵۸ء (شعبان ۱۲۷۴ھ) کو ان کا انتقال ہوا۔ مولانا عنایت علی کو دو دفعہ جماعت کا امیر بنایا گیا تھا۔

انگریزوں نے مجاہدین کو بے حد تشدد کا نشانہ بنایا اور اپنے طور پر اس جماعت کو بالکل ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ ان کے مرکز ستھانہ کو تباہ کر ڈالا اور توپوں سے اس گاؤں کو مسمار کر دیا۔ مجاہدین کا قلعہ ہاتھیوں سے تڑوا دیا گیا۔ مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

''ستھانہ منڈی اور مرکز مجاہدین کا نشان تک باقی نہ چھوڑا۔'' (سرگزشت مجاہدین، ص: ۳۱۳)

مولانا مہر مزید لکھتے ہیں:

''سیّد عبدالجبار شاہ کے مطابق ستھانہ کی دو آبادیاں تھیں، ایک زیریں ستھانہ، جس

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

میں عام لوگ رہتے تھے۔ دوسرا بالائی ستھانہ...... بالائی ستھانہ کو بارود سے اُڑا دیا گیا۔ سایہ دار درختوں کو بھی کاٹ ڈالا گیا۔ جو کٹ نہ سکے، ان کی چھال ایک ایک فٹ اُتار دی گئی تا کہ خشک ہو جائیں۔'' (سرگزشت مجاہدین، ص: ۳۱۳، ۳۱۴)

اب مجاہدین کا ایک اور دور شروع ہوتا ہے۔ مولانا ولایت علی کے بڑے بیٹے مولانا عبداللہ اپنے وطن پٹنہ (عظیم آباد) میں مقیم تھے۔ وہ انتہائی صاحب تقویٰ بزرگ تھے، جنگی معاملات کا بھی تجربہ رکھتے تھے۔ وہ ۱۹۔ نومبر ۱۸۵۹ء (۲۳۔ ربیع الاوّل ۱۲۷۶ھ) کو اہل و عیال سمیت پٹنہ سے روانہ ہوئے اور سرحد پہنچے۔ ان کا دورِ امارت چالیس برس پر محیط ہے، جو اس جماعت کا بہت طویل اور شان دار دورِ امارت ہے۔ انھوں نے ۲۹۔ نومبر ۱۹۰۲ء (۲۷۔ شعبان ۱۳۲۰ھ) کو وفات پائی۔ یہ اس جماعت کے آٹھویں امیر تھے۔

مولانا عبداللہ کی وفات کے بعد ان کے چھوٹے بھائی مولانا عبدالکریم کو مجاہدین کا امیر بنایا گیا۔ اب مجاہدین کی تعداد میں کافی اضافہ ہو گیا تھا اور ان کی سرگرمیاں بہت بڑھ گئی تھیں، انگریزی حکومت کے خلاف ان کے حملوں اور ان کی ترک تازیوں کا دائرہ دُور تک پھیل گیا تھا۔

مجاہدین کی جدو جہد کے آغاز سے لے کر مولانا عبدالکریم کے دورِ امارت تک ان کے جو مراکز مختلف مقامات پر قائم ہوئے، وہ انگریزوں نے تباہ کر دیے تھے، اب ان کا مرکز ''ٹیلوائی'' کے مقام پر تھا، لیکن مولانا عبدالکریم نے منصب امارت سنبھالا تو وہ ٹیلوائی سے ''اسمست'' چلے گئے تھے اور اسی کو اپنا مرکز قرار دے لیا تھا اور پھر ہمیشہ یہی مرکز رہا۔

اسمست کہاں واقع ہے؟ اس کی نشان دہی مولانا غلام رسول مہر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''اسمست برندوندی کے عین کنارے پر واقع ہے جو بونیر سے نکلتی اور کوہستانی علاقے کے نشیبی مقامات سے گزرتی ہوئی چملہ ندی سے مل کر دریائے سندھ میں گرتی ہے۔'' (سرگزشت مجاہدین، ص: ۴۹۴)

مولانا عبدالکریم بہت سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور میل جول کے آدمی تھے۔ لوگوں

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

سے ان کے روابط بڑے وسیع تھے۔ ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں سے بھی ان کے تعلقات قائم ہو چکے تھے، جن میں مولانا ابوالکلام آزاد، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی شامل ہیں...... دوسرے ہندوستانی رہنماؤں کی حیثیت تو سیاسی تھی، لیکن مولانا ابوالکلام آزاد کا معاملہ سیاسی رہنما کے علاوہ اپنے وقت کے منفرد دینی قائد کا بھی تھا۔ انھوں نے ''الہلال'' کے ذریعے قرآنی دعوت کا جودل پذیر سلسلہ شروع کیا تھا اور آزادیٔ وطن کی تحریک میں جو تگ و تاز کر رہے تھے، ان کی بنا پر وہ تمام مسلمان رہنماؤں سے یگانہ حیثیت رکھتے تھے، اس لیے مولانا ابوالکلام آزاد اپنی خاص قسم کی دینی حیثیت کی وجہ سے مجاہدین کے نزدیک ممتاز درجے پر فائز تھے اور ہندوستان میں مولانا عبدالکریم کے اصل مشیر......! مولانا غلام رسول مہر تحریر کرتے ہیں:

''مولانا عبدالکریم ہر ضروری معاملے کے متعلق مولانا آزاد ہی سے مشورہ لیتے تھے اور جب کوئی ضرورت پیش آتی تو اپنے خاص قاصد بھیج کر اس کی تکمیل کے انتظام کرا لیتے۔ مثلاً ایک موقعے پر مجاہدین کو قابل ڈاکٹر کی ضرورت پیش آئی۔ مولانا آزاد کو یہ اطلاع ملی تو انھوں نے اپنے نیاز مندوں میں سے ایک ایسے نوجوان کو وہاں بھیج دیا جنھوں نے ڈاکٹری کی تعلیم کی آخری سند تو ابھی نہیں لی تھی، لیکن اس کی تعلیم کے تمام مراحل طے کر چکے تھے۔ وہ ڈاکٹر مدت تک مجاہدین کے پاس رہا۔ پھر کابل چلا گیا اور وہاں سے ہندوستان واپس آیا۔''

(سرگزشت مجاہدین، ص: ۴۹۴)

مولانا عبدالکریم نے ۱۱۔ فروری ۱۹۱۵ء (۲۵۔ ربیع الاوّل ۱۳۳۳ھ) کو جمعرات کے روز نمازِ فجر کے بعد اسمست میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ جماعت مجاہدین کے یہ نویں امیر تھے اور کہا جاتا ہے کہ یہ اس قافلے کے آخری فرد تھے، جس کی قیادت کا شرف مولانا ولایت علی، مولانا عنایت علی اور مولانا عبداللہ حاصل کر چکے تھے۔

ان کی وفات کے ساتھ ہی امارت کا وہ دور ختم ہو گیا، جس کی ابتدا سیّد احمد شہید اور مولانا

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

شاہ اسماعیل شہید سے ہوئی تھی۔

مولانا عبدالکریم کے بعد امیر نعمت اللہ کو مسند امارت عطا کی گئی۔ یہ مولانا عبداللہ کے پوتے اور مطیع اللہ کے بیٹے تھے۔ انھیں ایک شخص محمد یوسف نے ۴۔ مئی ۱۹۲۱ء (۲۶۔ شعبان ۱۳۳۹ھ) کو شہید کر دیا تھا۔ شہادت کے وقت ان کی عمر صرف ۴۵ سال تھی۔ یہ مجاہدین کے دسویں امیر تھے۔

یہاں یہ یاد رہے کہ امیر نعمت اللہ کے زمانے میں جب مولانا عبدالرحیم عرف مولانا محمد بشیر وہاں گئے تو انھوں نے مجاہدین کا مرکز چمرکنڈ بنا لیا تھا جس نے بڑی شہرت پائی اور اسی مرکز کا نام لوگوں کی زبان پر چڑھ گیا۔

امیر نعمت اللہ کی شہادت کے بعد رحمت اللہ کو یہ منصب عطا کیا گیا اور وہ امیر رحمت اللہ کے نام سے معروف ہوئے۔ وہ مولانا عبداللہ کے پوتے اور امان اللہ کے فرزند تھے۔

وہ کن اوصاف و خصوصیات کے حامل تھے؟ اس سوال کا جواب مولانا غلام رسول مہر کی زبانی سنیے، جنھوں نے ان کو دیکھا اور ۱۹۴۵ء میں ان سے ملے تھے، ان کا کہنا ہے:

> ”یقین جانیے، مجھے وہ زہد و تقویٰ، ایثار و قربانی اور سادگی و بے نفسی کا ایک بے مثال نمونہ نظر آئے ...... میں اسمست گیا تو امیر صاحب نے کھدر کی شلوار اور کھدر کا لمبا کرتا پہن رکھا تھا۔ سر پر کھدر کی دستار تھی، جسے سیاہ رنگوا لیا تھا۔ پاؤں میں دیسی جوتا تھا، لیکن دونوں پاؤں کے جوتوں کی شکل مختلف تھی۔ میں نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ ایک جوتا کسی سے بدل گیا تھا، تلاش کے باوجود مل نہ سکا تو امیر صاحب بدلا ہوا جوتا ہی پہن رہے ہیں۔ وہ کام دے رہا ہے، اور جب کام دے رہا تو اسے چھوڑ کر نیا جوتا خریدنا محض تکلف ہے یا نفس پروری۔

وہ پانچوں وقت کی نماز مسجد میں خود پڑھاتے تھے۔ جماعت کے کاموں سے فارغ ہوتے تو اس کھیت میں کام کاج کے لیے چلے جاتے جو امیر کے لیے مخصوص تھا۔ اس میں موسم کی سبزیاں بوتے، روزانہ یا تیسرے دن سبزی اُتارتے، تھوڑی سی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

اپنے لیے رکھ کر باقی کی سب مجاہدین کے گھروں میں بانٹ آتے۔ مجھے تین چار روز ان کی خدمت میں رہنے اور گھنٹوں بات چیت کرنے کا موقع ملا۔ وہ خود بہت کم بولتے تھے۔ میں کوئی سوال کرتا تو تفصیل سے جواب دیتے۔"

(سرگزشت مجاہدین، ص: ۵۳۹، ۵۴۰)

جماعت مجاہدین نے ۱۸۲۶ء میں اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا اور آزادئ برصغیر یعنی ۱۹۴۷ء تک اس کی تگ وتاز مجاہدانہ جاری رہی۔ اس حساب سے اس جماعت نے ۱۲۱ سال کی طویل عمر پائی۔ اس اثنا میں اس پر کئی دور آئے اور وہ مختلف مراحل سے گزری۔ انگریزی حکومت نے اس کے کارکنوں کو گرفتار کیا، ان پر بغاوت کے مقدمات قائم کیے گئے، ان کو بے پناہ تشدد کا نشانہ بنایا، ان کو جیلوں میں ڈالا اور نوبت پھانسیوں تک پہنچی۔ اس جماعت کے اکابر کو جزائر انڈیمان (کالا پانی) بھیجا گیا۔ ان میں سے بعض نے وہیں وفات پائی اور بعض بیس بیس برس کے بعد وطن لوٹے۔ لیکن یہ لوگ استقامت کا پیکر تھے اور پہلے دن جو موقف اختیار کرلیا تھا، ہمیشہ اس پر قائم رہے۔ ان میں کبھی انتشار کی کیفیت پیدا نہیں ہوئی اور وہ کبھی مایوس نہیں ہوئے۔ وہ مستقل مزاج اور قوی ہمت لوگ تھے۔

ابتدا میں بعض احناف علمائے کرام بھی اس جماعت میں شامل تھے، لیکن بعد میں ایسے حالات پیدا ہوئے کہ وہ ان سے الگ ہو گئے اور فقط اہل حدیث میدان میں رہ گئے۔ مثلاً علمائے صادق پور، پنجاب کے مولانا محمد بشیر، مولانا فضل الٰہی، مولانا عبدالقادر قصوری، مولانا محی الدین احمد قصوری، مولانا محمد علی قصوری، فیروز پور کے حاجی نور احمد اور ان کے افرادِ خانہ مولانا عبید اللہ وغیرہ۔ مولانا محمد علی لکھوی۔ صوفی عبداللہ، علمائے غزنویہ، دہلی، بنارس اور مدراس کے حضرات۔ ضلع فیروز پور کے مولانا کرم الٰہی، ریاست پٹیالہ کے قاضی محمد سلیمان منصو رپوری، صوفی ولی محمد (ساکن فتوحی والا ضلع قصور)۔ یہ تمام لوگ اہل حدیث تھے، جنھیں وہابی کہا جاتا ہے۔ اس جماعت کے متعلق خود انگریز مصنفوں نے کتابیں لکھیں۔ مولانا غلام رسول مہر مرحوم ومغفور نے اُردو میں چار ضخیم کتابیں تصنیف کیں۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے بھی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

تفصیل سے لکھا۔ اور بھی متعدد اہل قلم نے ان کا تذکرہ کیا ہے۔ انگریزی میں ہندوستان کے ایک فاضل ڈاکٹر قیام الدین کی ''ہندوستان کی وہابی تحریک'' نہایت مشہور کتاب ہے۔ یہ دراصل ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے۔ یہاں اس سلسلے کی تفصیل میں جانا مقصود نہیں۔ تفصیل ان شاء اللہ اس کتاب میں بیان کی جائے گی جو برصغیر کی آزادی میں اہل حدیث کی تگ و دو کے موضوع پر لکھنا چاہتا ہوں۔

جماعت مجاہدین سے تعلق رکھنے والے اور ان کی مالی اور افرادی طور سے مدد کرنے والے بعض حضرات سے میری ملاقاتیں رہی ہیں۔ مجھے ان کی مجلسوں میں حاضر ہونے اور ان کی باتیں سننے کا شرف حاصل ہے۔ ماضی قریب کے ایک بہت بڑے مجاہد صوفی عبداللہ مرحوم کے حالات میں تو اس فقیر نے مستقل کتاب لکھی ہے جو ساڑھے چار سو صفحات پر محیط ہے اور مکتبہ سلفیہ شیش محل روڈ، لاہور نے شائع کی ہے۔

یہاں صرف یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ آزادیٔ برصغیر سے قبل کی سیاسی اور دینی و اصلاحی جماعتوں میں ''جماعت مجاہدین'' بھی تھی، جس کے دورِ آخر کے بعض ارکان سے کسی نہ کسی انداز میں میرا تعلق رہا۔ انگریزی حکومت کی پولیس ہر وقت ان لوگوں کے تعاقب میں رہتی تھی جن کے بارے میں اسے خیال گزرتا کہ یہ جماعت مجاہدین سے تھوڑا یا زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔ اس سے مالی تعاون کرتے ہیں یا اس کے نقطہ نظر کے مؤید ہیں، انھیں گرفتار کر لیا جاتا۔

مولانا محمد علی لکھوی اس جماعت کے کارکنوں کی معرفت اس کے مرکز چمرکنڈ میں روپے بھی بھیجتے تھے اور بعض مجاہدوں کو بھی انھوں نے کسی ذریعے سے وہاں بھیجا جنھوں نے جماعت کے طے شدہ منصوبے کے مطابق انگریزوں سے جہاد کیا۔ خفیہ پولیس والوں کو اس کا پتا چلا تو وہ مولانا ممدوح کی ان سرگرمیوں کی دیکھ بھال کرنے لگی۔ یہاں اس سلسلے کا ایک عجیب واقعہ سنیے۔

ہمارے ہاں کوٹ کپورہ (ریاست فرید کوٹ) میں جو لوگ خفیہ طور سے اس دور کے مطابق مجاہدین کی مالی امداد کرتے تھے، ان میں ہمارے ایک بزرگ حاجی محمد کریم بھی تھے،

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

(جن کا ذکر اس کتاب کے پہلے باب میں کیا گیا ہے) اور ایک معاون حاجی خیر الدین تھے (جو ۱۹۴۳ء میں کوٹ کپورہ میں وفات پا گئے تھے)۔ ملک تقسیم ہو گیا، پاکستان معرضِ قیام میں آ گیا اور ہم لوگوں نے ترک وطن کر کے ضلع فیصل آباد کی تحصیل جڑاں والا کے ایک گاؤں میں سکونت اختیار کر لی۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد حاجی محمد کریم کو جڑاں والا کی پولیس نے تھانے بلا کر پوچھا کہ آپ جماعت مجاہدین کی مالی مدد کرتے رہے ہیں۔ ان کے علاوہ حاجی خیر الدین کے بیٹے حاجی محمد رفیق زبیدی سے بھی پوچھ گچھ ہوئی کہ آپ کے والد جماعت مجاہدین کے معاون تھے۔

پولیس نے ان سے زیادہ باز پرس نہیں کی، بس ایک مرتبہ پوچھا اور معاملہ ختم ہو گیا، لیکن سوال یہ ہے کہ سالہا سال قبل جو تعاون جماعت مجاہدین سے ہندوستان میں کیا گیا تھا اس کا علم پاکستان کی ایک تحصیل کی پولیس کو کیسے ہوا؟ اور اسے کس ذریعے سے پتا چلا کہ یہ لوگ چمرکنڈ کی جماعت مجاہدین کے معاون تھے؟ معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں خفیہ پولیس کی نگرانی کا جال بہت وسیع تھا اور ہر تھانے میں کسی نہ کسی صورت میں مجاہدین کی امداد کرنے والوں کا ریکارڈ موجود تھا جو ایک سرکاری دفتر سے دوسرے سرکاری دفتر میں منتقل کر دیا جاتا تھا۔

۳ر مئی ۲۰۰۸ء — لاہور

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

انیسواں باب:

چند خالص سیاسی جماعتیں اور تحریکیں

آل انڈیا کانگرس کمیٹی:

۱۸۸۴ء میں ہندوستان کا وائسرائے لارڈ ڈفرن تھا۔ وہ ہندوستانیوں کو سیاسی مراعات دینے کا حامی تھا۔ اسی زمانے میں انڈین سول سروس سے تعلق رکھنے والا ایک انگریز مسٹر ہیوم تھا جو اپنے منصب سے ریٹائرڈ ہو چکا تھا۔ وہ ہندوستانیوں کی حمایت میں ہمیشہ سرگرم رہا۔ اس کے علاوہ برطانوی پارلیمنٹ کے چند ارکان بھی ہندوستان کو سیاسی مراعات دینے کے خواہاں تھے۔ مسٹر ہیوم کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ ہندوستانی اپنی ایک جماعت بنائیں جس کا ہر سال جلسۂ عام ہو، جس میں وہ اس پر غور کریں کہ انھیں انگریزی حکومت سے کیا تکلیفیں پہنچ رہی ہیں اور ان کا ازالہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ نیز وہ اپنے مطالبات حکومت کو پیش کریں۔ چنانچہ مسٹر ہیوم کی کوشش سے ۱۸۸۴ء میں انٹرنیشنل کانگرس کا قیام عمل میں آیا اور اس کا پہلا اجلاس پونا میں ۱۸۸۵ء میں بہ صدارت سریندر وناتھ بونر جی ہوا۔

دوسرا سالانہ اجلاس آخر دسمبر ۱۸۸۶ء میں کلکتہ میں ایک پارسی لیڈر دادا بھائی نوروجی کی صدارت میں منعقد ہوا اور تیسرا اجلاس ۱۸۸۷ء میں بمبئی کے ایک مشہور مسلمان رہنما بدرالدین طیب کے زیر صدارت مدراس میں منعقد کیا گیا۔ تیسرے اجلاس میں حسب ذیل قراردادیں منظور کی گئیں:

۱۔ ہندوستانیوں کو فوج کے اعلیٰ عہدوں پر متعین کیا جائے اور ہندوستان میں ایک فوجی کالج قائم کیا جائے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

۲۔ قانونِ اسلحہ میں ایسی ترمیم کی جائے، جس کی رو سے زیادہ لوگوں کو ہتھیار استعمال کرنے کا اختیار حاصل ہو۔

۳۔ جن لوگوں کی سالانہ آمدنی ایک ہزار روپے سے کم ہے ان سے انکم ٹیکس وصول نہ کیا جائے۔

۴۔ ہندوستانیوں کی غربت کو مدنظر رکھ کر ان کے لیے صنعتی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

اس طرح یہ سلسلہ آگے چلتا گیا اور روز بروز کانگرس کی سیاسی سرگرمیاں بڑھتی گئیں۔ تا آں کہ وہ انگریزوں کی سخت مخالفت پر اُتر آئی اور اس کے کارکنوں اور رہنماؤں کو انگریزی حکومت گرفتار کر کے جیلوں میں ڈالنے اور قید کرنے لگی۔ کانگرس کو خلافِ قانون بھی قرار دیا گیا۔ پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ ستمبر ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو کانگرس نے انگریزی حکومت کی مدد کے لیے ہندوستانیوں کی فوجی بھرتی کی شدید مخالفت کی جس کے نتیجے میں اس کے بہت سے رہنما اور کارکن گرفتار کر لیے گئے۔ پھر ۸۔ اگست ۱۹۴۲ء کو کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس صدر کانگرس مولانا ابوالکلام آزاد کے زیر صدارت بمبئی میں منعقد ہوا، جس میں انگریزی حکومت کے خلاف ''ہندوستان خالی کرو'' (Quit-India) ریزولیوشن پاس کیا گیا اور پورے ہندوستان میں گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پھر یہ ریزولیوشن حصولِ آزادی کی ایک ملک گیر تحریک کی صورت اختیار کر گیا۔

کانگرس ورکنگ کمیٹی کے متعدد ارکان (مولانا ابوالکلام آزاد، جواہر لال نہرو، مسٹر آصف علی، سیّد محمود، سردار پٹیل) اور بعض دیگر رہنماؤں کو قلعہ احمد نگر میں محبوس کر دیا گیا۔ جولائی ۱۹۴۵ء میں جنگ ختم ہوئی، لیکن اتحادی حکومتوں کی فتح کے آثار اس سے کافی عرصہ پہلے ظاہر ہونے لگے تھے، جس کے نتیجے میں جون ۱۹۴۵ء میں کانگرسی قیادت کی رہائی کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ رہائی کے بعد انگریزی حکومت سے برصغیر کی آزادی کے متعلق گفتگو ہونے لگی، جو مختلف مراحل سے گزرتی ہوئی بالآخر آزادی تک پہنچی۔ ۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء کو برصغیر دو حصوں میں بٹا۔ ایک حصہ بہ دستور ہندوستان رہا، دوسرا حصہ پاکستان کے نام سے موسوم ہوا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ہندوستان میں کانگرس کی حکومت قائم ہوئی اور انگریزی حکومت کے قیدی، اس ملک کی حکومت پر قابض ہوئے۔

کانگرس ۱۸۸۴ء میں قائم ہوئی تھی۔ ۶۳ سال اس کی تحریک مختلف منزلوں سے گزری اور پھر اس کی حکومت قائم ہوئی۔

بے شک برصغیر آزاد ہو گیا اور ہندوستان اور پاکستان دو الگ الگ ملک عالم وجود میں آ گئے۔ لیکن آزادی کے ساتھ جو فسادات کا ریلا آیا اور قتل و غارت کا جو طوفان اُٹھا وہ نہایت الم ناک تھا۔ کروڑوں کی تعداد میں لوگ اپنے آبائی مسکنوں سے نکل کر دوسرے مقامات میں منتقل ہوئے، لاکھوں انسان قتل ہوئے۔ اربوں کھربوں کی جائدادیں تباہ ہوئیں۔ لا تعداد مسجدیں اور مدرسے ختم ہو گئے۔ بے شمار شہروں، قصبوں اور دیہاتوں میں اسلام کا نام ونشان مٹ گیا۔ یہ سب بربادیاں ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور ان سے خود بھی دو چار ہوئے۔ یہ غالباً تاریخ انسانی کا سب سے بڑا فرقہ وارانہ فساد تھا اور سب سے بڑی انتقال آبادی۔

مسلم لیگ کا قیام:

کانگرس کے قیام سے بائیس سال بعد ۳۰۔ دسمبر ۱۹۰۶ء کو ڈھاکا میں نواب سلیم اللہ خاں کی تجویز و تحریک سے نواب وقار الملک کے زیر صدارت متحدہ ہندوستان کے بعض مسلمان سیاسی رہنماؤں کا جلسہ منعقد ہوا، جس میں آل انڈیا مسلم لیگ قائم کی گئی۔ یہ ملک میں انگریزی حکومت کے انتہائی عروج کا دور تھا۔ اس دور میں اپنے جائز اور بنیادی حقوق مانگنے کے لیے بھی بے حد نرم الفاظ استعمال کیے جاتے تھے۔ قیام مسلم لیگ کے حسب ذیل مقاصد قرار دیے گئے تھے:

☆ مسلمانانِ ہند کے دل میں برطانوی حکومت کے متعلق وفادارانہ خیالات کو ترقی دینا اور حکومت کی کسی کارروائی کے بارے میں انھیں غلط فہمی ہو تو اسے دُور کرنا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

☆ مسلمانانِ ہند کے سیاسی حقوق و فوائد کی نگہداشت کرنا اور ان کی ضروریات اور خواہشات کو مؤدبانہ طریقے سے حکومت کے سامنے پیش کرنا۔

☆ مسلم لیگ کے مقاصد کو نقصان پہنچائے بغیر مسلمانانِ ہند میں ایسے خیالات پیدا نہ ہونے دینا جو دوسرے فرقوں کے بارے میں معاندانہ ہوں۔

قیامِ مسلم لیگ کے ان مقاصد پر تنقید کی ضرورت نہیں۔ وہ انگریزی حکومت کا زمانہ تھا جو نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ تمام ہندوستانیوں کے لیے سخت اذیت ناک زمانہ تھا۔ آزادی کے بعد کیا ہوا؟ پاکستان میں ہم نے دیکھا کہ ایوب خاں نے حکومت پر قبضہ کیا تو بے شمار سیاست دان اس کی حمایت کرنے لگے اور اس کی امداد کے لیے کنونشن مسلم لیگ قائم کی۔ یحییٰ خاں برسرِ اقتدار آیا تو اس زانی اور شرابی کو بعض جماعتوں کے قائدین نے غازی قرار دیا۔ ضیاء الحق نے زمامِ حکومت ہاتھ میں لی تو ایک دو کے سوا تمام سیاسی جماعتیں اس کی کابینہ میں شامل ہو گئیں اور اس کو ملک کا نجات دہندہ قرار دیا اور ڈھنڈورہ پیٹنا شروع کر دیا کہ اب پاکستان میں اسلامی آئین نافذ ہو جائے گا۔ اس کی حمایت کے لیے جونیجو مسلم لیگ کے نام سے ایک مسلم لیگ بنائی گئی۔ پھر مشرف آیا تو بڑے بڑے لیڈر اس کے ساتھ ہو گئے اور اس کی حفاظت کے لیے قاف لیگ عالم وجود میں آ گئی۔ اس کے سامنے کسی قاف لیگیے کو بولنے کی جرأت نہ تھی۔ مجلس عمل نے اس کے لیے ۱۷ ویں ترمیم پاس کر دی۔ بہر حال ۱۹۰۶ء کے زمانے میں قیام مسلم لیگ کے مقاصد پر متعجب ہونے کی ضرورت نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مسلم لیگ انگریزوں نے بنائی تھی۔ سوال یہ ہے کہ کانگرس کس نے بنائی تھی؟ وہ بھی انگریزوں نے بنائی تھی، اور مسلم لیگ سے پہلے بنائی تھی۔ وہ تو محکومی کا زمانہ تھا۔ آزادی کے بعد کیا ہوا؟ ہم نے سیاسی اعتبار سے امریکہ کو اپنا نجات دہندہ قرار دیا۔ ایوب خاں کی فوجی حکومت کا باعث امریکہ ہوا، ضیاء الحق کو وہی لایا، ذوالفقار علی بھٹو کو اسی نے پھانسی دی، مشرف کو وہی لایا اور جو جی چاہا اس سے کراتا رہا۔ آج ملک میں جو افراتفری پھیلی ہوئی ہے، وہ امریکہ کی پیدا کردہ ہے جو اس نے مشرف کے ذریعے پروان چڑھائی۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

یہاں یہ بھی سنتے جایئے کہ مسلم لیگ ۱۹۰۶ء میں ڈھاکا میں قائم ہوئی۔ اس سے اگلے سال پنجاب میں دو مسلم لیگیں قائم ہوگئیں۔ ایک لاہور کے سر محمد شفیع بار ایٹ لا کی اور دوسری میاں سر فضل حسین کی۔

میں یہاں تفصیل میں جانا نہیں چاہتا۔ اختصار کے ساتھ یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ایک وقت آیا کہ اسی مسلم لیگ نے حصولِ پاکستان کو اپنا اصل مقصد قرار دیا اور ایک خاص رفتار کے ساتھ اس مقصد کی طرف بڑھنے لگی۔ اس کے منصب قیادت پر قائد اعظم محمد علی جناح فائز ہوئے اور انھوں نے مسلمانوں کے دلوں میں یہ بات راسخ کر دی کہ اس برصغیر میں ان کے تحفظ کے لیے علیحدہ خطۂ ارض کا حصول نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ ۲۳۔ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس منعقد ہوا، جس میں ملک کے مختلف حصوں سے مسلم لیگی رہنما شامل ہوئے اور اس مضمون کی قرار داد منظور کی گئی۔ پھر اس قرار داد نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی اور پورے ملک میں پاکستان کے نعرے گونجنے لگے۔ آخر ۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء کو ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔

تقسیم اس طرح ہوئی کہ صوبہ پنجاب کے انتیس ضلعوں میں سے سترہ ضلعے پاکستان کو اور بارہ ہندوستان کو ملے۔ بنگال تقریباً آدھا پاکستان میں شامل ہوا، اور آسام کا صرف ضلع سلہٹ پاکستان کو ملا۔ ان کے علاوہ تین صوبے (سندھ، سرحد، بلوچستان) پاکستان کے حصے میں آئے۔ قائد اعظم محمد علی جناح کے علاوہ جن مسلم لیگی رہنماؤں کو ہم نے دیکھا اور ان کی تقریریں سنیں وہ تھے نواب زادہ لیاقت علی خاں، چودھری خلیق الزماں۔ اسماعیل ابراہیم چندری گر، سردار عبدالرب نشتر، راجا غضنفر علی خاں، حسین شہید سہروردی، خواجہ ناظم الدین اور دیگر بہت سے رہنما۔ ان میں سے بعض کے ساتھ کھل کر باتیں کیں۔

صوبہ پنجاب کے مسلم لیگی رہنماؤں میں سے نواب افتخار حسین خاں آف ممدوٹ، میاں ممتاز دولتانہ، میاں عبدالباری اور متعدد دوسرے قائدین سے ملنے اور ان کی باتیں سننے کے مواقع میسر آئے۔ مسلم لیگ کی تحریک پاکستان کے زیادہ زور کا زمانہ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کا

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

تھا۔ یہ ہنگامہ خیز زمانہ تھا جو ہم نے دیکھا۔ مسلم لیگیوں کی تقریریں بھی سنیں اور اس کے مخالفوں یعنی کانگرسی، جمعیت علمائی اور احراری رہنماؤں کی بھی۔ اس زمانے میں سکھ لیڈروں کے جلسے بھی دیکھے اور ان کی تقریریں سنیں۔ وہ اخبارات ہم بڑی دلچسپی سے پڑھتے رہے جو تحریک پاکستان کے حامی یا مخالف تھے۔ مشہور مسلم لیگی قائدین میں سے نواب زادہ لیاقت علی خاں، راجا غضنفر علی خاں اور سردار عبدالرب نشتر ہندوستان کی عارضی حکومت میں شامل تھے جو کانگرس اور مسلم لیگ کی مشترکہ حکومت تھی۔

قیام پاکستان کی تحریک کے وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد دس کروڑ تھی۔ اس سے پچیس سال بعد بنگلہ دیش بنا تو برصغیر کے مسلمان تین حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ اب تینوں ملکوں میں ان کی مجموعی تعداد ساٹھ کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ موجودہ دور کے بعض ہندو دانش ور یہ کہنے لگے ہیں کہ اچھا ہوا پاکستان بن گیا اور مسلمان تین حصوں میں بٹ گئے۔ اگر ہندوستان تقسیم نہ ہوتا تو اس ملک میں ساٹھ کروڑ مسلمان ہندوؤں کے لیے مصیبت کا باعث بن جاتے۔ اب تین ملکوں میں منقسم ہیں اور تینوں میں کمزور ہیں۔ یہ ان لوگوں کی رائے ہے جو تقسیم ملک کے مخالف تھے۔ ہر دور کے الگ الگ مسائل ہوتے ہیں اور ان کے سلجھاؤ کے طریقے بھی مختلف ہوتے ہیں۔ افسوس ہے قیام پاکستان کے مقاصد پورے نہیں ہوئے۔ نہ یہاں اسلام آیا، نہ صحیح طوز سے جمہوریت کو پنپنے دیا گیا، نہ امن و امان کی فضا قائم ہوئی۔ حالات روز بروز خراب ہو رہے ہیں۔ اللہ ہی مہربانی کرنے والا ہے۔

خدائی خدمت گار:

۱۹۲۹ء میں خان عبدالغفار خاں نے صوبہ سرحد میں ''خدائی خدمت گار'' کے نام سے ایک جماعت قائم کی۔ خان عبدالغفار خاں ضلع پشاور کی تحصیل چارسدہ کے ایک گاؤں ''اتمان زئی'' کے رہنے والے تھے۔ وہ اس علاقے کے رئیس تھے اور انھوں نے علی گڑھ کالج میں تعلیم حاصل کی تھی۔ انھوں نے اپنے علاقے میں اپنی خدمات کا آغاز اصلاحی اور تعلیمی سرگرمیوں سے کیا۔ ابتدا میں صوبے کی سیاست میں بھی حصہ لیا مگر بہت کم۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

اس علاقے کے پٹھانوں کو حصولِ تعلیم کے زیادہ مواقع میسر نہ تھے۔ اس کمی کو عبدالغفار خاں نے شدت کے ساتھ محسوس کیا اور ۱۹۱۱ء میں صوبے کے مختلف مقامات میں بہت سے سکول قائم کر دیے۔

۱۹۱۹ء میں انھوں نے رولٹ بل کے خلاف ایک جلسہ منعقد کیا، جس میں ایک لاکھ سے زیادہ لوگ شریک ہوئے۔ اس جلسے کے نتیجے میں انگریزی حکومت نے انھیں گرفتار کر لیا۔ یہ ان کی پہلی گرفتاری تھی۔ رہائی کے بعد اپنے علاقے میں ایک سکول کھولا اور صوبہ سرحد میں اس کی شاخیں قائم کرنے کے لیے دورہ کیا جو انگریزی حکومت کو ناگوار گزرا اور ان سے قانونِ انسدادِ جرائم کے تحت ضمانت طلب کر لی گئی۔ ضمانت نہیں دی تو انھیں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا اور تین سال کی با مشقت قید ہوئی۔ بہ الفاظِ دیگر انھیں اپنی قوم کو تعلیم دینے کے جرم میں تین سال کی سزا دی گئی۔

۱۹۲۴ء میں وہ جیل سے رہا ہوئے تو اپنے صوبے میں بیاہ شادیوں اور دیگر تقریبات کی غلط رسوم کو ختم کرنے اور وفات کے بعد جو غیر اسلامی رسمیں مروج ہو گئی ہیں، ان کے خاتمے کی مہم شروع کی اور اصلاحی کاموں میں مصروف ہو گئے۔ پھر اپنی جماعت کا نام ''خدائی خدمت گار'' رکھ کر صوبے میں سیاسی سرگرمیوں کا آغاز کر دیا۔

۱۹۳۰ء میں وہ باقاعدہ کانگرس میں شامل ہو گئے۔ ان کی جماعت ''خدائی خدمت گار'' کا تعلق بھی کانگرس سے ہو گیا۔ اس جماعت کی سرگرمیوں کے بھی بہت سے پہلوؤں کو ہم نے دیکھا۔ ان کی وفات پر میں نے مندرجہ ذیل مضمون لکھا تھا جو ہفت روزہ ''اہل حدیث'' میں چھپا۔ وہ مضمون اس کتاب کے قارئین بھی ملاحظہ فرما لیں:

''آزادیٔ وطن کے معمر ہیرو، خدائی خدمت گار اور سرخ پوش رہنما خان عبدالغفار خان نے ۲۰۔ جنوری ۱۹۸۸ء کو بدھ کے روز صبح چھ بج کر پچیس منٹ پر طویل علالت کے بعد پشاور کے لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں ۹۸ برس کی عمر پا کر انتقال کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

''ان پر جولائی ۱۹۸۷ء میں فالج کا حملہ ہوا تھا۔ اس وقت وہ نئی دہلی میں تھے۔ وہاں

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں وہ کچھ عرصہ ہندوستان کے ماہر ڈاکٹروں کے زیر علاج رہے، لیکن افاقہ نہ ہوا۔ بمبئی کے ایک معروف ہسپتال میں بھی انھیں داخل کرایا گیا اور ماہر معالج ان کے علاج میں مصروف رہے۔ وہاں بھی وہ صحت یاب نہ ہو سکے۔ ۱۶۔ اگست کو انھیں پشاور لایا گیا اور لیڈی ریڈنگ ہسپتال کے تجربہ کار ڈاکٹر نہایت محنت اور توجہ سے ان کا علاج کرتے رہے۔ لیکن وہ جاں بر نہ ہو سکے اور وہاں پہنچ گئے، جہاں ہر شخص کو اپنے اپنے وقت پر پہنچنا ہے۔

''۲۱۔ جنوری جمعرات کی سہ پہر کو تین بجے پشاور کی جناح پارک میں ان کی نمازِ جنازہ ادا کی گئی، جس میں صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق، وزیر اعظم محمد خاں جونیجو، تمام وزرا، قومی اسمبلی کے ارکان اور صوبہ سرحد کے گورنر، وزیر اعلیٰ اور صوبائی اسمبلی کے ممبروں سمیت بے شمار لوگوں نے شرکت کی۔ اخباری اطلاع کے مطابق پاکستان کی تاریخ کا یہ سب سے بڑا جنازہ تھا۔ بعد ازاں ان کی وصیت کے مطابق ان کی میت کو جلال آباد (افغانستان) میں ان کے گھر میں دفن کیا گیا۔ اللھم اغفر لہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ۔

''خان عبدالغفار خاں، جنھیں صوبہ سرحد کے لوگ، محبت آمیز احترام کے جذبات سے ''باچا خاں'' کہتے ہیں، علاقہ پشاور کے گاؤں ''اتمان زئی'' میں ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مکرم کا نام بہرام خاں تھا جو اپنے عہد اور علاقے کے مشہور ''خان'' تھے۔ بہرام خاں دور کے بہت بڑے آزادی خواہ اور انگریز دشمن بزرگ تھے۔ ان کے والد سیف اللہ خاں نے اس موقع پر انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا، جب وہ بونیر پر قابض ہونا چاہتے تھے۔ وہ باقاعدہ میدان عمل میں اُترے اور انگریزوں کے خلاف جنگ کی۔ سیف اللہ خاں کے دادا عبید اللہ خاں تھے، جنھوں نے آزادی کے لیے درانیوں کا مقابلہ کیا اور پھانسی کی سزا پائی۔

''اس اعتبار سے اس خاندان کے تمام افراد کئی پشتوں سے حریت و آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔ ان کے خاندان کے مختلف افراد نے سیّد احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید کے جہاد میں بھی مجاہدانہ تگ و تاز کی تھی اور بہادری و شجاعت کے جوہر دکھائے تھے۔ عبدالغفار خاں کو یہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

جذبہ ورثے میں ملا تھا۔ انھوں نے ہر اس تحریک کا ساتھ دیا جو برصغیر کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے کی خواہاں تھی اور جس کا مقصد اس خطہ ارض کو ہم کنارِ حریت کرنا تھا۔ خان عبدالغفار خاں کے بڑے بھائی ڈاکٹر عبدالجبار خاں نے بھی جنھیں ''ڈاکٹر خاں'' کہا جاتا ہے، ان تحریکوں کا پورا ساتھ دیا جو برصغیر سے انگریزوں کو نکالنے کی متمنی تھیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور کئی سال ہندوستان کی مختلف جیلوں میں رہے۔

''خان عبدالغفار خاں عمر بھر انگریزوں کے خلاف نبرد آزما رہے اور اس کی پاداش میں بے پناہ تکلیفیں برداشت کیں۔ لیکن کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لائے۔ انھوں نے ۹۸ برس عمر پائی، جس میں تیس سال جیل کی نذر کیے اور اٹھارہ سال جلا وطن رہے۔ اس طرح وہ اڑتالیس برس قید اور جلا وطن رہے۔ مجموعی اعتبار سے ان کی آدھی عمر گھر سے باہر کٹی۔ برصغیر کا کوئی شخص اپنے ملک اور قوم کی خدمت کے لیے اتنی بڑی قربانی نہیں دے سکا۔

''وہ عالم جوانی میں حج بیت اللہ کے لیے گئے۔ اس موقعے پر ان کی اہلیہ بھی ان کے ہم سفر تھیں۔ واپسی میں بیت المقدس کا عزم کیا۔ وہاں پہنچے تو بیت المقدس کی سیڑھیوں سے گر کر اہلیہ وفات پا گئیں۔ لیکن انھوں نے اس کے بعد شادی نہیں کی اور اپنے آپ کو مخلوقِ خدا کی خدمت کے لیے وقف کیے رکھا۔

''وہ قیامِ پاکستان کے مخالف تھے۔ لیکن جب پاکستان معرضِ وجود میں آ گیا تو انھوں نے مارچ ۱۹۴۸ء میں پاکستان کی پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

''آزادیٔ ہند کے بارے میں میرا ایک اپنا تصور تھا جسے میں اپنی دانست کے مطابق صحیح سمجھتا تھا اور اس سے کروڑوں ہندوستانیوں کو اتفاق تھا۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میں نے تقسیم ہند سے اختلاف کیا تھا۔ یہ میری دیانت دارانہ رائے تھی کہ ملک تقسیم نہیں ہونا چاہیے لیکن اب تقسیم ایک حقیقت بن چکی ہے۔ اب ہمارا اختلاف رائے ختم ہو گیا اور میرے رفقاء پاکستان کے خدمت گزار ہیں۔ میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہم پاکستان کو ایسی ریاست بنانے کے آرزو مند ہیں،

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

جس کا نظامِ حکومت، قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی روایات کے مطابق ہو۔‘‘

’’ان کے آخری الفاظ کا واضح مطلب یہ ہے کہ وہ اس ملک میں خالص اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنے کے خواہاں تھے اور اس کے لیے وہ کوشاں ہونا چاہتے تھے۔ لیکن ان کے بعض مخالفوں نے حالات ایسے پیدا کر دیے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے اور انھیں مسلسل جیلوں میں بند رکھا گیا۔

’’ہمیں افسوس ہے ہفت روزہ ’’الاعتصام‘‘ اور ’’خدام الدین‘‘ کے سوا کسی مذہبی اور دینی اخبار نے ان کی سعی مخلصانہ اور تگ و تازِ مجاہدانہ کا اعتراف نہیں کیا۔ ہم ان دونوں مؤقر اخباروں کو ان کی حق گوئی پر مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

’’پھر نہایت تاسف کی بات یہ ہے کہ کسی مذہبی یا نیم اسلامی اور نیم سیاسی جماعت کے کسی چھوٹے بڑے رہنما نے اس مردِ مجاہد کی وفات پر اظہارِ تعزیت نہیں کیا۔ کیا وہ خدانخواستہ اسلام کے منکر تھے؟ قرآن کو نہیں مانتے تھے؟ حدیث رسول ﷺ سے انکار کرتے تھے؟ خلفائے راشدین کے منہج حکومت کو محل نقد و جرح ٹھہراتے تھے؟ کسی صحابی رسول کے بارے میں کبھی انھوں نے اس قسم کے الفاظ کہے تھے کہ کسی شخص کو محض اس لیے (معاذ اللہ) تنقید سے بالاتر نہیں قرار دیا جا سکتا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے صحابی تھے؟ کبھی انھوں نے کسی امام حدیث یا امام فقہ و اصول کو ہدف استہزا بنایا؟ کسی تحریر یا تقریر میں انھوں نے کبھی ارکانِ اسلام (کلمہ توحید، نماز، روزہ، حج، زکوۃ) یا دین و مذہب کے کسی چھوٹے بڑے حکم کا استخفاف کیا؟ اگر ان میں یہ باتیں نہیں تھیں اور ہرگز نہیں تھیں، اور وہ پابند احکام اسلام اور متبع کتاب و سنت تھے تو ان کی وفات پر چند الفاظِ حزن و ملال کے اظہار میں آخر کیا مضائقہ تھا؟

’’وہ صاف ستھرے کردار کے مالک تھے اور ان میں کوئی اخلاقی کمزوری نہ تھی اور یہی وہ اوصاف ہیں، جن کا ایک مسلمان میں پایا جانا ضروری ہے اور صحیح العقیدہ مسلمان کے لیے ایک مسلمان کو پرکھنے کی یہی اصل کسوٹی ہے۔ رہی سیاست تو اس دنیا میں کون ایسا شخص ہے، جس کی سیاست سے کسی نہ کسی کو اختلاف نہ ہو۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

''صدر ضیاء الحق نے ان کے بارے میں بالکل صحیح کہا ہے کہ

''خان عبدالغفار خاں نے عمر بھر معاشرے کی تعمیر نو کے لیے کام کیا ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ بہت کم لوگ ایک صدی تک اپنے نظریات پر قائم رہتے ہیں۔ وہ تجربہ کار سیاست دان اور خدائی خدمت گار مشہور تھے۔ ان کے انتقال پر مجھے دلی صدمہ پہنچا ہے۔ ان کی وفات کے ساتھ ہی ایک طویل سیاسی کردار ختم ہو گیا۔''

''یہ نہایت شان دار الفاظ ہیں جو ایک بڑے سیاست دان کے سانحہ ارتحال پر صدر مملکت نے کہے۔ اگر آئے دن سیاسی جماعتیں بدلتے رہنا اور ہر صاحب اقتدار کی اقتدا میں مصروف رہنا، لائق تحسین اور علامت خدمت ملک و ملت ہے تو بے شک خان عبدالغفار خاں نے یہ کام نہیں کیا۔

''قومی اسمبلی میں ان سے متعلق تعزیتی قرارداد میں اختلاف کیا گیا۔ اگرچہ وہ کسی قسم کی قرارداد کے محتاج نہیں ہیں لیکن ہم عرض کریں گے کہ ۳۰۔ جنوری ۱۹۴۸ء کو گاندھی جی مقتول ہوئے تو پاکستان کی پارلیمنٹ میں اظہارِ افسوس کیا گیا۔ بلکہ ایک روایت کے مطابق ان کے لیے ''دعائے مغفرت'' کی گئی۔ وہ پارلیمنٹ قائد اعظم محمد علی جناح اور خان لیاقت علی خاں جیسے اکابر قوم کی پارلیمنٹ تھی۔

''دعا ہے اللہ تعالیٰ خان عبدالغفار خاں مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔''

اب ہفت روزہ ''الاعتصام'' کا ادارتی شذرہ پڑھیے جو ''خان عبدالغفار خاں کی رحلت'' کے عنوان سے اس کے ۲۹۔ جنوری ۱۹۸۸ء کے شمارے میں چھپا۔

''۲۰ جنوری ۱۹۸۸ء کو آزادئ ہند کے عظیم ہیرو خان عبدالغفار خاں پشاور میں رحلت کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

''خان صاحب مرحوم نے ایک طویل زندگی پائی۔ وہ ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے اور ۹۸ سال کی طبعی عمر پا کر جنوری ۱۹۸۸ء میں انتقال کر گئے۔ خاں صاحب موصوف جن کو لوگ پیار

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

سے باچا خاں کہتے تھے، صوبہ سرحد ہی نہیں، پورے ہندوستان میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کی ہر دلعزیزی کا باعث دراصل ان کا وہ جذبۂ حریت تھا، جس کے تحت انھوں نے بدوشعور ہی سے انگریزی سامراج کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا تھا۔ ان کا یہ جذبہ کسی وقتی اور ہنگامی ضرورت کی پیداوار نہیں تھا بلکہ ان کے آبا و اجداد انگریزوں کے خلاف انیسویں صدی کی اس تحریک حریت کے جیالوں کے ہم رکاب و ہم نوا تھے جنھوں نے شہادت گاہ بالاکوٹ سے توانائیاں حاصل کیں اور ستھانہ اور امبیلہ کے سنگ زاروں میں اپنے لہو کے چراغ روشن کیے۔ باچا خاں کو حریت پروری ورثے میں ملی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے ہر اس تحریک یا تنظیم کا ساتھ دیا جو سامراج سے برسر پیکار ہوئی۔ اور آل انڈیا کانگرس کے ساتھ بھی ان کا تعاون خالصتاً اسی نظریے کے تحت رہا۔

''۱۹۴۷ء کی تقسیم اور قیامِ پاکستان کے وہ بے شک مخالف تھے، مگر جب پاکستان قائم ہو گیا تو انھوں نے مارچ ۱۹۴۸ء میں پاکستان کی پارلیمنٹ کے اجلاس میں یہ اعتراف کیا کہ وہ تقسیم کی حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں، نیز وہ پاکستان کو ایسی ریاست بنانے کے خواہش مند ہیں جس کا نظامِ حکومت قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی روایات کے مطابق ہو۔ اہل علم وخبر یہ جانتے ہیں کہ یہ نظریہ یا عقیدہ وہی ہے جس کے تحت ہمارے اکابر نے بالاکوٹ میں اپنی جانیں نچھاور کیں۔

''پاکستان کی سیاست اس چالیس سالہ دور میں جس آہنگ پر چلتی آئی ہے، وہ متذکرہ نظریے کے کبھی مطابق نہیں ہوئی، لہٰذا باچا خاں مرحوم کا اس سے مسلسل اختلاف خود بخود سمجھ میں آ جاتا ہے۔

''اب جب کہ وہ خالقِ حقیقی کے حضور حاضر ہو چکے ہیں، ان سے نظریاتی اختلافات بھی ختم ہو جانا چاہئیں اور ان کے لیے مغفرت تامہ کی دعا کرنی چاہیے اور ان کی حریت پروری کو خراجِ عقیدت پیش کرنا چاہیے۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین''

جماعت اہل حدیث کے دو اخباروں کے علاوہ اور کسی مذہبی اور دینی جماعت کے اخبار کو

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

اتنی بڑی سیاسی اور اسلامی شخصیت کے متعلق لکھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈرپوک اور متعصب لوگ اس قسم کے لوگوں پر لکھ بھی نہیں سکتے اور کوئی لکھے تو اسے برداشت بھی نہیں کر سکتے۔

اب عبدالغفار خاں کے بیٹے خان عبدالولی خاں کے متعلق ایک واقعہ سنیے!

۱۹۷۷ء میں جب بعض سیاسی اور مذہبی جماعتوں نے امریکہ کی انگیخت پر ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف تحریک چلائی تھی ان دنوں بھٹو نے ازراہ مزاح کسی مجلس میں کہا کہ ہمارے علمائے کرام حلوہ کھانے والے ہیں۔ بھٹو کے اس مزاح کا ردِّ عمل یہ ہوا کہ ان لوگوں نے دربار صاحب میں یعنی حضرت علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر حلوے کھانے شروع کر دیے۔ حلوے کی دیگیں وہاں آ رہی ہیں اور تحریک سے تعلق رکھنے والے مجاہدین جن میں جمعیت علمائے پاکستان کے ساتھ جماعت اسلامی اور مفتی محمود کی جمعیت علمائے اسلام کے اکابر و اصاغر بھی شامل تھے، حلوے کھا رہے ہیں۔ انھی دنوں خان عبدالولی خاں لاہور آئے تو کسی نے کہا کہ "داتا صاحب تشریف لے جائیے، وہاں حلوے کی دیگ کسی نے بھیجی ہے۔" اس وقت عبدالولی خاں کی اہلیہ بیگم نسیم ولی خاں بھی وہاں موجود تھیں۔

عبدالولی خاں مرحوم نے جواب دیا، ہمارے اسلاف کا تعلق مولانا اسماعیل شہید اور سیّد احمد شہید کی جماعت مجاہدین سے رہا ہے۔ اس لحاظ سے آپ ہمیں وہابی سمجھیے۔ ہم صرف اللہ کو داتا مانتے ہیں، وہی سب کو دیتا ہے۔ میں نہ کبھی کسی مزار پر گیا ہوں اور نہ کبھی نذر و نیاز کی کوئی چیز کھائی ہے۔ ہمارا بھٹو سے سیاسی اختلاف ہے۔ مزاروں پر حلوے کھانا کوئی سیاسی مسئلہ نہیں ہے۔ پھر اپنی بیگم کی طرف اشارہ کر کے کہا: یہ حلوہ کھانے کے لیے جانا چاہتی ہیں تو چلی جائیں۔ میں اس قسم کے کام نہیں کرتا۔

یہ تھے عبدالغفار خاں اور عبدالولی خاں کے مذہبی اور دینی افکار۔ رہے سیاسی معاملات تو یہ کوئی دین اسلام کا مسئلہ نہیں ہے۔ اپنے علم و مطالعہ کی روشنی میں جو شخص جس سیاسی جماعت کو ملک و ملت کے لیے صحیح سمجھتا ہے، اس سے وابستہ ہو جائے اور ملک، قوم اور ملت کی خدمت

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کرے۔ اگر کسی جماعت سے تعلق نہیں رکھنا چاہتا تو بے شک نہ رکھے۔ نہ کسی سیاسی جماعت سے تعلق رکھنے والے کو اللہ تعالیٰ نے جنت الفردوس کی خوش خبری سنائی ہے، نہ تعلق نہ رکھنے والے کو کسی قسم کی سزا کا مستوجب قرار دیا گیا ہے۔

سر مائیکل اوڈوائر کا قتل:

گزشتہ صفحات میں بتایا گیا ہے کہ جنگ عظیم اوّل (جولائی ۱۹۱۴ء تا اکتوبر ۱۹۱۸ء) کے بعد ایک وقت آیا کہ کانگرس، مسلم لیگ اور مجلس خلافت آزادیٔ وطن کے لیے متحد تھیں۔

اس جنگ کے بعد انگریزی حکومت نے ہندوستانیوں کو جن اذیتوں میں مبتلا کیا، اس کی اصل بنیاد رولٹ بل تھا، جسے آج سے کم و بیش ۹۰ سال قبل کے برصغیر کی سیاسی تاریخ میں نہایت اذیت ناک باب کی حیثیت حاصل تھی۔ مختصر الفاظ میں اس کا پس منظر یہ تھا:

اس دور کے وزیر ہند مسٹر مانٹیگو نے ۱۰۔ اگست ۱۹۱۷ء کو اعلان کیا تھا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد برطانوی حکومت ہندوستان میں بہ تدریج ایسی ذمہ دار حکومت قائم کر دے گی جو اسی ملک کے لوگوں پر مشتمل ہوگی اور انھی کے سامنے جواب دہ ہوگی۔ لیکن اس کے بجائے اختتامِ جنگ کے دو مہینے پہلے (۱۶۔ اگست ۱۹۱۸ء) کو حکومت نے اعلان کیا کہ آئندہ اہل ہند کو فوجی کمیشن میں اعلیٰ عہدوں سے نوازا جائے گا۔ اس اعلان سے ملک کی سیاسی جماعتوں میں بددلی پیدا ہوگئی اور ان کے رہنما سوچنے لگے کہ کہاں ذمہ دار حکومت اور کہاں فوج کی اعلیٰ ملازمت؟

اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے ۱۸۔ دسمبر ۱۹۱۸ء کو بنگال کے مولوی فضل الحق کے زیر صدارت دہلی میں مسلم لیگ کا جلسہ منعقد ہوا۔ اس جلسے کے صدر استقبالیہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری تھے۔ حکومت نے ان کا خطبۂ استقبالیہ تو ضبط کر لیا تھا، لیکن جلسے کے مقررین کی تقریروں کے کچھ حصے اخبارات میں شائع ہو گئے تھے۔ اس جلسے میں ایک قرارداد کے ذریعے حکومت برطانیہ سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ اس نے ہندوستان کے لوگوں سے جو وعدہ کیا تھا، اسے پورا کیا جائے اور انھیں اپنے ملک پر حکومت کرنے کا حق دیا جائے۔ اس قرارداد کی تائید میں

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا احمد سعید دہلوی ، مولانا عبدالباری فرنگی محلی ، مولانا عبدالقادر قصوری، مفتی کفایت اللہ اور مولانا آزاد سبحانی نے تقریریں کیں۔

اس کے بعد انگریزوں کے خلاف جلسے جلوسوں کا ملک گیر سلسلہ شروع ہو گیا، جس میں روز بہ روز تیزی آتی گئی۔ انگریزی حکومت کے خلاف ہندوستانیوں کے احتجاج کی ایک وجہ یہ بھی تھی جس نے آگے چل کر باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار کر لی، کہ اتحادیوں نے شرائط صلح میں ترکوں سے انتہائی ذلت آمیز سلوک کیا تھا۔ ابتدا میں اس سے ہندوستانی مسلمانوں نے اذیت محسوس کی ، لیکن بعد میں غیر مسلم بھی اس میں شریک ہو گئے اور تحریک خلافت کے نام سے ترکوں کی حمایت میں انگریزی حکومت کے خلاف ایک زبردست ملک گیر محاذ قائم ہو گیا۔ اس کے علاوہ ملک میں آزادی کی اور بھی کئی تحریکیں شروع ہو گئیں۔

اب حکومت نے انگلستان کی سپریم کورٹ کے جج مسٹر ایس ، اے، ٹی رولٹ کی رہنمائی میں ایک کمیٹی قائم کی۔ اس کمیٹی نے حکومت کو جو رپورٹ پیش کی ، وہ بالخصوص مسلمانوں کے سراسر خلاف تھی۔ رپورٹ میں انھیں دہشت گرد، شدت پسند اور حکومت کے باغی قرار دیا گیا تھا۔ اس رپورٹ کے نتیجے میں رولٹ بل تیار کیا گیا، جس کی رو سے برطانوی حکومت کو لوگوں پر اندھا دھند مقدمے چلانے اور انھیں گرفتار کر کے سزائیں دینے کا اختیار مل گیا۔ اس کے خلاف نہ اپیل ہو سکتی تھی، نہ داد فریاد کی کوئی صورت تھی۔

رولٹ بل کے خلاف ۶۔ اپریل ۱۹۱۹ء کو پورے ملک میں ہڑتال کا اعلان کیا گیا۔ چنانچہ اس اعلان پر عمل ہوا اور ملک کے تمام شہروں اور قصبوں میں ہڑتال کی گئی۔ اس سے چار دن بعد امرتسر میں رولٹ بل کے خلاف شدید ہنگامے ہوئے۔ پنجاب کی حکومت نے ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کو گرفتار کر کے کسی نامعلوم مقام پر پہنچا دیا، جس پر پورے شہر میں احتجاج ہوا۔ پھر بہت جلد پنجاب کے دوسرے شہروں اور علاقوں تک احتجاج کا دائرہ پھیل گیا۔ پنجاب کے گورنر سر مائیکل اوڈوائر نے صوبے میں مارشل لا لگا دیا اور لوگوں کو گرفتار کیا جانے لگا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

۱۳۔ اپریل کو بھی ہڑتال تھی اور امرتسر کے جلیاں والا باغ میں احتجاجی جلسے کا اعلان کیا گیا تھا۔ لوگ جلسے میں پہنچے تو گورنر مائیکل اوڈوائر کے حکم سے انگریزی فوج کے سربراہ جنرل ڈائر نے گولی چلا دی، جس سے چار سو سے زائد آدمی ہلاک اور ہزاروں زخمی ہو گئے۔ اس شدید المناک حادثے کے بعد لوگوں میں مزید جوش وخروش پیدا ہو گیا اور حالات بالکل بدل گئے۔ اب انگریزی حکومت نے پنجاب کے بعض شہروں کے ان مقامات پر جہاں لوگوں کی آمدورفت زیادہ تھی، پھانسیاں نصب کردیں اور لوگوں کو مجبور کیا جانے لگا کہ وہ روزانہ ان پھانسیوں کو دیکھیں اور سوچ لیں کہ اگر انھوں نے حکومت کی مخالفت کا سلسلہ جاری رکھا تو انھیں ان پھانسیوں پر لٹکا دیا جائے گا اور ان کی زندگی ختم کردی جائے گی۔

پنجاب کے انگریز گورنر کا نام سر مائیکل اوڈوائر تھا، جس نے امرتسر کے جلیاں والا باغ میں گولی چلانے کا حکم دیا تھا اور فوج کے کمانڈر کا نام جرنل ڈائر تھا جس نے گولی چلائی تھی۔ گولیوں اور گرفتاریوں کا یہ ملک گیر سلسلہ رولٹ بل کے تحت جاری کیا گیا تھا اور رولٹ بل اسے اس لیے کہا جاتا تھا کہ اس کے مصنف و مدون کا نام مسٹر رولٹ تھا جو انگلستان کی سپریم کورٹ کا جج تھا۔

جلیاں والا باغ کے حادثے سے ٹھیک بیس سال گیارہ مہینے بعد ۱۳۔ مارچ ۱۹۴۰ء کو پنجاب کے ایک شخص اودھم سنگھ نے سر مائیکل اوڈوائر کو گولی کا نشانہ بنایا۔ اس دن سر مائیکل اوڈوائر کا لندن کے کاکسٹن ہال میں ایک جلسے میں تقریر کرنے کا پروگرام تھا۔ جلسے کی صدارت سیکرٹری آف اسٹیٹ لارڈ زٹلینڈ کر رہا تھا۔ اودھم سنگھ پستول میں گولیاں بھر کر اس جلسے میں پہنچا۔ مائیکل اوڈوائر کی تقریر اس نے سنی۔ جب وہ تقریر ختم کر کے کرسی پر بیٹھنے کے لیے پیچھے کو گھوما تو اچانک ہال میں گولیاں چلنے لگیں جو اوڈوائر کے سینے میں پیوست ہو گئیں اور وہ زمین پر گر گیا۔ اس کا جسم لہو سے تر تھا اور زخموں کی شدت سے وہ اسی وقت مر گیا۔ اس طرح اودھم سنگھ نے اس سے ۱۳۔ اپریل ۱۹۱۹ء کے حادثے کا انتقام لے لیا۔

پولیس نے اسے گرفتار کرلیا۔ اس کا نام پوچھا گیا تو اس نے اپنا نام ''رام محمد سنگھ آزاد''

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

بتایا۔ اس عجیب وغریب نام کے بارے میں سوال کیا گیا تو اس نے جواب دیا کہ اس نام کے تینوں اجزا ہندو، مسلم، سکھ اتحاد کے مظہر ہیں۔ جلیاں والا باغ میں اوڈوائر کے حکم سے تینوں قوموں کے لوگوں پر گولی چلائی گئی تھی اور انھیں قتل کیا گیا تھا۔

سر مائیکل اوڈوائر کے قتل کی خبر سب سے پہلے رات کو آٹھ بجے برلن ریڈیو سے نشر ہوئی۔ خبر سنانے والے کا نام ملک عبدالرؤف تھا۔ وہ گوجراں والا کی معروف علمی شخصیت ملک عبدالقیوم مرحوم (سابق پرنسپل لا کالج لاہور) کے بھائی تھے۔ آواز بارعب اور کھنک دار، لہجہ دبنگ اور مقررانہ، سننے والے نہایت متاثر ہوتے تھے۔ وہ روزانہ رات کو آٹھ بجے برلن ریڈیو سے جنگ کی خبریں سنایا کرتے تھے۔ اہل حدیث مسلک کے حامل تھے۔ میں اس زمانے (۱۹۴۰ء) میں فیروز پور میں تعلیم حاصل کرتا تھا اور بڑے شوق سے برلن ریڈیو سے ملک عبدالرؤف کی آواز میں خبریں سنا کرتا تھا۔

جب اتحادی فوجوں نے (جو برطانیہ، فرانس، روس، چین اور امریکہ پر مشتمل تھیں) برلن پر تابڑ توڑ حملے کیے اور ان حملوں میں ہٹلر مارا گیا تو اس اثنا میں ملک عبدالرؤف بھی حملوں کی زد میں آکر موت کی آغوش میں چلے گئے اور برلن ریڈیو سے ان کی زوردار آواز ہمیشہ کے لیے بند ہوگئی۔ یہ ۱۹۴۵ء کے اپریل کا مہینا تھا۔

آزاد ہند فوج:

دوسری جنگ عظیم (یکم ستمبر ۱۹۳۹ء تا جولائی ۱۹۴۵ء) میں شامل ہونے والے بعض ہندوستانی (یعنی برصغیر پاک و ہند سے تعلق رکھنے والے) فوجیوں نے ایک آزاد ہند فوج (انڈین نیشنل آرمی) بنائی تھی، جسے آئی این اے کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ فوج میں بھرتی تو انگریزی حکومت کی مدد کے لیے ہوئے تھے، لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ جاپان، جرمنی، اٹلی (جن کے لیے "محوری" کی اصطلاح بنائی گئی تھی) اتحادی فوجوں (برطانیہ، فرانس، امریکہ) کے مقابلے میں کامیابی کی طرف بڑھ رہے ہیں تو انھوں نے اتحادی افواج سے الگ ہو کر جاپان

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

اور جرمنی وغیرہ سے تعلق پیدا کر لیا اور اپنی اس باغی فوج کو انھوں نے آزاد ہند فوج (یا انڈین نیشنل آرمی) کے نام سے موسوم کیا۔

یہاں یہ بھی یاد رہے کہ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں دو مرتبہ آزاد ہند فوج بنی تھی۔ پہلی مرتبہ جنرل موہن سنگھ کی کوشش سے بنی، لیکن ان فوجیوں کو جلد ہی احساس ہو گیا تھا کہ انھیں جاپان اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے، اس لیے اسے ختم کر دیا گیا تھا۔ دوسری مرتبہ سبھاش چندر بوس اور جنرل شاہ نواز وغیرہ نے اس کی بنیاد رکھی اور جلد ہی برما، سیلون، ملایا اور سنگاپور وغیرہ ملکوں میں اس کے اثرات پھیل گئے۔ جاپان آزاد ہند فوج کا حامی تھا لیکن آزاد ہند فوج (یا آزاد ہند حکومت) جنگ میں جاپان کی مددگار نہ تھی۔ بلکہ اس کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اگر کسی موقعے پر جاپان نے ہندوستان پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تو ان کی فوج جاپان سے لڑے گی اور اپنے ملک کو جاپان کے قبضے میں نہیں جانے دے گی۔

ان سطور میں اس آزاد ہند فوج کے بارے میں تھوڑی سی وضاحت کرنا مقصود ہے جو سبھاش چندر بوس اور جنرل شاہ نواز اور ان کے ساتھیوں کی کوشش سے ترتیب پائی تھی۔

سبھاش چندر بوس بیسویں صدی کے تیسرے اور چوتھے عشرے کے مشہور کانگرسی لیڈر تھے۔ ایک مرتبہ آل انڈیا کانگرس کے صدر بھی منتخب ہوئے، لیکن بعض باہمی اختلافات کی وجہ سے کانگرس سے علیحدہ ہو گئے تھے اور فارورڈ بلاک بنا لیا تھا۔ وہ کلکتہ کے رہنے والے تھے اور اپنے دور کے مشہور بیرسٹر تھے۔ ان کے ایک گہرے دوست حکیم عبدالسلام ہزاروی تھے جو ہری پور (ہزارہ) کے باشندے تھے۔ مجلس احرار سے تعلق رکھتے تھے اور مسلکاً اہل حدیث تھے۔ میں نے قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء کے آخر میں انھیں لاہور کی مسجد مبارک میں مولانا محمد حنیف ندوی سے گفتگو کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ نہ اس سے پہلے ان سے ملنے کا کبھی اتفاق ہوا تھا، نہ بعد میں ہوا۔ البتہ ان کے فرزند گرامی میجر محمد طارق میرے دوست ہیں۔

میں دراصل عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ سبھاش چندر بوس نے حکیم عبدالسلام ہزاروی سے کہا کہ وہ جرمنی جانا چاہتے ہیں تاکہ وہاں جا کر ہندوستان کی آزادی کے لیے کوشش کی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

جائے۔لیکن جنگ کے زمانے میں جرمنی جانے کی بہ ظاہر کوئی صورت نہ تھی۔تاہم وہ جرمنی پہنچ گئے۔کس طرح پہنچے؟ اس کی تفصیل میں نے ایک مضمون میں بیان کی ہے جو حکیم صاحب پر شخصیات کے مجموعے میں شائع کرنے کے لیے لکھا گیا ہے۔مختصر یہ کہ حکیم صاحب دہلی پہنچے۔ سبھاش چندر بوس کے بھائی سرت چندر بوس اور ان کی والدہ سے بات چیت ہوئی۔ان کے مشورے سے سبھاش چندر بوس نے لوگوں سے میل جول بند کیا اور کلکتہ میں اپنے گھر میں چھپ کر بیٹھ گئے۔داڑھی بڑھائی اور مولویوں جیسی شکل بنائی۔ترکی ٹوپی سر پر رکھی اور شیروانی پہنی۔رات کے اندھیرے میں کار پر گھر سے نکلے اور کلکتہ سے چالیس میل دور ایک ریلوے اسٹیشن سے (جس طرح حکیم صاحب سے طے ہوا تھا) راولپنڈی سے آگے کے لیے سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ لیا اور ریل پر سوار ہو گئے۔دوسرے دن رات کو وہاں پہنچے۔حکیم صاحب ان کے منتظر تھے۔ان کے قیام کا انتظام ریلوے اسٹیشن سے کئی میل دُور ایک بے آباد جگہ پر کیا گیا تھا۔خود حکیم صاحب کی بھی خفیہ پولیس والے نگرانی کرتے اور ان کی نقل و حرکت کا خیال رکھتے تھے، اس لیے ان کا گھر سے غیر حاضر رہنا بہت مشکل تھا۔تاہم وہ کسی نہ کسی طرح سبھاش چندر بوس سے ملتے اور اپنے خاص آدمیوں کے ذریعے سے ان کے لیے چائے اور کھانا وغیرہ پہنچاتے رہے۔

پھر انھیں پٹھانوں کا سا لباس پہنایا اور چمرکنڈ کے مجاہدین سے رابطہ کر کے انہی کے دو مجاہدوں کے ساتھ مرکز مجاہدین سے آگے افغانستان پہنچایا گیا۔۲۸۔مارچ ۱۹۴۱ء کو وہ جرمنی پہنچ گئے۔اسی روز برلن ریڈیو سے ان کے وہاں پہنچنے کا اعلان ہوا، جس سے ہندوستان کی انگریزی حکومت نہایت پریشان ہوئی۔جرمنی سے وہ جاپان چلے گئے۔اس کے بعد انگریزی حکومت نے سبھاش چندر بوس کے جرمنی پہنچنے کے متعلق واقعات کی جوکڑیاں ملائیں، اس کے نتیجے میں حکیم عبدالسلام ہزاروی کو گرفتار کر کے دیولالی کیمپ (راجپوتانہ) پہنچا دیا گیا۔ایک عرصے تک کسی کو پتا نہ چل سکا کہ حکیم صاحب کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ساڑھے تین سال حکیم صاحب وہاں قید رہے۔ڈیڑھ سال بعد پتا چلا کہ وہ دیولالی کیمپ میں قید ہیں۔رہائی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کے بعد حکیم صاحب اپنے وطن ہری پور میں طبابت کرنے لگے۔ انھوں نے ۲۳۔ جنوری ۱۹۷۷ء کو وفات پائی۔

جاپان پہنچنے کے بعد سبھاش چندر بوس نے جنرل شاہ نواز اور بعض دیگر باغی فوجیوں سے رابطہ قائم کیا اور آزاد ہندوستان حکومت قائم کر کے اس کی آزاد ہند فوج بنائی۔

اس سے کچھ عرصہ بعد حالات نے پلٹا کھایا، محوری ممالک جنگ ہار گئے اور اتحادیوں کو فتح حاصل ہوئی۔ جاپان نے ۱۵۔ اگست ۱۹۴۵ء کو اپنی شکست کا اعلان کیا اور اتحادیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔

اعلانِ شکست کے تین دن بعد ۱۸۔ اگست کو سبھاش چندر بوس بذریعہ ہوائی جہاز ٹوکیو سے نکلے۔ ان کے ساتھ بریگیڈیر حبیب الرحمٰن بھی تھے جو کشمیر کے رہنے والے تھے اور ان کا تعلق آزاد ہند فوج سے تھا۔ ان کا جہاز انڈو چائنا کے علاقے تائی وان کے ہوائی اڈے پر پہنچا تو اسے آگ لگ گئی اور بہت سے لوگوں کے ساتھ سبھاش چندر بوس بھی جل کر مر گئے۔ بریگیڈیر حبیب الرحمٰن شدید زخمی ہوئے، لیکن جان سے بچ گئے۔ انھوں نے برصغیر کے لوگوں کو سبھاش چندر بوس کی موت کی اطلاع دی۔ بریگیڈیر حبیب الرحمٰن نے اس واقعہ سے ۳۳ سال بعد ۱۹۷۸ء میں آزاد کشمیر کے ضلع میر پور کے ایک گاؤں میں وفات پائی۔

آزاد ہند فوج میں مسلمان، ہندو، سکھ سبھی شامل تھے، جن کی تعداد چالیس ہزار کے قریب تھی۔ اتحادیوں کی فتح کے بعد ان فوجیوں کو فوراً گرفتار کر لیا گیا اور بعض کو پھانسی دے دی گئی۔ بہت سے فوجیوں کو ہندوستان لا کر حکومت نے ان کے خلاف بغاوت کے مقدمے قائم کر کے جیلوں میں بند کر دیا۔

یہاں یہ وضاحت کرنا ضروری ہے کہ جنگ کے زمانے میں آزاد ہند فوج کا زیادہ تر تعلق جاپان سے تھا، کیوں کہ جاپانی فوجیں تیزی کے ساتھ ہندوستان کی طرف بڑھ رہی تھیں، لیکن جب جاپان کی حالت کمزور ہونے لگی اور اتحادی فوجیں جنوبی ایشیا کے ملکوں میں دوبارہ قدم جمانے لگیں تو آزاد ہند حکومت اور اس کے اداروں پر مصیبتوں کا سایہ منڈلانے لگا

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

جو لمحہ بہ لمحہ دراز سے دراز تر ہوتا چلا گیا۔ ۲۸۔ مئی ۱۹۴۵ء کو آزاد ہند لیگ ختم کر دی گئی۔ اس کی حکومت نے برما میں ایک بینک قائم کیا تھا جس پر انگریزوں نے قبضہ کرلیا اور ان لوگوں کو پکڑ لیا گیا جن کا کسی بھی شکل میں آزاد ہند فوج سے تھوڑا بہت تعلق تھا۔ اس فوجی تنظیم کے متعلقین اور معاونین کو یا تو پھانسی دے دیا گیا یا جیلوں میں ڈال کر سخت تشدد کا نشانہ بنایا جانے لگا۔

ان مظالم کا جو ہندوستان کی برطانوی حکومت کی طرف سے آزاد ہند فوج اور اس کے حامیوں پر ڈھائے جا رہے تھے، عوام کو کوئی علم نہ تھا۔ نہ اخباروں میں اس قسم کی کوئی چیز چھپ سکتی تھی۔ اس کا علم سب سے پہلے ہندوستان کے شہر گجرات (کاٹھیاواڑ) کے ایک شخص امرت لال سیٹھ کو ہوا، وہ ایک اخبار ''جنم بھومی'' کا ایڈیٹر تھا۔ اس نے انتہائی خفیہ طریقے سے کہ انگریزی حکومت کے کسی کارندے کو اس کا علم نہ ہو سکے، برما اور سیام جانے کا منصوبہ بنایا، اور یہی وہ مقامات تھے، جہاں کی جیلوں میں پہلے پہل آزاد ہند فوج کے افسروں اور سپاہیوں کو بند کیا گیا تھا اور وہ نہایت تکلیف کی زندگی گزار رہے تھے۔ امرت لال سیٹھ جس طرح خفیہ طریقے سے گیا تھا، اسی طرح اس نے خفیہ طور سے ان فوجیوں کی اذیتوں کے متعلق معلومات حاصل کیں اور پھر چھپتا چھپاتا واپس ہندوستان آیا۔ یہاں آکر اس نے ملک کے بعض سیاسی رہنماؤں سے وہ واقعات بیان کیے جو اس کے علم میں آئے تھے۔

اس سے چند روز بعد ۲۱۔ اگست ۱۹۴۵ء کو پنڈت جواہر لال نہرو نے سری نگر میں ایک پریس کانفرنس بلائی، جس میں انھوں نے کہا کہ سبھاش چندر بوس کے ساتھیوں میں سے بہت سے سپاہی اور افسر گرفتار کر کے ہندوستان لائے گئے ہیں اور ان میں سے بعض کو بغیر کسی عدالتی کارروائی کے تختہ دار پر لٹکا دیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان کے لوگ یہ معلوم کرنے کے لیے بے چین ہیں کہ اس ملک کی برطانوی حکومت ان کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتی ہے۔ اگر سختی کا برتاؤ کیا گیا تو ملک میں ایک نازک مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔

۲۷۔ اگست ۱۹۴۵ء کو ہندوستان کی برطانوی حکومت نے جواہر لال نہرو کی اس پریس کانفرنس کا جواب دیا اور اس ضمن میں اپنی پالیسی واضح کی۔ آزاد ہند فوج کے سلسلے میں

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

جواہر لال نہرو کا بھی یہ پہلا بیان تھا اور انگریزی حکومت نے بھی پہلی مرتبہ اس راز سے پردہ اُٹھایا تھا۔

اسی موضوع پر ان دنوں صدر کانگرس، مولانا ابو الکلام آزاد کا بیان اخبارات میں شائع ہوا، جس میں انھوں نے فرمایا کہ آزاد ہند فوج نے محوری کاز کو نہیں اپنایا اور نہ انھوں نے کسی محوری ملک کی مدد کی ہے۔ اس فوج کا اصل مقصد اپنے ملک کو آزاد کرانا تھا اور اسی جذبے کے تحت وہ لوگ کام کرتے رہے۔ انگریزی حکومت کا فرض ہے کہ اُن حالات کو سامنے رکھے، جن حالات میں اس فوج نے اپنی سرگرمیوں کا رُخ ملک کی آزادی کی طرف موڑا تھا۔ ان جوانوں کو تکلیف میں مبتلا کر کے حکومت ملک میں پیچیدہ حالات نہ پیدا کرے۔ اب جنگ ختم ہو چکی ہے اور ملک میں ایک دوسری فضا کروٹ لے رہی ہے۔ حکومت کو اسی فضا کی روشنی میں واقعات کا جائزہ لینا چاہیے۔

اس کے بعد ۲۴۔ ستمبر ۱۹۴۵ء کو پونا میں مولانا ابو الکلام آزاد کے زیر صدارت آل انڈیا کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا، جس میں آزاد ہند فوج کے گرفتار شدہ لوگوں کا قانونی دفاع کرنے کے لیے ڈیفنس کمیٹی بنائی گئی جو چار ارکان پر مشتمل تھی، وہ تھے: پنڈت جواہر لال نہرو، بھولا بھائی ڈیسائی، مسٹر آصف علی اور مسٹر گونندن سرن۔

انگریزی حکومت نے اعلان کیا کہ آزاد ہند فوج کے گرفتار شدگان کے خلاف مقدمے کی سماعت فوجی عدالت میں ۴۔ نومبر ۱۹۴۵ء کو شروع ہو گی، اس پر کانگرس کی قائم کردہ ڈیفنس کمیٹی کی طرف سے مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی اور مسٹر آصف علی نے بعض وجوہ کی بنا پر اعتراض کیا تو حکومت کی طرف سے ۱۵۔ نومبر ۱۹۴۵ء کو دہلی کے لال قلعے میں کورٹ مارشل کے سامنے آزاد ہند فوج کے مندرجہ ذیل تین بڑے افسروں کے خلاف مقدمہ پیش کیا گیا:

۱۔ کپتان شاہ نواز خاں ۱/۱۴ پنجاب رجمنٹ، عمر ۳۰ سال

۲۔ کپتان پی سہگل ۲/۱۰ بلوچ رجمنٹ، عمر ۲۸ سال

۳۔ لیفٹیننٹ جی ایس ڈھلوں ۱/۱۴ پنجاب رجمنٹ، عمر ۳۴ سال

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ان افسروں کے مقدمے کی سماعت کے لیے انگریز کی حکومت ہند نے جو فوجی عدالت قائم کی اس کا صدر میجر جنرل اے بی الگزینڈر تھا، اس کے علاوہ چھ ارکان اور تھے، جن میں تین انگریز اور تین ہندوستانی فوجی افسر تھے۔

کانگرس کی ڈیفنس کمیٹی نے اس مقدمے کی پیروی کے لیے ملک کے نومشہور قانون دانوں کی خدمات حاصل کی تھیں۔

مذکورہ تین ملزموں کے علاوہ ایک ملزم کیپٹن عبدالرشید تھا، اس کی پیروی میاں عبدالعزیز مالواڈہ بارایٹ لا نے کی۔

پہلے تین ملزموں پر حسب ذیل فرد جرم عائد کی گئی تھی:

۱۔ تینوں ملزموں کی تاج برطانیہ کے خلاف جنگ میں شرکت۔ ستمبر ۱۹۴۲ء سے ۲۶۔ اپریل ۱۹۴۵ء تک سنگاپور، ملایا، رنگون اور برما کے بہت سے مقامات پر تاج برطانیہ کے خلاف جو جنگ لڑی گئی، اس میں یہ تینوں شریک ہوئے۔

۲۔ ارتکابِ قتل

۳۔ اعانت قتل

تمام فوجی افسروں نے نہایت جرأت کے ساتھ اقرار کیا کہ انھوں نے تاجِ برطانیہ کے خلاف جنگ میں شرکت کی تھی۔ وہ اپنے ملک کی آزادی اور محبت کے لیے آزاد ہند فوج میں شامل ہوئے تھے اور آزاد ہندوستان کی جو عارضی حکومت قائم کی گئی تھی اس کے وہ رکن تھے۔

ایک مہینا اٹھارہ دن مقدمے کی سماعت جاری رہی۔ ۳۔ جنوری ۱۹۴۶ء کو فوجی عدالت نے فیصلہ سنایا اور ملزموں کو بری کر دیا گیا۔

آزاد ہند فوج کے بہت سے فوجیوں کو گرفتار کیا گیا تھا، لیکن زیادہ شہرت تین فوجیوں نے پائی۔ اس زمانے میں بڑے زور سے گلیوں اور بازاروں میں یہ نعرہ لگایا جاتا تھا، جس کی آواز اب بھی پردۂ سماع سے ٹکرا رہی ہے۔

لال قلعیوں آئی آواز

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

سہگل، ڈھلوں، شاہ نواز

شاہ نواز کا تعلق راولپنڈی سے تھا۔ آزادیٔ ملک کے بعد یہ دہلی چلے گئے تھے اور انھیں ہندوستان کی مرکزی حکومت کے محکمۂ ریلوے کا وزیر بنایا گیا تھا۔ انھوں نے ہندوستان ہی میں وفات پائی۔

آزاد ہند فوج کے گرفتار شدگان کے مقدمات کی سماعت دہلی کے لال قلعے میں انگریز کی فوجی عدالت میں ہوئی۔ اس سے ٹھیک ۸۸ سال پہلے بھی انگریز کی فوجی عدالت اسی قلعے میں بیٹھی تھی، جس کے سامنے ۸۔ جنوری ۱۸۵۸ء کو ہندوستان کے آخری مغل حکمران سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر کا مقدمۂ بغاوت پیش ہوا تھا۔ اس پر بھی اسی قسم کے الزامات عائد کیے گئے تھے جو آزاد ہند فوج کے ملزموں پر عائد کیے گئے تھے۔

پہلے مقدمۂ بغاوت میں جو بادشاہ کے خلاف قائم کیا گیا تھا، ملزم کا کوئی وکیل نہ تھا جو اس کی صفائی پیش کرتا۔ صفائی تو رہی ایک طرف، اس کے بعض قریبی عزیز اور دوست بھی اس کے خلاف شہادت دینے کے لیے عدالت میں موجود تھے۔ لیکن دوسرے مقدمۂ بغاوت میں پورا ملک ملزموں کا طرف دار تھا اور ملک کے وہ نامی گرامی وکیل ان کی صفائی دینے کے لیے عدالت میں تھے، جنھوں نے اس سے قبل کبھی ان کے نام بھی نہیں سنے تھے۔

تاریخ کا بھی عجیب معاملہ ہے۔ وہ بھیس بدل بدل کر آتی اور اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ پھر عدالت بھی بسا اوقات نئے نئے انداز میں جلوہ گر ہوتی اور نئے نئے کرشموں کا اظہار کرتی ہے۔ کبھی سچ کو جھوٹ بنا دیا جاتا ہے اور کبھی جھوٹ کو سچ میں بدلنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

بہر حال ۸۸ سال کے عرصے میں دہلی کے لال قلعے کی سنگین دیواروں نے دو مقدموں کی صدائیں سنیں۔ دونوں مقدمے فوجی تھے اور دونوں کا تعلق بغاوت سے تھا اور دونوں میں بغاوت انگریز کے خلاف تھی۔

پہلے مقدمۂ بغاوت میں ملک کے بادشاہ کو انگریزوں نے تختِ حکمرانی سے اُتار کر جلا وطن کر دیا تھا اور اس نے جلا وطنی کی حالت میں رنگون کے قید خانے میں وفات پائی۔ دوسرے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

مقدمہ بغاوت کے تھوڑے عرصے بعد ملک انگریزی اقتدار سے آزاد ہو گیا اور ملزموں میں سے ایک بڑا ملزم (شاہ نواز) حکومتی جماعت میں شامل ہوا اور اسے مرکزی وزیر بنایا گیا۔

قرآن مجید نے کتنی صحیح بات کہی ہے:

﴿تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ﴾ (آل عمران: ۱۴۰)

(ان دنوں کو ہم لوگوں میں بدلتے رہتے ہیں۔)

آزد ہند فوج کا قصہ صرف پینسٹھ چھیاسٹھ سال قبل کا ہے، لیکن ہماری موجودہ نسل کے اکثر حضرات کو اس کا کچھ پتا نہ ہو گا۔ اپنی تحریک آزادی اور تاریخ حریت کے بہت سے بنیادی پہلوؤں سے بھی یہ بے خبر ہیں۔

یکم جون ۲۰۰۸ء

لاہور

❁❁❁❁

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

بیسواں باب:

قیامِ پاکستان کے بعد کی
چند مذہبی اور سیاسی جماعتیں اور تحریکیں

اب دیکھتے ہیں قیامِ پاکستان کے بعد کون کون سی جماعتیں اور تنظیمیں قائم ہوئیں اور کون کون سی تحریکیں چلیں اور انھوں نے کس انداز سے کام کیا اور اس کے کیا نتائج نکلے۔ یہ گزارشات بھی اختصار سے پیش کی جائیں گی کیوں کہ سیاسی اور مذہبی جماعتیں تو بے شمار قائم ہوئیں اور انھوں اپنے اپنے انداز سے بہت کام کیے لیکن ان سب کا تذکرہ نہیں ہوسکتا۔

مرکزی جمعیت اہل حدیث:

اوّل خویش بعد درویش کے محاورے کے مطابق سب سے پہلے اپنی جماعت کی تنظیم جمعیت اہل حدیث کا ذکر کرنا چاہیے۔ قیامِ پاکستان سے چالیس پچاس سال قبل متحدہ ہندوستان میں اس کے نظم ونسق کی جو کوششیں ہوئیں اس کے ضروری پہلوؤں کی تفصیل گزشتہ صفحات میں بیان کی جاچکی ہے۔ اب پاکستان کے بعد کے واقعات سے مطلع ہونے کی سعی کرتے ہیں۔

اگست ۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں دیگر سیاسی اور مذہبی جماعتوں کی طرح اہل حدیث جماعت کا شیرازہ بھی بکھر گیا۔ پاکستان اس وقت دو حصوں میں منقسم تھا۔ ایک حصے کا نام مشرقی پاکستان تھا اور ایک کا مغربی پاکستان۔ مشرقی پاکستان میں ۱۹۴۷ء میں جماعت کی تنظیم ''جمعیت اہل حدیث بنگال و آسام'' کے نام سے قائم کی گئی تھی ...... اس کے صدر مولانا عبداللہ الکافی کو بنایا گیا تھا جن کا شمار متحدہ ہندوستان کی جماعت کے معروف رہنماؤں میں ہوتا تھا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

مغربی پاکستان کی جماعت اہل حدیث کی تنظیم ۲۴۔ جولائی ۱۹۴۸ء کو ''مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان'' کے نام سے قائم ہوئی۔ مرکزی جمعیت کے اس تاسیسی اجلاس میں جماعت کے کم و بیش ڈھائی سو علما و زعما نے شرکت کی۔ یہ اجلاس دار العلوم تقویۃ الاسلام کے ہال (واقع شیش محل روڈ لاہور) میں مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی کے زیر صدارت منعقد ہوا تھا۔

اس وقت اس کے صرف تین مرکزی عہدے داروں کا انتخاب کیا گیا تھا۔ صدر مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی، ناظم اعلیٰ پروفیسر عبدالقیوم اور ناظم مالیات میاں عبدالمجید۔ ان تینوں کا تعلق لاہور شہر سے تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر کوئی اہم جماعتی معاملہ پیش آئے تو یہ حضرات آسانی سے ایک دوسرے سے رابطہ قائم کر سکیں۔ مرکزی جمعیت کے قیام کے تھوڑے عرصے بعد مجھے اس کا آفس سیکرٹری بنایا گیا۔ چوں کہ ابتدا ہی میں مجھے اس خدمت پر مامور کر دیا گیا تھا، اس لیے میں اس کے تمام تنظیمی پہلوؤں سے آگاہ ہوں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اکابر جماعت میں سے کون بزرگ اس تنظیم سے کتنا تعلق رکھتے تھے اور کس بزرگ کے کس کے متعلق کیا خیالات تھے۔ مرکزی جمعیت کے بالکل ابتدائی دور کے لوگوں میں سے صرف دو آدمی اس وقت زندہ ہیں، ایک مولانا معین الدین لکھوی جو مجلس شوریٰ اور مجلس عاملہ سمیت مرکزی جمعیت کی تمام کمیٹیوں اور سب کمیٹیوں میں شامل رہے۔ دوسرا یہ فقیر جو اپنے فرائض منصبی کی بنا پر تمام پیش آمدہ معاملوں اور فیصلوں کو ضبط تحریر میں لانے کا ذمے دار تھا۔

پاکستان سے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد جمعیت اہل حدیث بنگال و آسام کو ''جمعیت اہل حدیث بنگلہ دیش'' اور مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کو ''مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان'' کہا جانے لگا۔ اور آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کو (جو دسمبر ۱۹۰۶ء میں قائم ہوئی تھی) ۱۹۵۷ء سے ''مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند'' کے نام سے موسوم کر دیا گیا۔ برصغیر کی جماعت اہل حدیث کی تقریباً پوری تاریخ میں نے اپنی ایک کتاب ''برصغیر میں اہل حدیث کی تبلیغی و تدریسی سرگزشت'' میں بیان کر دی ہے۔ یہ کتاب مکتبہ سلفیہ شیش محل

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

روڈ کی طرف سے شائع ہو رہی ہے۔

مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی کی وفات کے بعد مرکزی جمعیت اہل حدیث کے امیر مولانا محمد اسماعیل کو منتخب کیا گیا۔ ان کے بعد حضرت حافظ محمد گوندلوی کو، پھر مولانا معین الدین لکھوی کو، اب کئی سالوں سے اس کے منصب امارت پر پروفیسر ساجد میر متمکن ہیں۔ پروفیسر صاحب ممدوح مسلم لیگ (ن) کی طرف سے سینٹ کے رکن ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی اعتبار سے موجودہ دور کی مرکزی جمعیت اہل حدیث مسلم لیگ (ن) سے وابستہ ہے۔ لیکن میرا کسی جماعت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

تحریک تحفظ ختم نبوت:

یہ تحریک مرزائیوں کے خلاف شروع کی گئی تھی اور بڑی زوردار تحریک تھی جس کا آغاز ۱۹۵۲ء کے آخر میں ہوا تھا۔ اس کی ایک مجلس عمل بنائی گئی تھی جس میں ملک کی تمام دینی اور مذہبی جماعتوں کی اہم شخصیتیں شامل تھیں۔ اس کے صدر بریلوی مکتب فکر کے مولانا سیّد ابوالحسنات قادری اور ناظم اعلیٰ جمعیت اہل حدیث کے صدر مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی تھے۔ اس وقت پاکستان کے وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین تھے۔ حکومت نے سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا ابوالحسنات قادری، مولانا محمد اسماعیل سلفی، شیخ حسام الدین، مولانا عبدالغفار حسن، مولانا مجاہد الحسینی اور دیگر بہت سے علماء و زعماء کو گرفتار کر لیا تھا۔ سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا ابوالحسنات قادری، شیخ حسام الدین اور دیگر حضرات سے ملاقات کے لیے لاہور سنٹرل جیل میں مولانا داؤد غزنوی جاتے تو مجھے بھی ساتھ لے جاتے۔ پنجاب میں تحریک تحفظ ختم نبوت کا بہت زور تھا۔ کئی ہزار لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا تھا اور لاہور میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا تھا، جس کا ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد اعظم خاں کو بنایا گیا تھا، اور فوج کی گولیوں سے بے شمار لوگ مارے گئے تھے۔ یہ پہلا مارشل لا تھا جس سے پاکستان کے لوگ متعارف ہوئے۔ اس کے بعد ہم نے کئی مارشل لاؤں کو دیکھا اور ہر مارشل لا نے کئی کئی سال عمر پائی۔ ہماری حکومتی تاریخ آدھی سے زیادہ مارشل لائی تاریخ ہے، جس میں بے شمار لوگ قید ہوئے، لاتعداد لوگ اپنی فوج کے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ہاتھوں قتل کیے گئے۔ سیکڑوں کو جلا وطن کیا گیا اور کتنے ہی لوگوں کو کوڑوں کی سزا دی گئی۔ یہ سب معاملات ہمارے سامنے ہوئے اور ہم نے ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ جو آیا اس نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر پاکستانیوں کو ''میرے عزیز ہم وطنو!'' کے الفاظ سے مخاطب فرمایا اور پھر ''ملک وقوم کے بہترین مفاد'' کے لیے اپنے عزیز ہم وطنوں کی گردنوں پر سوار ہو گیا اور ''ملک وقوم کے بہترین مفاد'' کو زیادہ سے زیادہ طول دینے کی کوشش کی۔ اپنی مرضی کا قانون بنایا۔ سیاست دانوں کو وزارتیں دے کر اور مراعات سے نواز کر کام چالو کر دیا گیا اور پکڑ دھکڑ کا جال بچھا دیا گیا۔

اس طرح فوج نے بار بار اپنے ہی ملک کو فتح کر کے اقتصادی، معاشی، جمہوری طور سے اس کا کچومر نکال دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ یہاں اسلام آیا، نہ کوئی اور نظام۔

بہر حال ۱۹۵۳ء میں مرزائیوں کے خلاف زبردست تحریک چلی، جس کو حکومت نے دبانے کی بے حد کوشش کی، لیکن دبا نہ سکی۔

مرزائیوں کے بارے میں یہ عرض کر دیں کہ

۱۸۹۱ء میں مرزا غلام احمد قادیانی نے نبوت کا دعویٰ کیا تو اس پر سب سے پہلے کفر کا فتویٰ مولانا محمد حسین بٹالوی نے لگایا اور اس فتویٰ تکفیر پر ہندوستان کے ہر فقہی مسلک کے علمائے کرام کے تصدیقی دستخط کرائے اور مہریں لگوائیں۔ یہ پہلا فتویٰ تھا جو مدعیٔ نبوت مرزا غلام قادیانی پر برصغیر کے ایک عالم دین نے لگایا۔ خود مرزا صاحب نے مولانا بٹالوی کو ''اوّل المکفرین'' کہا۔ (یعنی مرزا صاحب کو سب سے پہلا کافر قرار دینے والا عالم)

- علی گڑھ کے ایک اہل حدیث عالم دین مولانا اسماعیل علی گڑھی نے ۱۸۹۲ء میں مرزا صاحب کے خلاف ''اعلاء الحق الصریح بتکذیب مثل المسیح'' کے نام سے رسالہ لکھا جو ۴۴ صفحات پر مشتمل تھا۔ یہ پہلا رسالہ تھا جو مرزا غلام احمد قادیانی کے ادعائے نبوت اور اعلانِ مثل المسیح کے بعد معرضِ تصنیف میں آیا۔
- علامہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری اس وقت بائیس تیئس برس کے نوجوان تھے۔ انھوں

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

نے مرزا کی نبوت کے خلاف ''غایت المرام'' کے نام سے ۱۸۹۲ء میں ایک ضخیم کتاب لکھی جو ۱۸۹۳ء میں چھپی۔

- مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی اس دور کے مشہور عالم دین تھے۔ متقی اور صالح ترین بزرگ۔ حضرت حافظ محمد لکھوی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند گرامی قدر اور حضرت میاں سیّد نذیر حسین دہلوی کے شاگرد رشید۔ انھوں نے بذریعہ الہام مرزا غلام احمد قادیانی کی تکفیر کا فتویٰ صادر فرمایا۔ انھیں اللہ کی طرف سے القا ہوا کہ یہ شخص فرعون و ہامان کا ساتھی ہے۔
- مولانا ثناء اللہ امرتسری پہلے عالم ہیں جو ۱۱۔ جنوری ۱۹۰۳ء کو مرزا صاحب سے مناظرے کے لیے قادیان گئے۔ انھوں نے قادیان میں تقریر کی اور مرزا صاحب کی نبوت کی تکذیب کا اعلان کیا۔ لیکن جواب دینے کے لیے مرزا صاحب گھر سے نہیں نکلے۔ حالاں کہ خود مرزا صاحب نے انھیں مناظرے کے لیے قادیان آنے کی دعوت دی تھی۔
- امرتسر کے صوفی عبدالحق غزنوی اوّلین بزرگ تھے، جنھوں نے مرزا صاحب کو مباہلے کا چیلنج دیا اور امرتسر میں مباہلہ ہوا۔
- قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۵۳ء کی تحریک تحفظ ختم نبوت سے تین سال قبل مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے کا مطالبہ سب سے پہلے ۱۹۴۹ء میں ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں مولانا محمد حنیف ندوی نے کیا۔ مولانا ندوی اس اخبار کے مدیر تھے اور میں نائب مدیر تھا۔ مولانا ممدوح نے اس موضوع پر جو مضامین لکھے، وہ ''مرزائیت نئے زاویوں سے'' کے نام سے طارق اکیڈمی فیصل آباد نے کتابی صورت میں شائع کیے۔ اس کتاب میں جس انداز سے مولانا محمد حنیف ندوی نے مرزائیت کا تذکرہ فرمایا اور اس کے مختلف پہلوؤں کو زیر بحث لایا گیا ہے، انھیں واقعی نئے زاویوں سے تعبیر کرنا چاہیے۔ کتاب کے نام سے بھی ادبیت جھلکتی ہے اور اس کے مندرجات بھی علم و ادب کا حسین مرقع ہیں۔ اگر قاری کچھ ادبی ذوق سے بہرہ مند ہو تو اس کتاب کے مطالعہ سے وہ نئے نئے الفاظ سے بھی آشنا ہوگا، طرزِ بیان سے بھی لطف اندوز ہوگا اور قادیانی نفسیات اور اس کے ادائے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

نبوت کا بھی اسے پتا چلے گا۔

مارشل لاؤں کا دور:

اب آیئے پاکستان کے مارشل لاؤں کی طرف۔ ۱۹۵۳ء کا مارشل لا تو صرف لاہور تک محدود تھا۔ اسے آپ آئندہ مارشل لاؤں کی بسم اللہ یا تمہید کہہ سکتے ہیں۔

پہلا مارشل لا پورے ملک میں ۷۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو ایوب خاں نے لگایا۔ اس وقت سکندر مرزا پاکستان کے منصب صدارت پر فائز تھے۔ ایوب خاں وزارت عظمیٰ پر متمکن ہوئے ، لیکن اس پر انھیں صبر نہیں آیا۔ بیس دن کے بعد ۲۷۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو انھوں نے سکندر مرزا کو صدارت سے الگ کیا اور خود صدر بن گئے۔ ہماری عدلیہ نے ان کی حمایت کی۔ انھوں نے اپنے وزیر مقرر کیے، اپنا آئین بنایا اور اپنی مرضی کا قانون چلایا اور دس سال حکومت کی۔ پھر جب ملک میں ان کی مخالفت ہونے لگی اور ان کے خلاف زوردار ملک گیر تحریک چلی تو انھوں نے ۲۔ مارچ ۱۹۶۹ء کو حکومت کی باگ ڈور جنرل یحییٰ خاں کے سپرد کر دی۔ یہ دوسرا ملک گیر مارشل لا ملک توڑ مارشل لا تھا۔ یحییٰ خاں کے اقتدار میں آنے پر بعض لوگ بہت خوش ہوئے۔ جماعت اسلامی کے لائق احترام سربراہ نے اسے غازی قرار دیا۔ ہمارے دوست مولانا سمیع الحق نے اپنے ماہنامے ''الحق'' میں اس کی آمد پر "یا یحییٰ خذ الکتاب بقوۃ" کے عنوان سے اداریہ لکھا۔ اس ''غازی'' کے زمانۂ اقتدار میں جو کچھ ہوا، وہ سب کو معلوم ہے۔ ۱۶۔ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ملک ٹوٹ گیا اور مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش کے نام سے الگ ملک بنا دیا گیا۔

پیپلز پارٹی کی حکومت:

۲۰۔ دسمبر ۱۹۷۱ء کو زمامِ اقتدار ذوالفقار علی بھٹو نے سنبھالی اور پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہوگئی۔ اب مغربی پاکستان کو پاکستان کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس سے قبل ذوالفقار علی بھٹو ایوب خاں کی حکومت میں شامل تھے اور وہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد معاہدۂ تاشقند کے سلسلے میں ایوب خاں سے اختلاف کی بنا پر حکومت سے مستعفی ہوئے تھے۔ ۳۰ نومبر ۱۹۶۷ء کو انھوں

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

نے پیپلز پارٹی کے نام سے الگ جماعت بنا لی جو مقبولیت میں تمام جماعتوں سے آگے نکل گئی۔

بھٹو کو پاکستان میں بہت سے مشکل ترین مسائل کا سامنا تھا۔ ۹۰ ہزار سے زائد فوجی ہندوستان کی قید میں تھے، جن میں سے پانچ ہزار کو کورٹ مارشل کے لیے چھانٹ کر لیا گیا تھا۔ دنیا کی جنگی تاریخ میں اتنی تعداد میں کوئی فوج دشمن کی قید میں نہیں آئی تھی۔ کم و بیش چھ ہزار مربع میل علاقے پر دشمن قابض ہو چکا تھا۔ نہ صرف پاکستان بلکہ پوری دنیا میں پاکستان کی فوج بدنام ہو گئی تھی اور اس کا حوصلہ ٹوٹ گیا تھا۔ بھٹو نے بڑی عقل مندی اور سیاسی سوجھ بوجھ سے کام لیا۔ انھوں نے ملک کی تمام سیاسی جماعتوں سے مشورہ کیا اور ان کے متعدد بڑے رہنماؤں کو ساتھ لے کر ہندوستان گئے اور وہاں کی وزیر اعظم اندرا گاندھی سے بات چیت کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۹۰ ہزار فوجی دشمن کی قید سے رہا ہو گئے۔ کورٹ مارشل کا معاملہ ختم ہوا اور مقبوضہ علاقہ پاکستان کو مل گیا۔

اپنے دورِ اقتدار میں بھٹو نے ۱۹۷۳ء میں پاکستان کا آئین بنایا۔ ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۷۳ء تک پورے چھبیس سال ملک کا آئین نہیں بن سکا تھا، ہندوستان اور پاکستان دونوں ملک ایک ہی دن آزاد ہوئے تھے۔ لیکن ہندوستان نے ۱۹۵۱ء میں آئین بنا کر اس کے مطابق ملک میں انتخابات بھی کرا لیے تھے۔ ۱۹۷۳ء کا آئین متفقہ آئین تھا۔ بھٹو کی کوشش اور بے پناہ تگ و دو سے پاکستان ایٹمی ملک بنا۔ فروری ۱۹۷۴ء میں بھٹو نے دنیا کے تمام اسلامی ملکوں کے سربراہوں کو لاہور میں جمع کیا اور کئی دن یہاں ان کا اجلاس جاری رہا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ دنیا بھر کے مسلمان ملکوں کے سربراہ ایک مقام پر جمع ہوئے اور انھوں نے مسلمانوں کے اجتماعی مسائل کو موضوع بحث بنایا۔ اس سے پہلے یا اس کے بعد نہ کبھی ایسی کوشش ہوئی اور نہ کبھی اس قسم کا اجتماع ہوا۔ دنیا میں جو حالات پیدا ہو گئے ہیں ان کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آئندہ اس قسم کا اجتماع شاید کبھی نہ ہو۔ بھٹو نے مرزائیوں کو اقلیت قرار دیا۔ شراب کی دکانیں بند کیں۔ گھوڑوں کی ریس پر جوئے کا سلسلہ ختم کیا۔ لیکن ۱۹۷۷ء میں انتخابات ہوئے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

تو بعض معاملات کو بہانہ بنا کر بعض سیاسی اور نیم سیاسی جماعتوں (مسلم لیگ، تحریک استقلال، پی، ڈی، پی، جمعیت علمائے اسلام، جمعیت علمائے پاکستان اور جماعت اسلامی وغیرہ) نے ان کے خلاف ملک میں ہنگامہ بپا کر دیا۔

اس ہنگامے میں احمد شاہ نورانی صاحب شامل ہوئے تو انھوں نے اس کا نام نظامِ مصطفیٰ رکھ دیا۔ اس ہنگامے کے نتیجے میں جنرل ضیاء الحق نے ۵۔ جولائی ۱۹۷۷ء کو ملک میں مارشل لا لگا دیا۔ یہ تیسرا مارشل لا تھا۔ انھوں نے جو کابینہ بنائی، اس میں فوجی جرنیلوں کے ساتھ جماعت اسلامی، پی ڈی پی، جمعیت علمائے اسلام اور جمعیت علمائے پاکستان کو بھی نمائندگی دی گئی اور ان جماعتوں کے دو دو تین تین آدمیوں کو وزیر بنایا گیا۔ اس لیے کہ ان کی تحریک کی وجہ سے ضیاء الحق برسر اقتدار آئے تھے اور اس کے بدلے میں وزارتوں کی صورت میں ان کو انعام و اکرام سے نوازنا ان کا اخلاقی فرض تھا جو انھوں نے ادا کیا۔ یہ لوگ کچھ عرصہ وزارتوں کے مزے لوٹتے رہے۔ پھر فوجی حکومت نے اپنا کام نکال کر انھیں چلتا کیا۔ اب فوج کو ان کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

مارشل لا کے بعد پیپلز پارٹی سے تعلق رکھنے والے بہت سے لوگوں کو جیلوں میں ڈالا گیا اور انھیں کوڑے مارے گئے۔ جن لوگوں کو کوڑے مارے گئے، ان میں ہمارے دیرینہ دوست قیوم نظامی بھی شامل تھے۔ ان کے والد مرحوم عبدالحمید مجھے ایک دن کوٹ لکھپت جیل لے گئے۔ جیل کے باہر بہت بڑا مجمع تھا۔ جیل سے نکال کر قیوم نظامی کو مجمع عام میں لایا گیا۔ ان کے کپڑے اُتارے گئے اور ننگے بند پر کوڑے برسائے گئے۔ یہ منظر دیکھ کر میرے لیے وہاں ٹھہرنا مشکل ہو گیا اور میں آنکھیں بند کر کے پیچھے ہٹ گیا۔ ان کے والد بھی روتے ہوئے میرے پاس آ گئے۔

بے شمار لوگوں کو جبراً جہاز میں بٹھا کر پاکستان سے نکال دیا گیا اور وہ کئی کئی سال مختلف ملکوں میں دھکے کھاتے رہے۔ بعض وہیں مر گئے۔

۴۔ اپریل ۱۹۷۹ء کو راولپنڈی جیل میں بھٹو کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ نواب زادہ نصر اللہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

خاں کے سوا تقریباً تمام سیاسی اور نیم سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کی خواہش تھی کہ بھٹو کو مار دیا جائے، اور اسے عدالت کا نام دے کر مار دیا گیا۔ مارشلائی حکومت نے اس کے جنازے میں بھی کسی کو شریک نہیں ہونے دیا۔

ضیاء الحق نے گیارہ سال حکومت کی۔ اس اثنا میں انھوں نے پیپلز پارٹی کو ختم کرنے کی پوری کوشش فرمائی، لیکن یہ پارٹی اتنی سخت جان ہے کہ ختم نہ ہوئی۔ وہ ۱۷۔ اگست ۱۹۸۸ء کو طیارے کے حادثے میں اپنے پچیس چھبیس ساتھیوں سمیت بہاول پور کے قریب جل کر اللہ کے دربار میں پہنچ گئے۔ ان کی موت نہایت عبرت ناک تھی۔

ذوالفقار علی بھٹو کی جمہوری حکومت کے خلاف جو ہنگامہ بپا کیا گیا تھا، اس میں بعض اہل حدیث حضرات بھی شامل تھے۔ ان کی شمولیت کا اصل باعث حصولِ ثواب تھا اس لیے کہ ہم ہر کام ثواب ہی کے لیے کیا کرتے ہیں لیکن یہ اللہ ہی جانتا ہے کہ انھیں ثواب حاصل ہوا یا نہیں۔ ہم عاجز بندوں کو صرف یہ معلوم ہے کہ انھوں نے جمہوریت کے خلاف جلسے جلوس کی رونق میں اضافہ کرنے کا کردار ادا کیا، اس کے بدلے میں وزارتیں دوسرے لوگ لے گئے اور ان کے حصے میں پولیس کے ڈنڈے اور دھکے آئے۔

۱۲۔ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو جرنیلوں نے جمہوری حکومت پر پھر دھاوا بولا اور پرویز مشرف صاحب چیف ایگزیکٹو کا روپ دھار کر اقتدار پر قابض ہو گئے۔ ایوب خاں نے کنونشن مسلم لیگ بنائی تھی، ضیاء الحق نے جونیجو مسلم لیگ قائم کی اور مشرف نے کاروبارِ حکومت چلانے کے لیے قاف لیگ کا ڈھانچا کھڑا کیا۔ یعنی سب جرنیلوں نے اقتدار کے لیے مختلف سازشیں کیں، ان میں مسلم لیگ ہی کا سہارا لیا اور یہی ان کی حکومت کے لیے امرت دھارا ثابت ہوئی۔ اس میں یہ خصوصیت ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد یہ ہر آمر کے لیے نسخہ شفا ثابت ہوتی رہی ہے۔

پرویز مشرف کا چوتھا مارشل لا تھا۔ بہت سے کاموں میں وہ اپنے پیش رووں سے آگے نکل گیا۔ اس نے لوگوں کو گرفتار کیا، جیلوں میں ڈالا، جلا وطن کیا، ان پر گولیاں چلائیں، ہزاروں کی تعداد میں طالب علموں، بچوں، بوڑھوں، جوانوں عورتوں کو بم مار مار کر قتل کیا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

لاتعداد لوگوں کو پکڑ کر امریکہ کے حوالے کیا اور ڈالر کمائے۔ مسجدیں منہدم کرائیں، دینی مدارس پر بم برسائے اور مسجدوں میں نماز پڑھتے ہوئے لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتارا۔ نو سال اس نے قتل وخون کا کھیل جاری رکھا اور مسلم لیگ قاف جو قائد اعظم کے نام سے بنائی گئی تھی، اس کھیل میں اس کی معاون رہی۔ اس کی وردی کو تحفظ دینا اس نے اپنا فرض قرار دیے رکھا۔ یعنی اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ قائد اعظم وردی اور مارشل لا کے حامی تھے۔ حالاں کہ قائد اعظم ہرگز اس کے حامی نہ تھے۔ متحدہ مجلس عمل نے بھی کتاب الحیل کھول کر اس کی مدد فرمائی۔ جواب نہ متحدہ رہی ہے، نہ مجلس۔ ماشاء اللہ بعض اہل حدیث حضرات بھی اس مجلس میں شامل تھے۔ آئین میں ۱۷ ویں ترمیم کا سہرا اسی کے سر بندھا۔ اس طرح پرویز مشرف کے اقتدار کو سہارا دینے کے کارِ خیر میں مجلس عمل کی وساطت سے ہمارا بھی تھوڑا بہت حصہ رہا۔ شاید دربار خداوندی میں اس کا ہمیں بھی کچھ ثواب ملے۔ کیوں کہ ہم ہر کام حصولِ ثواب اور رضائے الٰہی کے لیے کیا کرتے ہیں۔

یہاں ایک واقعہ سنیے جو ۱۹۷۷ء کی خلافِ جمہوریت اور فوجی حکومت کے قیام کی کوشش سے تعلق رکھتا ہے۔ میں اس زمانے میں ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ تھا اور دفتری اوقات کے بعد اپنے تصنیفی کام کے سلسلے میں میرا زیادہ وقت پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری میں گزرتا تھا۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری ان دنوں کچہری روڈ پر تھی۔ ایک دفعہ میں نیلا گنبد کی مسجد سے نمازِ عصر پڑھ کر باہر نکلا تو دیکھا کہ چوک میں مسجد مبارک اہل حدیث کے خطیب مولانا فضل الرحمٰن ازہری کھڑے ہیں۔ میں نے ان کو سلام کیا۔ یہ جمعرات کا دن تھا۔ میں بالعموم نمازِ جمعہ انھی کی اقتدا میں پڑھا کرتا تھا۔ وہ میرے مہربان دوستوں میں سے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ کل آپ مسجد مبارک میں ضرور جمعہ پڑھیں، اس لیے کہ میری درخواست پر یہ جمعہ مفتی محمود پڑھائیں گے۔

میں نے مولانا سے عرض کیا کہ نبی ﷺ کے فرمانِ اقدس صلوا خلف کل بر و فاجر کی رُو سے نماز ہر شخص کی اقتدا میں ہو جاتی ہے، لیکن یہ جمعہ میں مفتی صاحب کی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

اقتدا میں نہیں پڑھوں گا۔ اس لیے کہ یہ جمعہ خالص سیاسی نوعیت کا ہے اور ایک سیاسی جماعت اور ملک کے جمہوری وزیر اعظم کی مخالفت سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ کبھی کسی حنفی خطیب نے آپ کو یا کسی اہل حدیث عالم کو اپنی مسجد میں جمعہ پڑھانے اور وہاں خطبہ دینے کی دعوت دی؟

معلوم نہیں میرے مہربان دوست اور مسجد مبارک کے عالی مرتبت خطیب مولانا فضل الرحمٰن بن محمد ازہری کو اس فقیر ناتواں کی یہ گزارش یاد ہے یا نہیں۔ بہر حال اس گنہگار کو اور متعدد دیگر اہل حدیث حضرات کو اس سے اتفاق نہیں تھا۔ مولانا کی درخواست پر مفتی محمود نے خالص سیاسی نوعیت کا جمعہ پڑھایا۔ بحمد اللہ میں نے وہاں جمعہ نہیں پڑھا اور اس کے بعد مولانا سے اس موضوع پر کبھی بات بھی نہیں ہوئی۔

بعض لوگ بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ فرمایا کرتے ہیں کہ اسلام اور سیاست ایک ہے۔ مجھے ان کے اس نقطۂ نظر سے کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ سیاست کے معنی جو اُردو لغت کی ہر کتاب میں مرقوم ہیں یہ ہیں: شخصی و ملکی حالات و تعلقات کی دیکھ بھال اور مناسب اقدام۔ ملک کی حفاظت و نگرانی۔ ملک کا بندوبست۔ تنبیہ۔ رعب و داب۔ دھمکی۔ مکاری۔

اب اُردو لغت کی رو سے اسلام کے معنی ملاحظہ فرمایئے: دین محمدی۔ خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں سر تسلیم جھکانا۔ اسلام قبول کرنا۔ کافر سے مسلمان ہونا۔

قارئین نے سیاست اور اسلام دونوں کے معانی پڑھ لیے۔ لفظ اسلام کے معنوں میں کہیں تنبیہ یا رعب و داب یا دھمکی یا مکاری کا لفظ نہیں آیا، جب کہ کاروبارِ سیاست میں عملاً یہی کچھ ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص کسی سے کسی معاملے میں جھوٹ بولے یا اسے دھوکا دے یا اسے پریشان کرے تو ہم عام طور سے کہا کرتے ہیں کہ وہ شخص تم سے سیاست کر گیا۔ یا یہ کہ وہ سیاسی آدمی ہے، تم نے اس کی بات کیوں مانی؟ تم اس کی سیاست کے جال میں کیوں آئے؟ یہ کبھی نہیں کہتے کہ ''وہ تم سے اسلام کر گیا'' یا ''تم اس کی اسلامیت میں کیوں آئے؟'' بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ وہ مسلمان ہے، تم سے صحیح برتاؤ کرے گا۔ اسلامی طریقے سے پیش آئے گا۔ یعنی کسی سے اسلامی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

طریقے سے برتاؤ کرنا اور ہے، سیاسی طریقے سے برتاؤ کرنا یا پیش آنا اور ہے۔ بے شک علمائے دین نے انگریز کے زمانے میں سیاست کی اور بہت کی۔ لیکن وہ ملک کو غیر ملکی حکومت سے آزاد کرانے کی سیاست تھی اور بالکل صحیح تھی۔ اس دور میں بھی مستند علمائے دین نے "اسلام اور سیاست ایک ہے" کی بحث نہیں چھیڑی۔ پھر یہ بھی عجیب بات ہے کہ اسلام اور سیاست ان کے نزدیک ایک ہیں، لیکن ملازمت کے زمانے میں اس اسلام پر عمل نہیں کیا جاتا۔ بلکہ ملازمت سے استعفا دینے یا ریٹائرڈ ہونے کے بعد بھی دو سال تک اس اسلام کو قابل عمل نہیں سمجھا جاتا۔ یعنی یہ وہ اسلام ہے، جس پر کسی ملازم پیشہ کو عمل نہیں کرنا چاہیے۔ اگر ریٹائرمنٹ کی عمر ساٹھ سال ہے اور ملازمت چالیس برس تک چلتی ہے تو کم از کم بیالیس چوالیس سال اسلام پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں۔ جوانی اور کہولت کا پورا زمانہ اسلام کے دائرے سے باہر گزرا۔ بڑھاپے کو پہنچ گئے تو سیاست میں داخل ہو کر اس "اسلام" پر عمل کرنے لگے، جس کے معنے دھوکا، مکاری، تنبیہ اور رعب وداب کے ہیں۔ لوگ اس عمر میں اس قسم کے کاموں سے توبہ کرتے اور کنارہ کش ہوتے ہیں اور اسلام اور سیاست کو ایک قرار دینے والے اس کا ارتکاب فرماتے ہیں۔ اسلام اور سیاست کو ایک قرار دینے ہی کا نتیجہ ہے کہ وہ آج ایک بیان دیتے ہیں، کل اس سے انکار کر دیتے ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک نعوذ باللہ اسلام بدلتا رہتا ہے۔ آج کچھ، اور کل کچھ!

اسلام ایک ایسی حقیقت ہے، جسے ہرگز نہیں بدلا جا سکتا۔

آج کل سیاست دانوں نے ایک اور سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ وہ ہے قوم سے معافی مانگنا۔ فلاں معاملے میں ہم سے غلطی ہوئی، اس کی معافی مانگتے ہیں۔ یہ ان کا اقبال جرم ہے۔ اقبال جرم کو دنیا کی کوئی عدالت معاف نہیں کرتی۔ کسی کو قتل کر کے مجرم عدالت میں کہے کہ میں نے اسے قتل کر دیا ہے۔ اب مجھے معاف کیا جائے، کیا عدالت اسے معاف کر دے گی؟ ہرگز نہیں کرے گی۔ اسے اقرارِ جرم کی بنا پر سزا دی جائے گی۔ معافی مانگنے والے سیاست دانوں کو بھی اقرارِ جرم کی بنا پر سزا ملنی چاہیے۔ کیا سپریم کورٹ کے چیف جسٹس اس اقبالِ جرم کا از خود نوٹس لیں گے؟

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

چند اور باتیں:

ذوالفقار علی بھٹو کی ذات اور سیاست سے بعض خالص سیاسی جماعتوں کو بھی اختلاف رہا اور نیم دینی اور نیم سیاسی جماعتیں بھی ان پر تنقید کرتی رہیں۔ اب بھی یہی صورتِ حال ہے۔ اختلاف اور تنقید بُری چیز نہیں۔ کسی کو اس سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ یہ سلسلہ دنیوی معاملات میں بھی جاری رہتا ہے، مذہبیات میں بھی چلتا ہے اور سیاسیات میں بھی چلتا ہے۔ کوئی شخص اور کوئی جماعت غلطی سے مبرا نہیں۔ کوئی کسی کی غلطی کی نشان دہی کرے، کسی سے اختلاف کا اظہار کرے، کسی کو ہدف تنقید ٹھہرائے تو اسے برداشت کرنا چاہیے۔ لیکن یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ جس پر تنقید کی جارہی ہے اور اس کی غلطیوں کو اچھالا جا رہا ہے، اس میں کوئی اچھائی بھی ہوگی۔ اس کا ذکر بھی کرنا چاہیے۔ یہ کہیں نہیں لکھا کہ برائی کا ذکر کرو، اچھائی کا نہ کرو۔

بھٹو نے ملک وقوم کے لیے جو اچھے کام کیے، ان کا تذکرہ گزشتہ سطور میں اختصار سے کیا گیا ہے۔ پاکستان اگست ۱۹۴۷ء میں قائم ہوا۔ لیکن جون ۱۹۷۷ء تک پورے تیس سال اس ملک میں شراب خانے کھلے رہے اور شراب کی بھٹیاں قائم رہیں۔ شراب انگریزی حکومت کے زمانے کی طرح بنتی اور بکتی رہی۔ اس وقت اہل حدیث، حنفی (دیوبندی، بریلوی) شیعہ اور جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے بے شمار علمائے کرام موجود تھے۔ کسی نے شراب کے خلاف تحریک شروع نہیں کی۔ کسی نے افیون کے ٹھیکے ختم کرانے کی کوشش نہیں کی۔ گھوڑوں کی ریس کے نام سے جو اعام چلتا تھا، کسی نے اس کو ختم کرنے کے لیے آواز بلند نہیں کی۔ شراب خانے بھٹو نے بند کیے، افیون کے ٹھیکے بھٹو کے زمانے میں بند ہوئے۔ بعض مذہبی جماعتوں کے علمائے کرام کے کہنے سے جمعے کی چھٹی بھٹو کے عہد حکومت میں ہوئی۔ اگرچہ یہ چھٹی غلط تھی، لیکن علماء کے مطالبے پر ہوئی۔ چھٹی کے دن لوگ شادیاں کرتے ہیں اور رشتے داروں اور دوستوں سے ملاقات کے لیے سفر کرتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جمعہ نہیں پڑھا جا سکتا۔ مگر علمائے کرام کا نقطہ نظر یہ تھا کہ جمعہ پڑھا جائے یا نہ پڑھا جائے، چھٹی ضرور کی جائے۔ اب بھی بعض علمائے کرام کا یہ مطالبہ جاری ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

بہر حال ہمیں کسی شخص اور کسی پارٹی پر تنقید کرتے وقت ان باتوں پر بھی غور کرنا چاہیے جو ان کے دورِ اقتدار میں بروئے عمل آئیں۔ جس سے کسی معاملے میں اتفاق ہو، اس کی اچھائیوں کی فہرست بناتے جانا اور جس سے اختلاف ہو اس کی لغزشیں جمع کرتے جانا قرین انصاف نہیں۔

پنجاب پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے۔ ضیاء الحق کے زمانے میں میاں نواز شریف کو پہلے اس صوبے کا وزیر خزانہ بنایا گیا۔ پھر وہ اس کے وزیر اعلیٰ بنائے گئے۔ ضیاء الحق نے لاہور کے ایک اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے ان کے لیے طوالت عمر کی دعا کی اور فرمایا ''میری عمر بھی نواز شریف کو لگ جائے۔'' یعنی میاں نواز شریف صاحب، ضیاء الحق کی فوجی حکومت کی بہت بڑی ضرورت تھے اور بے شک میاں صاحب ان کے بہت کام آئے۔ ضیاء الحق کی فوجی حکومت سے انھوں نے کبھی اختلاف نہیں کیا۔ ۱۷۔ اگست کو وہ ان کے سالانہ عرس شریف میں بھی شرکت فرماتے رہے ہیں۔ وہ تو بعد میں جب خود ان پر ضرب پڑی تو فوجی حکومت کی مخالفت کرنے لگے۔ پہلے تو معاملہ اللہ کے فضل سے ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ میاں صاحب کے نزدیک جمہوری اور منتخب حکومت خود انہی کی تھی جو ایک فوجی جرنیل اور آمر نے ختم کی۔ ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت جو ضیاء الحق نے ختم کی، وہ ان کے نزدیک شاید نہ جمہوری تھی، نہ منتخب۔ یہ لینے اور دینے کے دو پیمانے ہیں۔ اپنے لیے اور ہے، دوسروں کے لیے اور۔ سیاسی جماعتوں کی یہی وہ روش ہے جو اختلاف کے بجائے دشمنی تک پہنچی اور یہی جمہوریت کے لیے نقصان کا باعث ہوئی۔

جماعت الدعوہ:

قیامِ پاکستان کے بعد جو بہت سی سیاسی اور خالص دینی تنظیمیں قائم ہوئیں، ان میں ایک تنظیم کا نام جماعت الدعوۃ ہے جو ۱۹۸۶ء میں پروفیسر حافظ محمد سعید کی قیادت میں قائم کی گئی۔ اس جماعت یا تنظیم کا نہ سیاست سے کوئی تعلق ہے اور نہ یہ کسی جماعت یا کسی گروہ کی مخالفت کرتی ہے۔ نہ کسی پر تنقید کرتی ہے اور نہ کسی کو ہدف اعتراض ٹھہراتی ہے۔ یہ سراسر رفاہی تنظیم ہے اور اس کا اصل مقصد خدمت خلق ہے۔ بے شک اسے قائم کرنے والے حضرات مسلک اہل

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

حدیث سے تعلق رکھتے ہیں اور یہی لوگ اس کے منتظم ہیں، لیکن اس کے دائرۂ خدمت میں ہر مسلک فقہی کے لوگ شامل ہیں بلکہ یہ غیر مسلمانوں کی بھی دل کھول کر خدمت کرتی ہے۔

جماعت الدعوۃ نے دو یونیورسٹیاں قائم کیں اور دو سائنس کالج اس کی نگرانی میں جاری ہوئے۔ اس کے علاوہ ایک سو ساٹھ سکول اور پچاس دینی مدارس اس کے زیر نگرانی معرضِ قیام میں آئے۔ ان تعلیمی اداروں میں تیس ہزار سے زائد طالب علم تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ملک میں اس کی ۱۵۸ فری ڈسپنسریاں ہیں اور اس نے ۲۷ ہسپتال بنائے ہیں جن میں مریضوں کا مفت علاج کیا جاتا ہے۔ اس کی کئی بہترین ایمبولینسیں ہیں۔ بلوچستان کے مختلف مقامات میں جماعت الدعوۃ نے میٹھے پانی کے ۲۸۴ کنویں کھدوائے ہیں اور اب تک یہ جماعت آٹھ لاکھ افراد کو ہیپاٹائٹس کی ویکسین لگوا چکی ہے۔ سونامی کے بعد سری لنکا اور انڈونیشیا میں بھی اس نے خدمات سرانجام دیں، جس کا دنیا کے تمام بڑے بڑے اداروں نے اعتراف کیا۔

۵۔ اکتوبر ۲۰۰۵ء کو اسلام آباد، راولپنڈی، آزاد کشمیر اور صوبہ سرحد کے بعض مقامات میں جو زبردست زلزلہ آیا تھا، اس میں جماعت الدعوۃ کے کارکنوں نے بے حد خدمات سر انجام دیں۔ زلزلے سے متاثرین کی مالی خدمت کی، ان کو رضائیاں، کمبل اور کپڑے دیے اور بے شمار لوگوں کے لیے مکان تعمیر کیے۔ ان کے علاج معالجے کا انتظام کیا، جس کا اعتراف اقوامِ متحدہ نے بھی کیا۔ لیکن ۲۶۔ نومبر ۲۰۰۸ کو بمبئی کے تاج محل ہوٹل اور اوبرائے ہوٹل میں جو دہشت گردی ہوئی، ہندوستان نے اس کا ذمہ دار جماعت الدعوۃ کو ٹھہرایا، اور اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے ہندوستان کے دعوے کو صحیح قرار دیا اور اس کے کہنے پر حکومت پاکستان نے اس پر پابندی عائد کر دی اور اس کے متعدد کارکنوں اور رہنماؤں کو گرفتار کر لیا۔ ان میں سے بعض کو عدالت نے رہا کر دیا اور پابندیاں بھی اُٹھا لیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جماعت الدعوۃ خالص رفاہی، اصلاحی اور تدریسی ادارہ ہے اور وہ اسی کام میں مصروف ہے۔

یکم دسمبر ۲۰۰۹ء		لاہور

❀❀❀❀

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

اکیسواں باب:

چند نا قابل فراموش اور سبق آموز واقعات

دوسرے لوگوں کی طرح میری زندگی میں بھی بے شمار واقعات پیش آئے، جن کے وقوع پر طویل عرصہ بیت چکا ہے، لیکن وہ واقعات اب بھی میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ ان میں سے چند واقعات اختصار کے ساتھ یہاں بیان کیے جاتے ہیں۔ ان واقعات کا عنوان میں نے ''نا قابل فراموش اور سبق آموز واقعات'' رکھا ہے۔ ''نا قابل فراموش'' کی کوئی خاص تعریف نہیں کی جا سکتی۔ نہ ''سبق آموز واقعات'' کا خاص تعین کیا جا سکتا ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک بڑے سے بڑا واقعہ کو بھی کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہوتی اور وہ اسے معمولی واقعہ سمجھ کر فراموش کر دیتے ہیں۔ بعض کے نزدیک کوئی چھوٹا سا واقعہ بھی بڑا اہم ہوتا ہے اور وہ انھیں ہمیشہ یاد رکھتے ہیں۔ اسی طرح بعض لوگ کسی چھوٹی سی بات کو بھی بڑی سبق آموز قرار دیتے ہیں۔ بعض لوگ کتنی بھی اہم بات ہو، نہ اسے کوئی اہمیت دیتے ہیں اور نہ اس سے کوئی سبق حاصل کرتے ہیں۔ بہر حال میں ذیل میں چند واقعات عرض کرتا ہوں جو میرے نزدیک نا قابل فراموش بھی ہیں اور سبق آموز بھی۔

۱: دس گیارہ سال کی عمر ہوگی کہ میں اپنے ہم عمر تین چار لڑکوں کے ساتھ اپنے شہر کے ریلوے اسٹیشن گیا۔ واپسی پر میرے ساتھی تو اسٹیشن کی سیڑھیوں کے ذریعے سے باہر آ گئے، لیکن میں نے پلیٹ فارم سے نکل کر ریلوے کی لائینوں کا رُخ کیا۔ ایک مال گاڑی چلنے کے لیے تیار کھڑی تھی، میں نے اس کے ایک ڈبے کے نیچے سے لائن پار کرنے کا فیصلہ کیا۔ لائن پار کر کے ابھی کھڑا نہیں ہوا تھا کہ گاڑی چل پڑی۔ یعنی زندگی اور موت کے درمیان ایک لمحے کا فاصلہ رہا ہوگا۔ اب میری عمر ۸۰ برس سے زیادہ ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

اللہ کی قدرت کا اندازہ فرمایئے ایک لمحے کا فاصلہ ستر سال سے زائد فاصلے میں پھیل گیا۔ یہ واقعہ جب میرے ذہن میں آتا ہے، میں کانپ جاتا ہوں اور پھر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس کے بعد اس نے اتنی طویل زندگی عطا فرمائی۔ اس کی وجہ یا تو مجھ سے تحریری صورت میں کوئی خدمت لینا مقصود تھا یا میرے گناہوں میں اضافہ کرنا۔ میں اپنی عمر کے لیل و نہار کو خوب جانتا ہوں کہ کس انداز سے گزرے اور کس انداز سے گزر رہے ہیں۔ ان میں نیکی کے بجائے گناہوں کی مقدار بہت زیادہ ہے۔ جتنی عمر بڑھتی گئی، اسی نسبت سے گناہ بڑھتے گئے۔ بعض اوقات گناہوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن پھر ''توبہ کرنی تھی کہ گھٹا چھا گئی'' والا معاملہ پیش آجاتا ہے۔ عمر کے ہر حصے میں گناہوں کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ چھوٹی عمر کے گناہ اور قسم کے ہوتے ہیں۔ جوانی کے اور قسم کے، بڑی عمر کے اور قسم کے۔

۲: یہی کوئی گیارہ بارہ سال کی عمر ہوگی۔ سردیوں کا موسم تھا کہ میرے ایک مرحوم بزرگ سیف الرحمٰن مجھے ایک سفر پر اپنے ساتھ لے گئے۔ صبح تین بجے کے پس و پیش ہم ریل سے اُترے۔ جس گاؤں جانا تھا، وہ ریلوے اسٹیشن سے کئی میل کے فاصلے پر تھا۔ اندھیری رات۔ جوں ہی ہم اسٹیشن سے باہر نکلے اور اپنی منزل کی طرف روانہ ہوئے، ہم سے چند قدم کے فاصلے پر دائیں جانب ایک لالٹین ہمارے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ نہ لالٹین اُٹھانے والا کوئی شخص دکھائی دیتا تھا اور نہ کسی کا کوئی ہاتھ نظر آتا تھا۔ میرے بزرگ نے فرمایا: بے خوف ہو کر آرام سے چلتے رہو۔ جب صبح کا اُجالا ہوا یعنی قرآن کے الفاظ میں ﴿ وَالصُّبۡحِ اِذَا تَنَفَّسَ ﴾ کی صورتِ حال پیدا ہوئی اور فضا میں روشنی پھیلنے لگی تو لالٹین غائب ہوگئی۔ میرے بزرگ نے مجھ سے پوچھا: ڈر تو نہیں لگتا؟ میں نے کہا: نہیں۔

یہ کیا معاملہ تھا اور کیوں تھا؟ اس کا مجھے نہ اُس وقت علم تھا، نہ اب کوئی بات سمجھ میں آتی ہے۔ نہ میں نے اپنے بزرگ سے اس کے متعلق کبھی پوچھا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

۴: ۱۹۳۹ء کے آخری دنوں کی بات ہے کہ میں مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے ساتھ لاہور آیا۔ مغرب کی نماز ہم نے مسجد مبارک میں پڑھی۔ نماز کے بعد کچھ کالی اور کچھ سفید چھوٹی ڈاڑھی والے گورے رنگ کے ایک خوب رو شخص نے جو شیروانی اور پاجامہ پہنے اور سر پر قراقلی ٹوپی لیے ہوئے تھے، قرآنِ مجید کا درس دینا شروع کیا۔ تقریباً پون گھنٹا ان کا درس جاری رہا۔ ان کے سامعین میں زیادہ تر اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ) کے استاد اور طالب علم تھے۔ مولانا عطاء اللہ حنیف نے بتایا کہ ان کا اسم گرامی مولانا محمد حنیف ندوی ہے۔ یہ اس مسجد میں خطبۂ جمعہ بھی ارشاد فرماتے ہیں اور روزانہ نمازِ مغرب کے بعد درس قرآن بھی دیتے ہیں۔ درس ختم ہوا تو مولانا عطاء اللہ صاحب نے جنھیں مولانا محمد حنیف ندوی پہلے سے جانتے تھے، اپنی جگہ سے اُٹھ کر انھیں سلام کیا۔ میں نے بھی ان کو سلام عرض کیا۔ خیر و عافیت کے تبادلے کے بعد مولانا عطاء اللہ حنیف نے جانے کے لیے مولانا حنیف ندوی سے اجازت چاہی تو انھوں نے فرمایا: ''اتنی جلدی؟ چلیے آپ کو چائے پلائیں۔''

مولانا محمد حنیف ندوی نے دائیں ہاتھ میں چھڑی پکڑی اور ہم تینوں مسجد سے باہر نکلے۔ ریلوے روڈ کی طرف اسلامیہ کالج کے بڑے دروازے سے باہر نکل کر سڑک پار کر کے تھوڑا آگے بڑھے تو ایک عمارت پر بہت بڑا بورڈ آویزاں تھا، جس پر موٹے موٹے حروف میں لکھا تھا: ''عرب ہوٹل۔''

ہم مولانا حنیف ندوی کے ساتھ اس ہوٹل کے اندر جا کر ایک کونے میں میز کے اردگرد پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ بیرا آیا اور مولانا نے اسے تین چائے لانے کو کہا۔ وہ ایک ٹرے میں چینی کی چھوٹی چھوٹی پیالیاں، اسی قسم کی چھوٹی چھوٹی تھالیوں میں رکھ کر لایا۔ پیالیوں کے ایک طرف چینی کی کنڈیاں سی لگی ہوئی تھیں۔ میں نے اس سے پہلے نہ چائے دیکھی تھی، نہ پی تھی اور نہ یہ معلوم تھا کہ چائے پینے کے کیا آداب ہیں۔ میں سمجھا یہ کوئی دوا یا بوٹی ہوگی، جس کا نام چائے ہے اور لاہور کے لوگ اسے عرب ہوٹل کی دکان میں آ کر پیتے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ہیں، اسی لیے تو چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں لائی گئی ہے، ورنہ کھانے پینے کی چیزیں تو کانسی یا پیتل کے بڑے بڑے برتنوں میں لائی جاتی ہیں تا کہ اچھی طرح پیٹ بھر جائے۔

میں دیکھتا رہا کہ مولانا محمد حنیف ندوی اور مولانا عطاء اللہ صاحب کس طرح یہ فریضہ سرانجام دینا شروع کرتے ہیں۔ جس طرح ان کو دیکھا، اسی طرح میں نے پیالی کی کنڈی میں انگشت شہادت ڈالی اور اسے اُٹھا کر منھ کو لگایا اور پھر گرم گرم چائے کا پانی کی طرح جو پورا گھونٹ بھرا تو وہ حلق کو چیرتی ہوئی معدے میں جا گری اور لمحہ بھر میں چودہ طبق روشن ہو گئے۔ آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے، زبان پر یکا یک چھالے اُبھر آئے اور ایسا لگا جیسے پیٹ میں آگ ڈال دی گئی ہے۔ اندر کا سارا نظام آناً فاناً درہم برہم ہو گیا۔ یوں سمجھیے کہ

برپا ضمیر زہد میں کہرام ہو گیا
ایماں دلوں میں لرزہ براندام ہو گیا

مولانا محمد حنیف ندوی سے یہ میری پہلی ملاقات تھی اور زندگی میں پہلی مرتبہ انہی کے ساتھ چائے پینے کا شرف حاصل ہوا۔ یا یوں کہیے کہ میری چائے نوشی کا افتتاح مولانا ممدوح کے ہاتھوں ہوا اور انہی کی نیک کمائی سے ہوا۔

عرب ہوٹل کسی زمانے میں لاہور کے ادیبوں، شاعروں اور اخبار نویسوں کا مرکز تھا اور اس کے ساتھ علم و ادب اور لطائف و ظرائف کی ایک تاریخ وابستہ تھی۔ بہت سال ہوئے عرب ہوٹل بھی ختم ہو گیا، اس کے مالک بھی اللہ کو پیارے ہو گئے، اس میں بیٹھنے والے شاید دو چار آدمی رہ گئے ہوں، باقی سب لوگ اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے:

آں قدح بہ شکست و آں ساقی نماند

۴: میں نے چھوٹی عمر میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تصویر کسی اخبار میں دیکھی اور ان کا کوئی مضمون پڑھا۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ وہ مضمون میری سمجھ میں آیا یا نہیں آیا، لیکن ان کی تصویر دیکھ کر ان کا پورا سراپا میری نظروں میں سما گیا۔ وہ مجھے نہایت خوب صورت معلوم ہوئے اور ان کے مضمون سے (قطع نظر اس کے کہ میں اسے سمجھ پایا یا نہیں سمجھ پایا)

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

بے حد متاثر ہوا۔ لیکن ان کی زیارت کا شرف مجھے ۱۹۳۹ء کے ماہ فروری کی کسی تاریخ کو ہوا۔ مَیں ان دنوں فیروز پور طلب علم میں مشغول تھا۔ ایک اخبار میں پڑھا کہ کل مولانا ابوالکلام آزاد لاہور تشریف لائیں گے اور موچی دروازے کے باہر جلسۂ عام میں تقریر کریں گے۔ اتفاق سے اس وقت مولانا معین الدین لکھوی بھی وہیں تھے۔ دوسرے دن مَیں اور مولانا معین الدین لکھوی ان کی تقریر سننے کے لیے لاہور آئے، لیکن انھوں نے تقریر نہیں کی۔ البتہ گول باغ (موجودہ ناصر باغ) میں شہریانِ لاہور کی طرف سے ان کے اعزاز میں چائے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ مولانا وہاں تشریف لائے اور ہم نے ان کی زیارت کی۔ پھر واپس فیروز پور چلے گئے۔ دوسرے دن پھر اخباروں میں اعلان ہوا کہ آج مولانا آزاد موچی گیٹ کے باہر تقریر فرمائیں گے۔ مولانا معین الدین تو اپنے مسکن مرکز الاسلام چلے گئے، لیکن میں لاہور آیا اور مولانا کی تقریر سنی۔

جس طرف سے مولانا کو جلسہ گاہ میں داخل ہونا تھا، وہاں دونوں طرف آمنے سامنے پہلے احرار رضا کار سرخ قمیصیں پہنے، ہاتھوں میں کلہاڑیاں اُٹھائے اور کلہاڑیوں کو ایک دوسری سے ملائے کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ سکھ رضا کار کرپان کے ساتھ کرپان کی نوک لگائے ہوئے تھے۔ خاکسار بیلچے سے بیلچہ ملائے اور پھر ہندو نوجوان لاٹھی سے لاٹھی کا سرا جوڑے ہوئے تھے۔ یہ ایک محراب سی تھی، جس کے بیچ میں سے مولانا کو گزرنا تھا۔ دروازے پر ایک لمبا چوڑا کپڑا آویزاں تھا، جس پر موٹے موٹے سنہری حروف میں مرقوم تھا...... ''ہندوستان کا بے تاج بادشاہ مولانا ابوالکلام آزاد زندہ باد!''

مولانا اس سے چند روز پیشتر آل انڈیا کانگرس کے صدر منتخب ہوئے تھے۔

بے شمار لوگ جلسہ گاہ میں موجود تھے۔ میں ہجوم میں گھس گھسا کر سٹیج کے قریب جا پہنچا۔ سٹیج پر کئی رہنما بیٹھے تھے۔ مرد بھی، عورتیں بھی۔ مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی بھی موجود تھے۔ جلسہ گاہ میں ایک شور بپا تھا۔ لیکن مولانا ابوالکلام آزاد ابھی نہیں آئے تھے۔ اس اثنا میں مختلف لوگوں نے نظمیں پڑھیں۔ تھوڑی دیر بعد مولانا تشریف لائے۔ جو لوگ بیٹھے تھے، وہ ان کو

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

دیکھنے کے لیے کھڑے ہوگئے اور جو کھڑے تھے، وہ انھیں ایڑیاں اٹھا اُٹھا کر دیکھنے لگے اور ''مولانا ابوالکلام آزاد زندہ باد'' کے نعروں سے فضا گونجنے لگی۔

مولانا کرسی پر بیٹھ گئے۔ مجمعے کی سطح ساکن اب متحرک ہوگئی تھی۔ مولانا داؤد غزنوی نے لوگوں کو خاموش رہنے کی اپیل کی، لیکن جلسہ گاہ میں ایک ہنگامہ بپا تھا اور ہر شخص آگے بڑھ کر مولانا آزاد کو دیکھنے اور سننے کے لیے مضطرب تھا۔ سٹیج کے پیچھے بھی شور مچا ہوا تھا اور لوگ درختوں پر چڑھ رہے تھے۔

اعلان کیا گیا اب ملک نصر اللہ خان عزیز کی نظم سنیے۔ ملک صاحب مشہور صحافی تھے اور مولانا آزاد کے عقیدت مند۔ ان کے ساتھ گونڈہ جیل میں قید رہے تھے۔ ان کی زندگی کا طویل عرصہ کانگرس میں گزرا۔ پھر جماعت اسلامی میں شامل ہوگئے تھے۔ ''امام الہند'' کے عنوان سے مولانا کی موجودگی میں انھوں نے طویل نظم پڑھی۔ نظم کا ایک ایک لفظ مولانا سے عقیدت و محبت کا مظہر ہے۔ ملک صاحب نے ترنم سے پڑھنا شروع کیا اور ان کی دل کش آواز نے سماں باندھ دیا۔ چند شعر ملاحظہ فرمایے:

اے امامِ محترم! اے رہبرِ عالی مقام
علم و تدبیر و سیاست ہیں ترے در کے غلام

تیری تحریر و خطابت نازشِ اسلام ہے
تیرا ہر اک لفظ گویا پارۂ الہام ہے

عزم تیرا کوہِ پیکر، حزم تیرا بے مثال
صدق تیرا بے عدیل اور عدل تیرا لازوال

تجھ پہ کھولے حق نے راز و معنیٔ اُمّ الکتاب
فیض ہے روح القدس کا، جس سے تو ہے فیض یاب

تو علم بردار ہے اسلام کی توحید کا
تو امیں ہے اس صدی میں رتبۂ تجدید کا

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

اس طویل نظم کا آخری شعر ہے:

نام ہے آزاد تیرا، ہند بھی آزاد ہو
یہ غلام آباد بھی آزاد ہو، دل شاد ہو

نظم کے ایک ایک مصرعے پر ملک نصر اللہ خاں عزیز کو داد ملی، لیکن سنا ہے کہ ان کے کلام کا جو مجموعہ شائع ہوا ہے، اس میں یہ نظم شامل نہیں کی گئی۔

نظم کے بعد مولانا داؤد غزنوی نے مولانا کی تقریر کا اعلان کیا اور وہ مائک پر آئے۔ اونچی دیوار کی کالے رنگ کی ٹوپی۔ قدرے چھوٹی موری کا پاجامہ اور شیروانی زیب تن۔ کندھوں پر دونوں طرف لٹکتی ہوئی گرم چادر۔ دونوں ہاتھ کولھوں پر رکھے ہوئے۔ وہ مائک پر آئے تو ان کی زیارت کے شائقین کی آوازیں باہم ٹکرا کر شور کا رنگ اختیار کر گئیں۔ انھوں نے تقریر شروع کی اور کہا: ''بہنو اور بھائیو!''

لیکن شور بند نہیں ہوا...... مولانا چند ثانیے خاموش رہے۔

پھر فرمایا: ''کیا جو لوگ میری پشت کی جانب ہیں خاموش رہیں گے؟''

یہ کہنا تھا کہ سناٹا چھا گیا۔ جو لوگ درختوں پر چڑھ رہے تھے، وہ جہاں تھے، وہیں رک گئے۔ اب وہ چمگادڑوں کی طرح درختوں سے چمٹے ہوئے تھے۔ میں نے جلسہ گاہ میں نصب سپیکر گنے، وہ چودہ تھے۔

تقریر پینتیس منٹ جاری رہی۔ فضا بالکل ساکت و صامت اور مجمع ہمہ تن گوش...... ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چاروں طرف نور کی چادر تنی ہوئی ہے۔

۵: سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری برصغیر کی دنیائے خطابت کے مشہور خطیب تھے۔ وہ کئی کئی گھنٹے بے تکان تقریر کرتے تھے۔ جو شخص ان کی تقریر سننے کے لیے آ جاتا، وہ اس میں مسحور ہو جاتا اور اُٹھنے کا نام نہ لیتا۔ میں نے پہلی دفعہ ان کی تقریر فیروز پور کی مجلس احرار کے ایک جلسے میں سنی۔ چھوٹے بڑے تمام احراری انھیں شاہ جی کہا کرتے تھے۔

عشا کی نماز سے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد تیں پینتیس آدمیوں کے ساتھ شاہ جی جلسہ گاہ میں

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

داخل ہوئے اور انھیں دیکھتے ہی امیر شریعت زندہ باد۔ مجلس احرار زندہ باد اور نعرۂ تکبیر اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ شاہ جی نے سٹیج پر کھڑے ہو کر چاروں طرف نگاہ ڈالی اور پھر ایک کرسی پر جو خاص طور سے ان کے لیے رکھی گئی تھی، تشریف فرما ہوئے۔

میرے خیال میں رات کے گیارہ بجے کے قریب اُنھوں نے تقریر کے لیے مائک سنبھالا اور پھر نعرے گونجنے لگے۔ ہاتھ کے اشارے سے انھوں نے نعروں کا سلسلہ بند کرایا اور ایک ادائے خاص سے دائیں بائیں دیکھ کر مائک کو ذرہ اپنے قریب کیا اور خطبۂ مسنونہ کے الفاظ سامعین کے پردۂ سماع سے ٹکرانے لگے۔ نہایت دل کش اور پُر تاثیر آواز۔ خطبے کے مضمون سے جب آواز کا زیر و بم ہم آہنگ ہوتا تو لوگ جھوم جھوم جاتے۔ پھر جب درود شریف پڑھنا شروع کیا اور اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کے الفاظ ان کی لسان سحر آفریں سے ادا ہوئے تو ایسے لگا کہ نبی آخر الزمان ﷺ کی ذاتِ اقدس سے عقیدت و احترام کے تمام لوازم ان کی ذات اور زبان میں جمع ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد جب آیاتِ قرآن کی تلاوت کا آغاز ہوا تو خیال گزرا کہ یہ آیات براہِ راست آسمان سے نازل ہو رہی ہیں۔ سبحان اللہ! ان اوصاف کا حامل خطیب اب کہاں پیدا ہوگا۔

برصغیر کے اس شہنشاہ خطابت نے قمری حساب سے ۷۱ برس اور عیسوی حساب سے عمر کی تقریباً ۷۰ منزلیں طے کرنے کے بعد ۹ ربیع الاوّل ۱۳۸۱ھ (۲۱ راگست ۱۹۶۱ء) کو ملتان میں وفات پائی۔

۶: پنجاب کی ریاستوں میں ایک سیاسی جماعت ''پرجا منڈل'' کے نام سے موسوم تھی۔ پرجا کے معنے ہیں عوام یا رعایا اور منڈل کے معنے ہیں پارٹی۔ یہ ہندی ترکیب ہے۔ آپ اسے انگریزی میں پیپلز پارٹی اور اُردو میں عوامی جماعت کا نام دے سکتے ہیں۔ پرجا منڈل ہماری ریاست فرید کوٹ میں بھی تھی اور میں اس کا سیکرٹری جنرل تھا۔ ہم نے پرجا منڈل کی طرف سے اپنی ریاست میں آزادی کی تحریک شروع کی تو ہمیں گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا گیا۔ یہ ۱۹۴۶ء کے ماہِ جون کی بات ہے۔ بہت سے لوگوں کو

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

رہا کر دیا گیا، لیکن ہم تیرہ آدمیوں کو جن چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیوں میں بند کیا گیا، جیل کی اصطلاح میں انھیں سنگین کوٹھڑیاں کہا جاتا تھا۔ یہ بارہ کوٹھڑیاں تھیں۔ چھ ایک دوسری کے ساتھ ملی ہوئی تھیں، جن میں مجھے، قاضی عبیداللہ، دوست محمد خاں، صوفی خوشی محمد، بھائی دیال سنگھ اور ایک ہندو رام لال کو بند کیا گیا تھا۔ ان کوٹھڑیوں کا رُخ مغرب کی طرف تھا۔ چھ آدمیوں کو ہماری پشت کی طرف ملحق چھ کوٹھڑیوں میں محبوس کیا گیا تھا، جن کا رُخ مشرقی جانب تھا۔ ایک کو کسی اور جگہ رکھا گیا تھا۔

ہماری کوٹھڑیوں کے بالکل سامنے کی دیوار کے دوسری طرف تین پھانسی گھاٹ تھے۔ ہم اپنی کوٹھڑیوں میں ایڑیوں کے بل کھڑے ہو کر گردن اونچی کر کے دیکھتے تو تینوں پھانسی گھاٹ صاف نظر آتے تھے۔ ایک مرتبہ تین حقیقی بھائیوں کو جو سکھ تھے، ایک ساتھ پھانسی دی گئی تھی۔ جس صبح کو انھیں پھانسی پر لٹکایا جانا تھا، اس پوری رات وہ اپنے مذہب کے مطابق عبادت کرتے رہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد رات کو تینوں بھائی بہ یک آواز پکارتے: ”مسلمان بھائیو! السلام علیکم۔ ہندو بھائیو! رام رام۔ سکھ بھائیو! ست سری اکال جو بولے سونہال۔ یہ ہماری اس دنیا کی زندگی کی آخری رات ہے۔ خدا کے لیے ہمیں معاف کر دو۔“

یہ آوازیں نہایت دردناک تھیں، جو شام سے لے کر صبح تک تمام رات بلند ہوتی اور قیدیوں کے کانوں میں پڑتی رہیں۔ مسلمان ان کے سلام، ہندو ان کے رام رام اور سکھ قیدی ان کے ست سری اکال کا جواب دیتے رہے۔ تمام رات یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھانسی دینے کے لیے لیور بھی تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ہلتے رہے اور ان کی کھٹکھٹاہٹ کی آواز کانوں میں پڑتی رہی۔ صبح چھ بجے جب ان تینوں کو بہ یک وقت پھانسی کے تختے پر چڑھایا گیا تو اسی قسم کے الفاظ کہتے کہتے ان کی آواز حلق میں اٹک کر ہمیشہ کے لیے بند ہو گئی۔ ان کو پھانسی دینے کے بعد لانگری کھانا لے کر آئے تو غم اور افسوس کی وجہ سے ہم میں سے کسی نے کھانا نہیں کھایا۔

نمبر دار قیدیوں سے ان کے بارے میں معلوم ہوا کہ یہ ریاست فرید کوٹ کے ایک گاؤں ”گولے والا“ کے رہنے والے تھے۔ گاؤں کے دو سکھ خاندانوں میں لڑائی ہوئی۔ یہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

تینوں بھائی دونوں فریقوں کو لڑائی سے روکنے کے لیے گئے۔ اتنے میں ایک فریق کے دو آدمی قتل ہو گئے اور قتل ان بھائیوں کے ذمے لگا دیا گیا۔ مخالفوں نے عدالت میں ان کے خلاف شہادتیں دیں۔ اصل قاتل بچ گئے اور ان کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ ان میں سے چھوٹا بھائی بیس اکیس سال کا نوجوان تھا اور غیر شادی شدہ تھا۔ دو بڑے بھائی شادی شدہ اور صاحب اولاد تھے۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ پھانسی دینے کے لیے لاہور کے علاقہ مزنگ سے ایک عیسائی کو بلایا جاتا ہے۔ اسے ایک آدمی کو پھانسی دینے کا پانچ روپے معاوضہ دیا جاتا ہے، جسے جیل کی اصطلاح میں ''پنج روپے سر'' کہا جاتا ہے۔ (یعنی پانچ روپے پر ہیڈ) علاوہ ازیں آنے جانے کا ریل کا کرایہ اور ایک شراب کی بوتل دی جاتی ہے۔

برصغیر کے عدالتی نظام کا اندازہ کیجیے کہ قتل کوئی کرتا ہے اور سزا کسی اور کو دی جاتی ہے۔

۷: اب تو معلوم نہیں کیا صورتِ حال ہے۔ تقسیم ملک سے قبل زیادہ تر جیلوں میں قیدیوں کے لیے جو سبزی ساگ، مولیوں، گاجروں اور شلجموں وغیرہ کی صورت میں پکائی جاتی تھی، اسے مشقتی قیدی چارا کترنے والی مشینوں میں کترتے تھے، جس میں مٹی کی اچھی خاصی آمیزش ہوتی تھی۔ کترنے اور پکانے سے پہلے نہ اُسے صاف کیا جاتا تھا اور نہ پانی سے دھویا جاتا تھا۔ اسی طرح مٹی سمیت لوہے کے کڑاہوں میں پکا کر قیدیوں کو دے دیا جاتا تھا۔ اس سے بسا اوقات پیچش وغیرہ کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ اس زمانے میں رفع حاجت کے لیے لوہے کا ایک ''پترا'' ہوتا تھا جو قیدی کی کوٹھڑی کی دیوار میں رکھ دیا جاتا تھا۔ کوٹھڑی کی چوڑی دیوار میں دونوں طرف بڑا سا سوراخ ہوتا تھا۔ قیدی رفع حاجت کے وقت اسے کوٹھڑی کے اندر کھینچ لیتا اور فراغت کے بعد پیچھے کو دھکیل دیتا۔ صبح سورج نکلنے کے بعد صفائی کرنے والا خاک روب اسے لے جاتا اور اس کی جگہ دوسرا پترا رکھ دیا جاتا۔

مجھے جیل میں گئے دس بارہ دن ہوئے تھے کہ پیچش کی شکایت ہو گئی اور خون آنے لگا۔ یہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

معاملہ زندگی میں پہلی دفعہ پیش آیا تھا۔ خون دیکھ کر میں حیران ہوا کہ یہ کیا سلسلہ ہے۔ مجھے اپنے متعلق کئی قسم کے شبہے ہونے لگے۔ دو دن اسی طرح گزر گئے۔ تیسرے دن صفائی کرنے والے نے میرے ہمسائے قاضی عبیداللہ سے کہا کہ تمھارے ساتھی قیدی لڑکے کو پیچش کی شکایت ہوگئی ہے اور خون آنے لگا ہے، اس کے لیے ڈاکٹر سے دوا لو۔ یہ سن کر مجھے تسلی ہوئی کہ کسی قسم کے خطرے اور شبہے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس خون کا تعلق پیچش سے ہے۔

وہ اتوار کا دن تھا۔ دوسرے دن پیر کو پریڈ تھی۔ سپرنٹنڈنٹ جیل آیا جو ڈاکٹر بھی تھا اور اس کا نام جگ دیش چند تھا۔ اس کے ساتھ داروغہ جیل عجائب سنگھ تھا۔ ایک اور افسر بہرام خاں تھا۔ قاضی عبیداللہ اور خاک روب نے سپرنٹنڈنٹ جیل کو میرے متعلق بتایا تو اس نے دوا لکھ کر دی کہ جیل کے ہسپتال سے لی جائے، نیز تین چار دن کے لیے روٹی بند کر دی اور اس کی جگہ دو وقت دودھ اور دلیا دینے کی ہدایت کی۔ اگر اس سے آرام نہ آئے تو جیل کے ہسپتال میں داخل کرا دیا جائے، لیکن پیچش کا عارضہ دوسرے دن ختم ہوگیا۔ تاہم دودھ اور دلیا کئی دن ملتا رہا۔

جیل کی اصطلاح میں پریڈ کا مطلب یہ ہے کہ ہفتے میں ایک دن سپرنٹنڈنٹ جیل پورے جیل خانے کا چکر لگاتا اور ہر قیدی کی کوٹھڑی اور قیدی کی بارک میں جاتا تھا (فرید کوٹ جیل میں پیر کا دن مقرر تھا)۔ اس وقت قیدی اپنا سامان جو لوہے کی دو باٹیوں اور دو کالے کمبلوں پر مشتمل ہوتا تھا، صاف کر کے اپنے سامنے رکھ لیتا اور کھڑا ہو جاتا۔ جیل کے اہل کار سپرنٹنڈنٹ کے ساتھ ہوتے تھے۔ قیدی کوٹھڑی یا بارک کے اندر ہوتا تھا، جسے باہر سے تالا لگا ہوتا تھا اور اسے علی گڑھی تالا کہا جاتا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ کوٹھڑی یا بارک کے باہر ہوتا۔ بعض اوقات سپرنٹنڈنٹ قیدی سے کوئی بات پوچھ لیتا یا خود قیدی اس سے کوئی ضروری بات کر لیتا۔ ورنہ زیادہ تر دونوں طرف سے خاموشی رہتی۔ سپرنٹنڈنٹ آتا اور دیکھ کر چلا جاتا۔

۸: ایک مرتبہ پرانے اخلاقی قیدیوں کے لیے ریاست کے حکام نے یہ حکم جاری کیا کہ ان کو جیل کے باہر سرکاری باغات یا بڑے اہل کاروں کی کوٹھیوں میں آب پاشی اور گھاس

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

وغیرہ کاٹنے کے لیے بھیجا جائے۔قیدی کی علامت کے لیے ان کے پاؤں میں لوہے کا ہلکا سا کڑا ڈال دیا جائے۔کام کے بدلے میں انھیں روزانہ کچھ پیسے بھی دیے جائیں۔ انھیں اپنے وارثوں سے روزانہ یا دوسرے دن ملنے کی اجازت بھی دی جائے۔ان کا لباس قیدی کا ہی ہوگا۔ یہ بہت بڑی رعایت تھی جو انھیں دی گئی اور اس پر عمل شروع ہوگیا۔ان قیدیوں میں ایک دس سالہ قیدی بھی تھا جو جیل حکام کے نزدیک بہت قابل اعتماد تھا۔اس کی قید کے صرف ایک مہینا ستائیس دن باقی تھے کہ وہ بھاگ گیا۔چند روز کے بعد اسے پکڑلیا گیا۔اب اس پر جیل سے فرار کا مقدمہ چلا اور اسے تین سال قید ہوئی۔یعنی ایک مہینا ستائیس دن جیل میں رہنا، اس کے لیے مشکل ہوگیا اور اس کے بجائے تین سال مزید قید میں رہا۔پنجابی محاورے کے مطابق زیادہ کھانے کے بجائے تھوڑے سے بھی گیا۔جیل کے زمانے میں مختلف قسم کے متعدد واقعات کا پتا چلا، لیکن ان میں سے قابل ذکر واقعات گزشتہ صفحات میں ایک مستقل باب میں بیان کیے جاچکے ہیں۔

:۹ ۱۹۳۹ء کی بات ہے کہ میں فیروز پور میں مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے حلقۂ درس میں شامل تھا۔وہاں ایک طالب علم آیا، جسے مولانا ممدوح کے استاذِ محترم حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی نے بھیجا تھا۔اس طالب علم کا نام محمد صادق تھا۔انیس بیس برس کا خوب صورت نوجوان۔چوڑا چہرہ، درمیانہ قد، سرخی مائل گورا رنگ، خوش لباس اور شیریں کلام۔یہ لڑکا ایک تاجر پیشہ ہندو خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور غالباً ضلع فیروز پور کے ایک ریلوے اسٹیشن منڈی گورو ہرسائے کا رہنے والا تھا۔سرکاری سکول میں اس نے چھ جماعتیں پڑھی تھیں۔ذہین اور سمجھ دار نوجوان تھا۔اسلامی تعلیم سے متاثر ہوکر موضع لکھوکے آیا اور مولانا عطاء اللہ لکھوی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔پھر وہیں دینی تعلیم کے حصول کا آغاز کیا۔لیکن وہ بیمار تھا اور اسے دورے پڑتے تھے۔دورے کے دوران میں اس کی جسمانی اور کلامی کیفیت عجیب طرح کی ہوجاتی تھی۔حضرت مولانا عطاء اللہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

لکھوی نے اسے اپنے شاگرد مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے پاس اس لیے بھیجا تھا کہ وہ اسے پڑھائیں بھی اور فیروز پور کے کسی طبیب سے اس کا علاج بھی کرائیں۔

محمد صادق پڑھنے میں تیز تھا اور نیک بھی تھا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ وہ انگریزی کا ایک حرف نہیں جانتا تھا۔ لیکن دورے کی حالت میں فٹافٹ انگریزی بولتا تھا اور انگریزی دان اس کی صحیح انگریزی گفتگو سن کر متعجب ہوتے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ اِدھر اس کی بیماری کا دورہ ختم ہوا اور اُدھر اس کی انگریزی کا خاتمہ ہوگیا۔

فیروز پور کے ایک مشہور طبیب حکیم احمد دین تھے، جو حکیم اجمل خاں دہلوی کے شاگرد تھے۔ روزانہ بے شمار مریض ان کے پاس آتے تھے۔ ان کی تشخیص بھی صحیح ہوتی تھی اور علاج بھی صحیح ہوتا تھا۔ ان کے علاج سے اللہ تعالیٰ مریض کو شفا بخشتا تھا۔ محمد صادق کو ان کے پاس لے کر گئے تو انھوں نے فرمایا کہ اس کا اصل علاج یہ ہے کہ اس کی شادی کردی جائے۔ اگر شادی نہ ہوسکے تو اس کا متبادل بھی انھوں نے بتایا، لیکن اس حالت میں نہ شادی کی کوئی صورت پیدا ہوسکتی تھی اور نہ متبادل پر عمل ممکن تھا۔

اس کے بعد قیامِ پاکستان تک میری محمد صادق سے ملاقات نہیں ہوئی۔ البتہ قیامِ پاکستان کے بعد اوکاڑہ میں اس سے ملاقات ہوئی۔ پتا چلا کہ وہ بالکل تندرست ہے۔ اس کی شادی بھی ہوئی اور وہ صاحب اولاد بھی ہوا۔

۱۰: ایک بات جو میں نے بعض لکھوی اور غیر لکھوی حضرات سے سنی یہ ہے کہ ایک مرتبہ سردیوں کا موسم تھا۔ آدھی رات کے وقت حافظ بارک اللہ لکھوی اپنے گاؤں موضع ''لکھوکے'' میں حسب معمول نمازِ تہجد کے لیے مسجد میں گئے۔ اندر داخل ہوئے تو اندھیرے میں ایک شخص کو ان کے پاؤں کی ٹھوکر لگی۔ وہ شخص غصے سے اُٹھا اور کہا: تمھیں دکھائی نہیں دیتا کہ میں یہاں لیٹا ہوا ہوں۔ حافظ صاحب نے نہایت نرمی سے فرمایا: معاف کیجیے، اندھیرے میں کچھ پتا نہیں چلا۔ وہ شخص اُٹھا اور ان کا بازو پکڑ کر کہا: میرے ساتھ باہر چلو۔ وہ انھیں نہر کے کنارے لے گیا جو لکھوکے گاؤں کے قریب

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ہے۔ بولا وہ سامنے دیکھو کیا ہے؟ حافظ صاحب نے فرمایا یہ جھگیاں سی ہیں، جن میں بہت سے عجیب وغریب شکل و شباہت کے لوگ بیٹھے ہیں۔ اس شخص نے کہا یہ جنات ہیں اور میں ان کا سردار ہوں۔ آج کل میں ہم لوگ یہاں سے چلے جائیں گے۔

پھر اس نے حافظ صاحب کو قرآنِ مجید کی چند آیات اور نبی ﷺ کی بعض احادیث مبارکہ کے کچھ الفاظ بتائے کہ یہ چیزیں لکھ کر اور پڑھ کر آپ اگر ان لوگوں کو دیں گے، جنھیں جنات کی شکایت ہو یا وہ اولاد سے محروم ہوں تو اللہ تعالیٰ انھیں شفا بخشے گا، اور ان کی جائز تمنائیں پوری فرمائے گا۔ یہ سلسلہ آپ کی سات پشتوں تک چلے گا۔ چناں چہ میں نے دیکھا کہ ان کے اخلاف میں سے مولانا معین الدین لکھوی کے تعویذات سے اللہ تعالیٰ شفا بخشتا ہے۔ حافظ بارک اللہ لکھوی کے بیٹے حافظ محمد لکھوی تھے۔ ان کے بیٹے مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی تھے۔ ان کے بیٹے مولانا محمد علی لکھوی مدنی اور ان کے فرزندان گرامی ہوئے مولانا محی الدین لکھوی اور مولانا معین الدین لکھوی۔ حافظ بارک اللہ لکھوی کے بعد یہ پانچویں پشت ہوئی۔ چھٹی پشت میں مولانا محی الدین لکھوی اور مولانا معین الدین لکھوی کی اولاد کا سلسلہ چلتا ہے۔

۱۱: ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے پیپلز پارٹی کی حکومت قائم کی تو حج اور مذہبی امور کے وزیر مولانا کوثر نیازی کو بنایا گیا تھا۔ ۱۹۷۳ء کی بات ہے کہ تحصیل چونیاں کے ایک گاؤں سے ایک شخص میرے ایک دوست کا رقعہ لے کر آئے کہ یہ دونوں میاں بیوی حج کے لیے جا رہے ہیں۔ انھوں نے مطلوبہ رقم بینک میں جمع کرادی ہے، لیکن ان کا چھ سال کا بچہ ہے، جس کی ان کے بعد حفاظت کرنے والا کوئی نہیں ہے، اس لیے اس بچے کو یہ اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ لیکن حکومت نے اعلان کیا ہے کہ سولہ سال سے کم عمر بچہ والدین کے ساتھ حج کے لیے نہیں جاسکتا۔ میں مولانا کوثر نیازی سے سفارش کروں کہ والدین کو اپنا بچہ ساتھ لے جانے کی اجازت دی جائے۔

یہ سفارش حکومت کے فیصلے کے بالکل خلاف تھی اور میرے لیے مولانا کوثر نیازی سے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

دوستانہ تعلقات کے باوجود یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ اپنی حکومت کے فیصلے کے خلاف والدین کو کم عمر بچہ ساتھ لے جانے کی اجازت دیں۔

میں نے ان صاحب سے معذرت کی اور کہا کہ میں نے کسی وزیر سے کبھی کسی کام کے لیے نہیں کہا۔ لیکن ان کا اصرار اتنا بڑھا کہ مجبوراً مجھے ان کے ساتھ اسلام آباد جانا پڑا۔ ہم تین آدمی رات کو لاہور سے چلے اور صبح کو راولپنڈی پہنچ گئے۔ مَیں نہایت پریشان تھا کہ میری یہ بات مانی جائے گی یا نہیں۔ فجر کی نماز کے لیے مسجد میں گیا۔ نماز کے بعد قرآنِ مجید کے چند رکوع پڑھے۔ پھر دُرود شریف اور سورۂ فاتحہ پڑھ کر دوبارہ قرآن کھولا تو سورۂ کہف کی یہ آیت سامنے آئی۔

﴿ يَنشُرْ لَكُمْ رَبُّكُم مِّن رَّحْمَتِهِ وَيُهَيِّئْ لَكُم مِّنْ أَمْرِكُم مِّرْفَقًا ۝﴾

یعنی تمھارا پروردگار اپنی رحمت کا سایہ تم پر پھیلا دے گا اور تمھارے اس معاملے کے لیے سروسامان مہیا فرما دے گا۔

آیت پڑھتے ہی میری پریشانی ختم ہوگئی اور مجھے یقین ہوگیا کہ جس کام کے لیے آئے ہیں، اللہ تعالیٰ اس میں کامیابی عطا فرمائے گا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم وزیر حج و مذہبی امور مولانا کوثر نیازی کے دفتر پہنچے اور انھیں ملاقات کی چٹ بھجوائی۔ میرا نام پڑھ کر وہ خود باہر آئے اور پہلے کی طرح نہایت اچھی طرح ملے۔

ہم تین آدمی تھے۔ میں نے اپنے دونوں ساتھیوں کا تعارف کرایا۔ انھوں نے چائے منگوائی اور خیر و عافیت پوچھی۔ میں نے آمد کا مقصد بیان کیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس دن بھی اخباروں میں یہ خبر آئی تھی کہ سولہ سال سے کم عمر کا بچہ والدین کے ساتھ حج کے لیے نہیں جاسکتا۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا: آج کا اخبار پڑھا ہے؟ میں نے کہا: پڑھا ہے۔ میرا جواب سن کر انھوں نے خود ہی سائل کی طرف سے اپنے سیکرٹری سے درخواست لکھوائی اور والدین کو بچہ ساتھ لے جانے کی اجازت دے دی۔

اس کے بعد ہم چند منٹ ان کے پاس بیٹھے اور پھر اجازت لے کر باہر آ گئے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

۱۲: اب ایک عجیب ترین واقعہ سنیے!

میں اور مولانا محمد حنیف ندوی ایک دن شام کے بعد انارکلی کے ایک ہوٹل میں چائے پی رہے تھے۔ یہ ہمارا روزانہ کا معمول تھا۔ مولانا محمد حنیف ندوی اس وقت ادارۂ ثقافت اسلامیہ سے منسلک تھے اور میں اخبار ''الاعتصام'' کا ایڈیٹر تھا۔ ایک دُو دن بعد عید آنے والی تھی۔ مولانا نے فرمایا عید آ رہی ہے اور میرے پاس کوئی پیسا نہیں ہے۔ وہ سستا زمانہ تھا۔ ہمارے جیسے لوگوں کے لیے دس پندرہ روپے عید کے لیے کافی ہوتے تھے۔ میرے پاس بیس روپے تھے۔ میں نے وہ روپے مولانا کی خدمت میں پیش کیے۔ لیکن انھوں نے نہیں لیے۔ فرمایا آپ کی عید بھی تو آ رہی ہے۔ میں نے ہر چند اصرار کیا اور عرض کیا بیس نہیں تو دس ہی لے لیجیے، لیکن انھوں نے کوئی پیسا مجھ سے نہیں لیا۔

ان کا مکان علاقہ مزنگ کے بھونڈ پورہ چوک میں تھا۔ وہاں جانے کے لیے وہ بھاٹی دروازے سے تانگے پر بیٹھتے اور جنازگاہ سے چند قدم آگے سعدی پارک اترتے تھے، جسے روڑاں والا چھپڑ کہا جاتا ہے۔ اس سڑک کا نام لٹن روڈ ہے اور اس کے دائیں جانب قبرستان میانی صاحب ہے۔ ہوٹل سے چائے پینے کے بعد میں نے مولانا کو حسب معمول بھاٹی دروازے سے تانگے پر بٹھایا اور خود اپنے گھر اندروں لوہاری گیٹ چلا گیا۔ بھاٹی دروازے سے سعدی پارک تک کا کرایہ اس وقت دو آنے تھا۔

معمول کے مطابق دوسرے دن شام کے بعد مولانا حنیف ندوی پھر اسی ہوٹل میں آئے۔ میں بھی وقت مقررہ پر پہنچ گیا۔ انھوں نے جیب سے نکال کر مجھے بالکل نئے پانچ پانچ روپے کے پانچ نوٹ دکھائے یعنی پچیس روپے۔ فرمایا کل جب وہ گھر جانے کے لیے سعدی پارک کے سٹاپ پر تانگے سے اُترے تو ایک نوجوان لڑکی وہاں کھڑی تھی۔ وہ لڑکی انھیں پکڑ کر سڑک پار کرا کے قبرستان میں لے گئی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اس وقت دونوں طرف ٹریفک چل رہی تھی اور مَیں شرم سار ہو رہا تھا کہ یہاں سے گزرنے والے لوگ کیا کہتے ہوں گے۔ قبرستان میں انھیں کچھ خوف بھی آیا۔ وہ لڑکی انھیں ایک پرانی ٹوٹی سی قبر پر لے گئی۔ وہاں یہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

نوٹ دیے اور پھر اسی وقت غائب ہوگئی۔ وہ لڑکی اپنا نام کلثوم بتاتی تھی اور بعض اوقات وہ مولانا سے ملتی اور فوراً غائب ہو جاتی تھی۔ مولانا کے گھر کے افراد کو بھی اس کا علم تھا۔ وہ مولانا سے باتیں کرتی تھی، لیکن کسی کو دکھائی نہیں دیتی تھی۔ یہ بات مولانا کی موجودگی میں ہنستے ہوئے مجھے مولانا کی بیٹیوں نے بھی بتائی۔ ایک دن میں ان کے گھر گیا تو ان کی ایک بیٹی سدرہ نے مجھے کہا چاچا جی! آپ دو منٹ لیٹ آئے ہیں، کلثوم ابھی ابی سے باتیں کرکے گئی ہے۔ مولانا اپنی بیٹی کی یہ بات سن کر مسکراتے رہے۔

مجھے معلوم نہیں کہ مولانا نے پچیس روپے کے وہ نئے پانچ نوٹ خرچ کیے یا نہیں کیے۔ یہ کیا معاملہ تھا، اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں نے واقعہ عرض کر دیا ہے۔

۱۳: ہماری ایک ممانی نہایت نیک خاتون تھیں۔ تہجد گزار اور روزانہ تلاوتِ قرآن کرنے والی۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ اس نے نماز پڑھ کر مصلیٰ اُٹھایا اور اس کے نیچے سے کچھ پیسے نکلے، جو اس نے اپنے پاس رکھ لیے یا کسی کو دے دیے۔ اس کی بیٹیوں نے یہ معاملہ خود دیکھا۔ لیکن پھر اس صالحہ خاتون نے ہنسی مذاق میں بعض عورتوں سے اس کا ذکر کر دیا اور کہا کہ معلوم نہیں یہ پیسے کہاں سے آتے ہیں۔ اس کے بعد یہ سلسلہ بند ہو گیا۔

۱۴: ایک مرتبہ مولانا سیّد محمد داوٗد غزنوی اور مولانا محمد اسماعیل سلفی نے ایک کام کے سلسلے میں مجھے صوفی عبداللہ مرحوم و مغفور کے پاس اوڈاں والا بھیجا۔ صوفی صاحب نے مجھے ازراہِ کرم دس دس روپے کے دو نوٹ عطا فرمائے۔ میں نے واپس آ کر اس کا ذکر مولانا غزنوی سے کیا تو فرمایا یہ نوٹ آپ خرچ نہ کریں۔ اپنے بکس وغیرہ میں رکھیں، جہاں اپنے پیسے رکھتے ہیں۔ ان شاء اللہ ان میں اللہ تعالیٰ برکت پیدا فرمائے گا۔

۱۶: عبدالرحمٰن نامی ایک نمبردار کا واقعہ ہے کہ وہ کسی وجہ سے اپنا معاملہ آبیانہ بروقت تحصیل دار کے دفتر جمع نہ کرا سکا۔ وہ گھر سے باہر تھا کہ پولیس اسے گرفتار کرکے تھانے لے گئی کہ رقم جمع کراؤ گے تو رہائی ہوگی۔ وہ حیران کہ میں رقم کیسے جمع کراؤں۔ میں تو تھانے بیٹھا ہوں، نہ میرے گھر والوں کو پتا ہے نہ کسی تعلق دار کو۔ اس نے اللہ سے دُعا کی کہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

تو ہی مجھے نجات دلانے والا ہے۔ اتنے میں اچانک ایک آدمی آیا اور آواز دی:
عبدالرحمٰن کون ہے؟ اس نے کہا: مَیں ہوں۔ جتنی رقم کی ضرورت تھی، اس شخص نے عبدالرحمٰن کو دی اور چلا گیا۔ عبدالرحمٰن کو بالکل معلوم نہیں کہ رقم دینے والا کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ یہ کیا سلسلہ ہے؟ یہ اللہ ہی جانتا ہے۔

۱۷: ایک روز مولانا محمد حنیف ندوی کے پاس ان کے ایک رشتے دار آئے، جن کا نام اختر علی تھا۔ انھوں نے کہا کہ کئی دن ہوئے میرا بیٹا اپنے ایک دوست کے ساتھ کہیں چلا گیا ہے۔ ہم سخت پریشان ہیں۔ کچھ پتا نہیں کہ وہ کہاں ہے اور اس کا دوست کہاں ہے۔ اس نے مولانا سے کہا آپ دُعا کریں، وہ لڑکے خیریت سے گھر آجائیں۔ مولانا نے اس کی بات سنی، وضو کیا اور قرآنِ مجید پکڑا۔ نہایت خشوع وخضوع سے سورۂ فاتحہ پڑھ کر قرآنِ مجید کھولا تو سورۂ المؤمنون کی یہ آیت سامنے آئی:

﴿ وَاٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ ۝ ﴾

(یعنی ہم نے ان دونوں کو ایک اونچے مقام پر جگہ دی جو ٹھہرنے کے قابل ہے اور وہاں صاف پانی جاری ہے۔)

یہ آیت پڑھ کر مولانا نے فرمایا یہ لڑکے مری گئے ہیں اور بالکل خیریت سے ہیں۔ دو ایک روز میں آجائیں گے۔ چناں چہ وہ لڑکے دوسرے دن آگئے...... اور وہ واقعی سیر کے لیے مری گئے تھے۔

۱۷: ایک مرتبہ ٹیلی فون پر مجھے کسی شخص نے ایسی خبر سنائی جو میرے لیے نہایت تشویش کا باعث تھی۔ یہ شام کا وقت تھا اور اس وقت صحیح صورتِ حال سے مطلع ہونا بہت مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ میں نے فوراً وضو کیا۔ دُرود شریف اور سورۂ فاتحہ پڑھ کر قرآنِ مجید کھولا۔ مشکل کے وقت عام طور پر انسان کا رجوع پوری طرح اللہ کی طرف ہو جاتا ہے۔ اب سورۂ نور کی یہ آیت میرے سامنے آئی۔

﴿ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ؕ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

اكْتَسَبَ مِنَ الْإِثْمِ ۚ﴾

(یعنی تم اسے اپنے لیے برا نہ سمجھو بلکہ یہ تمھارے لیے بہتر ہے، ان میں سے جس شخص نے جتنا گناہ کیا، اتنی ہی سزا پائے گا۔)

اللہ کے فضل سے میرا کچھ نہیں بگڑا، پریشان کرنے والے کو واقعی ندامت ہوئی۔

۱۸: میں، مولانا معین الدین لکھوی اور ہمارے ایک دوست قاضی عبیداللہ ۱۸ر جون ۱۹۴۷ء کو دہلی گئے۔ اس وقت مولانا محمد عبدہ دہلی کے دارالحدیث رحمانیہ میں خدمت تدریس سرانجام دیتے تھے۔ ہم ان سے بھی ملے اور ۲۲ر جون ۱۹۴۷ء کو ہم چاروں صبح پانچ بج کر دس منٹ پر مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت مولانا عبوری حکومت میں وزیر تعلیم تھے اور بطورِ وزیر نمبر ۲۲ پرتھوی راج روڈ (نئی دہلی) میں سکونت پذیر تھے۔ ان دنوں یہ تو کسی کو معلوم نہیں تھا کہ دونوں ملکوں کی آبادیوں کا یہ حال ہو جائے گا جو بعد میں ہوا۔ گفتگو کرتے ہوئے مولانا معین الدین نے مولانا آزاد سے کہا کہ ہم لوگ جو دینی مدارس چلا رہے ہیں آزاد ہندوستان میں ان مدارس کی حیثیت کیا ہوگی؟

مولانا نے فرمایا: آپ اپنی جگہ حالات کے مطابق کام کرتے رہیں۔ پھر قرآن کی یہ آیت پڑھی:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ﴾

(اس کے معنے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی پر ذمے داری کا بوجھ اس کی طاقت کے مطابق ہی ڈالتا ہے۔)

یہ سورۂ بقرہ کی آخری آیت کا ٹکڑا ہے۔ مولانا نے یہ الفاظ پڑھے تو ایسے محسوس ہوا کہ آیت مبارکہ کے یہ الفاظ ابھی نازل ہوئے ہیں اور اسی سوال کے جواب میں نازل ہوئے ہیں جو مولانا سے کیا گیا تھا۔

قرآن انتہائی بابرکت اور نہایت مقدس کتاب ہے۔ اللہ کا پاک تریں کلام۔ نوعِ انسانی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کی تمام مشکلات کا حل اس میں موجود ہے۔ جہاں وہ نماز روزے کے احکام دیتا ہے، وہاں اور بھی بے شمار نصیحتیں فرماتا ہے اور زندگی کے ہر شعبے میں انسان کی رہنمائی کرتا ہے۔ بشرطے کہ پورے غور سے اس کی تلاوت کی جائے اور اس کے ہر مقام کو سمجھ سوچ کر پڑھا جائے۔ بغیر سوچے سمجھے قرآن پڑھنے سے ثواب تو بے شک حاصل ہوتا ہے، لیکن اس سے اصل مقاصد تک رسائی نہیں ہوتی۔

۱۹: قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۴۷ء کے اکتوبر کے پہلے ہفتے میں ہم اپنے موجودہ گاؤں پہنچے تھے۔ وہاں جانے کے لیے لاہور ریلوے اسٹیشن سے ٹرین پر سوار ہونا تھا۔ مختلف نامعلوم مقامات کی طرف سفر کرنے والوں کا اسٹیشن پر بے پناہ ہجوم تھا۔ مرد، عورتیں، بچے، جوان، بوڑھے بے بسی کے عالم میں کھڑے تھے یا مال گاڑیوں کے کھلے ڈبوں یا پیسنجر ٹرینوں کے اندر اور چھتوں پر سوار ہو رہے تھے۔ چھتوں پر چڑھتے ہوئے ڈر بھی لگ رہا تھا کہ گر نہ جائیں۔

اس ہجوم میں بیمار اور کمزور لوگ بھی تھے، جن کا ٹرین کی چھت پر چڑھنا اور بیٹھنا بہت مشکل تھا۔ ہمیں کہیں جگہ نہ ملی تو دس بجے کے قریب ٹرین کی چھت پر چڑھ گئے۔ ٹرین کے اندر اور چھت پر حوائج ضروریہ سے فراغت کی کوئی صورت نہ تھی۔ لاہور سے گیارہ بجے کے قریب گاڑی شیخوپورہ کی طرف روانہ ہوئی۔ ایک بجے کے لگ بھگ شیخوپورہ سے آگے ننکانہ صاحب پہنچے تو گاڑی رُکی۔ وہاں بے شمار مقامی لوگ پناہ گیروں کے لیے چاول، روٹیاں، سالن، پانی اور کھانے پینے کی مختلف چیزیں لیے کھڑے تھے۔ وہ لوگ ازراہِ ہمدردی ٹرین کے اندر بھی لوگوں کو سامانِ خورونوش وافر مقدار میں صاف کاغذ اور مٹی وغیرہ کے برتنوں میں ڈال کر تقسیم کر رہے تھے اور چھتوں پر بیٹھے لوگوں کو بھی دے رہے تھے۔ یہ پہلا اور آخری موقع تھا کہ ہم نے ریل کی چھت پر سفر کیا۔ تین بجے جڑاں والا پہنچے اور ریلوے اسٹیشن کے قریب کھلے میدان میں جا بیٹھے۔ تین دن وہاں قیام رہا اور پھر اپنے موجودہ گاؤں میں آ گئے جو جڑاں والا شہر سے تین میل کے فاصلے پر ہے۔ اس وقت بعض غیر مسلم اپنے اپنے گھروں میں موجود تھے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

اور اپنا سامان بیچ رہے تھے۔ وہاں کسی غیر مسلم کا کوئی جانی یا مالی نقصان نہیں ہوا۔ ملٹری کی گاڑیاں آئیں اور انھیں بہ حفاظت ہندوستان لے گئیں۔

۲۰: ۲۱ رستمبر ۱۹۵۱ء کو پنجاب میں زبردست سیلاب آیا۔ دریائے راوی، ستلج اور چناب نے بڑی تباہی مچائی۔ میں اس وقت ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں کام کرتا تھا جو اس زمانے میں گوجراں والا سے شائع ہوتا تھا۔ چند روز بعد عیدالاضحیٰ آنے والی تھی اور مجھے گاؤں جانا تھا۔ ان دنوں گوجراں والا سے جڑاں والا جانے کے لیے لاہور کا راستہ اختیار کرنا پڑتا تھا۔ لیکن سیلاب کی وجہ سے گوجراں والا اور لاہور کا راستہ بند ہو چکا تھا۔ میں سخت پریشان تھا کہ راولپنڈی سے میرے گاؤں کا ایک دوست آ گیا۔ اس کا نام محمد صدیق تھا۔ وہ بھی عید کے لیے گاؤں جانا چاہتا تھا۔ ہم نے سوچا کہ گوجراں والا سے حافظ آباد جانا چاہیے۔ حافظ آباد سے فیصل آباد اور وہاں سے گاؤں چلے جائیں گے۔ وہ دوست رات میرے پاس رہا۔ صبح کو ہم حافظ آباد جانے کے لیے بس سٹینڈ پر گئے تو معلوم ہوا کہ سیلاب کی وجہ سے گوجراں والا اور حافظ آباد کا راستہ بند ہے۔ وہاں بہت لوگ کھڑے تھے جو حافظ آباد جانا چاہتے تھے۔ بڑی مشکل سے ایک بس حافظ آباد کے لیے تیار ہوئی۔ گوجراں والا سے حافظ آباد شاید پینتیس چھتیس کلومیٹر ہوگا۔ تمام راستہ پانی سے بھرا ہوا تھا اور جگہ جگہ گڑھے پڑے تھے۔ ڈولتی اور لڑکھڑاتی ہوئی بس آہستہ آہستہ تین گھنٹے میں حافظ آباد پہنچی۔

حافظ آباد سے اس وقت فیصل آباد پہنچنے کا ذریعہ وہ ٹرین تھی جو وزیر آباد کی طرف سے آتی تھی، لیکن معلوم ہوا کہ کئی میل تک ریل کی پٹڑی پانی میں ڈوبی ہوئی ہے، اس لیے ریل بند ہے۔ لوگ پریشانی کی حالت میں ریلوے اسٹیشن پر بیٹھے تھے۔ ایک مال گاڑی فیصل آباد جارہی تھی۔ ہم نے اس کے گارڈ سے بات کی اور اس نے ڈرائیور سے مشورہ کیا۔ انھوں نے مہربانی کی پندرہ بیس آدمیوں کو کھلے ڈبے میں بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ فیصل آباد پہنچے تو شام ہو چکی تھی اور فیصل آباد جڑاں والا روڈ بھی پانی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ رات فیصل آباد

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

گزاری۔ ہمارا گاؤں وہاں سے تقریباً تیس کلومیٹر ہوگا۔ صبح کو ہم پیدل چل پڑے۔ سڑک بری طرح ٹوٹی ہوئی تھی۔ فیصل آباد جڑاں والا روڈ جس پر دن رات بے شمار بسیں چلتی تھیں، اب ویران پڑی تھی۔ ہم گیارہ بجے کے قریب گھر پہنچے۔

گاؤں جا کر پتا چلا کہ لاہور جڑاں والا روڈ بھی بند ہے اور دریائے راوی کا پانی دیہات میں داخل ہوگیا ہے۔ سڑک بھی پانی کی لپیٹ میں آ گئی ہے اور تین تین چار چار فٹ پانی اس پر کھڑا ہے۔ دیہات کے بے شمار لوگ بے سروسامانی کے عالم میں لنڈیاں والی میں قدرے محفوظ اور اونچے مقامات پر بیٹھے ہیں۔ نہ ان کے پاس کھانے کو روٹی ہے، نہ پینے کو صاف پانی۔ ہم چند آدمیوں نے اپنے گاؤں سے کئی سو روٹیاں اکٹھی کیں، سالن پکوایا اور صاف پانی کے دس گیارہ کنستر بھرے اور انھیں تین چار تانگوں پر لاد کر لنڈیاں والی پہنچے اور یہ چیزیں ان سیلاب زدہ لوگوں میں تقسیم کیں۔ ان میں علاقے کے بہت سے امیر اور اچھے خاصے زمیندار بھی تھے۔ ان لوگوں کو دیکھ کر آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ان کے گندم کے ذخیرے اور گھروں کے سامان دریا کی تند و تیز لہروں کی نذر ہو گئے تھے۔ بہت بڑی تعداد میں ڈنگر ڈھور مر گئے تھے اور مکانات گر گئے تھے۔ اب وہ بالکل خالی ہاتھ تھے۔ اللہ کی قدرت دیکھیے کہ دینے والے ہاتھ اب لینے والے ہو گئے تھے۔ بعض بڑے گھرانوں کے لوگ اپنی عورتوں اور بچوں کے ساتھ بالکل خاموش بیٹھے تھے۔ ہم ان کے پاس کھانے پینے کی چیزیں لے کر پہنچے تو ان میں سے کتنے ہی لوگ رو پڑے۔ ان کے اگلے چار پانچ روز اسی طرح گزرے۔ ایسے مواقع پر سخت سے سخت دل آدمی بھی نرم ہو جاتا ہے اور اسے اللہ یاد آتا ہے۔ پتا چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کی حالت بدلنے کی کس قدر طاقت رکھتا ہے۔ وہ ایک منٹ میں امیروں کو محتاج بنا دیتا ہے اور وہ اکل و شرب کی تمام نعمتوں سے محروم ہو جاتے ہیں۔ نہ ان کے پاس کھانے کو روٹی ہوتی ہے، نہ پہننے کو کپڑا، نہ سونے کے لیے چارپائی اور نہ رہنے کے لیے مکان۔ آنِ واحد میں ہر شے سے محروم ہو جاتے ہیں۔ یہ دنیا عبرت گاہ ہے اور اللہ تعالیٰ دنیا والوں کو اپنی کبریائی اور ان کی بے چارگی کے نشانات کسی نہ کسی صورت میں دکھاتا رہتا ہے۔ ﴿ فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

الْأَبْصَارِ﴾

۲۱: ایک بہت بڑا سیلاب اکتوبر ۱۹۵۵ء میں آیا تھا۔ رات کے دس بجے کا وقت ہوگا کہ مولانا محمد حنیف ندوی، حاجی محمد اسحاق حنیف، فاروق قریشی اور ان سطور کا راقم، حاجی محمد اسحاق حنیف کی گاڑی پر گوجراں والا سے لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ گاڑی کا ڈرائیور عبدالکریم تھا۔ گیارہ بجے کے قریب مریدکے سے کچھ آگے نکلے تو اچانک سیلاب کے ریلے نے سڑک پر قبضہ کرلیا۔ اندھیری رات۔ گاڑی رُک گئی اور بہ ظاہر خطرناک صورتِ حال پیدا ہوگئی۔ اب حاجی صاحب گاڑی کے اسٹیرنگ پر بیٹھے اور مَیں، عبدالکریم اور فاروق قریشی شلواریں گھٹنوں سے اوپر کرکے گاڑی کو دھکا لگانے لگے۔ چند لمحوں کے بعد ہماری کمریں پانی میں ڈوب گئیں۔ لیکن گاڑی کو دھکیلتے رہے۔ عام طور سے سیلاب میں بچھو، سانپ، کتے، بلے ہر قسم کی موذی چیزیں آتی اور ایذا رسانی کا باعث بن سکتی ہیں۔ پھر اندھیری رات میں ان سے بچنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ گاڑی دھکیلتے وقت پانی کے زوردار حملے سے کبھی گاڑی ہچکولے کھاتی تھی اور کبھی ہم تینوں کے پاؤں اکھڑ جاتے تھے۔ دو گھنٹے سے زیادہ وقت اس اذیت میں گزرا۔ پھر خشک سڑک پر پہنچے تو جان میں جان آئی۔

اس سیلاب نے بڑی مار دھاڑ کی تھی اور پنجاب کے بہت سے علاقوں میں پھیل گیا تھا۔ لاہور شہر کا اچھا خاصا علاقہ اس کی گرفت میں آ گیا تھا۔ ''الاعتصام'' کا دفتر اس وقت شیش محل روڈ پر دارالعلوم تقویۃ الاسلام کی بلڈنگ میں تھا اور میں اس کا ایڈیٹر تھا۔ پانی دفتر کے دروازے تک آ گیا تھا۔

بھاٹی دروازے کے باہر سے لے کر چوبرجی اور اس کے آگے پونچھ روڈ اور اسلامیہ پارک تک کشتی چلتی تھی۔ اور اس علاقے کے لوگ سخت تکلیف میں تھے۔ اسلامیہ پارک میں مرحوم مولانا ظفر اقبال اور ان کے بھائی ڈاکٹر ریاض قدیر کے مکانوں میں دارالعلوم تقویۃ الاسلام کے طلباء کشتیوں کے ذریعے روٹیاں، سالن، صاف پانی اور دیگر ضروری سامان

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

پہنچاتے اور وہ قابل احترام بزرگ یہ چیزیں آگے پانی میں گھرے ہوئے لوگوں کے گھروں میں تقسیم کرتے۔ کشتی میں دارالعلوم کے طلباء کے ساتھ میں بھی جاتا تھا۔ وہ نہایت ابتلا کا وقت تھا اور بے حد عبرت ناک۔

۲۲۔ ۱۹۳۷ء میں فیروز پور میں مجلس احرار کے جلسے کے انعقاد کا فیصلہ ہوا۔ میں اس وقت مرکز الاسلام میں تعلیم حاصل کرتا تھا۔ مولانا محمد علی لکھوی مجلس احرار کے رہنماؤں میں سے تھے۔ انھوں نے اپنے دونوں بیٹوں (مولانا محی الدین لکھوی اور معین الدین لکھوی) کی قیادت میں طلبا کو مرکز الاسلام کے اردگرد کے دیہات میں مجلس احرار کے جلسے کی تشہیر کے لیے بھیجا۔ یہ مئی کا مہینا تھا۔ سخت گرمی کا موسم۔

ان دنوں ایک ایسا واقعہ پیش آیا، جس کے ہولناک حادثے کی شکل اختیار کرنے میں چند لمحوں کا فرق رہ گیا تھا۔ دریائے ستلج کے ہیڈ حسینی والا سے جو نہریں نکلتی ہیں، ان میں سے ایک نہر بہاول پور کے علاقے کو جاتی ہے جو نہر صادقیہ کہلاتی ہے۔ وہ پختہ نہر ہے اور اس کے اندر دونوں طرف کناروں تک پختہ اینٹیں لگائی گئی ہیں۔ اس میں کوئی بکری، بھینس یا انسان گر جائے تو اس کا باہر نکلنا تقریباً ناممکن ہے۔ اس لیے کہ پختہ اینٹوں میں کہیں ہاتھ ڈالنے اور گری ہوئی شے کو باہر نکالنے کی کوئی صورت نہیں۔ سارا معاملہ قسمت پر آجاتا ہے کہ اس کی قسمت میں اگر باہر آنا لکھا ہے تو آجائے گا، ورنہ بہ ظاہر معاملہ ختم ہے۔

ایک دن شدید گرمی میں طلباء کا قافلہ اس نہر کی پٹری پر جا رہا تھا کہ میرے ابتدائی عمر کے دوست اور ہم جماعت حاجی محمد رفیق نے گرمی سے گھبرا کر نہانے کے لیے اس پختہ نہر میں چھلانگ لگا دی۔ اب نہر سے اس کا نکلنا مشکل ہو گیا۔ لڑکوں نے شور مچا دیا۔ ''حاجی ڈوب گیا۔ حاجی ڈوب گیا۔'' جلدی سے مولانا محی الدین لکھوی نے ایک بڑا سا کپڑا نہر میں پھینکا جسے رفیق نے مضبوطی سے پکڑا اور اس طرح اس کپڑے کے ذریعے سے کھینچ کر اسے نہر سے نکالا گیا۔

یہ منظر نہایت خوف ناک تھا۔ اس واقعہ پر ستر سال سے زیادہ کا طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ لیکن اب بھی یہ واقعہ کبھی ذہن میں آتا ہے تو عجیب طرح کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کبھی کبھی میں اور حاجی رفیق گزشتہ دور کی باتیں کرتے ہوئے اس کا ذکر کیا کرتے تھے۔ حاجی محمد رفیق زبیدی نے ۳۔ نومبر ۱۹۹۳ء کو ہمارے گاؤں چک ۵۳ گ ب میں وفات پائی۔

۲۳۔ اسی زمانے یعنی ۱۹۳۷ء کی بات ہے کہ ایک شخص محمد اسماعیل جو ارائیں برادری سے تعلق رکھتے تھے اور میرے دوست تھے، سائیکل پر مرکز الاسلام پہنچے۔ ان کے بیٹے محمد کا عقیقہ تھا اور وہ عقیقے میں شرکت کے لیے مجھے لینے گئے تھے۔ کوٹ کپورہ سے بذریعہ سڑک مرکز الاسلام پینتالیس میل کے فاصلے پر تھا۔ وہاں سے تیس میل فیروز پور اور تقریباً پندرہ میل آگے مرکز الاسلام۔ موجودہ پیمائش کے مطابق کل فاصلہ تقریباً ساٹھ کلومیٹر تھا۔ اسماعیل نے بتایا کہ وہ نمازِ مغرب کے بعد کوٹ کپورہ سے روانہ ہوئے تھے۔ ان دنوں ٹریفک کی یہ کثرت نہ تھی جو ہم موجودہ زمانے میں دیکھتے ہیں۔ ہر طرف سناٹا۔ کہیں کہیں بس یا تانگے وغیرہ نظر آتے تھے۔ اس کے باوجود مسافر کے لیے راستے میں کوئی خطرہ نہ تھا۔ لوگ بے فکر ہو کر سفر کرتے تھے اور بالعموم رات کو سفر کیا جاتا تھا۔ اسماعیل نے بتایا کہ وہ رات کے دس بجے کے قریب سڑک پر ایک شیشم کے درخت کے نیچے سے گزر رہے تھے کہ درخت جھولنے لگا اور کھٹکھٹاہٹ کی آواز سنی، جو کچھ دیر جاری رہی۔ وہ وہاں رکے، سائیکل سے اُترے، درخت کے اوپر دیکھا۔ دائیں بائیں، آگے پیچھے ہر طرف نظر دوڑائی، لیکن کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ یہ کیا معاملہ تھا؟ کچھ پتا نہیں۔ اس کے بعد وہ وہاں سے چلے اور میرا خیال ہے رات کے ایک بجے کے قریب مرکز الاسلام پہنچے۔

قیامِ پاکستان کے بعد اسماعیل اپنے عزیزوں کے ساتھ چک نمبر ۷۰ گ ب چلے گئے تھے جو ہمارے گاؤں سے دس گیارہ میل کے فاصلے پر ہوگا۔ لیکن ان کا بیٹا محمد ہمارے گاؤں میں تھا۔ اسماعیل بھی آخر عمر میں ہمارے گاؤں آ گئے تھے اور یہیں فوت ہوئے۔

۲۴۔ سکھ اور ہندو مذہب میں شادیاں رشتے داروں میں نہیں کی جاتیں۔ چاچے تائے، ماموں کے بیٹے بیٹیوں کو حقیقی بہن بھائیوں کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ سنا تھا کہ ریاست فرید کوٹ کے ایک گاؤں کا ایک سکھ مر گیا۔ اس کا ایک حقیقی بھائی تھا اور بھائی کا ایک بیٹا

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

تھا۔ یعنی مرنے والے کا بھتیجا۔ مرنے والے نے اپنے پیچھے ایک بیوی چھوڑی اور ایک بیٹی۔ وہ اچھی خاصی زمین جائداد کا مالک تھا۔ باپ کے بعد زمین جائداد کی مالک اس کی بیٹی تھی۔ اس کی شادی کے بعد اس جائداد کا مالک اس کا خاوند تھا۔ مرنے والے کے بھائی اور بھتیجے کے ذہن میں آیا کہ یہ زمین جائداد انھیں ملنی چاہیے۔ چنانچہ بھتیجے نے کسی طرح اپنے چچا کی بیٹی کے ساتھ تعلقات قائم کر لیے اور تعلقات یہاں تک بڑھے کہ دونوں لڑکا لڑکی نے آپس میں شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ لڑکی کی ماں کو پتا چلا تو اس نے لڑکی کو روکنے کی کوشش کی اور بتایا کہ کسی قریبی یا دور کے رشتے دار سے شادی کرنا ہمارے مذہب میں جائز نہیں۔ تم یہ کام نہ کرو، لیکن لڑکی نے ماں کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ پھر لڑکے کے ماں باپ سے بات کی کہ اس حرکت سے باز آ جاؤ لیکن انھیں زمین جائداد کا لالچ تھا۔ انھوں نے جواب دیا کہ مسلمانوں میں بھی تو چاچے تائے اور ماموؤں کے بیٹے بیٹیوں کی شادیاں ہوتی ہیں، ہم بھی کر لیں تو کون سی برائی ہے؟

اب وہ عورت مہاراجا فرید کوٹ کی کچہری میں پہنچی۔ مہاراجا نے اس کی بات سن کے پوچھا کہ لڑکی کیا کہتی ہے؟ اس نے جواب دیا لڑکی کو انھوں نے اپنے ہاتھوں میں کر لیا ہے، وہ کہتی ہے کہ میں یہیں شادی کروں گی۔

مہاراجا نے کہا ہمارے مذہب میں یہ شادی جائز تو بے شک نہیں، لیکن جب لڑکی شادی کرنا چاہتی ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔

لڑکی کی ماں نے کہا آپ کا مطلب یہ ہے کہ شادی کا تعلق لڑکی کی مرضی سے ہے، مذہب اور دھرم یا کسی اور معاملے کا اس سے تعلق نہیں۔

مہاراجا نے کہا شادی کے مسئلے میں اصل اہمیت لڑکی کی مرضی کو حاصل ہے۔

یہ الفاظ سن کر وہ عورت باہر نکلی اور مہاراجا کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ کسی نے گاڑی کے ڈرائیور کو بتایا کہ تمھاری گاڑی میں کوئی دیہاتی قسم کی عورت بیٹھی ہے۔ ڈرائیور آیا اور اس نے عورت سے پوچھا تم کون ہو اور گاڑی میں کیوں بیٹھی ہو؟

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

اس نے جواب دیا میں مہارانی ہوں اور مہاراجا میرا پتی (شوہر) ہے۔

ڈرائیور نے کہا میں مہارانی کو اور مہاراجا کی تمام رشتے دار عورتوں کو جانتا ہوں۔ تم مہاراجا کے خاندان سے نہیں ہو۔ اس لیے گاڑی سے اُتر جاؤ۔ لیکن وہ عورت نہیں مانی۔ وہ برابر یہی کہتی رہی کہ میں مہارانی ہوں۔

ڈرائیور نے اندر جا کر مہاراجا کو بتایا تو وہ باہر آیا اور دیکھا کہ وہی عورت گاڑی میں بیٹھی ہے، جس کی لڑکی کی شادی کا مسئلہ درپیش ہے۔ مہاراجا نے اسے گاڑی سے اترنے کو کہا تو اس نے جواب دیا کہ ابھی آپ نے مجھ سے کہا ہے کہ شادی کے سلسلے میں اصل اہمیت عورت کی مرضی کو حاصل ہے۔ میں عورت ہوں اور آپ سے شادی کرنے کی خواہش مند ہوں۔ عورت کی بات سن کر مہاراجا نے اس سے کہا باہر آ جاؤ، ابھی فیصلہ کر دیتے ہیں۔ وہ باہر آئی۔ مہاراجا نے کہا بات کرنے میں مجھ سے غلطی ہوئی۔ اسی وقت پولیس کے ذریعے لڑکے اور اس کے والدین کو بلالیا گیا۔ مذہب کی مخالفت اور لڑکی کو ورغلانے اور اس سے ناجائز تعلقات کا مقدمہ قائم کیا گیا اور مسئلہ جو اُلجھ گیا تھا، سکھ عورت کی دانش مندی سے چند لمحوں میں حل ہو گیا۔

۲۵۔ ہم فرید کوٹ جیل سے رہا ہوئے تو آٹھ دس دن کے بعد ہم سے گفتگو کے لیے مہاراجا نے ہماری دعوت کی۔ دعوت میں پندرہ سولہ آدمی ہوں گے۔ ہم میں سے کسی کو بھی سرکاری دعوت میں جانے اور اس ماحول میں کھانے پینے کے آداب کا علم نہ تھا۔ مختلف قسم کے کھانے میز پر رکھے گئے۔ شراب کی بوتلیں بھی رکھی گئیں۔ میری نشست بھائی دیال سنگھ کے قریب تھی۔ وہ ہمارے ساتھ قید رہے تھے۔ نہایت شریف آدمی اور اپنے مذہب کے پابند۔ ان کا نام گزشتہ صفحات میں کئی مرتبہ آیا ہے۔ وہ کوٹ کپورہ کی پرجا منڈل کے صدر تھے۔ انھوں نے شراب کی بوتلیں دیکھیں تو کھڑے ہو گئے اور غصے سے کہا ہمیں دارو پینے کے لیے بلایا گیا ہے۔ جو نہ مسلمانوں کے مذہب میں جائز ہے اور نہ سکھوں کے مذہب میں۔ میرا ہاتھ پکڑ کر کہا: ''اُٹھ ساک محمد اسیں ایتھے نہیں بہہ سکدے۔'' (اٹھو محمد اسحاق! ہم یہاں نہیں بیٹھ سکتے) مہاراجا نے اسی وقت شراب کی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

بوتلیں میز سے اُٹھوادیں۔

سکھ مذہب میں پانچ چیزوں پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور تین چیزوں سے روکا گیا ہے۔ جن پر عمل کا حکم دیا گیا ہے، وہ ہیں کچھا، کڑا، کرپان، کیس، کنگا یعنی کچھا پہنو، بازو میں لوہے کا کڑا ڈالو، گلے میں کرپان (تلوار) لٹکاؤ، سر پر کیس یعنی لمبے بال رکھو اور ان میں کنگا ڈالے رکھو۔ اس عمل کو سکھوں کی مذہبی اصطلاح میں ''پنج ککے'' کہا جاتا ہے۔ ''ککا'' وہ کاف کو کہتے ہیں یعنی ان میں سے ہر لفظ کے شروع میں کاف آتا ہے، اس لیے یہ ''پنج ککے'' کہلاتے ہیں۔

جن تین چیزوں سے روکا گیا ہے، وہ ہیں دارو، ماس اور تمباکو۔ دارو کے معنے شراب، ماس کے معنی گوشت اور تمباکو سگریٹ وغیرہ۔ لیکن سکھ شراب بھی پیتے ہیں، بعض سکھ گوشت بھی کھاتے ہیں اور چھوٹی سی چلم میں سلفہ بھر کر تمباکو بھی پیتے ہیں۔

۲۶۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہمیں اپنے گاؤں میں گئے تھوڑے دن ہوئے تھے کہ ایک شخص کو باؤلے کتے نے کاٹ لیا۔ وہ شخص ہمارے قدیم وطن کوٹ کپورہ کا رہنے والا نہیں تھا، اس کے قریب کے کسی گاؤں سے اس کا تعلق تھا اور کوٹ کپورہ میں اس کے بعض رشتے دار رہتے تھے، انہی کے ساتھ قافلے میں وہ ہمارے گاؤں آیا تھا۔ خوب صورت جوان، چہرے پر داڑھی، پکا نمازی، بے حد ملنسار، جوان بیوی، چھوٹے چھوٹے بچے، بوڑھے ماں باپ۔ باؤلے کتے کے کاٹنے کے بعد وہ خود باؤلا ہو گیا۔

اس کے گھر میں اسے لوہے کی زنجیریں جکڑ دیا گیا۔ لوگ اسے دیکھنے جاتے تو اس کے بیوی بچے اور ماں باپ اسے دیکھ کر روتے۔ دیکھنے والوں کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو جاتے۔ وہ آنے جانے والوں کو پہچانتا تھا۔ روتا بھی تھا اور کہتا تھا مجھے چھوڑ دو۔ اس کے منہ سے جھاگ نکلتا تھا۔ نہایت الم انگیز اور تکلیف دہ کیفیت تھی۔ بے حد عبرت ناک منظر۔ کئی دن وہ اسی کیفیت میں رہا۔ کہا جاتا ہے کہ باؤلے کتے کے کاٹے ہوئے شخص کے سامنے اس رُخ سے پانی رکھا جائے، جس میں سورج کی شعاعیں پڑتی ہوں اور وہ اسے دیکھ لے تو اس کی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس قسم کی باتیں لوگ کرتے تھے، لیکن اس پر عمل کرنا بہت مشکل تھا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اسے اتنی تکلیف میں دیکھنا بھی مشکل تھا۔ پھر سنا تھا کہ اس کے سامنے پانی رکھا گیا اور سورج کا عکس دیکھ کر وہ اللہ کے دربار میں پہنچ گیا۔

کتے کے بارے میں ایک شخص نے بتایا کہ اس نے اپنے کھیت میں ایک کتا رکھا تھا جو اس کا بے حد فرماں بردار تھا۔ ایک دن اسے شبہ پڑا کہ کتا باؤلا ہو گیا ہے۔ اس کو گولی مارنے کی اسے ہمت نہیں پڑی۔ اس نے کتے سے کہا اب تم یہاں سے چلے جاؤ۔ یہ الفاظ کہہ کر اس کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے اور کتے کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ تاہم کتا وہاں سے چل پڑا۔ کتا تھوڑی دُور جاتا اور کھڑا ہو کر اس کی طرف پیچھے کو دیکھتا۔ جب تک وہ آنکھوں سے اوجھل نہیں ہو گیا، اسے پیچھے جھانک کر دیکھتا رہا۔

کتا مالک کا وفادر ہوتا ہے اور بلی گھر کو نہیں بھولتی۔ بعض لوگ اپنی بلی کو گھر سے بوری میں بند کر کے گھر سے کوسوں دُور چھوڑ کر آئے، لیکن وہ چند روز کے بعد گھر آ گئی۔

۲۷۔ ہمارے قدیم وطن کوٹ کپورہ میں ہمارے محلے میں ایک شخص عمر دین کی گڑ شکر وغیرہ کی دُکان تھی۔ ہم چند قریب قریب ہم عمر شام کے بعد وہاں آ جاتے اور مونگ پھلیاں، ریوڑیاں وغیرہ کھایا کرتے تھے۔ ہمارے ایک رشتے دار محمد صدیق تھے۔ ان کی ٹانگ پر پھوڑا نکلا، جس کی انھیں بہت تکلیف تھی۔ کئی ڈاکٹروں اور حکیموں سے علاج کرایا، لیکن آرام نہیں آیا، بلکہ تکلیف مزید بڑھ گئی۔ ایک دن ان کی تکلیف دیکھ کر خود مجھے تکلیف ہونے لگی۔ میں نے ان سے کہا مَیں اس پھوڑے پر دَم کرتا ہوں۔ اگر تم نے یقین کر لیا کہ دم سے ضرور آرام آ جائے گا تو ان شاء اللہ پھوڑا ختم ہو جائے گا۔ اس وقت ہمارے دوسرے دوست محمد زکریا، عبدالشکور اور عبدالقیوم وغیرہ بھی وہاں موجود تھے۔ میں نے بسم اللہ پڑھ کر دَم کیا، اسے کچھ افاقہ محسوس ہوا۔ دوسرے دن پھر کیا، اللہ نے فضل فرمایا اور تین دن میں پھوڑا بالکل ختم ہو گیا۔ اس کے بعد جب بھی اسے اس قسم کی کوئی تکلیف ہوتی، اس نے دَم کرایا اور تکلیف رفع ہو گئی۔ اس کا تعلق یقین

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

اور صدقِ دل سے ہے۔ آرام دینے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ میاں محمد صدیق نے جڑاں والا میں وفات پائی۔ وہ میرے قریبی عزیز اور دوست تھے۔

کتاب کے اس باب میں جو چند واقعات لکھے گئے ہیں ممکن ہے اکثر قارئین کے نزدیک کوئی خاص اہمیت نہ رکھتے ہوں، لیکن میرے خیال میں ان میں سے بعض واقعات ناقابل فراموش بھی ہیں اور سبق آموز بھی......! کسی واقعہ کے ناقابل فراموش اور سبق آموز یا عبرت ناک ہونے کا اصل وقت وہی ہوتا ہے، جب وہ وقوع پذیر ہو رہا ہو اور کوئی شخص یا کوئی معاشرہ اس کی لپیٹ میں آیا ہو، اس کے بعد عام لوگوں کے لیے یہ واقعات بے اثر ہو جاتے ہیں۔ میں نے یہ واقعات یہاں اس لیے درج کیے ہیں کہ میں ان میں سے گزرا ہوں یا یہ کہ یہ واقعات میرے سامنے وقوع پذیر ہوئے تھے اور میرے لیے اس وقت بے حد اثر انگیز اور نصیحت آموز ثابت ہوئے تھے۔

۲۹۔ یہ غالباً ۱۹۷۲ء کے فروری یا مارچ کی بات ہے۔ میں اپنے دفتر ادارہ ثقافت اسلامیہ میں بیٹھا تھا۔ دس بجے کا وقت ہوگا میرے دوست ضیا کھوکھر بھی وہیں تھے جو بعد میں وزیر اعظم کے اخبارات سے متعلق شعبے کے ڈائریکٹر مقرر کیے گئے۔ اب بھی وہ اسی منصب پر فائز ہیں۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور اُٹھایا تو فیصل آباد سے میرے ہم نام دوست مولانا محمد اسحاق چیمہ بول رہے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ جامعہ تعلیم الاسلام (ماموں کانجن) کے لیے جو زمین خریدی گئی ہے، اس کے ایک حصے پر بعض لوگ قابض تھے جنھوں نے رہائش کے لیے وہاں جھگیاں بنا رکھی تھیں۔ پیپلز پارٹی کی اس وقت نئی نئی حکومت قائم ہوئی تھی، اس پارٹی کے فیصل آباد کے ایک ایم این اے (ممبر قومی اسمبلی) نے جھگیوں میں رہائش پذیر لوگوں سے کہا کہ وہ یہ جگہ نہ چھوڑیں۔ یہ جگہ ہماری حکومت کی طرف سے مستقل طور پر ان کے نام الاٹ کر دی جائے گی۔ جامعہ تعلیم الاسلام سے تعلق رکھنے والے بعض لوگوں نے ان سے قبضہ چھڑوانے کی کوشش کی تو اس ایم این اے نے اپنے اثر و رسوخ سے انھیں گرفتار کرا کے فیصل آباد جیل میں بھجوا دیا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

مولانا محمد اسحاق چیمہ نے مجھے کہا کہ میں میاں محمود علی قصوری سے ملوں اور ان سے کہوں کہ وہ اس ایم این اے کو اس حرکت سے روکیں اور کوشش کریں کہ یہ جگہ جامعہ تعلیم الاسلام کے قبضے میں آئے جس نے اسے خریدا ہے۔

میاں محمود علی قصوری اس وقت پیپلز پارٹی کی حکومت میں وزیر قانون تھے۔ برصغیر کے مشہور اہل حدیث عالم اور سیاسی رہنما مولانا عبدالقادر قصوری کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ ان کے سب سے بڑے بھائی مولانا محی الدین احمد قصوری تھے جو کئی سال مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں کلکتے رہے تھے اور پھر تین سال کے لیے برطانوی حکومت نے انھیں نظر بند کر دیا تھا۔ مولانا آزاد نے اپنی معروف تصنیف ''تذکرہ'' میں ان کا ذکر کیا ہے۔ مولانا اس خاندان کو ''خاندان سعادت قصور'' قرار دیتے ہیں۔ مولانا محی الدین احمد قصوری سے چھوٹے مولانا محمد علی قصوری ایم اے کینٹب تھے جن کی زندگی کا طویل عرصہ یاغستان کی جماعت مجاہدین میں گزرا تھا۔ اس کی تفصیل انھوں نے اپنی ایک کتاب ''مشاہدات کابل و یاغستان'' میں بیان کی ہے۔

میں عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ مولانا محمد اسحاق چیمہ کا ٹیلی فون سنتے ہی میں اور ضیا کھوکھر دونوں میاں محمود علی قصوری کے مکان پر پہنچے۔ میاں صاحب اس دن اتفاق سے لاہور میں تھے۔ میں نے ان کے انتخاب میں ان سے تعاون کیا تھا، لیکن ان کی کامیابی کے بعد نہ ان کو مبارک باد دی اور نہ ان سے ملاقات کے لیے گیا۔ اب گیا تو انھوں نے کہا کہ تم نے ہمیں چھوڑ ہی دیا، اب تک کیوں نہیں آئے؟

میں نے آمد کا مقصد بیان کیا اور صوفی عبداللہ صاحب کا تعارف کرایا اور ان کی قائم کردہ جامعہ تعلیم الاسلام کے متعلق تفصیل بیان کی تو انھوں نے اسی وقت اس ایم این اے کے نام رقعہ لکھ کر مجھے دیا اور کہا کہ یہ رقعہ آپ نے خود اسے پہنچانا ہے۔ اس رقعے میں انھوں نے لکھا تھا کہ صوفی عبداللہ صاحب جماعت اہل حدیث کی بہت بڑی اور مؤثر شخصیت ہیں۔ انھوں نے جامعہ تعلیم الاسلام کے لیے جو جگہ خریدی ہے، اس کے ایک حصے پر کچھ لوگوں نے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

قبضہ کر رکھا ہے۔ ان کا قبضہ چھڑانے کے سلسلے میں تم ان کی مدد کرو۔ رقعہ لے کر میں فیصل آباد پہنچا۔ کچہری میں مولانا محمد اسحاق چیمہ میرا انتظار کر رہے تھے اور وہ ایم این اے صاحب بار روم میں بیٹھے تھے۔ انھیں جب بتایا گیا کہ یہ میاں محمود علی قصوری کا رقعہ ہے تو انھوں نے کھڑے ہو کر رقعہ لیا اور پڑھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ جیل میں بند تھے، وہ باہر آ گئے اور مقبوضہ جگہ جامعہ تعلیم الاسلام کے قبضے میں آ گئی۔

کسی سیاسی جماعت سے منسلک ہونا یا انتخابات میں کسی سیاسی شخصیت کی مدد کرنا یا نہ کرنا کوئی شرعی مسئلہ نہیں ہے۔ قرآن و حدیث یا فقہ کی کسی کتاب میں کہیں نہیں لکھا کہ فلاں سیاسی جماعت سے تعاون کرو اور فلاں سے نہ کرو۔ اس کا تعلق شریعت سے نہیں، حالات سے ہے۔ حالات کی روشنی میں جس سیاسی جماعت کا زاویۂ فکر اور طریق عمل ملک و قوم کے لیے فائدہ مند ہو اس سے تعاون کرنا چاہیے۔ پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ اس وقت ملک میں کوئی ایسی جماعت نہیں ہے جو فقط اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے کوشاں ہو۔ اسلام بے چارے کا اب کوئی نام بھی نہیں لیتا، یہ تو تھوڑا بہت مسجدوں میں رہ گیا ہے، سیاست سے دلچسپی رکھنے والوں نے اسے سیاست کے دائرے سے خارج کر دیا ہے۔ بہر حال میاں محمود علی قصوری نے اس وقت جماعت اہل حدیث کے بہت بڑے تدریسی ادارے کی بہت مدد کی۔ مجھے معلوم نہیں اس ادارے کی موجودہ انتظامیہ کے کسی معزز رکن کو اس کا علم ہے یا نہیں، اور علم ہے تو اس کی تھوڑی بہت قدر بھی ان کے ذہن میں ہے یا نہیں۔ اس وقت یہ بہت بڑا مسئلہ تھا، جس کی اطلاع مجھے مولانا محمد اسحاق چیمہ نے دی اور میں نے میاں محمود علی قصوری سے اس کی اہمیت بیان کی تو مسئلہ حل ہو گیا۔ اب قصوری خاندان میں کوئی ایسا آدمی نہیں ہے جو اس قسم کے معاملات میں کسی کی مدد کرنے کی صلاحیت یا اہلیت رکھتا ہو۔ بلکہ میں تو یہ بھی عرض کروں گا کہ جن سیاسی جماعتوں اور دھڑوں سے ہم نے تعلقات استوار کر رکھے ہیں، ان میں سے کوئی جماعت اور کوئی دھڑا بھی ضرورت پڑنے پر کسی مسلکی معاملے میں ہماری مدد نہیں کرے گا۔ ہمارے لیے وہ اپنے کسی ہم مسلک اور ہم خیال کو ناراض نہیں کرے گا۔ جواب صاف لفظوں میں ہمیں بھی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

نہیں دیا جائے گا، لیکن تاریخیں دی جائیں گی کہ آج کریں گے اور کل کریں گے یعنی ٹرخایا جائے گا۔ ہمارے ساتھ معاملہ کچھ اس قسم کا رہے گا کہ ہمارا جماعتی نوعیت کا کوئی کام بھی ان کی وساطت سے نہ ہو اور ہمارے ووٹ بھی ان کو ملتے رہیں۔ یعنی سیاسی منافقت کا سلسلہ چلے گا۔

اس کتاب کے بعض مندرجات سے میرے بعض اہل علم دوستوں کو اتفاق بھی ہو سکتا ہے اور اختلاف بھی۔ یہ فقیر سب کا شکر گزار ہے اور سب کا احترام کرتا ہے۔ نہ اتفاق کرنے والوں کو سر پر بٹھانے کا قائل ہے، نہ اختلاف کرنے والوں کے خلاف کسی قسم کا فتویٰ صادر کرتا ہے۔

اب چند اور واقعات ملاحظہ ہوں جو میرے نزدیک بڑے عجیب و غریب ہیں۔ یہ واقعات یا تو مجھے خود صاحب واقعہ نے سنائے یا ان کے قریبی عزیزوں اور تعلق داروں نے بیان کیے۔

❀ لاہور میں فلیمنگ روڈ پر چوک برف خانے کے قریب ایک صاحب علم شخص حکیم عبدالمجید عتیقی فروکش تھے۔ میانہ قد، دبلے پتلے، گورے چٹے۔ نرم کلام اور نہایت ملنسار۔ انکسار اور فروتنی کا دل کش پیکر۔ میرے ان سے قیامِ پاکستان کے بعد مراسم قائم ہوئے، جب میں اکتوبر ۱۹۴۸ء میں لاہور آیا۔ لیکن اس سے پہلے اپنے قدیم وطن (کوٹ کپورہ) میں میں نے ان کی بعض کتابیں پڑھی تھیں، جن میں ایک کتاب کا نام "ترکانِ احرار" ہے۔ زبان، انداز اور معلومات کے اعتبار سے نہایت عمدہ کتاب۔ ترک محبانِ وطن کے حالات پر مشتمل۔

آزادیٔ برصغیر سے قبل ان کے مکان کو لاہور کے بعض مشہور ادیبوں، شاعروں، اخبار نویسوں اور سیاسی رہنماؤں اور کارکنوں کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی جن میں مسلمان بھی شامل تھے اور ہندو بھی۔ مسلمانوں میں مولانا غلام رسول مہر، ملک نصر اللہ خاں عزیز، مولانا عبدالمجید سالک، مولانا چراغ حسن حسرت اور مولانا محمد حنیف ندوی قابل ذکر ہیں، جن کی حکیم صاحب کے ہاں آمد و رفت رہتی تھی۔

حکیم صاحب کا منحنی سا وجود سیاسی اور سماجی یادوں کا بہت بڑا خزانہ تھا۔ انھیں بے شمار

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

شعرا کے بے شمار شعر یاد تھے۔ ولی دکنی سے لے کر اختر شیرانی تک قدیم و جدید شاعروں کے اشعار ان کے ذہن میں محفوظ تھے اور بروقت اور برمحل شعر پڑھتے تھے۔

وہ کئی تضادات کا دلچسپ مجموعہ تھے۔ وہ نابینا تھے، ان کی اہلیہ بینا تھیں۔ فقہی مسلک کے اعتبار سے وہ اہل حدیث تھے، ان کی اہلیہ شیعہ تھیں۔ سیاسی نقطہ نظر سے وہ کانگرسی تھے، ان کی اہلیہ محترمہ پکی مسلم لیگی تھیں۔ مگر دونوں میں محبت کا مضبوط رشتہ قائم تھا۔ نہ ان میں کبھی سیاسی جھگڑا ہوا، نہ مذہبی اور مسلکی تنازع پیدا ہوا۔ بیوی پردے کی سخت پابند تھیں، لیکن شوہر نامدار کے تمام دوستوں اور ملنے والوں کو جانتی تھیں۔ جب کوئی آتا، اس کے لیے موسم کے مطابق چائے اور پانی وغیرہ کا فوراً انتظام کرتیں۔ ہر رمضان میں ایک یا دو مرتبہ حکیم صاحب مجھے اور مولانا محمد حنیف ندوی کو افطاری پر بلاتے۔ ان کی اہلیہ اپنے شوہر سمیت ہماری افطاری کی چیزیں اذان سے چند منٹ پہلے بھیج دیتیں۔ خود شیعہ مذہب کے مطابق دس منٹ بعد روزہ افطار کرتیں۔ حکیم صاحب اولاد سے محروم تھے۔

حکیم عبدالمجید عتیقی جن حضرات سے خاص طور پر عقیدت رکھتے تھے، ان میں مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی کا اسم گرامی سرفہرست ہے۔ وہ ہفتہ عشرہ کے بعد مولانا غزنوی سے ملاقات کے لیے تشریف لایا کرتے تھے۔ اخبار ''الاعتصام'' کا دفتر بھی وہیں تھا، مجھے بھی وہ یاد فرماتے اور میں انھیں سلام عرض کرتا۔ نابینا ہونے کے باوجود ان کا اُردو اور انگریزی کا خط بہت صاف تھا۔ کاغذ پر ان کا قلم رکھ دیا جاتا اور وہ لکھتے چلے جاتے۔ سطر ختم ہونے پر شروع سطر میں پھر محل کتابت کی نشان دہی کر دی جاتی اور قلم پھر رواں ہو جاتا۔ مجھے خود حکیم صاحب نے یا ان کے کسی دوست نے بتایا تھا کہ جوانی کے زمانے میں ان کی آنکھوں میں کوئی تکلیف ہوئی، جس کی وجہ سے ان کی قوت بصارت ختم ہوگئی، لیکن اس کے بجائے اللہ تعالیٰ نے انھیں بصیرت کی نعمت عطا فرمادی۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد آزادئ برصغیر کے لیے انگریزی حکومت کے خلاف جو مختلف تحریکیں چلیں، ان میں حکیم صاحب نے بھرپور حصہ لیا اور اس کے نتیجے میں وہ ملک کی مختلف

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

جیلوں میں قید رہے۔ مثلاً تحریک ترک معاملات، تحریک عدم تعاون اور مجلس خلافت وغیرہ میں وہ سرگرم رہے۔ وہ سخت قسم کے مذہبی آدمی تھے۔ اب ان کے متعلق دو واقعات سنیے جو انھوں نے خود سنائے۔

❀ قیامِ پاکستان سے قبل ایک مرتبہ وہ میاں شیر محمد شرق پوری سے ملاقات کے لیے شرق پور گئے۔ اس وقت وہ نابینا تھے اور ایک شخص ان کے ساتھ تھا۔ کچھ دیر میاں شیر محمد کے پاس رہے۔ پھر لاہور آنے کے لیے اڈے پر پہنچے۔ ان دنوں ٹریفک کا معاملہ موجودہ دور سے بالکل مختلف تھا، کافی دیر کے بعد بس چلتی تھی۔ ایک بس لاہور کے لیے تیار ہوئی تو حکیم صاحب اور ان کے ساتھی کو ڈرائیور نے فرنٹ سیٹ پر بٹھایا اور بس چل پڑی۔ تقریباً آدھا فرلانگ گئی ہو گی کہ بس رکی۔ ڈرائیور نے حکیم صاحب سے کہا آپ یہ سیٹ خالی کر دیں، پچھلی سیٹ پر چلے جائیں۔ حکیم صاحب نے پوچھا یہاں کسی بیمار کو بٹھانا ہے؟ جواب دیا: نہیں۔ کسی بوڑھے یا عورت کو بٹھانا ہے؟ کہا: نہیں۔ بولے: تو پھر مجھے کیوں اُٹھایا جا رہا ہے؟ جواب ملا تھانیدار صاحب لاہور جا رہے ہیں، انھیں فرنٹ سیٹ پر بٹھانا ہے۔ حکیم صاحب نے کہا: اگر تھانیدار کو بٹھانا ہے تو میں یہ سیٹ خالی نہیں کروں گا۔ کسی بیمار یا بوڑھے یا عورت کے لیے تو سیٹ چھوڑ دوں گا، تھانیدار یا کسی اور سرکاری افسر کے لیے نہیں چھوڑوں گا۔ اب وہاں عجیب صورتِ حال پیدا ہو گئی۔ اس زمانے میں تھانیدار کا مقابلہ کرنا بہت مشکل تھا۔ کافی دیر بس رکی رہی۔ سواریاں بھی پریشان ہو گئیں اور انھوں نے حکیم صاحب کی منت سماجت کی کہ آپ پچھلی سیٹ پر آ جایے۔ بالآخر حکیم صاحب بس سے اُتر پڑے اور کہا کہ میں اس بس پر سوار نہیں ہوں گا۔ دوسری بس سے لاہور جاؤں گا۔

بس ابھی روانہ ہوئی تھی کہ اس کا ٹائر پھٹ گیا۔ آدھ پون گھنٹے میں ٹائر بدلا اور بس روانہ ہوئی تو دوسرا ٹائر پھٹ گیا۔ اڈے پر جا کر اور ٹائر لایا گیا، وہ بدلا تو چند منٹ میں تیسرا ٹائر پھٹ گیا۔ اب خود تھانیدار اور بس کا ڈرائیور حکیم صاحب کے پاس آئے اور عرض گزار

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ہوئے کہ آپ اس بس پر بیٹھیے اور فرنٹ سیٹ پر تشریف رکھیے۔

حکیم صاحب نے کہا: میں اس بس پر نہیں بیٹھوں گا۔ اب آپ جایئے، کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ چنانچہ بس بخیریت لاہور پہنچ گئی۔

❀ حکیم صاحب نے بتایا کہ تقسیم ملک سے قبل ان کے پاس ایک ہندو نوجوان آیا کرتا تھا۔ وہ مذہب اور دھرم وغیرہ کو بالکل نہیں مانتا تھا۔ کہا کرتا تھا کہ نہ اللہ ہے، نہ رسول ہے، نہ کوئی میشوز ہے، نہ کوئی دیوتا ہے، بس یہ دنیا ہے، اس میں اچھا کام کرو تاکہ لوگوں کو آرام پہنچے۔ کسی کو تکلیف نہ پہنچاؤ۔ مرنے کے بعد قصہ ختم۔ نہ کوئی جزا ہے، نہ سزا۔ مسلمان مردے کو زمین میں دفن کر دیتے ہیں اور ہندو جلا دیتے ہیں۔

حکیم صاحب اسے سمجھانے کی کوشش کرتے کہ اس دنیا میں جو اچھا یا بُرا کام کیا جائے گا، مرنے کے بعد اس کی سزا یا جزا ملے گی۔ اللہ بھی موجود ہے اور رسول بھی لوگوں کو راہِ راست پر لانے کے لیے اس نے بھیجے، مگر وہ اپنی ضد پر قائم تھا۔

ایک دن حکیم صاحب اسے قبرستان میانی صاحب لے گئے اور فرمایا مجھے کسی ایسی قبر پر بٹھا دو جو تمھارے خیال میں بہت پرانی ہو۔ اس نے ان کو ایک قبر پر بٹھا دیا۔ حکیم صاحب نے ایک دائرہ کھینچا اور اس سے کہا کہ میں کچھ پڑھوں گا۔ تم مضبوطی سے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھنا اور دائرے سے باہر نہ نکلنا۔ حکیم صاحب نے کچھ پڑھنا شروع کیا تو تھوڑی دیر کے بعد اس نوجوان کے ہاتھ کانپنے لگے۔ حکیم صاحب نے اس کے ہاتھوں کو پکڑا اور محسوس کیا کہ وہ کانپ رہا ہے۔ اس کے بعد کچھ اور پڑھنا شروع کیا تو اس کی گھبراہٹ میں کچھ کمی ہوئی۔ پھر وہ قبرستان سے باہر آ گئے۔ حکیم صاحب نے اس سے گفتگو کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ خاموش رہا۔ کوئی بات نہیں کی۔ اس کے بعد وہ حسب معمول حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا، لیکن اس موضوع پر اس نے ان سے کبھی گفتگو نہیں کی ..... میں نے حکیم صاحب سے یہ نہیں پوچھا کہ آپ نے قبر پر کیا پڑھا اور اسے کیا کچھ دکھائی دیا۔ انھوں نے بات کی اور میں نے سن لی۔

❀ مولوی ولی محمد ایک مشہور بزرگ تھے جو سیّد احمد شہید بریلوی اور مولانا اسماعیل شہید

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

دہلوی کی جماعت مجاہدین سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا مسکن ضلع قصور کا ایک گاؤں فتوحی والا تھا۔ جو دریائے ستلج کے قریب ہے۔ مولوی ولی محمد کی کرامتوں اور قبولیت دعا کے بہت سے واقعات مشہور تھے۔ میں نے تقسیم ملک سے قبل مولوی ولی محمد کو دیکھا تھا اور ایک دفعہ ان کے گاؤں بھی گیا تھا۔ حضرت مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے صاحب زادۂ گرامی قدر حافظ احمد شاکر نے مرحوم علیم ناصری کے حوالے سے بتایا کہ مولوی ولی محمد مرحوم کے ملنے والے ایک شخص جنت دوزخ کے وجود کو نہیں مانتے تھے۔ ایک دن نمازِ ظہر کے بعد مولوی ولی محمد انھیں اپنے حجرے میں لے گئے اور دونوں وہاں اس طرح لیٹ گئے کہ ایک کے پاؤں ایک طرف تھے اور دوسرے کے دوسری طرف۔ لیکن سر دونوں کے ملے ہوئے تھے۔ مولوی صاحب نے ان سے کہا کہ اب تم سو جاؤ میں بھی سو جاتا ہوں، لیکن ہمارے سر اسی طرح ملے رہنے چاہئیں۔ معلوم نہیں نیند کی حالت میں اس شخص نے کیا دیکھا اور اس پر کیا کیفیت طاری ہوئی۔ نیند سے بے دار ہونے کے بعد وہ جنت اور دوزخ کے وجود کا قائل ہو چکا تھا۔

یہ کیا معاملہ ہے؟ اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

❀ یہی حافظ احمد شاکر راوی ہیں کہ ان کے ایک رشتے دار مولوی عبدالحق تقسیم ملک کے بعد کوٹ رادھا کشن (ضلع قصور) میں آ بسے تھے۔ انھوں نے حافظ احمد شاکر کو ان کے دادا یعنی مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے والد محترم میاں صدر الدین حسن مرحوم کے متعلق بتایا کہ وہ روزانہ نمازِ عصر کے بعد خاص لہجے میں سورۂ الرحمٰن اور سورۂ یٰس پڑھا کرتے تھے۔ مولوی عبدالحق بیان کرتے ہیں کہ ان کی وفات کے بعد قبرستان کی طرف سے ہمیں عصر کے بعد ان کی آواز میں سورۂ رحمٰن اور سورۂ یٰس کی تلاوت سنائی دیتی تھی۔ بارہا ایسا ہوا کہ ان کی تلاوت سن کر ہم قبرستان کی طرف چل پڑے۔ جیسے جیسے قبرستان کے قریب ہوتے گئے، تلاوت کی آواز آہستہ ہوتی گئی۔ قبرستان میں پہنچے تو آواز آنا بند ہوگئی۔ یہ تجربہ انھوں نے کئی دفعہ کیا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

میاں صدر الدین جن کو ہم نے نہیں دیکھا، موضع بھوجیاں (ضلع امرتسر، مشرقی پنجاب) کے رہنے والے تھے۔ مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے والد تھے اور مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی کے والد محترم حضرت امام سیّد عبدالجبار غزنوی کے مرید اور ان سے بیعت تھے۔ ان کی اہلیہ (یعنی مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کی والدہ) بھی حضرت امام سیّد عبدالجبار غزنوی کے حلقہ ارادت سے تعلق رکھتی تھیں۔

اس واقعہ کے راوی مولوی عبدالحق کو میں نے دیکھا ہے اور ان کے حلقے میں بیٹھا ہوں۔ صالح بزرگ تھے۔ اور اپنے عہد کے پرانے بزرگوں کے واقعات سناتے وقت بعض اوقات ان پر ایک خاص قسم کی جذباتی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔

❀ ایک اور واقعہ سنیے۔ اس کے راوی بھی محترم المقام حافظ احمد شاکر ہیں۔ ان کے دفتر (اخبار الاعتصام) میں ایک مزدور کام کرتا تھا۔ اس نے ان کو بتایا کہ ایک مرتبہ وہ حج بیت اللہ کے لیے گیا۔ بیت اللہ شریف میں بیٹھا تھا کہ اس نے اللہ کی بارگاہ میں دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے۔ وہ دعا کر رہا تھا کہ اسے چند عورتیں نظر آئیں۔ ہماری اس دنیا کی عورتوں سے بالکل الگ قسم کی عورتیں، انتہائی حسین وجمیل۔ اس نے دعا ختم کی تو وہ عورتیں غائب ہوگئیں۔ اب بھی وہ کبھی متوجہ الی اللہ ہو کر دعا کرتا ہے تو وہی صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن جب دعا ختم کر کے چہرے پر ہاتھ پھیرتا ہے تو وہ صورتِ حال ختم ہو جاتی ہے۔

کوئی مانے یا نہ مانے، کچھ معاملات ایسے ضرور ہیں جو بعض خاص اوقات میں اللہ کے بعض بندوں پر ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اس قسم کے معاملات کی کیفیات وتفصیلات کا ہمیں علم نہیں۔

❀ ضلع گورداس پور (مشرقی پنجاب) کے کسی گاؤں کے رہنے والے ایک شخص امام الدین تھے، ان کے اس نام کا علم بہت کم لوگوں کو ہوگا۔ انھیں میاں الحمد للہ کہا جاتا تھا۔ اس لیے کہ غمی شادی کی ہر بات سن کر وہ ایک خاص لہجے کے ساتھ قدرے بلند آواز سے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

الحمد للہ کہا کرتے تھے۔ کسی کی وفات کی خبر سنتے تو کہتے الحمد للہ۔ کسی کے ہاں بچے کی ولادت کا بتایا جاتا تو کہتے الحمد للہ۔ بہ کثرت الحمد للہ کہنے کی وجہ سے ان کا نام ہی الحمد للہ پڑ گیا تھا۔

تقسیم ملک سے قبل وہ ہمارے قدیم وطن کوٹ کپورہ جایا کرتے تھے اور لوگ نہایت مسرت سے ان کی باتیں سنا کرتے تھے۔ مجھے بھی ان کی گفتگو سے دلچسپی تھی۔ چھوٹا قد، گٹھا ہوا بدن، سرخی مائل گندمی رنگ، چہرے پر مسکراہٹ، دل میں خشیت الٰہی کا جذبہ صادقہ موجزن، سادہ لباس اور پر خلوص اسلوب کلام۔ اپنے عہد کے علما و صلحا کا تذکرہ والہانہ انداز سے کرتے اور جن اہل اللہ کی مجلسوں میں بیٹھنے کے انھیں مواقع میسر آئے تھے، ان کی باتیں بے حد شوق سے سناتے۔ اس مردِ درویش کی دعا اللہ قبول فرماتا تھا۔

وہ مویشیوں کی تجارت کرتے تھے۔ ہمارے شہر سے بارہ تیرہ کلو میٹر کے فاصلے پر ریاست نابھہ میں ایک قصبہ ''جیتو منڈی'' کے نام سے موسوم تھا۔ وہاں گرمیوں کے دنوں میں مویشیوں کی منڈی لگتی تھی اور لوگ دور دور کے علاقوں سے مویشی خریدنے اور بیچنے کے لیے وہاں آیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک شخص کے ساتھ میاں الحمد للہ بھی وہاں پہنچ گئے۔ انھوں نے سات آٹھ کٹے اور کٹیاں خریدے۔ وہاں سے انھوں نے کوٹ کپورے پہنچنا تھا۔ سخت گرمی میں ان کے مویشی ہانپنے لگے۔ خود ان دونوں کا بھی گرمی سے برا حال ہو گیا۔ وہ ریتلا علاقہ تھا۔ ان کے ساتھی نے کہا: میاں الحمد للہ دعا کرو، اللہ تعالیٰ بارش برسائے، ہمیں بھی کچھ آرام میسر ہو اور ہمارے کٹے کٹیوں کی تکلیف بھی رفع ہو۔

میاں الحمد للہ نے کہا جی تو میرا بھی دعا کرنے کو چاہتا ہے، لیکن پھر خیال آتا ہے کہ بارش ہو گئی تو یہ جانور ریت میں دھنسیں گے اور ان کا چلنا مشکل ہو جائے گا یعنی انھیں اللہ پر یقین تھا کہ بارش کی دعا کی تو بارش ضرور ہو گی، لیکن جانوروں کے لیے مشکل پیدا ہو جائے گی۔

ساتھی نے کہا کوئی بات نہیں، آپ دعا کریں، ان جانوروں کو ہم کسی نہ کسی طرح ہانک

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کر لے جائیں گے۔ چنانچہ اس شخص کے بقول میاں الحمد للہ نے دعا کی اور تھوڑی دیر بعد آسمان پر بادل نمودار ہوئے، گھٹا چھائی اور بارش ہونے لگی۔ اس کے نتیجے میں واقعتاً جانوروں کے لیے چلنا کچھ مشکل ہو گیا۔ لیکن کسی طرح وہ انھیں کوٹ کپورے لے آئے۔ یہ بات اس شخص نے میاں الحمد للہ کی موجودگی میں سنائی۔ وہ سنا رہا تھا اور میاں الحمد للہ مسکرا رہے تھے۔
اس واقعہ پر کم و بیش ستر سال گزر چکے ہیں، لیکن میں اب بھی انھیں اپنے شہر کی جامع مسجد میں بیٹھے اور مسکراتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔

۲۰ دسمبر ۲۰۰۹ء لاہور

❀❀❀❀

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

بائیسواں باب:

چند شخصیات اور چند واقعات

زندگی میں جن بے شمار شخصیات سے میری ملاقاتیں ہوئیں اور تعلقات استوار ہوئے، ان میں علما، شعرا، خطبا، مقررین، اخبار نویس، مصنفین، سیاسی رہنما ہر قسم کے اور ہر مذہب و مسلک کے لوگ شامل ہیں۔ ان میں سے چند شخصیات کا تذکرہ اختصار کے ساتھ ذیل میں کیا جاتا ہے:

✪ ان حضرات میں ایک عظیم شخصیت مولانا ابو الکلام آزاد کی ہے۔ مولانا ممدوح پر میں نے ایک طویل مضمون اپنی کتاب ''بزمِ ارجمنداں'' میں لکھا ہے۔ یہ مضمون خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ کی طرف سے کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ زیرِ مطالعہ کتاب کے گزشتہ صفحات کے متعدد مقامات میں مولانا کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ مجھے ان کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہے۔

تقسیمِ ملک کے بعد جو ہولناک حالات ہندوستان میں پیدا ہو گئے تھے اور مسلمان جن مصائب میں پھنس گئے تھے، اگر مولانا آزاد وہاں نہ ہوتے تو ہندوستان مسلمانوں سے خالی ہو جاتا۔ دہلی کی جامع مسجد میں مسلمان جمع ہو گئے تھے جو پاکستان آنا چاہتے تھے۔ ۲۷۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو مولانا نے اس اجتماع میں ایسی زوردار تقریر کی کہ وہ لوگ تقریر سنتے ہی گھروں کو چلے گئے اور پھر وہیں رہے۔

✪ میں دنیائے خطابت کے ممتاز ترین خطیب سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کی چند تقریریں سننے اور ان سے ہم کلام ہونے کی سعادت سے بہرہ مند ہوا۔ اس کا تفصیل سے ذکر میں نے اپنی ایک کتاب ''نقوشِ عظمتِ رفتہ'' میں کیا ہے۔ زیرِ نظر کتاب کے بھی بعض مقامات

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

میں ان کے متعلق چند باتیں بیان کی گئی ہیں ۔ ان کی زندگی میں چھوٹے بڑے تمام احراری انھیں ''شاہ جی'' کہہ کر پکارتے تھے۔ ان کی رحلت کے بعد بھی یہی لفظ چلتا ہے۔

دہلی کی جامع مسجد کے سامنے کے بہت بڑے میدان کے ایک بہت بڑے جلسے میں تحریک آزادی کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے شاہ جی نے کہا دلّی والو! جس صورت میں آزادی ملے اور جن مشکلات سے گزر کر ملے، اسے حاصل کرنے کی جدو جہد کرنا میرا نصب العین ہے۔ اس کے بعد انھوں نے دونوں ہاتھ پھیلا کر ایسی شکل بنائی جیسے پانی سے گزرنے کا راستہ بنا رہے ہوں اور پھر پنجابی کا یہ شعر پڑھا:

جے ہیر سمندروں پار ہووے
بکّاں نال سمندر نوں جھٹ سٹا

یہ سنتے ہی مجمعے کے سکوت کا بند ٹوٹ گیا۔ بیٹھے ہوئے لوگ داد و تحسین پیش کرنے کے لیے اچھلنے لگے ، جبہ و دستار میں ملبوس علمائے کرام بھی تڑپ اُٹھے۔ واہ واہ کی صدائیں بلند ہونے لگیں اور ''امیر شریعت سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری زندہ باد'' کے نعرے گونجنے لگے۔

ظاہر ہے دلی کے سامعین میں سے بہت کم لوگوں نے پنجابی کے اس شعر کے معنے سمجھے ہوں گے، لیکن شاہ جی نے جس اسلوب، جس ہیئت اور جس جذبے سے شعر پڑھا اور جس طرح دونوں ہاتھوں کو عملی شکل میں ڈھالا، اس نے شعر کے ایک ایک لفظ کے مطلب کو نکھار دیا تھا۔

- ۱۹۵۶ء میں مولانا داؤد غزنوی اور شاہ جی کے درمیان بعض معاملات میں کچھ رنجش سی پیدا ہو گئی تھی۔ اس سلسلے میں مولانا تاج محمود اور مولانا مجاہد الحسینی دونوں مولانا داؤد غزنوی کی خدمت میں آئے۔ میں اس وقت ہفت روزہ ''الاعتصام'' کا ایڈیٹر تھا اور اس مجلس میں موجود تھا۔ شاہ جی سے بات کرنے کے لیے ان حضرات کے ساتھ مولانا غزنوی نے مجھے بھیج دیا۔ اس دن ہلکی ہلکی سی بارش ہو رہی تھی۔ مجلس احرار کا دفتر دلّی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

دروازے کے باہر سرکلر روڈ پر شاہ محمد غوث کے مزار کے سامنے ایک بلڈنگ کی دوسری اور تیسری منزل میں تھا۔ بارش کی وجہ سے سڑک پر گارے کی موٹی موٹی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ اسی بلڈنگ میں مجلس احرار کے ترجمان اخبار ''آزاد'' کا دفتر تھا، جس کے ایڈیٹر مولانا مجاہد الحسینی تھے۔ ہم دوسری منزل مین گئے تو ایک بڑے کمرے میں موٹے بان کی چوکھڑا بنی ہوئی چھوٹی سی چار پائی پر برصغیر کا شہنشاہِ خطابت آلتی پالتی مارے مجلس احرار کے لیٹر پیڈ پر کچھ لکھ رہا تھا۔ سامنے چھ سات آدمی دری پر بیٹھے تھے جو کئی جگہ سے پھٹی ہوئی تھی اور اس کے بڑے بڑے سوراخ اس کی بوسیدگی اور کہنگی کا اعلان کر رہے تھے اور بتا رہے تھے کہ یہ عمر کی بہت سی منزلیں طے کر چکی ہے اور اس پر بے شمار کاروانِ احرار گزر چکے ہیں۔

شاہ جی کے انہماک کو دیکھ کر ہم تینوں ''سرھانے میر کے آہستہ بولو'' کی عملی تصویر بنے ہوئے تھوڑا سا آگے بڑھے اور جوتے اُتار کر بہ زبانِ خفی السلام علیکم کہہ کر نہایت ادب سے دوزانو ہو کر دری پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر کے بعد شاہ جی نے کاغذ سے نگاہ اُٹھائی تو میں نے اُٹھ کر ان کو مؤدبانہ سلام عرض کیا۔ مولانا تاج محمود اور مجاہد الحسینی نے کھڑے ہو کر ان کو میرا نام بتایا۔ میرا نام سن کو (جو ان کے مقابلے میں کسی بھی شمار قطار میں آنے کے لائق نہیں) برصغیر کے خطیب اعظم چار پائی سے اُٹھے اور مجھے اپنی بغل میں لے لیا۔ پھر مولانا تاج محمود اور مولانا مجاہد الحسینی سے فرمایا تم خاموشی سے آ کر بیٹھ گئے، آتے ہی کیوں نہیں بتایا، میں اپنے عزیز کو لینے کے لیے دروازے پر جاتا۔ ان کے یہ الفاظ اس فقیر کے لیے بہت بڑے اعزاز کی حیثیت رکھتے تھے۔ پھر اس سے بھی بڑا اعزاز یہ ملا کہ اپنے برابر چار پائی پر بٹھایا۔ عجیب تر بات یہ کہ اصرار کر کے سرھانے کی طرف بٹھایا اور ایک تکیہ جو چار پائی پر پڑا تھا، ٹیک لگانے کے لیے عنایت فرمایا۔ اس پیکر شفقت کی پُر خلوص باتیں سن کر اور کیفیت انکسار دیکھ کر میں ندامت سے پانی پانی ہو گیا۔ ایک آدھ منٹ تو کسی نہ کسی طرح سرھانے کی طرف بیٹھا، پھر یہ عرض کر کے پائنتی کی طرف آ گیا کہ اب تعمیل ارشاد ہو گئی اور الامر فوق الادب پر عمل کر

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

لیا گیا۔ اس سے زیادہ اس فقیر میں ہمت نہیں۔

میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹا شاہ جی کی خدمت میں رہا اور ان کے بہت سے ارشادات سننے کا شرف حاصل ہوا۔

قیامِ پاکستان کے بعد شاہ جی ملتان میں قیام پذیر ہوئے۔ وہیں ۲۔ اگست ۱۹۶۱ء کو ان کا سانحہ ارتحال پیش آیا۔

✪ جن عظیم شخصیات کی خدمت میں مجھے حاضر ہونے اور ان کے ارشادات سے مستفید ہونے کا موقع ملا، ان میں ایک اہم شخصیت حضرت مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی کی تھی۔ میں مسلسل پندرہ سال ان کی خدمت میں حاضر رہا۔ اس کی تفصیل اپنی کتاب ''نقوشِ عظمت رفتہ'' میں بیان کر چکا ہوں۔ زیرِ نظر کتاب کے بھی بعض مقامات میں مولانا کا تذکرہ کیا گیا ہے جو خوانندگان محترم کے مطالعہ میں آیا۔

✪ اکتوبر ۱۹۴۵ء میں جمعیت علمائے ہند کی طرف سے اس کے مرکزی دفتر دہلی میں (مسلم لیگ کے سوا) مختلف سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کی میٹنگ بلائی گئی تھی، جس کا ذکر گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔ اس میٹنگ میں بنگال کے مولوی فضل الحق بھی شامل تھے، جنھیں شیر بنگال کہا جاتا تھا۔ ان کی جماعت کا نام پرجا پردیشک پارٹی تھا۔ سانولا رنگ، طویل قامت، گداز جسم، مونچھیں اور داڑھی صاف، سر پر ترکی ٹوپی، پاجامہ کرتہ اور شیروانی پہنے ہوئے۔ گرج دار آواز، اُردو بولتے تھے اور تلفظ بالکل صحیح۔ شرکائے مجلس انھیں مولوی صاحب کہتے تھے۔

ان سے کسی نے پوچھا آپ کو مولوی کیوں کہا جاتا ہے، جب کہ آپ کے چہرے مہرے پر مولویت کے کوئی آثار نہیں ہیں؟

وہ مسکرائے اور بتایا کہ مولوی ہمارا خاندانی لقب ہے۔ ہمارے خاندان کے بزرگ باقاعدہ مولوی تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور صرف ونحو وغیرہ علوم انھوں نے اپنے اساتذہ سے پڑھے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ میری والدہ چاہتی تھیں، میں بھی اپنے باپ دادا کی طرح مولوی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

بنوں، لیکن میں انگلستان چلا گیا اور بیرسٹری پاس کر لی۔ واپس آیا تو والدہ نے کہا بیٹا تم بے شک بیرسٹر بھی بنے رہو اور وکالت وغیرہ کرتے رہو، لیکن میری خواہش ہے کہ تم اپنے بڑوں کی طرح مولوی بھی بنو۔ چنانچہ میں نے والدہ کی خواہش کے مطابق تمام دینی علوم حاصل کیے۔

مولوی فضل الحق کا شمار متحدہ ہندوستان کے ممتاز مسلمان سیاسی رہنماؤں میں ہوتا تھا۔ وہ بنگال کے وزیر اعلیٰ بھی رہے۔ ۲۳۔ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور کے اجلاس میں قرار دادِ پاکستان انگریزی زبان میں انھی نے پیش کی تھی جس کا اُردو ترجمہ مولانا ظفر علی خان نے کیا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد مشرقی پاکستان کے گورنر بھی مقرر کیے گئے۔ مرکزی حکومت کی کابینہ میں بھی انھیں ایک مرتبہ شامل کیا گیا۔ وہ جرأت مند اور بلند کردار سیاسی رہنما تھے۔ افسوس ہے بنگالی رہنماؤں کو مغربی پاکستان کے رہنما پریشان کرتے رہے، جس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا۔ ابتدا ہی میں مشرقی اور مغربی پاکستان میں تعلقات خراب ہونے لگے تھے۔ ایک مرتبہ اسمبلی کے ایک بنگالی رکن کو لیاقت علی خان نے اسمبلی میں بنگلہ زبان میں تقریر کرنے سے روک دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ انگریزی میں تقریر کریں۔

- جمعیت علمائے ہند کی طلب کردہ اسی میٹنگ میں ایک شخص خواجہ عبدالمجید کو دیکھا۔ وہ بیرسٹر تھے اور دراصل الہ آباد کے رہنے والے تھے۔ وہیں وکالت کا آغاز کیا اور طویل عرصے تک اسی پیشے سے منسلک رہے۔ ۱۹۱۹ء کی ترک موالات (یا عدم تعاون) کی تحریک میں وکالت ترک کر دی تھی۔ پھر کسی زمانے میں علی گڑھ چلے گئے تھے اور وہیں مستقل طور سے سکونت اختیار کر لی تھی۔ بعد میں حالات ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ بہت سے وکلا نے وکالت دوبارہ شروع کر دی، لیکن خواجہ عبدالمجید اس پیشے میں دوبارہ نہیں آئے۔ وہ یوپی کے ایک کھاتے پیتے گھرانے کے عالی حوصلہ اور مہمان نواز فرد تھے۔ مسلکاً اہل حدیث تھے۔ اس کا پتا مولانا عبدالماجد دریا بادی کے ایک مضمون سے چلا جو ان کی وفات کے بعد ہفت روزہ ''صدق جدید'' میں چھپا۔ خواجہ صاحب کا حلیہ کسی حد تک مولانا ابوالکلام

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

آزاد سے ملتا تھا۔لیکن فرق یہ تھا کہ ان کا قد مولانا آزاد سے کچھ چھوٹا تھا۔

ایک دن خواجہ صاحب نے حاضرین مجلس کو چار بجے کی چائے کی دعوت دی۔ ان کے ایک طرف مولانا سیّد حسین احمد مدنی بیٹھے تھے جو جمعیت علمائے ہند کے صدر تھے اور دوسری طرف مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی تشریف فرما تھے جو جمعیت علمائے ہند کے نائب صدر تھے۔ مولانا حسین احمد مدنی نے چائے کی ایک پیالی پی تو خواجہ صاحب ان کے لیے دوسری پیالی بنانے لگے۔ مولانا نے فرمایا بس اور نہ بنایے، میں نے ایک ہی پیالی پینا تھی اور وہ پی لی۔ خواجہ صاحب نے کہا ایک پیالی اور پی لیجیے۔

مولانا مدنی نے خواجہ صاحب کے یہ الفاظ سن کر ایک لطیفہ بیان کیا جو واقعہ بھی تھا۔فرمایا ایک مرتبہ پٹنہ میں جمعیت علمائے ہند کا اجلاس ہوا۔ اجلاس کے بعد میرے چند شاگرد مجھے اپنے گاؤں لے گئے۔ انھوں نے چائے کا اہتمام کیا اور ایک بڑے برتن میں کھانے کے لیے رس لائے گئے۔ میزبان نے پیالے میں چائے ڈالی جو میں نے پی۔ ایک آدھ رس بھی کھایا۔ دوسری دفعہ وہ پیالے میں چائے ڈالنے لگے تو میں نے روک دیا اور کہا جتنی چائے پینا تھی پی لی۔ اب گنجائش نہیں۔ ایک شخص نے جو قریب ہی بیٹھا تھا، بڑی معصومیت سے کہا: حضرت ایک پیالہ اور پی لیجیے، مُوت ہی تو ہے۔ یعنی اس شخص نے چائے کا نتیجہ بیان کر دیا کہ پیشاب بن کر نکل جائے گی۔

خواجہ صاحب کا انتقال ۳۔ دسمبر ۱۹۶۲ء کو علی گڑھ میں ہوا۔

✪ ریاست فرید کوٹ کی پرجا منڈل کے بعض ارکان کا تذکرہ صفحات سابقہ میں ہو چکا ہے۔ اب ایک واقعہ اور ملاحظہ فرمایئے:

دوسری جنگ عظیم کے فوراً بعد ۱۹۴۵ء میں جب ہندوستان کی برطانوی حکومت نے سیاسی قیدیوں اور نظر بندوں کو رہا کیا اور کچھ عرصے کے بعد عام انتخابات کا اعلان ہوا تو ملک کے لیڈروں نے دوروں کا سلسلہ شروع کر دیا تھا، جن میں اس عہد کے مشہور سوشلسٹ لیڈر جے پرکاش نارائن بھی شامل تھے۔ وہ پنجاب کے دورے پر آئے تو ان کی اہلیہ بھی ان کے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ساتھ تھیں۔ وہ ضلع فیروز پور کے ایک شہر ''موگا'' پہنچے تو ریاست فرید کوٹ کی پرجا منڈل کے ہم چند ارکان ان سے ملنے گئے۔ ہم نے ان کو فرید کوٹ آنے اور تقریر کرنے کی دعوت دی۔ وہ مان گئے اور اپنے پروگرام میں کچھ تبدیلی کر کے اپنی اہلیہ کے ساتھ دوسرے دن چار بجے فرید کوٹ پہنچے۔

گرمیوں کا موسم تھا اور رمضان کا مہینا۔ فرید کوٹ شہر کی غلہ منڈی میں نمازِ عشا اور تراویح کے بعد دس بجے ان کی تقریر کا اعلان کیا گیا۔ مولانا حافظ عبداللہ بڈھیمالوی مشہور عالم دین تھے (جنھوں نے ۹۔ مئی ۱۹۸۷ء کو موضع کمیانہ ضلع فیصل آباد میں وفات پائی۔) اس زمانے میں وہ ہر سال فرید کوٹ کی مسجد اہل حدیث میں نمازِ تراویح پڑھاتے اور قرآن مجید سناتے تھے۔ ہم نے ان سے جلسے کی صدارت کے لیے عرض کیا۔ ازراہِ کرم انھوں نے ہماری گزارش منظور فرمائی اور جلسے کی صدارت کی۔ سٹیج سیکرٹری کے فرائض میرے ذمے تھے۔ تلاوت قرآن مجید اور نظم کے بعد جے پرکاش نارائن نے تقریر شروع کی۔ شستہ اور عام فہم اُردو میں انھوں نے اظہارِ خیال کیا۔ تقریر میں انگریز کی مخالفت کے علاوہ کوئی دوسری بات نہیں کی۔ کسی جماعت یا کسی رہنما کا کسی بھی انداز میں نام نہیں لیا۔

بہت بڑا مجمع تھا۔ جلسے کے دوران میں خیر خواہانہ رنگ میں ایک شخص نے میرے کان میں کہا کہ کچھ افراد نے یہ منصوبہ بنایا ہے کہ تم لوگ رات کو جلسے سے فارغ ہو کر کوٹ کپورہ جاؤ گے تو تمھیں راستے میں پکڑا جائے گا اور سب کی پٹائی کی جائے گی۔ جوانی کا ابتدائی زمانہ تھا۔ میں نے بے باکی سے جواب دیا کہ جلسہ ختم کر کے ہم یہاں سے جائیں گے اور دیکھیں گے کون ہمارا راستہ روکتا ہے۔ میرے ایک عزیز عبدالشکور کا ریس کا گھوڑا تھا جو بہت دوڑتا تھا۔ میں نے ان سے تانگہ لے کر آنے کے لیے کہہ رکھا تھا، کیونکہ جلسے کے بعد واپس اپنے گھر پہنچنا تھا۔ رات کے ایک بجے جلسہ ختم ہوا اور ساتھ ہی آسمان پر بادل چھا گئے اور ہلکی ہلکی سی بارش ہونے لگی۔ میں، گیانی ذیل سنگھ، بھائی دیال سنگھ اور قاضی عبیداللہ تانگے پر سوار ہوئے تو میں نے ان سے کہا کہ راستے میں حملے کا خطرہ ہے، اس لیے چوکس رہنا اور ادھر ادھر دھیان رکھنا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ذیل سنگھ نے یہ الفاظ سن کر گھبراہٹ کا اظہار کیا تو عبدالشکور نے کہا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم چلیں گے تو کوئی ہمیں پکڑ نہیں سکے گا۔ بس دعا کیجیے کہ درخت گرا کر راستہ نہ بند کر دیا گیا ہو۔

فرید کوٹ سے کوٹ کپورہ بجانب مشرق سات میل کے فاصلے پر ہے اور گیانی ذیل سنگھ کا گاؤں ''سندھواں'' جو راستے میں پڑتا ہے، وہاں سے پانچ میل ہے۔ ان دنوں فرید کوٹ اور سندھواں کے درمیان کوئی آبادی نہ تھی۔ راستے میں لب سڑک صرف ایک گوردوارہ تھا جو بڑے بڑے درختوں کے جھنڈ میں گھرا ہوا تھا۔ وہاں ایک نلکا تھا جس کے ساتھ ایک پختہ چوبچا بنا ہوا تھا اور تانگے والے وہاں گھوڑوں کو پانی پلاتے تھے۔ اس کے اردگرد کافی دُور تک پھیلا ہوا چھوٹے بڑے درختوں کا ایک ذخیرہ تھا۔ میں اور گیانی ذیل سنگھ تانگے میں اگلی سیٹ پر اور قاضی عبیداللہ اور بھائی دیال سنگھ تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ اندھیری رات کے چاروں طرف پھیلے ہوئے سناٹے میں گھوڑا دوڑنے لگا تو اس کی ٹاپوں کے سوا کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی اور اس کے زوردار قدموں سے تارکول کے سیاہ کمبل میں لپٹی ہوئی سڑک کے تن بدن سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے۔ ہم ''بابا فرید دی مال'' سے تین فرلانگ آگے نکلے ہوں گے کہ سڑک کے دونوں طرف جھاڑیوں میں کھٹکھٹاہٹ سی ہوئی اور ایک دم چار لاٹھیاں اوپر کو اُٹھ گئیں، لیکن ہم نے اپنے آپ کو قابو میں رکھا۔ موقعے کی نزاکت کو بھانپ کر شکور نے چھانٹا لہراتے ہوئے گھوڑے کو للکارا۔ گھوڑے نے جب خطرہ محسوس کیا اور مالک کی آواز سنی تو اور تیز ہو گیا۔

ادھر بھائی دیال سنگھ نے مجھ سے مخاطب ہو کر ذرا اونچی آواز میں کہا ''ساک مدا چلا دے پستول۔''

ہم بالکل خالی ہاتھ تھے اور پستول چلانے کی آواز محض ''پھوکا ڈراوا'' تھا۔ اتنے میں برق رفتار گھوڑا جو تیزی سے سفر کو نگل رہا تھا، ایک میل آگے نکل کر گوردوارے تک جا پہنچا۔ ہم چاروں تو خطرے میں تھے ہی اور خطرناک بھی تھے، ہمارے ساتھ پانچواں عبدالشکور بھی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

خطرے کی زد میں تھا۔ مگر اللہ نے ہم سب کو محفوظ رکھا اور چند منٹ میں ہم سندھواں پہنچ گئے جو گیانی سنگھ کا گاؤں تھا۔ تانگہ سڑک پر کھڑا کیا۔ میں اور قاضی عبیداللہ تانگے سے اُترے اور گیانی ذیل سنگھ کو ان کے گھر چھوڑ کر آئے۔ پھر چار پانچ منٹ بعد اپنے مسکن کوٹ کپورہ جا پہنچے۔ پہلے غلہ منڈی گئے، وہاں ''بازار مائی سیواں'' میں بھائی دیال سنگھ کی دودھ دہی کی دکان تھی اور دکان کے اوپر ان کی سکونت تھی، ان کو وہاں اُتار کر قاضی عبیداللہ کے مکان پر گئے اور پھر اپنے گھر پہنچے۔ اتنے میں سحری کی اذان ہونے لگی اور ہم سحری کھانے میں مشغول ہو گئے۔ تمام رات بھاگ دوڑ میں گزر گئی۔

دوسرے دن آٹھ نو بجے پرجا منڈل کے دفتر پہنچے۔ کچھ دیر بعد گیانی جی اور دوسرے دوست بھی آ گئے۔ رات کی باتیں ہونے لگیں تو میں نے ہنس کر کہا: سیاست کے عشق نے دلوں سے خوف و ہراس نکال دیا ہے۔ اگر خدانخواستہ رات کسی کو کوئی تکلیف پہنچ جاتی تو پنجابی کی یہ بولی ہم پر بالکل صحیح ثابت ہوتی:

کندھاں ٹپ کے بھنا لیے گوڈے نی پیٹے عشق دیے

یعنی تو عشق کی ماری ہوئی ہے اور تو نے دیواریں پھاند کر اپنے گھٹنے تڑوا لیے ہیں۔

یہ وہی گیانی ذیل سنگھ ہیں جو پانچ برس ہندوستان کے صدر رہے اور ہزاروں محافظ اور باڈی گارڈ جن کے آگے پیچھے چلتے رہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ اتنے لمبے عرصے کی چھوٹی چھوٹی باتیں انھیں یاد رہی ہوں گی۔ مجھے چونکہ خود ''بڑا آدمی'' بننے کا تجربہ نہیں ہے، اس لیے میں سمجھتا تھا کہ بڑا بننے کے بعد انسان پہلی باتیں بھول جاتا ہے، گیانی جی بھی بھول گئے ہوں گے، لیکن ان کے ایک خط سے (جو انھوں نے ۴۔ اپریل ۱۹۸۴ء کو لکھا اور ۱۲۔ اپریل کو مجھے ملا) معلوم ہوا کہ وہ پچھلی باتوں کو بھولے نہیں، یہ باتیں انھیں یاد ہیں۔ ان کے الفاظ ہیں: ''آپ کے خطوط پا کر بے حد خوشی ہوئی، بڑی پرانی یادیں فلم کی طرح آنکھوں کے سامنے گھومنے لگیں۔''

✪ پرجا منڈل کے زمانے میں مَیں اور ایک سکھ سیاسی کارکن چنن سنگھ ڈوڈ (جو کمیونسٹ تھا)

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

لاہور آئے۔ ہم دو آدمیوں کو فرید کوٹ آنے کی دعوت دینے آئے تھے۔ ایک منشی احمد دین کو جو سوشلسٹ پارٹی سے تعلق رکھتے تھے اور راولپنڈی کے رہنے والے تھے، لیکن چند روز سے لاہور میں مقیم تھے۔ دوسرے شخص تھے، چاندی لال ورما۔ یہ پنجاب بیوپار منڈل کے صدر تھے اور بھاٹی دروازے کے اندر بازار حکیماں میں ان کا مکان تھا۔ لوہاری دروازے کی طرف سے انارکلی میں داخل ہوں تو دائیں جانب ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا۔ اب وہاں تین منزلہ خوب صورت مسجد بنی ہوئی ہے۔ ہوٹل کے سامنے پیپل کا درخت تھا۔ قیامِ پاکستان کے کئی سال بعد تک یہ ہوٹل موجود رہا۔ ہم اس ہوٹل کے قریب پہنچے تو گوشت کی خوشبو آئی۔ چنن سنگھ ڈوڈ وہیں رک گیا۔ بولا دوپہر ہوگئی ہے اور بھوک لگی ہے، کھانا کھالیں۔ میں نے کہا یہ مسلمانوں کا ہوٹل ہے اور گائے کا گوشت پک رہا ہے۔

بولا چھوڑو ان باتوں کو۔ آؤ گائے کا گوشت کھا کر دیکھتے ہیں کہ کیسا ہوتا ہے اور مسلمان کس طرح یہ گوشت پکاتے ہیں۔ پلیٹ کی قیمت دو آنے تھی۔ چنن سنگھ ڈوڈ تنور کی روٹیوں کے ساتھ گوشت کی چار پلیٹیں کھا گیا۔ وہ لمبے قد کا کھلے ڈیل ڈول کا جوان تھا۔

گائے کا گوشت کھا کر اس نے مونچھوں کو تاؤ دیا اور کہا: سکتر جی! سواد آ گیا۔ بہت اچھا کھانا بڑے پریم نال کھادا۔ (سیکرٹری صاحب! مزہ آ گیا، بہت اچھا کھانا، بڑے شوق سے کھایا) بولا یوں ہی لوگوں نے باتیں بنائی ہیں۔ گائے کیا کہتی ہے، مجھے نہ کھاؤ۔ میں تو مذہب دھرم کو مانتا ہی نہیں۔ لیکن تم نے کسی کو بتانا نہیں کہ ہم نے لاہور جا کر گائے کا ماس کھایا۔

✪ ان دنوں برصغیر کی ریاستوں میں آزادی کی لہر بڑی تیزی سے جاری تھی۔ دہلی مسلم ہوٹل (انارکلی) میں شیخ عبداللہ، بخشی غلام محمد، چودھری غلام عباس اور بعض دیگر کشمیری رہنماؤں کو دیکھا۔ انارکلی سے دہلی مسلم ہوٹل میں داخل ہوں تو بائیں جانب کے تین چار کمروں میں ان کا قیام تھا۔ ہم نے کچھ دیر ان لوگوں سے باتیں کیں۔ شیخ عبداللہ کو اس

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

زمانے میں ''شیر کشمیر'' کہا جاتا تھا اور جواہر لال نہرو سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے۔

- اسی زمانے میں فیروز پور کے گوکھلا ہال میں ایک کمیونسٹ مقرر ٹیکا رام سخن کی تقریر سنی۔ وہ شورش کاشمیری کے لہجے میں تقریر کرتا تھا۔ بے حد شستہ اُردو میں زور دار تقریر۔ انگریزی حکومت کے خلاف اس کی زبان آگ اُگلتی تھی۔ بے شمار شعرا کے شعرا سے زبانی یاد تھے۔ خود بھی شاعر تھا۔ ایک مجلس میں اس سے گفتگو ہوئی اور پھر اس سے تعلقات پیدا ہوئے، اس وقت وہ لوگوں سے پنجابی میں بات کرتا تھا۔

- ایک مرتبہ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں یہی ٹیکا رام سخن اور ریاست فرید کوٹ کے رلیا سنگھ برگاڑی سے میری ملاقات فیروز پور ریلوے اسٹیشن پر ہوئی۔ یہ دونوں سیاسی قیدی تھے اور لاہور سنٹرل جیل سے پولیس کے اہل کار انھیں کسی اور جیل میں لے جارہے تھے۔ ان دونوں کو ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ رلیا سنگھ سے میرے پہلے سے مراسم تھے۔ وہ ریاست فرید کوٹ کے ایک گاؤں ''برگاڑی'' کے رہنے والے تھے اور کمیونسٹ پارٹی سے منسلک تھے۔ کسی زمانے میں ریاست فرید کوٹ کی پرجا منڈل سے ان کا تعلق تھا۔ پھر کچھ اختلاف ہوا تو پرجا منڈل سے الگ ہو گئے تھے۔

- اوّلیں مرتبہ ۱۹۳۸ء میں مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی کی زیارت ہوئی۔ انھوں نے اسی سال اپنی مشہور کتاب ''تراجم علمائے حدیث ہند'' مکمل کی تھی اور وہ اسی سال دہلی میں چھپی تھی۔ مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی دہلی جاتے ہوئے مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے ملاقات کے لیے فیروز پور آئے تھے۔ ان سے انھوں نے اپنی اس کتاب کی دوسری جلد کے لیے مشورہ کیا تھا، جس میں وہ پنجاب کے علمائے اہل حدیث کا تذکرہ کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے مولانا بھوجیانی کو علمائے پنجاب کی فہرست دکھائی، جس میں انھوں نے مولانا کے کہنے سے چند مزید نام شامل فرمائے۔ طویل قامت، چوڑا چہرہ، خشخشی داڑھی، کشادہ پیشانی، کشادہ سینہ، زبان میں تھوڑی سی لکنت، سر پر ٹوپی، پاجامہ اور شیروانی زیب تن۔ پان کھاتے تھے۔ میں ان کی باتیں سنتا رہا۔ تعجب ہوتا تھا

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کہ یہ کس طرح کتابیں لکھتے ہیں۔ دو دن ان کا قیام فیروز پور رہا۔ دو تین دفعہ انھوں نے مجھ سے کسی کام کے لیے کہا اور میں نے نہایت خوشی سے تعمیل ارشاد کی۔ میں لاہور آیا تو ان سے تعلقات استوار ہوئے۔ انھوں نے ۱۶ر جنوری ۱۹۶۶ء کو اپنے آبائی وطن سوہدرہ میں وفات پائی۔ ان کا سال ولادت ۱۸۹۰ء کے پس و پیش تھا۔

✪ ۱۹۵۱ء میں علامہ سیّد سلیمان ندوی جامعہ اشرفیہ کے جلسے میں لاہور تشریف لائے۔ اس وقت جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد کی مول چند بلڈنگ میں تھا۔ ''الاعتصام'' ان دنوں گوجرانوالا سے شائع ہوتا تھا اور میں معاون مدیر کی حیثیت سے اس اخبار سے منسلک تھا۔ میں اور مولانا محمد حنیف ندوی، سیّد صاحب سے ملاقات کے لیے جامعہ اشرفیہ گئے۔ وہ ایک کمرے میں قیام فرما تھے اور ایک صاحب ان کے پاس بیٹھے تھے۔ ہم گئے تو وہ صاحب اُٹھ کر چلے گئے۔ شاید وہ اس انتظار میں تھے کہ کوئی آئے تو میں جاؤں۔ سیّد صاحب کو میں نے پہلی دفعہ دیکھا تھا اور یہ پہلی رویت آخری رویت ثابت ہوئی۔ چوڑا بشرہ، گورا رنگ، گھنی سفید داڑھی، میانہ قد، چمک دار آنکھیں، سر پر سفید ململ کا عمامہ اور سفید قمیص، خوش مزاج اور خندہ رو، ان کا قلم تاریخ اور اسلامیات میں برابر چلتا تھا۔ اس سے کئی سال پہلے سیّد صاحب مولانا اشرف علی تھانوی کے حلقہ بیعت وارادت میں شامل ہو چکے تھے۔

مولانا حنیف ندوی کو دیکھ کر سیّد صاحب بہت خوش ہوئے اور بغل گیر ہو کر ملے۔ خیر و عافیت کے مبادلے اور ادھر ادھر کی چند باتوں کے بعد مولانا نے سیّد صاحب سے فرمایا۔

آپ نے سیرۃ النبی کو بہشتی زیور کے قدموں میں ڈال دیا ہے۔ سیّد صاحب نیچے دری پر گاؤ تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔ انھوں نے جسم کو تھوڑی سی حرکت دی اور مسکراتے ہوئے فرمایا:

''آپ ہماری عمر کو پہنچیں گے تو آپ بھی یہی کریں گے۔''

مولانا نے جواب دیا: ''میرا بھی یہی خیال ہے کہ آپ پر عمر کا اثر ہے۔''

یہ الفاظ سن کر سیّد صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور خاموش ہو گئے۔ اس

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کمرے کی دیوار پر جس میں سیّد صاحب قیام فرماتے تھے، جامعہ اشرفیہ کے اس جلسے کا اشتہار لٹک رہا تھا، جس میں وہ تشریف لائے تھے۔ مولانا حنیف ندوی کی اس پر نظر پڑی تو دیکھا کہ ہر عالم کے نام کے ساتھ ''حضرت'' کا لفظ مرقوم ہے، لیکن سیّد صاحب کو ''مؤرخ اسلام سیّد سلیمان ندوی'' لکھا گیا ہے۔ مولانا نے کہا: ''یہ اشتہار دیکھیے۔ اس حلقے میں آپ ''مؤرخ اسلام'' ہی رہیں گے۔ آپ کی ''حضرت'' بننے کی خواہش یہاں کبھی پوری نہیں ہو گی۔ ''حضرت'' وہی ہوں گے جو پہلے سے اس حلقے سے وابستہ ہیں۔ یہ اعزاز آپ کو نہیں ملے گا۔''

مولانا حنیف ندوی نے جس زمانے (۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۰ء تک) دار العلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) میں تعلیم حاصل کی، اس زمانے میں ندوہ کے سب لوگ آپس میں بے تکلفی سے پیش آتے تھے۔ مولانا کبھی سیّد صاحب کے حلقۂ شاگردی میں شامل نہیں رہے۔ سیّد صاحب اس وقت ندوہ کے معتمد تعلیمات تھے اور دار المصنفین (اعظم گڑھ) میں تصنیفی خدمات سر انجام دیتے تھے۔ البتہ بہ حیثیت عہدہ ندوہ میں ان کی آمد و رفت رہتی تھی۔ جامعہ اشرفیہ میں ان دونوں میں جو گفتگو ہوئی، اس میں بے تکلفی کا عنصر نمایاں تھا۔ قیامِ پاکستان کے کچھ عرصہ بعد سیّد صاحب پاکستان آ گئے تھے اور کراچی میں سکونت اختیار کر لی تھی، وہیں ۲۲۔ نومبر ۱۹۵۳ء کو وفات پائی۔

✪ گرمیوں کے دن تھے۔ کوئی دس بجے کا وقت ہو گا، میں اپنے دفتر ادارہ ثقافت اسلامیہ میں بیٹھا تھا کہ ایک کشیدہ قامت عمر رسیدہ آدمی تشریف لائے۔ سرخی مائل گورا رنگ، ململ کا کرتہ اور سفید لٹھے کی شلوار پہنے ہوئے۔ لمبے قد کا ایک نوجوان ان کے ساتھ تھا جو سگریٹ پی رہا تھا اور اس عمر رسیدہ شخص کا چہرہ اس کے سگریٹ کے دھوئیں کی زد میں تھا۔ اس بزرگ نے کہا کہ میرا نام (جسٹس) منیر ہے اور میں فلاں کتاب خریدنا چاہتا ہوں جو ادارہ ثقافت اسلامیہ نے شائع کی ہے۔ دفتر کے متعلقہ آدمی نے انھیں وہ کتاب پیش کی اور جسٹس صاحب نے یہ کتاب خریدی، جس کی رسید دفتر کے کلرک نے ان کو دی۔ ان کے ڈرائیور کے بدبودار سگریٹ کے بدبودار دھوئیں کی لہریں ان کے منہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

پر پڑ رہی تھیں۔ میں نے موقع پا کر علیحدگی میں اس سے کہا: تم اپنے باس کے سامنے جو سپریم کورٹ کے چیف جسٹس رہے ہیں، سگریٹ کیوں پیتے ہو؟ ان کی موجودگی میں تو کسی زمانے میں چڑیا پر نہیں مارتی تھی۔ اس نے کہا: وہ زمانہ گیا، جس زمانے کی آپ بات کرتے ہیں!

یہ وہی جسٹس منیر تھے، جنھوں نے ۱۹۵۴ء میں پاکستان کی مرکزی اسمبلی کے اسپیکر مولوی تمیز الدین کے خلاف فیصلہ دیا تھا اور پاکستان کے گورنر جنرل ملک غلام محمد کے موقف کی حمایت کی تھی، جنھوں نے ۲۴۔ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو مرکزی اسمبلی توڑ دی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ پاکستان کی عدالتیں حکمرانوں کی حمایت پر کمر بستہ ہوئیں۔

✪ ایک مرتبہ ادارہ ثقافت اسلامیہ میں ۳۰۔ جنوری کو خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کی برسی کی تقریب تھی۔ اس تقریب میں سپریم کورٹ کے (سابق چیف جسٹس) شیخ انوار الحق بھی شریک تھے۔ مرحوم ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی پر کئی سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ مہمانوں کے لیے چائے کا انتظام دوسری منزل میں میرے کمرے میں کیا گیا تھا۔ چائے نوشی کے دوران ایک شخص نے جسٹس صاحب سے پوچھا: بھٹو صاحب کی سزائے موت کے متعلق اب آپ کا کیا خیال ہے؟

جسٹس صاحب خاموش رہے۔ پھر تھوڑا سا قریب ہو کر اس نے کہا: شاید آپ نے میری گزارش نہیں سنی۔ اس کے بعد اس نے پھر وہی سوال کیا۔ جسٹس صاحب نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن سوال سننے والے بعض لوگوں نے محسوس کیا کہ جسٹس صاحب کے چہرے پر پریشانی کے آثار اُبھر آئے ہیں۔

✪ ہمارے ایک بزرگ قاضی عبدالعلی تھے۔ میں نے ان کا دور جوانی بھی دیکھا۔ عہد پیری بھی دیکھا۔ انھوں نے ۱۹۱۵ء میں پٹیالہ کے مہندرا کالج میں بی اے پاس کیا تھا۔ میرا خیال ہے وہ ریاست فرید کوٹ کے پہلے یا دوسرے مسلمان ہوں گے جنھوں نے آج سے کم وبیش ۹۵ سال پہلے بی اے تک تعلیم حاصل کی۔ صاف گو آدمی تھے۔ حصولِ تعلیم

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کے بعد انھیں فرید کوٹ میں سرکاری ملازمت ملی تو وہیں گجروں کے محلے میں ایک پرانے سے مکان میں رہنے لگے۔ اکیلے ہی تھے۔ پڑوسیوں نے ان سے کہا کہ اس مکان میں چڑیلوں کا بسیرا ہے۔ طویل عرصے سے یہ مکان خالی پڑا ہے۔ جو لوگ اس میں رہائش کے لیے آتے ہیں، ان کے کانوں میں مختلف قسم کی ڈراؤنی آوازیں پڑنا شروع ہو جاتی ہیں، دروازے کھٹ کھٹ کرنے لگتے ہیں، دیواریں ہلنے لگتی ہیں اور وہ مارے ڈر کے بھاگ جاتے ہیں۔۔ قاضی عبدالعلی جی دار آدمی تھے۔ انھوں نے کہا میں اسی مکان میں رہوں گا اور دیکھوں گا کہ چڑیلیں بھاگتی ہیں یا میں بھاگتا ہوں۔ چنانچہ پہلی رات آئی تو وہی کچھ ہونے لگا جس کی انھیں اطلاع دی گئی تھی۔ وہ چارپائی سے اُٹھے۔ آگ جلائی، حقے کی چلم بھری اور مکان میں چل پھر کر حقہ پینے لگے اور ساتھ ہی یہ حرکت کرنے والوں کو بہ آوازِ بلند گالیاں دینا شروع کر دیں۔ تین چار روز دونوں میں مقابلہ جاری رہا اور قاضی صاحب جیت گئے۔ پڑوسی حیران کہ یہ شخص تو چڑیلوں سے بھی بازی لے گیا۔

کسی وجہ سے قاضی عبدالعلی نے فرید کوٹ کی سرکاری ملازمت چھوڑ دی تھی۔ کچھ عرصہ وہ فاضلکا بنگلہ بھی رہے۔ وہاں ایک سکول میں پڑھاتے تھے، لیکن مطمئن نہیں تھے۔ روپڑ شہر اس وقت ضلع انبالہ کی ایک تحصیل تھا، (اب ضلع ہے) وہاں کے ایک ہائی سکول میں بھی وہ کئی سال معلم رہے۔ کسی زمانے میں ڈیرہ اسماعیل خاں کے ایک ہائی سکول میں جو خان عبدالغفار خاں نے جاری کیا تھا، وہ ٹیچر مقرر ہو گئے تھے۔ عبدالغفار خاں کی ان سیاسی اور اصلاحی سرگرمیوں کے جو انھوں نے صوبہ سرحد میں انجام دی تھیں، وہ بہت مداح تھے۔ انھوں نے اس موضوع پر فارسی میں ایک نظم بھی لکھی تھی۔ میں نے یہ نظم ان کے گھر (کوٹ کپورہ) میں شیشے کے فریم میں دیکھی تھی۔ ڈیرہ اسماعیل خاں سے واپس آکر انھوں نے فیروز پور چھاؤنی کے ایک ہائی سکول میں معلّمی شروع کر دی تھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد یہ سکول راولپنڈی منتقل ہو گیا تھا اور قاضی صاحب وہیں چلے گئے تھے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

مجھ سے ان کا رویہ ہمیشہ مشفقانہ رہا۔ حاجی محمد علی (جن کا گزشتہ صفحات میں ذکر ہوا)، قاضی عبدالعلی کے چھوٹے بھائی تھے۔ قاضی عبدالعلی کو بہت سے وظائف یاد تھے۔ ان کے فوائد بھی وہ بتایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے بتایا کہ اوّل آخر درُود شریف پڑھ کر ان گنت مرتبہ روزانہ یا حافظ یا حفیظ یا ناصر یا نصیر یا وکیل یا رقیب یا اللّٰہ پڑھا جائے تو اللہ تعالیٰ رزق کے خزانے اس کے لیے کھول دیتا ہے اور کسی کی احتیاج باقی نہیں رہتی۔

وہ سکول سے ریٹائرمنٹ کے بعد راولپنڈی سے جڑاں والا آگئے تھے۔ وہیں ۲۶۔ اگست ۱۹۷۶ء کو ان کا انتقال ہوا۔

ان کی وفات تک میری جو کتابیں چھپیں، ان کے مطالعہ میں آئیں۔ راولپنڈی کے زمانۂ قیام میں ہفت روزہ ''الاعتصام'' بھی وہ منگواتے تھے۔ اس اخبار کی ادارت اس وقت میرے سپرد تھی۔

فیروز پور کے زمانۂ قیام میں قاضی عبدالعلی بھٹیاں والی بستی میں رہتے تھے۔ یہ ۱۹۳۸ء کی بات ہے۔ میں ان دنوں وہاں مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے حلقۂ درس میں شامل تھا اور کبھی کبھی قاضی صاحب کی خدمت میں چلا جاتا تھا۔ انھوں نے مجھے کئی دفعہ کہا کہ تم میرے پاس آجاؤ، میں تمھیں پڑھایا کروں گا۔ لیکن میں ان کے فرمان پر عمل نہ کر سکا۔

✪ مولانا ظفر علی خاں برصغیر کی سیاست وصحافت، تحریر و خطابت اور شعر و ادب کی عظیم شخصیت تھے۔ میں نے ان کو سب سے پہلے ۱۹۳۶ء میں دیکھا اور لاہور میں مسجد شہید گنج کے سلسلے کے ایک جلسے میں ان کی تقریر سنی۔ میری عمر اس وقت گیارہ بارہ برس کی تھی۔ اس کے بعد ۱۹۳۸ء میں فیروز پور چھاؤنی کے ایک اجتماع میں ان کے خطاب کی سماعت کا شرف حاصل ہوا۔ اس سے دس سال بعد ۱۹۴۸ء میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کے آفس سیکرٹری کے طور پر میں لاہور آیا۔ اب تو دنیا بدل گئی ہے۔ اس زمانے میں معاملات کچھ اس قسم کے تھے کہ جس شخص کو فلمیں دیکھنے کا شوق ہوتا، وہ لاہور کے سینما گھروں کے چکر لگاتا اور فلمیں دیکھتا۔ جس کے دل میں مختلف مقامات کے سیر کی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

تمنا کروٹ لیتی وہ چڑیا گھر، عجائب گھر، شالیمار باغ، مقبرہ جہاں گیر اور انارکلی وغیرہ کا رُخ کرتا۔ جو ادبی محفلوں میں شامل ہونے کا خواہاں ہوتا، وہ ادبی قسم کے مجمعوں کا متلاشی رہتا۔ میرا پسندیدہ موضوع ادبی اور علمی مجلسوں کی حاضری تھا۔ ایک دن اخبار میں پڑھا کہ آج چار بجے دیال سنگھ لائبریری میں مولانا ظفر علی خاں کی زیر صدارت مجلس مشاعرہ منعقد ہوگی جس میں فلاں فلاں شعرا اپنا کلام پیش کریں گے۔ اس سے قبل میں نے کبھی مشاعرہ نہیں سنا تھا۔

چار بجے سے چند منٹ پہلے میں لائبریری ہال پہنچا۔ خاصی تعداد میں سامعین بیٹھے تھے۔ شعراء بھی آگئے تھے۔ میں اس مجلس میں نو وارد تھا۔ نہ کوئی مجھے جانتا تھا، نہ میں کسی کو جانتا تھا۔ شعراء کی جماعت میں ملک نصر اللہ خاں عزیز بھی شامل تھے، جنھیں میں پہچانتا تھا اور ان کی تحریروں سے متاثر تھا لیکن صدر مشاعرہ مولانا ظفر علی خاں ابھی تشریف نہیں لائے تھے۔ کافی دیر ان کا انتظار کیا گیا۔ بالآخر منتظمین کے فیصلے کے مطابق ملک نصر اللہ خاں عزیز کو کرسیٔ صدارت پر بٹھا دیا گیا۔ وہ ابھی کرسی پر بیٹھے ہی تھے کہ مولانا ظفر علی خاں آگئے۔ انھیں دیکھ کر حاضرین ان کے احترام میں کھڑے ہو گئے اور ملک صاحب نے کرسیٔ صدارت خالی کر دی۔ لیکن مولانا اس پر نہیں بیٹھے۔ دوسری کرسی پر بیٹھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو صدارت کی کرسی پر بیٹھنے کے لیے اصرار کیا۔ لیکن دونوں میں سے کوئی صاحب بھی نہیں بیٹھے اور کرسی خالی پڑی رہی۔ حاضرین نے مولانا کو اپنا کلام سنانے کے لیے عرض کیا تو انھوں نے فرمایا کافی مدت سے میں نے کچھ نہیں لکھا۔ البتہ آپ کو اپنی ایک پرانی نظم سناتا ہوں۔ وہ نظم کئی شعروں پر مشتمل تھی۔ اس کے چند اشعار میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

آدم کی نسل پر ہوئی حجت خدا کی ختم
دنیا میں آج دین کی تکمیل ہو گئی
اپنا جواب آپ تھی جو آخری دلیل
افلاک پر حوالۂ جبریل ہو گئی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

بطحا میں رحمت دو جہاں کا ہوا ظہور
منشاءِ کردگار کی تعمیل ہو گئی
آ کر محمدؐ عربی نے لگائی مہر
اللہ کے قبالہ کی تسجیل ہو گئی

آخری سے پہلا شعر ہے:

مرزائیوں کا نام ذرا دیر سے مٹا
حق کے جلال سے یہی اک ڈھیل ہو گئی

یہ پوری نظم مولانا کے مجموعہ کلام ''نگارستان'' میں ''حجت حق کا اتمام'' کے عنوان سے مندرج ہے۔

مرزائیت کے بارے میں مولانا ظفر علی خاں نے بہ صورت نظم و نثر بہت کچھ لکھا۔ ''ارمغان قادیان'' ان کا ایک مستقل مجموعہ کلام ہے، جس میں نثر کا بھی اچھا خاصا حصہ ہے۔ اس مجموعے میں ایک نظم کا عنوان ہے ''اطالوی حسینہ''۔ یہ نظم مولانا نے ۸۔ مارچ ۱۹۳۱ء کو لکھی۔ اس زمانے کے لاہور میں ایک ہوٹل کا نام سیسل ہوٹل تھا، جس کی منتظمہ اٹلی کی ایک خاتون تھی، اس ہوٹل میں ایک روز مرزا غلام احمد قادیانی کے بیٹے اور خلیفہ مرزا بشیر الدین محمود مقیم ہوئے۔ اس کے بعد وہ اطالوی خاتون اچانک غائب ہو گئی اور شہر میں شور مچ گیا۔ دوسرے دن اسے قادیان میں دیکھا گیا۔ اس پر مولانا نے ایک نظم لکھی جو ان کے اخبار ''زمیندار'' میں چھپی۔ پھر لوگوں کی زبانوں پر چڑھ گئی۔ نظم آٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔ جی تو یہاں پوری نظم درج کرنے کو چاہتا ہے لیکن اس کے دو تین شعر ہی درج کیے جاتے ہیں:

اے کشور اطالیہ کے باغ کی بہار — لاہور کا دمن ہے ترے فیض سے چمن
پیغمبر جمال تیری دل رُبا ادا — پروردگارِ عشق ترا چلبلا چلن

آخری شعر ہے:

میں بھی ہوں تیری چشم پُرفسوں کا معترف — جادو وہی ہے آج جو ہو قادیاں شکن

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ارمغانِ قادیان ہی میں ایک نظم کا عنوان ہے ''ساتگین مل کا عقد''۔ اس طویل نظم کے چند شعر پڑھیے۔ یہ نظم مولانا نے ۲۱۔ فروری ۱۹۳۴ء کو کہی:

اگرچہ لغزشیں مری پند کی مستحق نہیں
نہیں ہوں نا اُمید مَیں خدا کے لطف عام سے

سنا ہے برق بن کے پھر گرے گی فَرَقِ کفر پر
وہ تیغ جو کبھی خجل ہوئی نہ تھی نیام سے

جہانِ اجتہاد میں سلف کی راہ گم ہوئی
ہے تجھ کو اس کی جستجو تو پوچھ ابوالکلام سے

وہ بھاگتے ہیں اس طرح مباہلہ کے نام سے
فرار جس طرح کفر ہو مسجد الحرام سے

پکار کر یہ کہہ رہا ہے زلزلہ بہار کا
نہ بچ سکے گا قادیان خدا کے انتقام سے

مسیلمہ کے جانشیں گرہ کٹوں سے کم نہیں
کتر کے جیب لے گئے پیمبری کے نام سے

مولانا نے ''اسرارِ دربارِ قادیاں'' کے عنوان سے ۱۵۔ جولائی ۱۹۳۱ء کو ایک نظم مدراس میں لکھی۔ اس کے دو شعر بحوالہ ''ارمغان قادیان'' درج ہیں:

خدا شرمائے اس ظالم ثناء اللہ کو جس نے
نہ چھوڑا قبر میں بھی قادیانیت کے بانی کو

خدا نے عقد خود باندھا جس کا اپنے باوا [1] سے
اڑا کر لے گئے غیر، اس عروسِ آسمانی [2] کو

---

[1] مرزا غلام احمد کے الہام ''انامنك و انت منی بمنزلة اولادی'' کی طرف اشارہ ہے۔

[2] محمدی بیگم مراد ہے، جس کے متعلق مرزا صاحب نے کہا تھا کہ اس سے میری شادی آسمانوں میں ہوئی ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

''ارمغانِ قادیان'' پر مولانا چراغ حسن حسرت نے طویل مقدمہ لکھا، جو چھبیس صفحات پر مشتمل ہے۔ بے شک یہ عالمانہ اور محققانہ مقدمہ ہے۔ نہایت عمدہ الفاظ، بہترین انداز، اس کے مطالعہ سے بہت سی معلومات سے آگاہی ہوتی ہے۔ انھوں نے مولانا ظفر علی خاں کا دفاع اور مرزا صاحب کے دعاوی کا ابطال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ان (مولانا ظفر علی خاں) کے کلام پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ وہ میرزا بشیر الدین محمود کی زندگی کے بعض خاص مشاغل کا ذکر نہایت بے باکی سے کرتے ہیں۔ اس مجموعے کی بعض دلآویز نظمیں مثلاً ''اطالوی حسینہ'' وغیرہ اسی قسم کے واقعات کے متعلق ہیں۔ میرے خیال میں میرزا صاحب جیسے صاحب ادّعا لوگوں کے معاملے میں یہ طریقہ اختیار کرنا ہرگز معیوب نہیں۔ وہ مدعی الہام ہیں۔ اپنے آپ کو دنیا کا مقدس ترین انسان اور اپنی جماعت کو مقدس ترین گروہ سمجھتے ہیں۔ ان کے دعاوی کی صداقت کو جانچنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ ان کے اعمال کو اخلاق کے مسلمہ معیار پر پرکھا جائے۔ اگر وہ اور ان کے رفقا، جنھیں مسیح موعود کے صحبت یافتہ ہونے کا دعویٰ ہے، بہ اعتبار مکارم اخلاق عام لوگوں سے بہتر نہیں تو یہ نتیجہ نکال لینا نہایت سہل ہے کہ میرزا غلام احمد اپنے دعوؤں میں سچے نہیں تھے۔''

بہرحال عرض یہ کرنا مقصود ہے کہ اس فقیر نے مولانا ظفر علی خاں کو بھی دیکھا، ان کی تقریریں سنیں اور ایک مشاعرے میں ان کا کلام خود ان کی زبان سے سنا۔ پھر ایک مرتبہ غالباً ۱۹۵۲ء میں انھیں گوجراں والا میں اس حال میں بھی دیکھا کہ ریلوے اسٹیشن کے قریب سے میں اور مولانا محمد حنیف ندوی گزر رہے تھے، بہت سے لوگ ایک کار کے اردگرد کھڑے تھے۔ پتا چلا کہ اس کار میں مولانا ظفر علی خاں بیٹھے ہیں۔ ہم بھی آگے بڑھے۔ مولانا فرنٹ سیٹ پر بیٹھے تھے۔ اور ان کے منہ سے رال ٹپک رہی تھی۔ ان کے ساتھ ان کے فرزند گرامی مولانا اختر علی بیٹھے تھے۔ وہ رومال سے بار بار ان کا منہ صاف کرتے تھے۔ مولانا محمد حنیف ندوی نے ان سے مصافحہ کرتے ہوئے دو دفعہ اپنا نام بتایا۔ محمد حنیف ندوی۔ محمد حنیف ندوی۔ پھر

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

یہی الفاظ مولانا اختر علی خاں نے کہے۔ انھوں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے آہستہ سے کہا: ''اچھا محمد حنیف ندوی! شکریہ۔''

مولانا ظفر علی خاں نے ۲۷۔ نومبر ۱۹۵۶ء کو وفات پائی۔ میں نے ۷۔ دسمبر ۱۹۵۶ء کے ''الاعتصام'' میں ان پر تعزیتی اداریہ لکھا اور اسی اشاعت میں ''مولانا ظفر علی خاں'' کے عنوان سے ان کے متعلق مولانا محمد حنیف ندوی کا مضمون شائع ہوا۔ اس زمانے میں مولانا ظفر علی خاں کے برادرِ صغیر مولانا حامد علی خاں کا ایک ماہانہ رسالہ ''الحمرا'' شائع ہوتا تھا۔ انھوں نے میرا اداریہ اور مولانا محمد حنیف ندوی کا مضمون (دونوں) ''الحمرا'' میں اپنے ادارتی نوٹ کے ساتھ شائع کیے جس کا مفہوم یہ تھا کہ اس کے بعد مولانا ظفر علی خاں کے بارے میں میرے لیے مزید کچھ لکھنے کی گنجائش نہیں رہی۔ انھوں نے مجھے شکریے کا خط بھی لکھا۔ یہ ان کی مہربانی تھی۔

مولانا ظفر علی خاں پر ان شاء اللہ شخصیات کے کسی مجموعے میں مستقل مضمون لکھا جائے گا۔

- متحدہ ہندوستان کی ایک بڑی شخصیت مولانا غلام رسول مہر کی تھی۔ وہ مختلف میدان ہائے علم میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔ تصنیف و تالیف، ادب و صحافت، تحقیق و ترجمہ، شعر و انشا، جغرافیہ و تاریخ ہر موضوع پر ان کی حکمرانی تھی۔ تقسیم ملک سے قبل میں نے ان کی سب سے پہلی تصنیف ''سیرت ابن تیمیہ'' دیکھی تھی۔ ان کا پہلا مکتوب (پوسٹ کارڈ) میں نے گوجراں والا میں مولانا محمد حنیف ندوی کے نام دیکھا۔ یہ ۱۹۵۰ء کی بات ہے۔ مولانا محمد حنیف ندوی ہفت روزہ ''الاعتصام'' کے ایڈیٹر تھے اور میں ان کا خادم تھا۔ مہر صاحب کا پوسٹ کارڈ امام ابن تیمیہ کی کسی کتاب کے بارے میں آیا تھا جو مولانا ندوی نے ان سے بغرض مطالعہ لی تھی اور مہر صاحب نے اس کتاب کی واپسی کے لیے تحریر فرمایا تھا۔

اس کے بعد ان کی زیارت کا موقع اس طرح ملا کہ ۹۔ نومبر ۱۹۵۳ء کو سلطان عبدالعزیز (ابن سعود) کا انتقال ہوا تو ''الاعتصام'' میں میری چند سطور چھپیں اور مولانا اسماعیل غزنوی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

مرحوم کا تعزیتی مضمون شائع ہوا۔ اس سے چار پانچ روز بعد مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی نے مجھے فرمایا کہ ان کی مہر صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ انھوں نے کہا ہے کہ میں (اسحاق) ہفتے کے روز گیارہ بجے کے قریب لوہاری دروازے کے اندر شیخ مبارک علی کی دکان پر ان کی خدمت میں حاضری دوں، وہ مجھے سلطان ابن سعود کے متعلق مضمون عنایت فرمائیں گے۔ میں وقت مقررہ پر وہاں پہنچا تو پانچ چھ آدمی بیٹھے تھے۔ میں ان میں سے صرف علامہ حسین میر کاشمیری کو جانتا تھا۔ انھوں نے مجھے دیکھتے ہی اپنے خاص لہجے میں فرمایا: ''آ گیا اخبار الاعتصام اور آ گئی جماعت اہل حدیث''...... سامنے کی کرسی پر ایک صاحب بیٹھے تھے۔ سر پر قراقلی ٹوپی۔ داڑھی مونچھ صاف۔ آنکھوں پر نظر کی عینک۔ سرخی مائل رنگ، انھیں بیٹھے ہوئے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ قد خاصا لمبا ہے۔ میں نے آگے بڑھ کر ان سے مصافحہ کیا۔ وہ سمجھ گئے کہ میں کون ہوں اور کس کام سے آیا ہوں۔

خالص جالندھر کی پنجابی زبان میں فرمایا کہ میں نے مولانا داؤد غزنوی سے عرض کیا تھا کہ الاعتصام کے ایڈیٹر صاحب آئیں۔ ان سے ملاقات بھی ہو جائے گی اور میں انھیں مضمون بھی دے دوں گا۔ آپ نے مہربانی کی کہ آ گئے۔ میں ہفتے کے روز یہاں حاضری دیتا ہوں۔ مضمون کی پروف ریڈنگ اچھی طرح ہونی چاہیے۔

فل سکیپ کاغذ کو لمبائی میں کاٹ کر اس کے دو حصے کر کے مضمون لکھا گیا تھا۔ عنوان تھا: ''جلالۃ الملک عبدالعزیز مرحوم و مغفور''...... بہت معلوماتی مضمون تھا، جو ۱۱۔ دسمبر ۱۹۵۳ء کے ''الاعتصام'' میں چھپا۔

یہ ان سے پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد بے شمار مرتبہ بے شمار ملاقاتیں ہوئیں۔ انھوں نے خود ہی مسلم ٹاؤن میں اپنے مکان پر حاضر ہونے کی دعوت دی۔ شیخ مبارک علی کی دکان پر بھی ہفتے کے روز میرا حاضری کا سلسلہ جاری رہا۔ پبلشرز یونائیٹڈ (انارکلی) میں بھی بہت مرتبہ ان کی خدمت میں گیا، اور مکان پر تو اکثر آمد و رفت رہی...... خط و کتابت بھی ہوئی۔ میرے پاس ان کے تیرہ چودہ خطوط ہوں گے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

میں شعری نزاکتوں سے آگاہ نہیں۔ ایک مرتبہ ایک بہت بڑے عالم دین کی وفات پر میں نے تعزیتی اداریہ لکھا اور اس کے آغاز میں شعر اس طرح لکھا:

بادہ کش تھے جو پرانے وہ اُٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آب بقائے دوام لے ساقی

مہر صاحب نے اخبار پڑھتے ہی خط ارسال فرمایا کہ تم نے شعر غلط لکھا ہے۔ شعر اس طرح ہے:

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اُٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آب بقائے دوام لے ساقی

میں نے اخبار کی اگلی اشاعت میں ان کا یہ خط شائع کر دیا۔

چوتھی صدی ہجری کے محمد بن اسحاق ابن ندیم وراق کی کتاب ''الفہرست'' میں بہت سے مقامات اور متعدد بلاد و امصار کے نام آتے ہیں۔ ظاہر ہے صدیوں پیشتر کے جغرافیے اب بالکل بدل چکے ہیں۔ میں نے اس کا اُردو ترجمہ شروع کیا تو مہر صاحب نے فرمایا مجھے قدیم دور کے شہروں اور علاقوں کے نام پہنچا دیا کرو، میں جدید جغرافیے کے مطابق لکھ دیا کروں گا کہ اب وہ مقامات کہاں کہاں واقع ہیں۔ لیکن افسوس ہے، میں ان کی اس پیش کش سے فائدہ نہ اُٹھا سکا۔

وہ میرے نہایت مہربان تھے۔ میں ان شاء اللہ ان سے متعلق تفصیلی مضمون لکھوں گا۔ انھوں نے ۱۶۔ نومبر ۱۹۷۱ء کو اچانک وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

✪ ۱۹۶۹ء کے جولائی سے لے کر اپریل ۱۹۷۰ء تک (نو دس مہینے) پروفیسر حمید احمد خاں کا تعلق بہ حیثیت ایڈیشنل ڈائریکٹر ادارہ ثقافت اسلامیہ سے رہا۔ اس سے قبل وہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ کے اکیڈمک ڈائریکٹر اس زمانے میں ڈاکٹر شیخ محمد اکرام تھے، جن کی زندگی کا بہت بڑا عرصہ انڈین سول سروس میں گزرا تھا۔ یعنی وہ پرانے بیورو کریٹ تھے۔ ادارے میں پروفیسر حمید احمد خاں کو شمس العلما

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

مولانا الطاف حسین حالی کے بعض مطبوعہ مضامین کی جمع و ترتیب کا کام دیا گیا تھا۔ حالی کے مضامین میں بعض اس قسم کی ''احادیث'' درج ہیں۔ مثلاً:

حب الوطن من الایمان

(وطن کی محبت ایمان کا حصہ ہے۔)

الکاسب حبیب اللہ

(ہاتھ سے کام کرنے والا اللہ کا محبوب ہے۔)

حب العرب من الایمان

(ملک عرب کی محبت جزو ایمان ہے۔)

میں اس وقت ادارہ ثقافت اسلامیہ میں ریسرچ فیلو کے طور پر خدمات انجام دیتا تھا۔ پروفیسر حمید احمد خاں اکثر میرے کمرے میں تشریف لاتے اور جو حدیث ان کے مطالعہ میں آتی اس کے متعلق دریافت کرتے کہ یہ حدیث کس کتاب میں ہے۔ کتاب وہ خود دیکھتے تو انھیں تسلی ہوتی۔ وہ ہنسنے یا مسکرانے کے عادی نہ تھے۔ ان کا چہرہ ہر وقت سنجیدگی کی مضبوط گرفت میں رہتا تھا۔ ایک دن انھوں نے حدیث "الکاسب حبیب اللہ" کے بارے میں پوچھا کہ کس کتاب میں ہے اور محدثین کے نزدیک اس کی کیا حیثیت ہے۔ ہمارے کاتب کا نام حبیب اللہ تھا اور اور اس وقت وہ میرے ایک مضمون کی کتابت کر رہا تھا۔ خود حمید احمد خاں کی کتاب کا کاتب بھی وہی تھا جو ''ارمغانِ حالی'' کے نام سے چھپی۔ میں نے ان سے کہا " الکاسب حبیب اللہ " کو چھوڑیے کہ یہ کیسی ''حدیث'' ہے البتہ "الکاتب حبیب اللہ " بالکل صحیح ہے۔ اس کے تمام راوی اور شاہد نہ صرف ادارہ ثقافت اسلامیہ میں بلکہ اور بھی مختلف مقامات میں موجود ہیں اور سب عادل، ضابط، ثقہ اور صادق ہیں۔

میری اس گزارش پر ان کے لبوں پر تھوڑی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ پروفیسر حمید احمد خاں مجھ پر بڑی شفقت فرماتے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں کے سب سے چھوٹے سوتیلے بھائی تھے اور خاص مزاج کے اہل علم تھے۔ میں نے ان پر طویل مضمون لکھا ہے جو ابھی شائع نہیں

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ہوا۔ انھوں نے ۲۲۔ مارچ ۱۹۷۴ء کو اچانک وفات پائی۔

✪ مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی برصغیر کے مشہور مصنف و محقق تھے۔ عربی اور اُردو میں ان کی بہت سی کتابیں شائع ہوئیں جو اہل علم کے مطالعہ میں آئیں۔ وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے مہتمم اور حضرت سیّد احمد شہید رائے بریلوی کے اخلاف میں سے تھے۔ ایک بڑے خاندان کے بڑے رکن۔

ان کے ایک بھانجے ڈاکٹر سیّد سلمان ندوی ہیں جو دارالعلوم ندوہ میں خدمت تدریس پر مامور ہیں۔ وہ کئی دفعہ پاکستان آئے۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ بھی تشریف لائے اور مجھے ملے۔ ڈاکٹر سلمان ندوی نے میری بعض کتابیں تو ندوہ میں پڑھی تھیں، لیکن ملاقات لاہور میں ہوئی۔ پہلی دفعہ وہ میرے مرحوم دوست حافظ عبدالرشید ارشد (مکتبہ رشیدیہ، لاہور) کے ساتھ ادارہ ثقافت اسلامیہ آئے تھے۔ میانہ قد، سرخی مائل گندمی رنگ، چوڑا چہرہ، کشادہ پیشانی، کرتہ پاجامہ اور شیروانی زیب تن۔ سر پر سفید کپڑے کی ٹوپی۔ نستعلیق اور خوش کلام جوان۔ اس طرح ملے جیسے مدتوں سے آشنائی ہو۔ گفتگو میں اپنائیت کا جذبہ غالب اور بے تکلفی کا عنصر نمایاں۔

میرے سامنے تو انھوں نے میرے بارے میں کوئی خاص بات کبھی نہیں کی، لیکن حافظ عبدالرشید ارشد (مرحوم) نے مجھے کئی مرتبہ بتایا کہ تمھارے متعلق ان کے خیالات بہت اچھے ہیں، اور تمھاری تصنیفی تگ و دو کا اچھے الفاظ میں تذکرہ کرتے ہیں۔ حافظ صاحب مرحوم نے تو اس سلسلے میں بہت کچھ بتایا تھا، لیکن میری ''کسر نفسی'' مجھے اس ''بہت کچھ'' کے اظہار کی اجازت نہیں دیتی۔ یہ چند الفاظ میں نے بہت دبے دبے قلم سے تحریر کیے ہیں:

ڈاکٹر سیّد سلمان ندوی کا مجھے لکھنؤ سے خط بھی آیا تھا، جس میں مجھے ندوہ میں حاضری کی دعوت دی گئی تھی، لیکن میں ان کے ارشاد پر عمل نہ کر سکا۔ وہ عربی کے آدمی ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ عربی میں سفرنامہ لکھ رہے ہیں۔ آپ کے متعلق اس میں میرے خیالات کا پتا چلے گا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ایک مرتبہ وہ تشریف لائے تو حافظ عبدالرشید ارشد نے مجھے رات کے کھانے پر بلایا اور فرمایا آج اونٹ کے گوشت کا پلاؤ پکایا گیا ہے۔ میں نے اونٹ کے گوشت کا پلاؤ پہلی دفعہ کھایا۔ عرض فقط یہ کرنا مقصود ہے کہ ندوۃ العلماء (لکھنؤ) کے ڈاکٹر سیّد سلمان ندوی سے بھی ہماری صاحب سلامت رہی اور ان سے متعدد مرتبہ ملاقات کے مواقع میسر آئے۔

ایک مرتبہ وہ لاہور آئے تو مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی قبر پر جانے کی خواہش ظاہر کی۔ میں انھیں مولانا کے مکان پر لے گیا، جہاں وہ اور ان کی بیگم مدفون ہیں۔ وہاں ہم نے دعائے مغفرت کی۔

گزشتہ سطور میں مولانا ظفر علی خاں کے ایک مشاعرے کا ذکر ہے جو میں نے لاہور میں سنا۔ اب ایک اور مشاعرے کے بارے میں سنیے!

✪ ۱۹۵۴ء کی بات ہے کہ لاہور میں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان کرکٹ میچ ہوا۔ وہ سردیوں کا موسم تھا۔ پاکستان کی طرف سے ہندوستان میں راجا غضنفر علی خاں ہائی کمشنر کے عہدے پر متمکن تھے۔ انھوں نے کرکٹ میچ دیکھنے کے لیے پاکستان آنے والوں کو نہایت کھلے دل سے ویزے دیے۔ سکھ خاص طور پر پاکستان آئے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ ان کی تعداد پچاس ہزار سے زائد تھی۔ لاہور میں جدھر دیکھو سکھ ہی سکھ نظر آتے تھے۔ وہ پہلی دفعہ پاکستان آئے تھے، جن میں اخبار نویس، ادیب اور شاعر اچھی خاصی تعداد میں تھے۔ راجا غضنفر علی خاں کا شمار مسلم لیگ کے پرانے رہنماؤں میں ہوتا تھا۔ انھوں نے اپنے دورِ ہائی کمشنری میں دونوں ملکوں کو ایک دوسرے کے قریب کرنے کے لیے بڑی جدو جہد کی اور اس میں بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ وہ تقسیم ملک سے قبل کی تمام سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۷/ اپریل ۱۹۶۳ء کو فوت ہوئے۔

۱۹۵۴ء میں کرکٹ میچ کے موقعے پر راجا صاحب خود بھی لاہور آئے تھے۔ ان کی کوشش

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

سے گول باغ میں (جسے صدر ایوب کے زمانے سے مصر کے صدر جمال عبدالناصر کے نام سے "ناصر باغ" کہا جاتا ہے) پنجابی مشاعرے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ بہت بڑا مجمع تھا۔ مشاعرے کی صدارت راجا غضنفر علی خاں نے کی تھی، جس میں بہت سے پاکستانی اور ہندوستانی شعرا نے اپنا کلام سنایا تھا اور بڑی داد پائی تھی۔

ایک شاعر نے جو نظم پڑھی، اس کا مطلب یہ تھا کہ متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں اور غیر مسلمانوں میں انگریزی حکومت نے اختلاف پیدا کیا تا کہ یہ آپس میں لڑتے جھگڑتے رہیں اور ہم اطمینان سے ان پر حکومت کرتے رہیں۔ چنانچہ انگریزوں کی انگیخت سے ملک میں مسلم غیر مسلم جھگڑے فساد ہونے لگے اور معاملہ دور تک پہنچ گیا۔ اس شاعر کی طویل نظم کے تین شعر مجھے یاد ہیں جو درج ذیل ہیں۔

جدوں وچ سمندر طوفان آوے
لہراں نال لہراں پیاں لڑ دیاں نے
جدوں آن جھکھڑ انھیر چڑھدے
پُھلاں نال سُولاں پیاں اڑ دیاں نے
بھانڈے گھراں دے تدوں ٹھہکدے نے
چونکے جدوں کچیاں چڑھدیاں نے

ان اشعار کا مطلب یہ ہے کہ جب سمندر میں طوفان آتا ہے تو اس کی لہریں آپس میں گھتم گتھا ہو جاتی ہیں اور خوب لڑتی ہیں۔

جب فضا میں جھکڑ پھیلتے اور آندھیاں آتی ہیں تو کانٹے ادھر اُدھر سے آکر پھولوں کے ساتھ اڑنے لگتے ہیں۔

اچھے بھلے گھروں میں اس وقت دنگے فساد تک نوبت پہنچ جاتی ہے، جب مختلف خاندانوں کی عورتیں بیاہ کر لائی جاتی ہیں اور صحن میں بیٹھ کر الگ الگ لہجے میں باتیں کرتی اور

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

بھائیوں کو بھائیوں سے لڑاتی ہیں۔

یہ مشاعرہ رات گئے تک جاری رہا اور میں نے اور مولانا محمد حنیف ندوی نے ایک ہی جگہ کھڑے ہو کر پورا مشاعرہ سنا۔ میرا بھائی سعید احمد اس وقت چھ سات سال کا تھا، وہ بھی ہمارے ساتھ رہا۔ اب سعید احمد ماشاءاللہ دو بیٹیوں اور دو بیٹوں کا باپ ہے۔ بڑی بیٹی نے ایم اے ایم ایڈ کیا ہے اور وہ ایک سرکاری کالج میں لیکچرار ہے۔ بیٹے یونیورسٹی میں تعلیم پا رہے ہیں۔ اللہ انھیں خیریت سے رکھے اور اعمالِ خیر کی نعمت عطا فرمائے۔ آمین

۲۷۔ دسمبر ۲۰۰۹ء لاہور

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

تئیسواں باب:

ہندوستانی حضرات کے دعوت نامے اور میری عدم تعمیل

ہندوستان سے مجھے مختلف اوقات میں متعدد حضرات کے کئی دعوت نامے آئے، لیکن میں نہیں جا سکا۔ دعوت بھیجنے والوں میں سکھ مذہب سے تعلق رکھنے والے ہمارے سیاسی رفقاء میں سے گیانی ذیل سنگھ کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ (ان کا تذکرہ گزشتہ صفحات کے بعض مقامات میں آ چکا ہے) گیانی ذیل سنگھ تین سال سے زیادہ عرصہ فرید کوٹ جیل میں قید رہے تھے۔ وہ ایک غریب خاندان کے غریب فرد تھے۔

آزادیٔ ملک کے بعد ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے پہلے وہ مشرقی پنجاب کی کانگرس کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے، پھر صوبے کے وزیر اعلیٰ بنائے گئے۔ بعد ازاں ہندوستان کے وزیر داخلہ بنے۔ وزارت داخلہ سے ترقی کر کے ہندوستان کے منصبِ صدارت تک پہنچے۔ وہ ایک غیر معروف اور پسماندہ گاؤں کے کچے گھر میں پیدا ہوئے۔ وہیں پلے بڑھے اور ملک کے قصر صدارت تک پہنچے۔ یعنی کچے گھر سے قصر صدارت تک۔

اب گیانی ذیل سنگھ کے بارے میں چند باتیں اور سنیے!

ایک مرتبہ مشرقی پنجاب کے شہر مالیر کوٹلہ سے ایک صاحب جن کا نام ماسٹر کفایت اللہ تھا، اپنے بعض عزیزوں سے ملنے کے لیے لاہور آئے، مجھے بھی ملے۔ میں اس وقت ادارہ ثقافت اسلامیہ میں ریسرچ فیلو کے طور پر خدمات سر انجام دیتا تھا۔ ماسٹر کفایت اللہ دلچسپ آدمی تھے، ان سے مل کر اور ان سے گفتگو کر کے مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ اس وقت مشرقی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

پنجاب کے وزیراعلیٰ گیانی ذیل سنگھ تھے اور ان سے کفایت اللہ صاحب کے اچھے مراسم تھے۔ انھوں نے بتایا کہ تقسیم ملک سے قبل کے فرید کوٹی دوستوں کا تذکرہ کرتے ہوئے گیانی جی آپ کا نام بھی لیا کرتے ہیں۔ میں نے اس پر ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اب کبھی گیانی جی سے آپ کی ملاقات ہو تو انھیں میرا سلام پہنچایے۔ ماسٹر کفایت اللہ سیاسی اعتبار سے گیانی ذیل سنگھ کے ہم خیال نہیں تھے، لیکن ذاتی میل جول کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

۱۹۷۶ میں گیانی ذیل سنگھ مشرقی پنجاب کے وزیراعلیٰ کی حیثیت سے لاہور آئے۔ وہ سرکاری مہمان تھے اور پرل کانٹی نینٹل ہوٹل میں انھیں ٹھہرایا گیا تھا۔ تین چار دن وہ یہاں رہے۔ میں نے ان سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔ ایک دن پنجاب پولیس کے ایک بڑے آفیسر کا (جو میرے بے تکلف دوست تھے اور مجھ سے انھوں نے قرآن مجید کا ترجمہ بھی پڑھا تھا) نو بجے کے قریب ٹیلی فون آیا۔ انھیں معلوم تھا کہ آزادیٔ برصغیر سے پہلے گیانی ذیل سنگھ سے میرے دوستانہ مراسم تھے اور فرید کوٹ میں ہم نے اکٹھے سیاسی جدوجہد کی تھی۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا آپ کے پرانے دوست گیانی ذیل سنگھ یہاں آئے ہیں، ان سے ملاقات ہوئی؟

میں نے جواب دیا: ''نہیں''

کہا: ''ان سے ملنا چاہتے ہو''؟

میں نے کہا: ''اگر کوئی صورت پیدا ہو جائے تو ضرور ملوں گا۔''

انھوں نے کہا: میں ڈی ایس پی کو بھیج رہا ہوں، وہ آپ کو ان سے ملا دیں گے۔

ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ پر ہے جو پرل کانٹی نینٹل ہوٹل سے بالکل متصل ہے۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد ڈی ایس پی صاحب میرے پاس آئے اور کہا کہ گیانی جی چند منٹ پہلے لاہور سے دہلی چلے گئے ہیں۔ مجھے افسوس ہے میں آپ کی ان سے ملاقات نہیں کرا سکا۔

۱۹۸۰ء کے انتخابات میں گیانی ذیل سنگھ نے کانگرس کے ٹکٹ پر ہندوستان کی پارلیمنٹ (لوک سبھا) کا انتخاب ہوشیار پور سے لڑا اور کامیاب ہوئے۔ اس طرح وہ پنجاب کی صوبائی سیاست کے دائرے سے نکل کر مرکز کی ملک گیر سیاست میں داخل ہوئے اور ہندوستان کے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

وزیر داخلہ بنائے گئے۔

۱۹۸۲ء میں لاہور سے مولانا عطاء اللہ حنیف اور میرے گوجراں والا کے دوست ضیاء اللہ کھوکھر دہلی گئے تو گیانی ذیل سنگھ سے بھی ملے۔ اس وقت وہ ہندوستان کے وزیر داخلہ تھے۔ دورانِ گفتگو میں انھوں نے میرے بارے میں پوچھا اور مجھے سلام پہنچایا۔

حکومت ہند کے اس زمانے میں ہمارے ایک دوست ڈاکٹر نثار احمد فاروقی دہلی یونیورسٹی میں شعبہ عربی کے چیئر مین تھے اور عربی مجلّے ''ثقافتہ الہند'' کے ایڈیٹر تھے۔ یہ مجلّہ کسی زمانے میں مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی وزارتِ تعلیمات کی طرف سے جاری کیا تھا اور اس کے ایڈیٹر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کو بنایا گیا تھا۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی وفات کے بعد اس کی ادارت ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کے سپرد ہوئی۔ یہ مجلّہ ابتدا ہی سے میرے نام آتا تھا۔ خالص علمی اور تحقیقی مجلّہ تھا۔ ڈاکٹر فاروقی کی لاہور آمدورفت رہتی تھی۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ نے ان کی ایک کتاب بھی شائع کی تھی۔ ایک مرتبہ وہ لاہور آئے تو انھوں نے مجھے بتایا کہ ان کی یونیورسٹی میں ایک دفعہ ہندوستان کے صدر گیانی ذیل سنگھ کو دعوت دی گئی تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ میں لاہور گیا تھا اور محمد اسحاق بھٹی سے ملا تھا۔ یہ سن کر گیانی جی بڑے خوش ہوئے، آپ کے متعلق پوچھا اور چند باتیں کیں اور کہا کہ آپ لاہور جائیں تو انھیں میرا اسلام پہنچائیں۔

اس سے کچھ عرصہ بعد گیانی جی پر میرا ایک مضمون روزنامہ ''جنگ'' (لاہور) کے سنڈے ایڈیشن میں چھپا۔ لیکن یہ مضمون بہت مختصر تھا۔ ان کے حالات میں چند اشاروں پر مشتمل۔!

اس سے چند ماہ بعد مارچ ۱۹۸۴ء میں دہلی میں غیر وابستہ ممالک کی کانفرنس ہوئی۔ اس موقعے پر میں نے روزنامہ ''مشرق'' (لاہور) میں گیانی ذیل سنگھ پر کچھ تفصیل سے مضمون لکھا۔ یہ مضمون ''مشرق'' کے سنڈے ایڈیشن کے دو شماروں میں چھپا۔ اس میں ان کے بعض پرانے مسلمان رفقا کی تصویریں بھی چھپیں جو ان کے ساتھ پرجا منڈل کی تحریک میں فرید کوٹ جیل میں قید رہے تھے۔ اس اخبار کے چیف ایڈیٹر ہمارے مرحوم دوست ضیاء الاسلام انصاری

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

تھے۔ بہت سال ہوئے یہ اخبار بند ہو گیا ہے۔ یہ نیشنل پریس ٹرسٹ کا خالص سرکاری اخبار تھا اور ضیاء الحق کی حکومت کا سخت حامی۔

غیر وابستہ ممالک کی کانفرنس کے زمانے میں پاکستان کے منصبِ صدارت پر ضیاء الحق فائز تھے۔ وہ اس کانفرنس میں شرکت کے لیے دہلی گئے تھے۔ جو اخبار نویس ان کے ساتھ دہلی گئے، ان میں ضیاء الاسلام انصاری بھی شامل تھے۔ میں نے ان کے ہاتھ گیانی ذیل سنگھ کو خط بھی بھیجا اور کھدر کا لباس بھی بھیجا جو شلوار، قمیص اور پگڑی پر مشتمل تھا۔ ضیاء الاسلام انصاری نے دہلی سے واپس آ کر مجھے بتایا کہ وہ پریذیڈنٹ ہاؤس یعنی راشٹر پتی بھون (Rashtrapati Bhavan) گیانی ذیل سنگھ کو میرا خط اور لباس پہنچانے کے لیے گئے تو پتا چلا کہ اس دن وہ دہلی سے باہر کہیں دورے پر گئے ہیں۔ ان سے ملاقات نہ ہو سکی، لیکن خط اور کپڑے ان کے سیکرٹری کو دے دیے۔

اس کے بعد میں نے گیانی جی پر زیادہ مفصل مضمون جناب مجیب الرحمٰن شامی کے ماہنامے ''قومی ڈائجسٹ'' میں لکھا۔ اس کے اسٹنٹ ایڈیٹر اس وقت تنویر قیصر شاہد تھے جو آج کل روزنامہ ''ایکسپریس'' (اسلام آباد) کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر ہیں اور ''تعاقب'' کے مستقل عنوان سے اس اخبار میں کالم لکھتے ہیں۔ یہی مجھ سے مضمون لینے کے لیے میرے دفتر ادارہ ثقافت اسلامیہ آئے تھے۔ ان کا شمار میرے مخلص دوستوں میں ہوتا ہے۔ ''قومی ڈائجسٹ'' والوں نے اس مضمون کی اشاعت سے پہلے اخبارات کے سٹالوں پر اشتہار چھپوا کر بھیجے تھے۔ انھوں نے اس کا عنوان رکھا ''میرا جانی ذیل سنگھ گیانی۔'' ایک طویل نوٹ کے ساتھ بڑے اہتمام سے یہ مضمون شائع کیا گیا۔

پھر مزید حک و اضافے کے ساتھ یہ مضمون میری کتاب ''نقوشِ عظمت رفتہ'' میں چھپا۔

میرے اس خط کا جواب جو میں نے گیانی جی کو ضیاء الاسلام انصاری (چیف ایڈیٹر روزنامہ ''مشرق'') کے ہاتھ بھیجا تھا، ۴۔ اپریل ۱۹۸۴ کو گیانی جی نے لکھوایا جو ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے!

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ڈاکٹر پرمانند پانچال
او۔ایس۔ڈی (لینگوئجز)

۴۔اپریل ۱۹۸۴ء

مکرمی جناب بھٹی صاحب۔آداب

صدر جمہوریہ ہند کے نام آپ کا بتاریخ ۱۲/ مارچ ۱۹۸۴ء کا خط موصول ہوا۔اس سے پیشتر بھی آپ کا خط انھیں مل گیا تھا۔آپ کے خطوط پانے سے صدر صاحب بہت خوش ہوئے۔بڑی پرانی یادیں پھر تازہ ہو کر فلم کی طرح گھومنے لگیں۔آپ نے صدر صاحب کو جو پوشاک بھیجی تھی وہ اُنھیں مل گئی جس کے لیے وہ آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔آپ کا خاندان کیسا ہے؟ خیر و عافیت بھیجیے۔اُن کی دلی خواہش ہے کہ جب کبھی آپ ہندوستان تشریف لائیں اُن سے ملاقات ضرور کریں۔

قاضی عبید اللہ صاحب، مولوی سلیمان صاحب، فرید کوٹ کے صوفی صاحب اور دوسرے ساتھیوں کی خیریت اور اُن کے پتے لکھیے۔ایک بار قاضی عبید اللہ صاحب کا خط آیا تھا۔اُن کے ویزے کا انتظام کروا دیا گیا تھا۔پھر اُن کے بعد سے اُن کی کوئی خبر نہیں آئی۔اُن کا پتہ کیا ہے؟ مہربانی کرکے لکھیے۔

صدر صاحب آپ سب کو اپنی نیک خواہشات بھیجتے ہیں۔

آپ کا

پرمانند پانچال

یہ خط جو دہلی کے پریذیڈنٹ سیکرٹریٹ سے ۴۔اپریل ۱۹۸۴ء کو بھیجا گیا، مجھے ۱۳۔اپریل ۱۹۸۴ کو ملا۔یعنی دہلی سے لاہور تک ہوائی جہاز کا سفر اس نے نو دن میں طے کیا۔

اس خط میں گیانی ذیل سنگھ نے خاص طور سے تین آدمیوں کے نام لیے ہیں، وہ ہیں قاضی عبید اللہ، مولوی سلیمان اور فرید کوٹ کے صوفی صاحب۔۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۲ء تک ساڑھے تین سال فرید کوٹ جیل میں قاضی عبید اللہ، مولوی محمد سلیمان اور گیانی ذیل سنگھ اکٹھے قید رہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

تھے۔ بعض اور دوست بھی تھے۔ مولوی سلیمان سے گیانی جی نے جیل میں قرآن پڑھا تھا (یہ معلوم نہیں کہ کتنا پڑھا تھا) مولوی صاحب موصوف ہمارے شہر کوٹ کپورہ کے رہنے والے تھے اور بڑے باحمیت اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ انھوں نے ۱۹۷۵ء میں راجہ جنگ (ضلع قصور) میں وفات پائی۔ قاضی عبیداللہ سے گیانی جی نے جیل میں اردو پڑھی۔ قاضی صاحب جنوری ۱۹۹۴ میں موضع چک نمبر ۳۶ گ ب (تحصیل جڑاں والا ضلع فیصل آباد) میں فوت ہوئے۔

فرید کوٹ کے صوفی صاحب کا نام گیانی جی کو یاد نہیں رہا۔ ان کا نام صوفی خوشی محمد تھا۔ یہ فرید کوٹ سے تعلق رکھتے تھے اور ریاست فرید کوٹ کے ایک قصبے ''گونیانہ منڈی'' میں تحصیل دار کے دفتر میں کلرک تھے۔ ملازمت چھوڑ کر پرجا منڈل میں شامل ہوئے تھے۔ فرید کوٹ جیل میں میری کوٹھڑی سے بائیں جانب تیسری کوٹھڑی ان کی تھی۔ یہ فرید کوٹ شہر کی پرجا منڈل کے جنرل سیکرٹری تھے۔ آزادی کے بعد منٹگمری (موجودہ ساہی وال) آگئے تھے۔ دو دفعہ مجھے ملنے کے لیے لاہور آئے۔ بے حد شریف اور نیک آدمی تھے۔ ساہی وال میں ان کا انتقال ہوا۔

ستمبر ۱۹۸۴ء میں گیانی ذیل سنگھ کے داماد ڈاکٹر لال سنگھ کا انتقال چنڈی گڑھ میں ہوا۔ میں نے یہ خبر اخبارات میں پڑھی تو گیانی جی کو تعزیت کا خط لکھا۔ انھوں نے پریذیڈنٹ سیکرٹریٹ (Rashtrapati Bhavan) سے اس خط کا جواب تحریر کیا۔ لیکن یہ خط ہندی زبان میں تھا، جس میں میرے تعزیتی خط پر میرا شکریہ ادا کیا گیا تھا۔

گیانی ذیل سنگھ نے ہندوستان کے لیے میرے ویزے کا انتظام بھی کر دیا تھا، جس کی اطلاع خط کے ذریعے مجھے ہندوستان کے سفارت خانے (اسلام آباد) سے مل گئی تھی، لیکن میں ویزا لینے نہیں گیا اور ہندوستان نہیں جاسکا۔

میرے بعض ہندوستانی دوست (بالخصوص مالیر کوٹلہ کے مرحوم کفایت اللہ صاحب) مجھے کہا کرتے تھے کہ تم ہندوستان نہیں جاسکو گے، جب ہندوستان کے سب سے بڑے حکمران (صدر) کی دعوت پر وہاں نہیں جاسکے جو تمھارا دوست بھی ہے تو اور کس کی دعوت پر جاؤ گے؟

عجیب بات یہ ہے کہ خود کفایت اللہ صاحب نے مجھے اپنے بیٹے کی شادی میں شرکت کا

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

دعوت نامہ بھیجا، لیکن میں نہیں جاسکا۔ دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ کے استاذ ڈاکٹر سیّد سلمان ندوی صاحب نے ندوے کی ایک تقریب میں شمولیت کے لیے لکھنؤ سے خط لکھا، لیکن میں نہیں گیا۔ دہلی کے دیوبندی مسلک کے ایک مشہور مصنف مولانا اخلاق حسین صاحب کے خطوط آئے۔ انھوں نے مجھے دہلی آنے کی دعوت دی۔ ہندوستان کے عربی، فارسی، اردو، انگریزی کے معروف محقق و مصنف اور ممتاز ادیب ڈاکٹر مالک رام نے کئی خطوط لکھے، جن میں مجھے دہلی کی بعض علمی تقریبات میں شرکت کے لیے تاکید کی گئی تھی، لیکن میں ان تقریبات میں شرکت نہ کرسکا۔ ایک مرتبہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر سیّد حامد شاہ نے یونیورسٹی کے ایک سیمینار میں حاضری کے لیے دعوت دی۔ اس تقریب میں مجھے ''برصغیر میں علم فقہ'' کے موضوع پر مقالہ پڑھنے کے لیے کہا گیا تھا، لیکن میں نہ جاسکا۔ دہلی یونیورسٹی کی ایک تقریب میں شمولیت کے لیے پروفیسر ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کا خط آیا، لیکن میں حاضر نہ ہوسکا۔ ایک دفعہ بھوپال کے ایک سیمینار میں شمولیت کی دعوت آئی، جو صوبہ ہریانہ کے گورنر مظفر حسین کی صدارت میں منعقد ہورہا تھا، میں یہ دعوت بھی قبول نہ کرسکا۔ یہ سیمینار نواب سیّد صدیق حسن خان کے بارے میں ہندوستان کی مرکزی جمعیت اہل حدیث کی طرف سے ہورہا تھا، لیکن میں حاضر نہ ہوسکا۔ اس طرح اور بھی ہندوستان کے متعدد افراد اور اداروں کی طرف سے دعوت نامے آئے لیکن مجھے وہاں جانے کا موقع نہ ملا۔

اب ایک اور تقریب کے متعلق سنیے، جس میں شرکت کے لیے میں واقعتہً تیار ہوگیا تھا۔ میرے ہندوستانی حلقۂ احباب کے ایک معزز رکن ڈاکٹر عبدالرحمٰن فریوائی ہیں جن کا اصل وطن تو ہندوستان کے صوبہ یوپی کے مشہور شہر الٰہ آباد کے قرب و جوار کا ایک قصبہ ہے، لیکن وہ طویل مدت سے سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض میں سکونت پذیر ہیں اور وہاں کی ایک یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ متعدد کتابوں کے مصنف اور مترجم ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ممدوح کے والد مکرم کا اسم گرامی مولانا عبدالجبار ہے۔ اپنے علاقے کی مشہور شخصیت۔ اس نواح میں انھوں نے بے حد دینی اور سماجی خدمات سرانجام دیں۔ ڈاکٹر صاحب ہر سال اگست کے مہینے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

میں کسی ایسی معروف شخصیت کو جنھوں نے تصنیف و تالیف سے متعلق خدمات سر انجام دی ہوں، اپنے والد کے نام سے عبدالجبار ایوارڈ دیتے ہیں۔ اس تقریب کا انعقاد الٰہ آباد شہر میں کیا جاتا ہے، جس میں ہندوستان کے بہت سے علما و زعما کو دعوتِ شرکت دی جاتی ہے۔

۲۰۰۷ء کے ماہ جولائی کی سولہ یا سترہ تاریخ تھی کہ مجھے عزیزی حماد شاکر نے ریاض سے ٹیلی فون کیا کہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن فریوائی اور ان کے ساتھیوں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس سال عبدالجبار ایوارڈ آپ کو دیا جائے۔ اس کے لیے ۱۴۔ اگست کی تاریخ مقرر کی گئی ہے اور یہ تقریب الٰہ آباد کے ایک بڑے ہال میں منعقد کی جائے گی اور ایوارڈ وصول کرنے کے لیے آپ کو وہاں بلایا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب کے کہنے پر میں نے آپ کو اطلاع دی ہے۔ وہ خود بھی آپ سے بات کریں گے۔ میں نے ان سے کہا کہ ۱۴۔ اگست کو ہندوستان تقسیم ہوا اور پاکستان معرضِ قیام میں آیا تھا، جس سے ہندوستان کے ہندوؤں کو سخت تکلیف پہنچی تھی، اس لیے ۱۴۔ اگست کو ہم پاکستانیوں کو ہندوستان کا ویزا نہیں ملے گا۔ چوتھے یا پانچویں روز خود ڈاکٹر عبدالرحمٰن فریوائی کا ٹیلی فون آ گیا۔ ان سے بھی میں نے یہی عرض کیا کہ ان تاریخوں کو ویزا نہیں ملے گا۔ انھوں نے مجھ سے اتفاق نہیں کیا اور فرمایا ویزا ضرور ملے گا۔

اس پر پانچ چھ روز گزرے تھے کہ ان کے دہلی آفس سے مجھے باقاعدہ ہندوستان پہنچنے کے لیے دعوت نامہ آیا۔ انھوں نے اس تقریب کے مہمانانِ خصوصی پاکستان کے تین آدمیوں کو بنایا تھا۔ وہ تھے حافظ احمد شاکر، ان کے بیٹے حماد شاکر اور فیصل آباد کے علی ارشد۔ ان تینوں کو بھی دہلی آفس سے دعوتی خطوط موصول ہو گئے تھے۔ اب ہم چاروں (میں، حافظ احمد شاکر، حماد شاکر اور علی ارشد) ۲۷۔ جولائی ۲۰۰۷ کو ویزے کی درخواست دینے کے لیے ہندوستان کے سفارت خانہ (اسلام آباد) پہنچے۔ ہماری درخواستیں رکھ لی گئیں اور کہا گیا کہ یکم اگست کو ایک آدمی آ جائے، اسے ان درخواستوں کی منظوری یا عدم منظوری کے بارے میں بتا دیا جائے گا۔ مجھے دو اگست کو اسلامی نظریاتی کونسل کے ایک اجتماع میں اسلام آباد جا کر مقالہ پڑھنا تھا۔ اس کے دفتر کی طرف سے ہوائی جہاز کا آمد و رفت کا ٹکٹ مجھے مل گیا تھا۔ لیکن ہندوستان

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کے ویزا آفس میں حماد شاکر گئے اور ہمیں ویزے نہیں دیے گئے۔

میں پہلا پاکستانی تھا، جسے عبدالجبار ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا تھا۔لیکن حکومت ہند نے مجھے وہاں جانے کی اجازت نہیں دی۔ تاہم یہ ایوارڈ میری غیر حاضری کے باوجود مجھے مل گیا تھا جو میری طرف سے مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کے جنرل سیکرٹری اور اخبار ''ترجمان'' دہلی کے ایڈیٹر مولانا اصغر علی امام مہدی نے وصول کیا۔ یہ خبر ہندوستان کے بعض اخبارات میں چھپی تھی جو میں نے پڑھی۔ اس ایوارڈ پر میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن فریوائی اور ایوارڈ دینے کا فیصلہ کرنے والی کمیٹی کے معزز ارکان کا شکر گزار ہوں، جنھوں نے میری حقیر سی تصنیفی خدمات کی بنا پر مجھے اس اعزاز کا مستحق گردانا۔

جی چاہتا ہے کہ ہندوستان جا کر اپنے قدیم وطن کے ان گلی محلوں کو دیکھوں جن کے چکر لگاتے ہوئے میرا بچپن گزرا اور جہاں میں جوانی کی منزل کو پہنچا۔ میرا وہاں کوئی رشتے دار نہیں ہے اور پوری ریاست فرید کوٹ میں کوئی میرا جاننے والا بھی نہیں ہے۔لیکن وہ دھرتی تو موجود ہے، جس پر چل پھر کر میری عمر کا ایک حصہ گزرا۔ اس دھرتی سے میری بہت سی یادیں وابستہ ہیں، خوش گوار بھی اور ناخوش گوار بھی۔ سیاسی بھی اور غیر سیاسی بھی۔ فرید کوٹ کی وہ جیل دیکھنے کو بھی جی چاہتا ہے جس میں آزادئ وطن کے لیے میں قید رہا۔لیکن بہ ظاہر وہاں جانے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

ہندوستان کی مرکزی جمعیت اہل حدیث کے (سابق جنرل سیکرٹری) مولانا عبدالوہاب خلجی میرے دیرینہ دوست ہیں جو دہلی رہتے ہیں اور ہندوستان کے حکومتی اور سماجی حلقوں میں بڑا اثر رکھتے ہیں، وہ پاکستان آئیں تو مجھے ضرور ملتے ہیں۔ چند ماہ پیشتر چار پانچ دوستوں کے لیے (جن میں مَیں بھی شامل تھا) انھوں نے ویزے کے لیے کوشش کی۔ اس میں وہ کامیاب ہوئے، لیکن نومبر ۲۰۰۸ء میں بمبئی کا حادثہ پیش آ گیا اور حالات نازک صورت اختیار کر گئے۔ ویزے کا معاملہ پھر وہیں کا وہیں رہا۔

۲ مارچ ۲۰۰۹ء — لاہور

❀❀❀❀

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

چوبیسواں باب:

جن کتب خانوں سے استفادہ کیا

گزشتہ صفحات میں بتایا جاچکا ہے کہ اخبار الاعتصام کی ادارت سے علیحدگی کے بعد میں نے تصنیف و تالیف کا باقاعدہ سلسلہ ادارہ ثقافت اسلامیہ سے شروع کیا اور اسی دور میں کتب حوالہ کی تلاش کے لیے مختلف کتب خانوں کے چکر لگانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ کا کتب خانہ کم و بیش چودہ ہزار کتابوں پر مشتمل تھا اور میری ضرورت کی بہت سی کتابیں اس میں موجود تھیں، لیکن جب تحریر کا دائرہ کچھ وسیع ہوا تو پتا چلا کہ قدیم دور کی بعض قلمی کتابوں سے بھی استفادے کی ضرورت ہے اور بہت سی ایسی کتابوں کا مطالعہ بھی ضروری ہے جو ادارے کی لائبریری میں نہیں ہیں۔ چنانچہ اس کے لیے میں نے پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا رخ کیا۔ وہاں میرے موضوع کی تمام (مطبوعہ وغیر مطبوعہ) کتابیں موجود تھیں۔

میں نے ”برصغیر میں علم فقہ“ پر کام کا آغاز کیا تو سب سے پہلے ”فتاویٰ غیاثیہ“ کی ضرورت پڑی جو قلمی کتاب ہے اور ہندوستان کے ساتویں صدی ہجری اور تیرھویں صدی عیسوی کے بادشاہ غیاث الدین بلبن کے عہد کے ایک اہل علم کی تصنیف ہے۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے چیف لائبریرین اس وقت ملک عبدالرحیم تھے جو اس حلقے میں ”رحیم صاحب“ کے مختصر عرف سے معروف تھے اور اورینٹل سیکشن کے انچارج قاضی عبدالنبی کوکب (مرحوم) تھے۔ میں فتاویٰ غیاثیہ پر مضمون لکھنے کی غرض سے لائبریری گیا اور قاضی عبدالنبی کوکب سے اپنا مقصد بیان کیا تو جواب ملا کہ لائبریری میں کتاب تو ہے لیکن یہ معلوم نہیں کہ کہاں ہے۔ غلطی سے اس کے اصل مقام سے کہیں دوسری جگہ رکھی گئی ہے، یعنی Misplace ہے۔ پہلے بھی تلاش کی گئی، لیکن ملی نہیں۔ مجھے ان کے اسلوبِ کلام سے اندازہ ہوا کہ وہ کتاب مجھے دینا

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

نہیں چاہتے۔ میں واپس دفتر چلا گیا۔

دوسرے دن پھر لائبریری گیا، لیکن کتاب کے حصول میں اب بھی ناکام رہا۔ تیسرے دن گیا تو قاضی عبدالنبی کوکب نے مجھ سے سوال کیا: آپ اسی کتاب پر کام کرنا چاہتے ہیں؟ میں نے جواب دیا: اپنے کام کا آغاز اسی کتاب سے کرنا چاہتا ہوں۔ اب انھوں نے اپنے دل کی بات کہی۔ فرمایا: آپ اہل حدیث ہیں، مَیں آپ کو حدیث کے سلسلے کی وہ قلمی کتابیں دیتا ہوں جو برصغیر کے اصحابِ علم نے لکھیں۔ ان پر کام کریں۔ فتاویٰ غیاثیہ فقہ حنفی کی کتاب ہے، میں حنفی ہوں اور اس پر کام کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے عرض کیا: حنفی اور اہل حدیث تو میں اور آپ ہیں۔ میں علمی اور تحقیقی کام کرنا چاہتا ہوں جو نہ حنفی ہے نہ اہل حدیث! علاوہ ازیں میرا کام آپ سے مختلف ہوگا۔ آپ دس بارہ سطروں میں کتاب کا صرف تعارف کرائیں گے۔ میں تعارف کے ساتھ اس کے مندرجات کی وضاحت کروں گا اور بتاؤں گا کہ آج سے صدیوں قبل کے برصغیر میں معاملات یعنی تجارت، کاروبار، خرید و فروخت، نکاح، طلاق، وکالت، خلع، حضانت، وراثت وغیرہ پر غوروفکر کا کیا طریقہ تھا۔ قاضی صاحب خاموش ہوگئے، لیکن کتاب مجھے نہیں ملی۔

بالآخر انھوں نے فرمایا کہ ''فتاویٰ غیاثیہ'' تو کہیں سے مل نہیں رہا، البتہ اس کی فلم موجود ہے، اس کی مدد سے کام کرو۔ میں نے فلم مشین میں لگائی۔ ایک بنگالی سکالر تھے، وہ بھی فلم کے ذریعے ایک قلمی کتاب پر کام کر رہے تھے۔ فتاویٰ غیاثیہ عربی زبان میں ہے۔ پانچ چھ روز میں بڑی مشکل سے تھوڑا سا کام ہوا۔

ایک دن میں دفتر گیا تو ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شیخ محمد اکرام کے پاس پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے چیف لائبریرین رحیم صاحب بیٹھے تھے۔ وہ نہایت تپاک سے ملے اور کہا مجھے پتا چلا ہے کہ آپ ہماری لائبریری جاتے ہیں، مجھے کیوں نہیں ملتے۔ یہ بے رخی کیوں ہے؟

میں نے اپنے کام کی نوعیت بتائی تو انھوں نے کہا: کل ضرور آؤ۔ چنانچہ میں دوسرے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

دن لائبریری گیا تو سورت حال بدلی ہوئی تھی اور کتاب فوراً مجھے مل گئی۔ اب اس پر کام کرنا بہت آسان ہوگیا تھا۔ میں نے اس کتاب کی روشنی میں دو تین روز میں مضمون مکمل کرلیا۔ پھر گیارہ فتاووں پر کام کیا جو برصغیر کے مختلف مقامات میں لکھے گئے تھے اور قلمی تھے۔ یہ ایک مستقل کتاب ہوگئی جو برصغیر میں علم فقہ کے نام سے چھپی۔ اس قسم کا کام اب تک کسی نے نہیں کیا۔ یہ فقیر پہلا شخص ہے جس کو یہ خدمت سرانجام دینے کی اللہ نے توفیق دی۔ یہ کتاب اب کتاب سرائے اُردو بازار لاہور نے شائع کی۔

اس کے بعد کئی سال میرا پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں استفادے کا سلسلہ جاری رہا اور وہاں کے عملے کے تمام ارکان سے میرے دوستانہ مراسم قائم ہوگئے۔ اس لائبریری میں کئی لاکھ کتابیں تو مطبوعہ ہیں اور تیس پینتیس ہزار غیر مطبوعہ!

دوسری لائبریری جہاں میری آمدورفت رہی پنجاب پبلک لائبریری ہے۔ یہاں مجھے بعض ایسی قلمی کتابیں ملیں جو پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں نہیں تھیں۔

دیال سنگھ لائبریری میں بھی میرا آنا جانا رہا اور یہاں مجھے حوالے کی متعدد کتابوں کے مطالعے کا موقع ملا۔

عجائب گھر (لاہور) کی لائبریری سے بھی میں نے فائدہ اٹھایا۔ اس لائبریری میں لاہور کے دو مشہور سکالروں اور ممتاز مصنفوں کی لائبریریاں منتقل ہوگئی ہیں۔ وہ ہیں مولانا غلام رسول مہر اور ڈاکٹر خواجہ عبد الرشید (سابق ایم ایس میوہسپتال لاہور)۔ یہ دونوں بزرگ میرے مہربان اور مشفق تھے۔

انفرادی لائبریریوں میں حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کی لائبریری (دار الدعوۃ السلفیہ شیش محل روڈ، لاہور) جس کا نام اب ''مولانا محمد عطاء اللہ حنیف لائبریری'' رکھا گیا ہے، کم وبیش بیس ہزار کتابوں کا نہایت علمی مجموعہ ہے۔ مجھے اس لائبریری کی ہر کتاب ہر وقت مل سکتی ہے۔ اس میں پرانے ماہانہ اور ہفت روزہ رسائل بھی موجود ہیں۔ میں نے اس لائبریری سے استفادہ کیا اور کر رہا ہوں۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

جناب محمد عالم مختار حق کی لائبریری بھی لاہور کی انفرادی لائبریریوں میں مشہور لائبریری ہے۔ اس لائبریری کی جس کتاب کی مجھے جب ضرورت پڑی، مجھے ملی۔ میں ٹیلی فون کرتا ہوں، عالم صاحب مجھے کتاب بھجوا دیتے ہیں۔ بعض اوقات وہ خود میری مطلوبہ کتاب لے کر میرے غریب خانے پر تشریف لے آتے ہیں۔ یہ ان کی مہربانی ہے۔ اگر میں ان کی لائبریری میں جانا چاہوں تو مجھے لے جانے کے لیے ان کی گاڑی آجاتی ہے اور میں چلا جاتا ہوں۔ وہ بھی مجھ سے کوئی کتاب لینا چاہیں تو میں بلا تامل کتاب پیش کر دیتا ہوں۔

میرے دوست پروفیسر عبدالجبار شاکر کی لائبریری بیت الحکمت بھی بہت بڑی لائبریری ہے، جو عربی، اردو، انگریزی، فارسی اور دیگر متعدد زبانوں کی ایک لاکھ سے زیادہ (مطبوعہ اور غیر مطبوعہ) کتابوں پر محیط ہے اور ہر موضوع کا نہایت علمی ذخیرہ۔ لیکن وہ میرے مکان سے خاصی دور ہے۔ اس لیے مجھے ان کی لائبریری سے استفادے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن جب چاہوں اس سے استفادہ کرسکتا ہوں۔ میرے گوجراں والا کے دوست ضیاء اللہ کھوکھر کی لائبریری لاکھوں کتب و رسائل کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ان سے میں نے بعض چیزیں منگوائیں جو انھوں نے بھجوا دیں۔

میری اپنی لائبریری بہت مختصر ہے، تین ہزار سے کچھ زیادہ کتابوں پر مشتمل۔ اس میں میرے مطلب کی بہت سی کتابیں موجود ہیں۔ پہلے بتا چکا ہوں کہ تقسیم ملک کے وقت اپنے وطن (کوٹ کپورہ) میں میرے پاس کم و بیش دو سو کتابیں تھیں جو وہیں رہ گئیں۔

میں ۱۹۴۸ء میں لاہور آیا تو میری تنخواہ نوے روپے تھی جو ان حالات میں مناسب تنخواہ تھی۔ وہ سستا زمانہ تھا اور کتابوں کی قیمتیں بہت کم تھیں، کسی کی چار آنے، کسی کی آٹھ آنے، کسی کی بارہ آنے یا روپیہ ڈیڑھ روپیہ۔ میں ہر مہینے پانچ چھ روپے کی کتابیں خریدتا تھا، جن کی تعداد پندرہ سولہ تک پہنچ جاتی تھی۔ پھر تنخواہ ایک سو پچیس روپے ہوئی تو دس بارہ روپے کی ماہانہ خریداری ہونے لگی۔ کبھی پندرہ بیس روپے کی بھی ہو جاتی تھی۔ دو سو روپے آمدنی ہوئی تو

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کتابوں کی خریداری کا سلسلہ اور بڑھ گیا۔ اخبار الاعتصام میں تبصرے کے لیے بھی کتابیں آتی تھیں، اس کی دو کاپیوں میں سے ایک کاپی میری (یعنی تبصرہ نگار کی) ہوتی تھی۔ پھر جیسے جیسے آمدنی بڑھتی گئی، کتابوں کی خریداری بڑھتی گئی۔

کتابیں مَیں اب بھی خریدتا ہوں۔ چند روز پیشتر بہ یک وقت سولہ ہزار روپے کی کتابیں خریدیں۔ اللہ تعالیٰ کا اس فقیر پر یہ انتہائی کرم ہے کہ اس کی طرف سے نازل شدہ آخری کتاب ہدیٰ قرآن مجید سے اس گناہ گار کو خاص لگاؤ ہے۔ میں قرآن مجید کا مترجم یا مفسر نہیں ہوں، لیکن میرے چھوٹے سے کتب خانے میں برصغیر میں بولی جانے والی بہت سی زبانوں کے ترجمے والے قرآن مجید موجود ہیں۔ اردو زبان کے ایک دو کے سوا تمام ترجمے، سندھی زبان کے ترجمے جو نظم یا نثر میں کیے گئے۔ پھر پنجابی، سرائیکی، پشتو، بلوچی، بنگلہ، ہندی، انگریزی، فارسی سب زبانوں کے ترجمے اللہ کی مہربانی سے میرے پاس موجود ہیں۔ شاید اتنے تراجم والے قرآن کسی بڑی لائبریری میں بھی نہیں ہوں گے۔ نیز اُردو عربی کی بعض تفسیریں بھی ہیں۔ ان زبانوں کی مدد سے جو تھوڑی بہت میں جانتا ہوں، قرآن مجید کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔

نصابی اور درسی کتابوں کے ساتھ ساتھ ابتدا ہی میں مجھے دیگر مضامین کی کتابوں کے مطالعے کی عادت پڑ گئی تھی اور میں اپنی استطاعت کے مطابق کتابیں خرید کر پڑھنے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن اب میں دیکھتا ہوں کہ سکولوں اور کالجوں کے زیادہ تر طلباء نصابی کتابوں کے علاوہ دوسری کتابیں نہ خریدنے میں دلچسپی رکھتے ہیں، نہ پڑھنے میں۔ نہ ان کے ماں باپ انھیں اس طرف توجہ دلاتے ہیں۔ بعض دفعہ مالی حالات بھی شوق اور کوشش کے باوجود کتابیں خریدنے کی اجازت نہیں دیتے۔

۵۔ مارچ ۲۰۰۹ء — لاہور

❀❀❀❀

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

پچیسواں باب:

میرے متعلق مضامین اور تقریبات

میری حقیر سی تصنیفی خدمات سے متعلق بہت سے دوستوں نے مضامین سپرد قلم کیے اور بعض اداروں نے مستقل طور سے اجلاس منعقد کر کے میری تصانیف کا تذکرہ کیا اور مجھے شیلڈز عطا کیں۔ اس عزت افزائی پر میں ان کا بے حد شکر گزار ہوں۔ میری مختلف کتابوں پر تبصرے بھی بے شمار اہل علم نے کیے، جن سے میرا حوصلہ بڑھا اور میرے قلم میں توانائی آئی۔ افسوس ہے میں یہ تبصرے محفوظ نہ کر سکا۔ جن دوستوں نے مستقل مضامین لکھے، ان میں مندرجہ ذیل حضرات شامل ہیں۔

۱: مجھے یاد پڑتا ہے سب سے پہلے مجھ پر تعارفی مضمون جناب علی ارشد نے لکھا جو ماہنامہ "تعلیم الاسلام" (ماموں کانجن، ضلع فیصل آباد) میں چھپا۔ اس ماہنامے کے ایڈیٹر قاضی محمد اسلم سیف فیروز پوری مرحوم تھے۔ وہ میرے مخلص ترین دوست تھے۔ انھوں نے طویل علالت کے بعد ۱۵۔ اکتوبر ۱۹۹۶ء کو ماموں کانجن میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے۔ مضمون نگار علی ارشد کا فیصل آباد کے کھاتے پیتے تعلیم یافتہ گھرانے سے تعلق تھا۔ ان کی لائبریری تقریباً پندرہ ہزار کتابوں پر مشتمل ہے۔ وہ کتب و رسائل محض خریدتے ہی نہیں تھے، ان کا باقاعدہ مطالعہ بھی کرتے تھے۔ اس طرح ان کا دامن معلومات خاصا وسیع تھا۔ مجھے بارہا ان کی لائبریری سے رجوع کرنے کا موقع ملا انھوں نے ۱۷ فروری ۲۰۰۹ء کو اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کیا۔ مجھے لاہور ان کی وفات کی اطلاع پہنچی تو میں نہایت افسوس کے ساتھ ان کے جنازے میں شامل ہوا۔

۲: میرے دیرینہ دوستوں کی فہرست میں مولانا عبدالعظیم انصاری کا اسم گرامی بھی شامل

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ہے۔ تقسیم ملک سے قبل ان کا مسکن ایک شہر نما قصبہ ''پٹی'' تھا جو اس وقت ضلع لاہور میں شامل تھا۔ تقسیم ملک کے بعد وہ قصبہ ہندوستان کے حصے میں آیا اور ضلع امرتسر (مشرقی پنجاب) میں شامل کیا گیا۔ یہ قصبہ بہت سے نامور اصحابِ علم کا مقام سکونت رہا۔ مولانا عبدالعظیم انصاری مشہور مصنف اور مقالہ نگار تھے۔ انھوں نے ۲۱ نومبر، ۲۸، نومبر اور ۵ دسمبر ۱۹۹۷ء کے ہفت روزہ ''الاعتصام'' (لاہور) کے تین شماروں میں میرے متعلق مضمون لکھا۔ عنوان تھا: ''محمد اسحاق بھٹی ...... حالات و تاثرات''۔ انصاری صاحب کا انتقال ۲۸۔ دسمبر ۲۰۰۲ء کو قصور میں ہوا۔ میں ان کے جنازے میں شامل تھا۔

۳: ''الاعتصام'' ہی میں میرے ایک عزیز دوست جناب ملک عصمت اللہ نے اس فقیر کے بارے میں مقالہ لکھا۔ ان کا تعلق انیسویں صدی عیسوی کے ساتویں عشرے کے معروف عالم و صالح بزرگ حضرت مولانا غلام رسول (ساکن قلعہ میہاں سنگھ، ضلع گوجراں والا) سے ہے۔ مولانا ممدوح سے بے شمار کرامات کا صدور رہوا۔ وہ ۱۲۹۱ھ (۱۸۷۴ء) میں فوت ہوئے۔ میں نے اپنی کتاب ''فقہائے ہند'' کی دسویں جلد میں ان کے حالات تفصیل سے بیان کیے ہیں جو کتاب کے ساٹھ صفحات میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کی بعض کرامات بھی بیان کی ہیں۔

ملک عصمت اللہ نیک خاندان کے نیک رکن ہیں۔ وہ کبھی کبھی کوئی مضمون لکھتے ہیں اور تحقیق سے لکھتے ہیں۔ ان کا اسلوب تحریر دلکش اور شستہ ہے۔ میرے متعلق ان کا طویل مقالہ ۲۴ مئی ۲۰۰۲ء کے الاعتصام میں چھپا۔

۴: میرے متعلق ایک مضمون جناب ملک عبدالرشید عراقی کا معرض اشاعت میں آیا۔ عراقی صاحب بہت سی کتابوں کے مصنف و مؤلف اور زود نویس مقالہ نگار ہیں۔ جماعت اہل حدیث کے تقریباً تمام اخباروں میں قارئین ان کی قلمی کاوشوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔

۵: ہندوستان کے اصحابِ قلم کی جماعت میں مولانا عبدالمعید عبدالجلیل سلفی کو علم و ادراک اور تحریر و کتابت کے اعتبار سے بڑی شہرت حاصل ہے۔ اللہ نے ان کو ادبیت سے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

بھرپور رواں دواں اسلوبِ نگارش سے نوازا ہے۔ معلومات کی فراوانی ان کے مقالات کا اصل جوہر ہے۔ وہ صوبہ یوپی کے شہر علی گڑھ سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے مجھ پر ''محمد اسحاق بھٹی کی تذکرہ نگاری...... ہم عصر تذکرہ نگاری کے پس منظر میں'' کے دوہرے عنوان سے طویل مقالہ لکھا جو دہلی کے ''جریدہ ترجمان'' میں چھپا۔ پھر یہی مقالہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' (لاہور) ۷۔ دسمبر ۲۰۰۶ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ ان کے مقالے کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

''مولانا محمد اسحاق بھٹی کی تحریروں سے زمانے سے شناسائی ہے۔ فقہائے ہند و پاک کے سلسلے کو بھی دیکھنے کا موقع ملا۔ دائرۂ معارف اسلامیہ اور تاریخ ادبیات ہندوپاک میں بھی ان کی تحریروں کو پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ''الاعتصام'' کی پرانی فائلیں جو جامعہ سلفیہ (بنارس) میں طلباء کی انجمن کی لائبریری اور جامعہ رحمانیہ (بنارس) کی لائبریری میں ملیں، ان کی بھی ورق گردانی کی اور جب تذکرہ وتراجم پر ان کا سلسلہ اشاعت پذیر ہونا شروع ہوا اور اس کی خبر لگی تو بڑے شوق سے اسے ادھر ادھر سے لے کر اور اس کو چۂ عشق میں رسوا ہو کر پڑھا اور کسی نہ کسی طرح پاکستان سے مہنگے داموں نقوش عظمت رفتہ، بزم ارجمنداں اور کاروان سلف کو حاصل کیا اور دوسرے تمام کاموں کو معطل کر کے پورے انہماک سے انھیں پڑھا اور ان کی اہمیت کے تقاضوں کو پورا کر کے پڑھا۔ کہیں رویا، کہیں مسکرایا، کہیں قہقہہ لگایا، کہیں اش اش کیا، کبھی جرعہ جرعہ ان سے قلب و ذہن کو سیراب کرنے کی کوشش کی۔ کبھی حیرتوں اور حسرتوں میں غوطہ زن ہوا۔ گاہے بلند قامت علماء کے علم وتقویٰ کا تمنائی بنا۔ بارے اپنی ناکامیوں اور تہی دستیوں پر ماتم کیا۔ آخر میں قافلۂ حدیث سے مستفید ہوا اور توقع ہے اس سلسلے کی دوسری کڑیاں بھی جلد ضیابار ہوں گی۔''

۶: فیصل آباد کے ایک دوست محمد رمضان سلفی نے میری کتابوں کی مدد سے میرے متعلق مقالہ سپرد قلم کیا جو دہلی کے ''جریدہ ترجمان'' (۲۰۰۸ء) کی پانچ اشاعتوں میں اس کے ایڈیٹر مولانا اصغر علی سلفی کے تعارفی نوٹ کے ساتھ شائع ہوا۔ محمد رمضان نے اس

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

مقالے میں میرے متعلق دوسرے حضرات کے مضامین بھی شامل کر لیے ہیں اور اب اسے مرکز الحرمین اسلامی فیصل آباد کی طرف سے میاں طاہر صاحب کتابی صورت میں شائع کر رہے ہیں۔ یہ کتاب شاید ڈھائی سو صفحات تک پہنچ جائے گی۔

۷: فیصل آباد ہی کی ایک خاتون پروفیسر فوزیہ سحر (اسلامیہ کالج برائے خواتین فیصل آباد) نے پنجاب یونیورسٹی (لاہور) کی طرف سے میری خاکہ نگاری پر ایم فل کیا۔عنوان ہے ''محمد اسحاق بھٹی کی خاکہ نگاری''۔نگران ہیں پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے ڈاکٹر پروفیسر ضیاء الحسن۔ اس مقالے پر مقالہ نگار کو ۲۰۰۶ء میں پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے ایم فل کی ڈگری ملی۔ یہ مقالہ کتابی صورت میں چھپ گیا ہے۔ میرے فیصل آباد کے ایک عزیز دوست شاہد حسین نے پبلشر سے اس کی تیس کاپیاں خریدیں اور اپنے ملنے والے مطالعہ کے شائقین کو تقسیم کیں۔

شاہد حسین سے میرے طویل مدت سے مراسم قائم ہیں۔ وہ لاہور آئیں تو مجھے ضرور ملتے ہیں۔فیصل آباد میں ان کا اچھا خاصا کتب خانہ ہے۔ مجھ سے ان کے مراسم کا یہ عالم ہے کہ میری جو کتاب چھپی، انھوں نے خریدی اور پڑھی۔ میری بعض کتابوں کے مسودے بھی انھوں نے حاصل کیے۔ میں نے مسودے حاصل کرنے کی وجہ پوچھی تو جواب دیا کہ میں آپ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مسودات اپنی لائبریری میں محفوظ کرنا چاہتا ہوں۔ میں فیصل آباد جاؤں تو انھیں ملنے کی کوشش کرتا ہوں۔فیصل آباد میں میرا حلقۂ احباب کافی وسیع ہے۔

۹: میں ۲۰۰۰ء میں حج بیت اللہ کی سعادت سے بہرہ مند ہوا۔ اس کے بعد جون ۲۰۰۸ء میں اللہ تعالیٰ نے عمرے کے اسباب پیدا فرما دیے۔ کویت میں میرے بہت سے پاکستانی اور ہندوستانی احباب فروکش ہیں۔ ان میں سے کوئی صاحب پاکستان تشریف لائیں تو ازراہ کرم مجھے یاد فرماتے اور ملاقات کے لیے لاہور تشریف لاتے ہیں۔عمرے سے فارغ ہو کر ان کی دعوت پر میں یکم جولائی ۲۰۰۸ کو کویت پہنچا۔ میرے کویتی دوستوں میں سے مولانا عارف جاوید محمدی، مولانا صلاح الدین مقبول احمد، مولانا عبدالخالق مدنی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

اور دیگر متعدد حضرات کویت ایئرپورٹ پر موجود تھے۔ اس کی تفصیل اپنے سفر نامہ ''زیارت حرمین اور سفر کویت'' کے عنوان سے لکھ چکا ہوں۔ یہ سفر نامہ ''الاعتصام'' کی پانچ قسطوں (از ۱۱ ستمبر ۲۰۰۸ تا ۱۶۔ اکتوبر ۲۰۰۸) شائع ہوا۔ میرے وہاں پہنچنے پر روز نامہ ''کویت ٹائمز'' کی دو قسطوں میں ایک ہندوستانی اہل قلم سکالر محمد انور محمد قاسم سلفی کا مضمون ''مؤرخ اہل حدیث مولانا محمد اسحاق بھٹی'' کے عنوان سے چھپا۔ اس طویل مضمون کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے۔

''دورِ حاضر میں اگر تاریخ نویسی اور خاکہ نگاری کے متعلق بات کی جائے تو یہ ناممکن ہے کہ اس تعلق سے محترم محمد اسحاق بھٹی حفظہ اللہ کا تذکرہ نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ بھٹی صاحب نے اپنی شگفتہ تحریر اور جادو بیانی سے اس فن کو تازگی اور فکر کو بالیدگی عطا فرمائی ہے۔ بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں اگرچہ خاکہ نگار بے شمار ہیں، لیکن بھٹی صاحب کی بات ہی کچھ اور ہے

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

محمد اسحاق بھٹی وہ کہنہ مشق صحافی، مؤرخ، عالم دین، تجزیہ نگار اور خاکہ نویس ہیں جو تقریباً ساٹھ سال سے اپنے رشحات قلم کی عطر بیزی سے ایک دنیا کے طالبانِ علوم دینیہ، وارثان علوم نبوت اور محبانِ اسلامی صحافت کی مشام روح کو معطر کیے ہوئے ہیں،

''میرے لیے یہ بات باعث سعادت ہے کہ میں اس عظیم مؤرخ، مصنف اور خاکہ نگار کا تعارف قارئین کی خدمت میں پیش کروں جس نے اپنی زندگی کے ساٹھ سال لوح و قلم کی خدمت میں لگا دیے اور اس عرصے میں کم و بیش پچاس ہزار صفحات تحریر کیے، جسے اگر ایک ساتھ جمع کیا جائے تو کم از کم سو ضخیم جلدیں بن جائیں اور جن کی علمی خدمات پر طلبا نے ایم اے، ایم فل کے مقالے لکھے اور

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

پی ایچ ڈی کی تیاری کر رہے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند کے بے شمار مجلّات و رسائل میں ان کی تحریریں شائع ہو رہی ہیں اور اردو دان طبقے کے مطالعہ میں آ رہی ہیں۔"

۱۰: کویت سے ایک ماہنامہ رسالہ "امتی" (Ommaty) عربی زبان میں شائع ہوتا ہے۔ اس کے جولائی ۲۰۰۸ء کے شمارے میں اس فقیر کے بارے میں مولانا صلاح الدین مقبول احمد نے مضمون سپرد قلم کیا۔ اس مضمون کا عنوان ہے: "من اعلام العصر الحاضر۔ فضیلة الاستاذ محمد اسحاق بھٹی۔ مؤرخ القاری الهندية الباكستانية الشهير ."

فاضل مضمون نگار کا وطنی تعلق ہندوستان سے ہے۔ انھوں نے، اس مضمون میں میری حقیر سی تصنیفی خدمات کا خاصی تفصیل سے ذکر کیا ہے اور میرے حالات بیان کیے ہیں۔ میں اس پر ان کا نہایت شکر گزار ہوں۔

۱۱: بعض ہفت روزوں اور ماہناموں میں میرے انٹرویو بھی شائع ہوئے۔ ایک انٹرویو ماہنامہ "شہادت" کے چیف ایڈیٹر خالد سیال نے لیا جو اپریل ۱۹۹۸ء کے "شہادت" میں چھپا۔ مضامین کے اعتبار سے "شہادت" پاکستان کا ایک وقیع ماہنامہ ہے جو اسلام آباد اور مظفر آباد (آزاد کشمیر) سے شائع ہوتا ہے۔ خالد سیال کا قلم بڑا سیال ہے۔ وہ نہایت محنت سے رسالہ مرتب کرتے ہیں۔ زبان، انداز اور مندرجات کی رو سے یہ ماہنامہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ جناب خالد سیال صاحب نے مجھ سے سیاسی اور غیر سیاسی بہت سے سوالات پوچھے اور میں نے ان کے ہر سوال کا اپنے علم و مطالعہ کی روشنی میں جواب دینے کی کوشش کی۔ جو کچھ میں نے کہا صحافتی اخلاق اور قاعدے کے مطابق انھوں نے من وعن شائع کیا۔

۱۲: مجھ سے ایک انٹرویو حکیم محمد یحییٰ ڈاہروی نے کیا جو "تنظیم اہل حدیث" (لاہور) میں چھپا۔

۱۳: ایک انٹرویو کراچی کے ماہنامہ "صراط" نے لیا۔ وہ بھی مکمل شائع ہوا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

۱۴: ایک اور ماہنامے ''آرزو'' کے ایڈیٹر نے بھی انٹرویو لیا۔

۱۵: دہلی کے اخبار ''ترجمان'' میں وہاں کے انگریزی، اردو، فارسی، عربی اور ہندی کے سکالر سید عبدالقدوس نقوی نے (جو ابن احمد نقوی کے قلمی نام سے لکھتے ہیں) میری تصنیفی خدمات کے متعلق نظم لکھی۔ ''ترجمان'' کے حوالے سے یہ نظم پاکستان کے بعض اخباروں میں بھی چھپی۔ سید ابن احمد نقوی نے میری ان تمام کتابوں پر تبصرے کیے جو ہندوستان میں چھپیں۔

۱۶: پاکستان کے ایک شاعر محمد سعید کی چند نظمیں لاہور کے ''الاعتصام'' میں چھپیں، جن میں میری خدمات کا ذکر کیا گیا ہے۔

۱۷: میری ایک کتاب کا نام ''اسلام کی بیٹیاں'' ہے۔ اس کتاب کا آغاز نبی ﷺ کی ازواج مطہرات کے حالات سے کیا گیا ہے۔ ان کے بعد حضور ﷺ کی پاک باز صاحب زادیوں کا تذکرہ ہے۔ دہلی کے سکالر سید عبدالقدوس نقوی (ابن احمد نقوی) نے ازواج مطہرات اور نبی ﷺ کی صاحب زادیوں کے تذکار کا انگریزی میں ترجمہ کر دیا ہے جو دہلی کے ایک ناشر نے چھاپا۔

۱۸: ''نقوش عظمت رفتہ'' میں میں نے ایک مفصل مضمون گیانی ذیل سنگھ پر لکھا، جو میرے قدیم وطن کوٹ کپورہ کے قریب کے گاؤں ''سندھواں'' کے رہنے والے تھے۔ ۱۹۸۲ میں وہ ہندوستان کے صدر بنائے گئے (ان کا ذکر گزشتہ صفحات میں کیا گیا ہے) سید عبد القدوس نقوی نے یہ مضمون بھی انگریزی میں منتقل کر دیا ہے اور ہندوستان میں چھپ گیا ہے۔ گیانی ذیل سنگھ کی موت ۲۵ دسمبر ۱۹۹۵ء کو واقع ہوئی۔

۱۹: میری ایک کتاب ''برصغیر میں اسلام کے اوّلیں نقوش'' کا ہندوستان کے ایک محقق مترجم نے ہندی زبان میں ترجمہ کر دیا ہے۔

میرا سب سے طویل انٹرویو ماہنامہ ''علم و آگہی'' (فیصل آباد) کے جولائی، اگست، ستمبر ۲۰۱۰ء کے تین شماروں میں شائع ہوا جو جناب محمد یٰسین عمر، قاری محمد افضل، جناب سجاد انور

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

منصور، محمد رمضان سلفی اور بعض دیگر حضرات نے لیا۔

اس فقیر کو پاکستان، ہندوستان اور کویت کے مختلف علمی اداروں کی طرف سے اب تک جو شیلڈز عطا کی گئیں، ان کی تاریخ وار تفصیل حسب ذیل ہے:

ا: مورخہ ۱۰۔ اگست ۲۰۰۵ کو بدھ کے روز شام کے وقت میرے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ رسیور اٹھایا تو آواز آئی:

میں بھٹی صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔

میں نے عرض کیا: میں حاضر ہوں۔ فرمایے کیا ارشاد ہے؟

کہا: میں فیصل آباد سے میاں طاہر بول رہا ہوں۔ ۱۲۔ اگست کو جمعۃ المبارک کے دن ہم نے آپ کے اعزاز میں ایک تقریب منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

میں میاں طاہر صاحب سے متعارف نہیں تھا۔ انھوں نے خود ہی یہ حقیقت سمجھ لی اور کہا آپ مجھے نہیں جانتے، میں نے بھی آپ کو نہیں دیکھا، البتہ آپ کی کتابیں پڑھی ہیں۔ میری اور میرے ساتھیوں کی خواہش ہے کہ آپ کو یہاں بلا کر آپ کے ساتھ ایک نشست کا اہتمام کیا جائے۔ جمعے کی شام کا کھانا آپ ہمارے ساتھ کھائیں گے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہم نے کارڈ چھپوا کر بہت سے لوگوں کو اس تقریب میں شرکت کی دعوت دی ہے۔

سخت گرمی کا موسم تھا اور میں گھبرا رہا تھا۔ میں نے فیصل آباد ایک دوست کو ٹیلی فون کر کے میاں طاہر صاحب کے بارے میں متعارف ہونے کی کوشش کی۔ انھوں نے کہا کہ کتنے ہی لوگوں کو شرکت کے لیے دعوت نامے بھیجے گئے ہیں، گھبرانے کی ضرورت نہیں جمعے کو ضرور آؤ۔

فیصل آباد میرے بعض عزیز بھی رہتے ہیں، میں چاہتا تھا کہ انھیں بھی اس تقریب میں شرکت کی دعوت دوں۔ لیکن مجھے ان میں سے صرف دو عزیزوں کے ٹیلی فون نمبروں کا علم تھا۔ ایک اپنی بہن کے داماد محمد حنیف کا اور دوسرے اپنے عزیز میاں امجد کا۔ یہ دونوں جھنگ روڈ پر رہتے ہیں۔ میں نے ان کو تقریب میں شرکت کے لیے ٹیلی فون کیا اور وقت مقررہ پر میں

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

اپنے چند دوستوں کے ساتھ مرکز الحرمین الاسلامی (گل بہار کالونی ستیانہ روڈ) پہنچا، جہاں تقریب کا انعقاد کیا گیا تھا۔ ہر حلقے کے کثیر تعداد میں لوگ موجود تھے، کاروباری بھی، مختلف محکموں کے ملازم بھی، جامعہ سلفیہ اور دیگر دینی اداروں کے مدرسین اور کالجوں کے بعض پروفیسر بھی۔ میرے دونوں عزیز (محمد حنیف اور میاں امجد) بھی میرے جانے سے پہلے آ گئے تھے۔ مطبوعہ دعوت نامہ دو آدمیوں کی طرف سے بھیجا گیا تھا۔ مفتی محمد اسحاق اور میاں طاہر کی طرف سے۔ مفتی صاحب کو میں پہچانتا تھا، اس لیے کہ اس سے چند ماہ پیشتر ان کے صاحب زادے محمد جعفر صاحب نے مجھے شام کے کھانے پر بلایا تھا، جس میں میرے بعض دوست بھی شامل تھے۔ مفتی صاحب بھی اس کھانے میں شریک تھے۔ محمد جعفر کاروبار کرتے ہیں اور مختلف موضوعات کی کتابیں پڑھنے کے شائق ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے بے حد عقیدت مند ہیں۔ ایک مرتبہ انھوں نے فیصل آباد کے ایک بڑے ہوٹل میں مجھے خاص طور سے عشایے پر بلایا تھا۔ اس عشایے میں ان کے چند دوست بھی شریک تھے اور یہ محفل کافی دیر جاری رہی تھی۔

بہرحال مقامِ انعقادِ تقریب (مرکز حرمین) میں میری آنکھیں میاں طاہر کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اتنے میں ایک صاحب آئے، میانہ قد، معتدل جسم، اعتدال کے دائرے میں کالی داڑھی، لبوں پر مسکراہٹ، گندمی رنگ، شلوار قمیص میں ملبوس۔ نرم اور پُر وقار آواز میں السلام علیکم کہتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئے: بھٹی صاحب ہیں؟

میں نے ''ہاں'' میں جواب دیا تو بغل گیر ہو گئے۔ وہیں میرے ایک دوست محمد سرور طارق (طارق اکیڈمی فیصل آباد) تشریف لے آئے۔ انھوں نے فرمایا کہ میاں طاہر میرے چھوٹے بھائی ہیں۔ میں نے دیکھا کہ بڑے بڑے بینر لگے ہوئے ہیں، جن پر میری تمام تصانیف کے نام نمایاں الفاظ میں لکھے گئے ہیں۔ ایک بینر پر میرے لیے خیر مقدمی الفاظ مرقوم ہیں۔ اب مفتی محمد اسحاق کی صدارت میں کارروائی کا آغاز ہوتا ہے۔ تلاوت قرآن مجید کے بعد میاں طاہر نے میرا تعارف کرایا اور اس تقریب کے انعقاد کا مقصد بیان کیا۔ بعد ازاں جامعہ سلفیہ کے شیخ الحدیث مولانا عبدالعزیز علوی، نائب شیخ الحدیث حافظ مسعود عالم، ادارہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

علوم اثریہ کے صدر مولانا ارشادالحق اثری اور بعض دیگر حضرات نے میری تصنیفی خدمات کی وضاحت کی۔ میرے ایک پبلشر عزیزی عمر فاروق قدوسی بھی لاہور سے وہاں پہنچ گئے تھے۔ انھوں نے بھی تقریر کی۔ پھر مجھے چند گزارشات پیش کرنے کا حکم دیا گیا۔ میں نے میاں طاہر صاحب اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ آخر میں تقریب کے صدر مفتی محمد اسحاق صاحب نے چند باتیں بیان فرمائیں اور میرے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ کھانے کے دوران اور اس کے بعد بعض حضرات نے مجھ سے کچھ سوالات کیے اور میں نے اپنی معلومات کے مطابق انھیں جواب دینے کی کوشش کی۔

میاں طاہر کے بھائی محمد سرور طارق صاحب نے کئی سال پہلے فیصل آباد میں طارق اکیڈیمی کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا تھا جو کامیابی سے جاری ہے۔ اس اکیڈیمی کی طرف سے متعدد کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ میری ایک کتاب ''ارمغان حدیث'' بھی اس اکیڈیمی نے شائع کی ہے، جو معاملات سے متعلق ایک سو احادیث پر مشتمل ہے۔ طارق صاحب تو آج کل لندن میں ہیں لیکن اکیڈیمی کا انتظام دوسرے دوستوں کے سپرد ہے۔ ''علم وآگہی'' کے نام سے اکیڈیمی کا ایک ماہانہ رسالہ بھی جاری ہے۔ اب وہ ایک قرآن مجید شائع کررہے ہیں، جس کا ترجمہ برصغیر کے مشہور اہل علم کا تصدیق شدہ ہے۔

طارق اکیڈیمی نے ایک لائبریری قائم کی ہے، جس کا نام ''اسماعیل لائبریری'' ہے۔ میاں محمد اسماعیل، میاں طارق اور میاں طاہر کے دادا تھے۔ ڈیڑھ سال قبل اس کا افتتاح ہوا تھا۔ اس موقعے پر مجھے بھی دعوتِ شرکت دی گئی تھی۔ اچھا خاصا مجمع تھا اور مجھے اس کے افتتاح کے لیے فرمایا گیا تھا۔ میں کہنا دراصل یہ چاہتا ہوں کہ ۱۲۔ اگست ۲۰۰۵ء کو میاں طاہر صاحب کے قائم کردہ ''مرکز الحرمین'' (فیصل آباد) کی طرف سے مجھے شیلڈ عطا کی گئی، جس پر یہ الفاظ مرقوم ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

معروف دانشور مولانا محمد اسحاق بھٹی حفظہ اللہ...... تصنیف، تحقیق، تخلیق اور طویل صحافیانہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

سفر کی کامیابی پر خراج تحسین...... بارك الله فى جهودكم وشكر الله سعيكم .

میاں طاہر مرکز الحرمین گل بہار کالونی۔فیصل آباد۔

دینی اور روحانی مسائل کا حل فتاویٰ آن لائن، مولانا مفتی محمد اسحاق (جھال والے، فیصل آباد)

۲: فیصل آباد والی اس تقریب کے تیسرے دن بعد گجرات کے دوستوں نے تقریب کا اہتمام کیا۔ اس کی اطلاع مجھے حافظ احمد شاکر کے بڑے صاحب زادے حماد شاکر نے دی۔ یہ تقریب دراصل حافظ عبد الستار عاصم (نائب ناظم جمعیت اہل حدیث ریاض سعودی عرب) کے مکتبہ ابن تیمیہ (گجرات) کے افتتاح کے موقعے پر منعقد ہوئی تھی، جس کے مہمانانِ گرامی ہمارے عزیز دوست قاضی عبد القدیر خاموش، حافظ حماد شاکر، مولانا منظور احمد (گوجراں والا) اور بعض دیگر حضرات تھے اور صدر تھے مولانا حفیظ الرحمٰن لکھوی۔ منتظم حافظ طارق محمود یزدانی (امیر مرکزی جمعیت اہل حدیث گجرات) مولانا عبد الواحد سلفی اور مکتبہ ابن تیمیہ کے مدیر حافظ عبد الوہاب عابد تھے۔ تقریب ۱۴۔ اگست ۲۰۰۵ء کو اتوار کے دن گجرات کے صوفی ریسٹورنٹ ہال میں منعقد کی گئی تھی۔ اس وقت پنجاب کے وزیر تعلیم میاں عمران مسعود تھے، انھی نے مجھے شیلڈ دینا تھی۔ شیلڈ پر جو الفاظ تحریر کیے گئے، وہ یہ ہیں۔

سند اعتراف خدمات۔ پیش خدمت عظیم اسکالر، نامور مؤرخ جناب مولانا محمد اسحاق بھٹی حفظہ اللہ مصنف کتب کثیرہ، سابق ایڈیٹر ''الاعتصام'' (لاہور)...... بہ دست عزت مآب جناب میاں عمران مسعود صاحب وزیر تعلیم صوبہ پنجاب۔

من جانب حافظ عبد الستار عاصم نائب ناظم مرکزی جمعیت اہل حدیث الریاض سعودی عرب الرئیس مکتبہ ابن تیمیہ و حافظ عبد الوہاب عابد مدیر مکتبہ ابن تیمیہ۔ جی ٹی ایس چوک گجرات۔

۳: تیسری شیلڈ ایک تدریسی ادارے مرکز ابن الخطاب الٰہ آباد (ضلع قصور) کی طرف سے ۲۷۔ مئی ۲۰۰۶ء کو دی گئی۔ اس مرکز کے مدیر مولانا محمد اکبر سلیم ہیں۔ یہ ایک بہت بڑا تدریسی ادارہ ہے جو مولانا ممدوح نے جاری کیا ہے۔ اس کا نصاب تعلیم اس انداز سے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

چلتا ہے کہ پہلی جماعت سے لے کر چھ سال میں طالب علم وفاق المدارس کا نصاب ختم کر کے عصری تعلیم میں بی اے تک پہنچ جاتا ہے۔ اکبر سلیم صاحب نے لڑکیوں کا مدرسہ بھی جاری کیا ہے۔ دونوں مدرسے کامیابی سے چل رہے ہیں، لڑکوں کا بھی اور لڑکیوں کا بھی۔ اس مرکز کے مجمع عام میں بہ دست مولانا محمد یوسف شیخ الحدیث دار الحدیث راجووال مجھے جو شیلڈ مولانا محمد اکبر کی طرف سے دی گئی، اس پر یہ الفاظ مرقوم ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم...... اللہ اکبر...... ھدیۃ تذکاریہ۔ اھدیت لصاحب الفضیلۃ مولانا محمد اسحاق بھٹی حفظہ اللہ عند مجیئہ فی مرکز ابن الخطاب الاسلامی من جانب محمد اکبر سلیم رئیس مرکز ابن الخطاب الاسلامی۔ الٰہ آباد۔ قصور۔ پاکستان۔

۴: گزشتہ صفحات میں بتا چکا ہوں کہ ۱۴۔ اگست ۲۰۰۷ء کو مجھے ایک ہندوستانی اسکالر ڈاکٹر عبدالرحمٰن فریوائی نے اپنے والد محترم عبدالجبار کے نام کا ایوارڈ دینے کے لیے ہندوستان آنے کی دعوت دی تھی۔ انھوں نے اس تقریب کے پاکستانی مہمانان خصوصی کو بھی دعوت نامے بھیجے تھے، لیکن ہندوستانی سفارت خانے نے ہمیں ویزے نہیں دیے۔ تاہم میری غیر حاضری میں میرا ایوارڈ معروف ہندوستانی اہل علم مولانا اصغر علی ایڈیٹر اخبار ''ترجمان'' (دہلی) نے وصول کیا۔ میں پہلا پاکستانی تھا، جس کی تصنیفی خدمات کی بنا پر اس ایوارڈ کا مستحق قرار دیا گیا۔

۵: اب ایک اور ایوارڈ کے متعلق سنیے جو مجھے کویت کے مرکز دعوۃ الجالیات (جمعیت اہل حدیث) کی طرف سے ۳۔ جولائی ۲۰۰۸ء کو دیا گیا اور اسی موقعے پر ''مجھے مؤرخ اہل حدیث'' کا خطاب ملا۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ کویت سے تعلق رکھنے والے میرے دوستوں نے جن میں مولانا عارف جاوید محمدی خاص طور سے قابل ذکر ہیں، مجھے کویت آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ میں جون ۲۰۰۸ء کے آخر میں عمرے کے لیے گیا اور اس کے بعد یکم جولائی کو کویت پہنچا۔ کویت میں میرے بہت سے پاکستانی اور ہندوستانی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

اصحابِ علم دوست اقامت گزیں ہیں۔ میری کویت آمد کا اعلان وہاں کے اردو اخبار (کویت ٹائمز) میں ہو چکا تھا اور اس اخبار کی دو قسطوں میں میرے متعلق ہندوستانی اسکالر مولانا محمد انور سلفی کا مضمون بھی شائع ہو گیا تھا۔ ۳۔ جولائی کو نماز عشا کے بعد وہاں کے ایک بہت بڑے ہال میں جسے قرطبہ ہال کہا جاتا ہے، پاکستانی، ہندوستانی اور بنگلہ دیشی حضرات کا اجتماع ہوا۔ اجتماع میں متعدد عرب مشائخ بھی شریک تھے۔

کم و بیش ایک ہزار افراد کے اس اجتماع میں دینی، دعوتی اور رفاہی کاموں کی عالمی تنظیم جمعیت احیاء التراث الاسلامی کے رئیس اور قافلۂ خیر کے سربراہ شیخ طارق سامی سلطان العیسیٰ نے مرکز دعوۃ الجالیات کی طرف سے مجھے ''مؤرخ اہل حدیث'' کے خطاب والی شیلڈ سے نوازا۔ کویتی عرب رہنماؤں میں شیخ ڈاکٹر وائل الحساوی نائب رئیس جمعیت احیاء التراث الاسلامی، جناب شیخ فلاح خالد فلاح المطیری رئیس لجنۃ القارۃ الہندیہ، مشہور کویتی محقق شیخ محمد ناصر العجمی بھی اس موقعے پر تشریف فرما تھے۔ برصغیر کے ممتاز عالم دین اور محقق و مصنف محترم شیخ صلاح الدین مقبول احمد بھی وہاں موجود تھے، جنھوں نے عربی میں مقالہ پڑھا جس میں میری تصنیفی خدمات کا تذکرہ کیا اور شیخ محمد انور محمد قاسم سلفی نے جو بہت عرصے سے کویت میں مقیم ہیں، اردو میں مقالہ پڑھا۔ اپنے مقالوں میں انھوں نے تفصیل سے میری مختلف علمی مساعی سے حاضرین کو آگاہ فرمایا۔

اجتماع میں مجھے جو شیلڈ دی گئی، اس پر مندرجہ ذیل الفاظ تحریر ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

”قال الله تعالى: وقل اعملوا فسيرى الله عملكم ورسوله والمؤمنون.

”وقال النبى ﷺ: من لم يشكر الناس، لم يشكر الله.

يسر مركز دعوة الجاليات (بالكويت) تقرير الكراغ التذكاريه۔

مورخ اهل حديث۔ لفضيلة الشيخ محمد اسحاق بن

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

عبدالمجید بھٹی حفظه الله۔ اعترافاً وتقريرًا لجهود الشيخ المشكورة في تاريخ اهل الحديث۔ فجزاه الله عنا وعن الاسلام خيرًا .

”یہ پُر وقار شیلڈ عالم اسلام کے عظیم صحافی و مصنف مولانا محمد اسحاق بھٹی حفظہ اللہ کو تاریخ اہل حدیث کے لیے ان کی گراں قدر خدمات پر خراج تحسین پیش کرتے ہوئے مرکز دعوۃ الجالیات کے ماہانہ اجتماع (قرطبہ) میں مورخہ: ۲۹/۶/۱۴۲۹ھ مطابق ۳/۷/۲۰۰۸ء کو پیش کی گئی۔ من جانب: مرکز دعوۃ الجالیات (جمعیت اہل حدیث) کویت۔

اجتماع میں میں نے چند الفاظ میں اس عزت افزائی پر عرب شیوخ اور پاکستانی و ہندوستانی حضرات کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد میرے دوست مولانا عارف جاوید محمدی نے دعا کی۔ اجتماع ختم ہوا تو تمام حاضرین نے مجھ سے مصافحہ کیا اور بغل گیر ہوئے۔ اجتماع میں میرے وطن (جڑاں والا) کے ایک نوجوان امتیاز احمد بھی تھے جو ہمارے گاؤں (چک نمبر ۵۳ گ ب) کے سکول کے سابق ہیڈ ماسٹر جناب محمد رفیق کے صاحب زادے ہیں۔ وہ دوسرے دن میری قیام گاہ پر آئے اور مجھے شام کے کھانے کی دعوت دی۔ امتیاز احمد صاحب کئی سال سے کویت میں مقیم ہیں۔

ایک اور دوست سے تقریباً چالیس سال بعد ملاقات ہوئی۔ وہ ہیں امان اللہ بلتستانی۔ میرے زمانۂ ادارتِ ”الاعتصام“ میں وہ دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اب بہت مدت سے کویت میں اقامت گزیں ہیں۔ وہ دو تین مرتبہ مجھے ملنے کے لیے آئے۔

۱۱۔ جولائی کو اسی قرطبہ ہال میں نماز عشا کے بعد ”برصغیر میں علم حدیث“ کے موضوع پر میری تقریر کا پروگرام تھا۔ اس دن بھی بہت بڑا مجمع تھا۔ کرسیوں کی نشستیں کم پڑ گئیں تو حاضرین نے فرش پر دریاں بچھالیں۔ سٹیج سیکرٹری تین جولائی کے اجتماع میں بھی مولانا عبدالخالق مدنی تھے اور گیارہ جولائی کے اجتماع میں بھی وہی تھے۔ دونوں اجتماعات میں انھوں نے بڑی خوب صورتی سے اپنا فریضہ ادا کیا اور احسن طریقے سے پروگرام چلایا۔ حاضرین کے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کھانے کا انتظام ہال میں کیا گیا تھا۔ کھانا حاجی محمد ارشد صاحب نے کھلایا۔ بہت اچھا کھانا تھا۔ حاجی صاحب کا وطنی تعلق گوجراں والا سے ہے۔ کویت میں کاروبار کرتے ہیں۔ سنا ہے اس قسم کے ماہانہ تبلیغی اجتماعات میں کھانے کی ذمہ داری انھوں نے اپنے اوپر لے رکھی ہے، اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ ہر مہینے تقریباً ایک ہزار آدمی کو کھانا کھلانا بڑے دل گردے کا کام ہے۔

۶: اس فقیر کو چھٹی شیلڈ مرکزی جمعیت اہل حدیث کے شعبہ طبع وتالیف کی طرف سے ۱۶۔ اگست ۲۰۰۸ء کو عطا کی گئی۔ اس کا اہتمام اس شعبے کے ناظم پروفیسر ڈاکٹر عبدالغفور راشد نے مرکزی جمعیت کے دفتر ۱۰۶ راوی روڈ لاہور میں کیا تھا۔ اس موقعے پر پروفیسر ڈاکٹر حماد لکھوی، پروفیسر ڈاکٹر عبدالستار حامد، پروفیسر رانا تنویر قاسم، حافظ احمد شاکر، مولانا حافظ صلاح الدین یوسف، پروفیسر ڈاکٹر عبدالغفور راشد، رانا شفیق پسروری، مولانا عبدالرشید حجازی، مولانا عبدالقادر ندوی، پروفیسر عبدالرحمٰن لدھیانوی اور بعض دیگر حضرات نے اپنی تقریروں میں اس عاجز کی تصنیفی مساعی کا تذکرہ کیا۔ اجتماع میں ڈاکٹر عبدالغفور راشد نے مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان کے امیر پروفیسر ساجد میر صاحب کا میرے متعلق پیغام بھی سنایا۔ انسانی فطرت کے مطابق مجھے اس اجتماع کے انعقاد پر بے حد مسرت ہوئی۔

مرکزی جمعیت اہل حدیث کا قیام ۲۴۔ جولائی ۱۹۴۸ کو ہوا تھا۔ جمعیت کے اس تاسیسی اجتماع میں تقریباً ڈھائی سو اہل حدیث علما وزعما نے شرکت کی تھی۔ اجتماع میں یہ فقیر بھی شامل تھا اور مولانا معین الدین لکھوی بھی شریک تھے۔ شرکائے اجتماع میں سے اب صرف مَیں اور مولانا لکھوی زندہ ہیں، باقی سب حضرات عالم جاودانی میں پہنچ چکے ہیں۔ مَیں مرکزی جمعیت کا پہلا آفس سیکرٹری تھا اس لیے اس کی پوری تاریخ سے آگاہ ہوں۔ میں اگرچہ اب کسی جماعتی تنظیم میں شامل نہیں ہوں، تاہم سب میں شامل ہوں۔ جو حضرات بہتر کام کرتے ہیں، ان کا حامی ہوں۔ وہ کسی تنظیم سے وابستہ ہیں یا اس سے باہر ہیں۔ جماعتی سلسلے میں کسی کی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

مخالفت میں نے کبھی نہیں کی۔ بحمد اللہ اس باب میں میری زبان بھی محتاط ہے اور میرا قلم بھی بفضل خدا بے حد احتیاط سے اپنا سفر تحریر طے کر رہا ہے۔ مجھے اس تقریب سے خوشی اسی لیے ہوئی کہ اس کی تاسیس میں میرا بہت بڑا حصہ ہے اور میں نے اس کے نظم ونسق کے لیے اس وقت بھاگ دوڑ کی تھی اور مختلف مقامات کے سفر کیے تھے، جب کہیں جانا آنا بہت مشکل تھا۔ سفر کے ذرائع محدود تھے۔ کرائے کے لیے پیسا نہیں ہوتا تھا۔ بہر حال ۱۶۔ اگست ۲۰۰۸ء کو مرکزی جمعیت اہل حدیث کے شعبۂ طبع و تالیف کی جانب سے مجھے شیلڈ کا اعزاز عطا کیا گیا، جس پر یہ الفاظ نقش ہیں۔

”مؤرخ اہل حدیث مولانا محمد اسحاق بھٹی۔

من جانب شعبہ طبع و تالیف مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان۔“

مقررین کی تقریروں کے بعد میں نے اس شعبے کے ارکان، میرے متعلق اظہار رائے کرنے والے دوستوں اور تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

۷: اب ایک اور تقریب کے بارے میں سنیے جو اس فقیر کے متعلق منعقد کی گئی۔ اس کی تاریخ انعقاد ۱۱۔ جنوری ۲۰۰۹ء ہے۔ اتوار کا روز ہے اور مقام انعقاد ہے ہمدرد ہال واقع لٹن روڈ، لاہور۔ اس تقریب کا اہتمام شاکرین نے کیا۔ شاکرین کون ہیں؟ حضرت الاستاذ مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے صاحب زادۂ ذی قدر حافظ احمد شاکر اور حافظ صاحب کے پانچ فرزندانِ گرامی عزیز القدر حماد شاکر، عباد شاکر، خلاد شاکر، ہناد شاکر اور جواد شاکر۔ باپ بیٹوں کے اس مجموعے کو ہم شاکرین سے تعبیر کریں گے۔ یہ ساتویں تقریب ہے جو میرے بارے میں منعقد کی گئی۔ اس سے پہلی چھ تقریبوں کے اصحابِ انتظام میں سے بھی کسی نے مجھ سے نہ مشورہ کیا، نہ میری رائے لی۔ بس ایک دن یا دو دن پہلے مجھے اطلاع دی اور دوسرے مدعوین کی طرح دعوتِ شرکت سے نوازا۔ اس ساتویں تقریب کے بارے میں بھی یہی کچھ ہوا۔ حافظ احمد شاکر رات کو میرے غریب خانے پر تشریف آئے اور اپنے منصوبے اور پروگرام سے مطلع کیا۔ تیسرے دن

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

رات کو دعوتی کارڈ لے کر آ گئے۔ میرا خیال ہے مجھ سے انھوں نے چائے بھی نہیں پی۔ یہ بھی مجھے یاد نہیں آ رہا کہ میں نے ان سے چائے کے لیے کہا بھی تھا یا نہیں۔ یہ البتہ یاد ہے کہ وہ چند منٹ بیٹھے اور کارڈ دے کر چلے گئے۔ مقررین کا انتخاب، ان سے رابطہ، مہمانانِ گرامی کی فہرست وغیرہ سب انہی نے کیا۔ میرا اس میں کوئی حصہ نہیں۔ مجھے امید نہیں تھی کہ یہ تقریب زیادہ کامیاب رہے گی، اس لیے کہ اس سے پہلے محرم کی دو چھٹیاں آ گئی تھیں اور ایک چھٹی اتوار کی تھی۔ اس لیے ڈاک کے ذریعے مدعوین تک بروقت دعوت نامے پہنچنے کا بہ ظاہر کوئی امکان نہ تھا۔ لیکن شاکرین نے بڑی ہمت سے کام لیا۔ انھوں نے لاہور اور لاہور سے باہر کے حضرات سے رابطہ کیا اور مجھے بعض حضرات نے بتایا کہ انھیں ایک سے زیادہ مرتبہ ٹیلی فون کیے گئے۔

تقریب کا وقت ایک بجے سے لے کر چار بجے تک تھا۔ مولانا عبدالقادر ندوی کی صدارت تھی اور مہمانان خصوصی تھے شیخ الحدیث مولانا مفتی حافظ ثناء اللہ مدنی، شیخ الحدیث مولانا محمد یوسف دارالحدیث راجووال (ضلع اوکاڑہ) ڈاکٹر حافظ عبدالکریم ناظم اعلیٰ مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان، جماعت کے معروف رہنما جناب حاجی محمد شریف چنگوانی (ملتان) حضرت علامہ قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری کے پوتے جناب قاضی حسن معزالدین۔ یہ تمام حضرات تشریف فرما تھے۔ سٹیج سیکرٹری کا فریضہ اخبار ''الاعتصام'' کے ایڈیٹر حافظ عبدالوحید نے انجام دیا۔ تقریب کا آغاز قاری احمد حسن کی تلاوت قرآن مجید سے ہوا۔ ہال سامعین سے بھر گیا تھا۔ تلاوت کے بعد حافظ احمد شاکر نے خطبہ استقبالیہ پڑھا۔ اس کے بعد تقریروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ مقررین تھے مولانا حافظ عبدالوہاب روپڑی، مولانا حافظ مسعود عالم (جامعہ سلفیہ، فیصل آباد) مولانا مجاہد الحسینی (فیصل آباد) پروفیسر ڈاکٹر عبدالغفور راشد، مولانا ارشادالحق اثری، پروفیسر ڈاکٹر محمد یحییٰ، جناب مصطفیٰ صادق، جناب رانا شفیق خان پسروری، ڈاکٹر حافظ عبدالرشید اظہر (اسلام آباد) ڈاکٹر حافظ عبدالحمید ازہر (اسلام آباد)، پروفیسر عبدالجبار شاکر (ڈائریکٹر جنرل دعوہ اکیڈیمی انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

آباد) اور ناصر محمود۔

تقریروں کے بعد آخر میں اس فقیر کی باری آئی۔ میں نے تقریب کے منتظمین حافظ احمد شاکر سمیت دیگر عزیز القدر شاکرین، مقررین حضرات اور سامعین کرام کا شکریہ ادا کیا جو اس سرد موسم میں اسلام آباد، فیصل آباد، گوجراں والا، وزیر آباد، ملتان، ڈیرہ غازی خاں، حجرہ شاہ مقیم، راجووال، جڑاں والا، بہاول نگر اور لاہور کے مختلف علاقوں سے تشریف لائے تھے اور جنھوں نے کم وبیش چار گھنٹے یہاں صرف کیے اور اس فقیر کی عزت افزائی کا باعث ہوئے۔

آخر میں شیخ الحدیث حضرت مفتی ثناء اللہ مدنی نے تقریر ارشاد فرمائی۔ انھوں نے میری حقیر سی تصنیفی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ تصانیف برصغیر کے علمائے کرام کے حالات پر مشتمل ہیں، ان کا عربی زبان میں ترجمہ ہونا چاہیے تاکہ عرب اہل علم ہمارے ماضی اور حال کے علمائے کرام کی تدریسی، تبلیغی، تصنیفی مساعی سے باخبر ہوسکیں۔ پھر انھوں نے دعا فرمائی اور تقریب اختتام کو پہنچی۔ بعد ازاں حاضرین کی چائے وغیرہ سے تواضع کی گئی۔ چائے کے ساتھ ''وغیرہ'' کئی چیزوں کا بہترین مجموعہ تھا۔

بعض تقریبات میں میرے متعلق لائق تکریم مقررین نے ''مورخ اہل حدیث'' کے الفاظ استعمال کیے۔ (اور کویت میں مجھے یہ خطاب دیا گیا) یہ ان کی مہربانی ہے۔ لیکن گزارش یہ ہے کہ میں ذاتی طور پر ہرگز اس کا دعویٰ نہیں کرتا کہ میں اتنا بڑا مؤرخ ہوگیا ہوں۔ میری کار گزاری صرف یہ ہے کہ میں نے چند کتابیں لکھی ہیں، جن میں جماعت کے بزرگوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ کام اور بھی متعدد حضرات نے کیا ہے اور بہتر انداز میں کیا ہے اور ماشاء اللہ کر رہے ہیں۔

اس موضوع کی تحریروں میں مجھ سے غلطیاں بھی ہوئی ہوں گی۔ کہیں لغزش فہم کا ارتکاب بھی ہوا ہوگا۔ کسی واقعہ کو سمجھنے میں ٹھوکر بھی کھائی ہوگی اور کوئی اہم بات بیان کرنے سے رہ بھی گئی ہوگی۔ لکھنے والا مبرا عن الخطاء نہیں ہوسکتا، اس لیے میں اپنی کسی بات کو حرفِ آخر نہیں سمجھتا۔ بس زیادہ سے زیادہ یہی عرض کرسکتا ہوں کہ میں نے تحریری خدمت کرنے کی کچھ

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کوشش کی ہے اور اپنی ہمت کے مطابق کر رہا ہوں۔میں نے موجودین پر بھی لکھا ہے۔ موجودین پر لکھنا بہت نازک مسئلہ ہے۔اگر کسی کی تعریف کی جائے تو الزام عائد ہوسکتا ہے کہ اس سے رعایت کی گئی ہے۔اگر ہنسی مذاق یا کوئی لطیفہ ہو جائے تو خفگی کا اظہار کیا جاتا اور منہ بسورلیا جاتا ہے۔شخصیات پر لکھنے والا آخر کیا کرے۔

اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا متمنی اور دوستوں کی دعاءوں کا طالب ہوں۔جن حضرات نے میرے متعلق مضامین لکھے اور تقریبات کا اہتمام کیا اور جو حضرات ان تقریبات میں شامل ہوئے، میں ان سب کا بے حد شکر گزار ہوں۔اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے اور اس معصیت کیش کو اپنی اور اپنے رسول اکرم (ﷺ) کی اطاعت کی توفیق سے بہرہ مند کرے۔ آمین یارب العالمین

۱۱۔مارچ ۲۰۰۹ء لاہور

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

چھبیسواں باب:

ساٹھ باسٹھ سال پہلے کا لاہور

اب ساٹھ باسٹھ سال پہلے کے لاہور کے بارے میں چند باتیں۔

☆ میں 1948ء کے اکتوبر میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کے آفس سیکرٹری کے طور پر جب لاہور آیا، اس وقت مرکزی جمعیت کا دفتر شیش محل روڈ پر دارالعلوم تقویۃ الاسلام کی بلڈنگ میں تھا۔ حضرت مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی جمعیت کے صدر تھے۔ ان کی سکونت بھی اسی بلڈنگ میں تھی۔ اس علاقے میں چار سڑکیں قریب قریب تھیں۔ وہ تھیں ذیلدار روڈ، شیش محل روڈ، موہنی روڈ اور شاہ جہان روڈ۔ دو ہائی سکول تھے۔ ایک موہنی روڈ پر جو قیام پاکستان سے قبل ہندوؤں کا سکول تھا۔ وہ سکول اب بھی ہے۔ ایک ذیلدار روڈ اور حضرت علی ہجویری رحمہ اللہ کے مزار کے درمیان انجمن حمایت اسلام کا جاری کردہ اسلامیہ ہائی سکول۔ یہ لاہور کا بہت بڑا سکول تھا۔ اس کی گراؤنڈ خاصے رقبے میں پھیلی ہوئی تھی اور شان دار بلڈنگ تھی۔ قدیم دور کا یہ تاریخی ہائی سکول اپنے دورِ اقتدار میں ضیاء الحق نے ختم کیا اور اس کی گراؤنڈ اور پوری بلڈنگ حضرت علی ہجویری رحمہ اللہ کے مزار کو دے دی گئی۔ کچھ حصہ سامنے کی سڑک میں شامل کر دیا گیا۔

☆ شیش محل روڈ کے قرب وجوار میں آبادی بہت کم تھی۔ موہنی روڈ سے تھوڑا سا آگے بلال گنج تھا۔ اس کے اردگرد خالی جگہ تھی۔ ایک ارائیں بلڈنگ تھی۔ اس کے قریب چند مکان تھے اور ایک مسجد تھی، جسے کارداروں کی مسجد کہا جاتا تھا۔ اس تمام علاقے میں انسانی آبادی محدود تھی اور مچھروں اور مکھیوں کی آبادی غیر محدود......!

☆ شیش محل روڈ پر مرکزی جمعیت کے دفتر سے ملحق مجھے رہائش کے لیے کمرہ دیا گیا تھا۔ پہلی رات آئی تو تقریباً دو بجے ایک نہایت خوف ناک اونچی آواز فضا میں گونجی۔ ایسے لگا کہ یہ آواز چند فٹ کے فاصلے سے آئی ہے۔ اپنے قریب لیٹے ہوئے شخص سے پوچھا: یہ کیا ہے؟ اس نے بتایا کہ چڑیا گھر میں شیر دھاڑا ہے اور رات کے سناٹے میں تقریباً تین میل کے فاصلے کو چیرتی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ہوئی اس کی آواز یہاں سنائی دے رہی ہے۔ اس کے بعد کئی دفعہ یہ آواز کانوں میں پڑی۔ پھر مکانوں اور مکینوں کی تعداد بڑھی تو وہاں تک شیر کی آواز کی رسائی کا سلسلہ ختم ہوا۔

☆ بھاٹی دروازے اور لوہاری دروازے کے درمیان باغ کے ایک کونے میں پہلوانوں کا اکھاڑا تھا، جس میں چھوٹے بڑے پہلوان دن کے تین بجے کے بعد ''زور'' کرتے تھے۔ بڑے پہلوان چھوٹے بچوں کو پہلوانی کے گُر اور داؤ سکھاتے اور ان کے کان ملتے تاکہ کان موٹے ہوں اور لوگوں کو پتا چلے کہ یہ پہلوان ہے۔

☆ دور تک پھیلے ہوئے اس باغ میں بے شمار درخت تھے۔ گرمیوں کے موسم میں ان درختوں کے سائے میں مختلف ٹولیوں کی شکل میں لوگ بیٹھ جاتے، کسی ٹولی کو کوئی اچھی سی آواز والا ہیر وارث شاہ سنا رہا ہے، کوئی ''سی حرفی ہدایت اللہ'' سنا رہا ہے، کوئی عبدالستار کی لکھی ہوئی (پنجابی نظم کی سورہ یوسف کی تفسیر) قصص المحسنین سنا رہا ہے، کوئی ملکھی رام کے بارہ ماہ سنا رہا ہے، کہیں تاش اور شطرنج کی بازی چل رہی ہے۔ بے فکر لاہوریے تمام دن یہ سلسلہ جاری رکھتے تھے۔

☆ بھاٹی دروازے کے باہر کا چوک اب تو بہت وسیع ہو گیا ہے۔ اس وقت چھوٹا تھا اور یہاں تکے کباب بنائے جاتے تھے۔ چوک میں ایک سائیں بیٹھا ہوتا تھا، جس کے اردگرد چند کپڑے تو ہوتے تھے لیکن وہ ننگ دھڑنگ ہی رہتا تھا۔ عورتیں آتیں، ادب سے اس کے پاؤں کو ہاتھ لگاتیں اور قریب ہو کر بیٹھ جاتیں۔ بعض خواتین جوشِ عقیدت سے اس کے پاؤں اور ٹانگیں دابتیں۔ موسم کے مطابق لسی، پانی، چائے اور دودھ وغیرہ پلاتیں۔ وہ آنکھیں بند کر کے خاموش بیٹھا رہتا۔ 1953ء کی تحریک تحفظ ختم نبوت کے موقعے پر لاہور میں مارشل لا نافذ کیا گیا تھا، اس کی باگ ڈور جنرل اعظم خاں کے سپرد کی گئی تھی۔ اس اثنا میں بھاٹی دروازے کے باہر جلوس پر فوج نے گولی چلائی، جس سے کتنے ہی لوگ مر گئے۔ سائیں پر گولی لگی تو وہ بھی مر گیا۔ اسے حضرت علی ہجویری رحمہ اللہ کے مزار کے قریب کی ایک گلی میں دفن کیا گیا۔ اب اس کی پختہ قبر ہے، جس پر اس کا نام محمد حیات لکھا ہے۔

☆ رمضان المبارک کا مہینا شروع ہوتے ہی ایک شخص جن کا نام مولوی نور محمد تھا، کاموں کی سے آیا کرتے تھے۔ وہ بھاٹی دروازے کے باہر وسیع باغ میں روزانہ آٹھ بجے سے دس گیارہ بجے تک تقریر کرتے تھے۔ اس علاقے کی گلیوں سے بے شمار عورتیں ان کی تقریر سننے آیا کرتی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

تھیں۔ وہ پنجابی میں تقریر کرتے اور بہ کثرت پنجابی شعر پڑھتے۔ گیارہ بارہ بجے واپس کاموں کی چلے جاتے تھے۔ پہلی رمضان سے لے کر رمضان کی آخری تاریخ تک ان کا سلسلہ تقریر جاری رہتا۔ تقریر سننے والی عورتیں انھیں پیسے بھی دیتیں اور کپڑے بھی دیتیں۔ روزانہ دو تین گھنٹوں میں ان کی اچھی خاصی کمائی ہو جاتی تھی۔ اب یہ باغ ختم ہو گیا اور یہاں بہت چوڑی سڑک بن گئی ہے اور اس پر ویگنوں اور بسوں کا قبضہ ہے۔

☆ اس زمانے میں نہ ویگنیں ہوتی تھیں، نہ سکوٹر، نہ موٹر سائیکل، نہ رکشے۔ کاریں بہت کم تھیں۔ سائیکل کو امیرانہ سواری سمجھا جاتا تھا۔ شہر میں زیادہ تر لوگ سائیکل چلاتے اور اسی پر دفتروں میں جاتے تھے۔ میں نے بھی ایک سو پچیس روپے کا سائیکل خریدا تھا جو کئی سال چلاتا رہا۔ بعض دوست مجھے سائیکلسٹ کہنے لگے تھے۔ عام لوگوں کی سواری تانگہ تھا۔ مال روڈ پر تانگے چلتے تھے۔ مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی پنجاب اسمبلی کے ممبر تھے۔ اسمبلی کے ممبر کو اس وقت ایم۔ ایل۔ اے (ممبر لیجسلیٹو اسمبلی) کہا جاتا تھا۔ مولانا ممدوح تانگے پر اسمبلی جاتے تھے۔

☆ بھاٹی اور لوہاری گیٹ سے ریلوے اسٹیشن اور دہلی دروازے تک تانگے کا کرایہ دو آنے تھا۔ اچھرے کی طرف آمد و رفت کا ذریعہ بھی تانگہ تھا۔ لوہاری دروازے کے باہر مسلم مسجد کے سامنے خاصا بڑا تانگہ سٹینڈ تھا، جس کی ٹین کی چھت تھی۔ تانگے والے وہاں تانگے کھڑے کرتے اور گھوڑوں کو چارہ کھلاتے۔ گھوڑوں کو پانی پلانے کے لیے کارپوریشن کی طرف سے وہاں دو تین سرکاری نلکے لگائے گئے تھے۔

☆ ماڈل ٹاؤن سے بس چلتی تھی جو میو ہسپتال کے قریب آ کر رکتی تھی۔ اومنی بس والے کچھ عرصہ صبح پانچ بجے سے سات بجے تک سفر کرنے والوں سے صرف ایک آنہ وصول کرتے رہے، سفر کرنے والا جہاں مرضی جائے، کرایہ فقط ایک آنہ تھا۔

☆ بھاٹی دروازے سے ایم۔ اے۔ او کالج کی طرف سے سانده کو سات نمبر بس جاتی تھی اور کرایہ تھا ایک آنہ۔ تانگے کا کرایہ براستہ کرشن نگر دو آنے تھا۔

☆ انارکلی لاہور کا مشہور بازار تھا۔ یوں تو اس میں تمام دن لوگوں کی چہل پہل رہتی تھی، لیکن شام کو پانچ چھ بجے سے لے کر رات کے تقریباً دس بجے تک میلہ بھرا رہتا اور خوب رونق رہتی۔ لاہور کے بہت سے معروف لوگ جن میں بڑے بڑے سیاسی رہنما، سرکاری افسر اور صوبائی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

وزیر بھی ہوتے، شام کے بعد روزانہ انارکلی کی سیر کو آتے۔ لاہور کے اس چھوٹے سے ٹکڑے کو انسانوں کے گلشن رواں کی حیثیت حاصل تھی۔ صوبائی اسمبلی کے اجلاس کے دنوں میں انارکلی کی رونق مزید بڑھ جاتی تھی۔ پنجاب کے مختلف علاقوں کے ارکانِ اسمبلی اس کی سیر کرتے اور ان سے میل ملاقات کرنے والے لوگ بھی ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ اس زمانے میں کسی قسم کی سکیورٹی اور حفاظت کا کوئی تصور نہ تھا۔ لوگ ارکانِ اسمبلی کے ٹھکانوں پر آزادی سے جاتے اور ان سے ملتے تھے۔ خود ارکانِ اسمبلی کی بھی اپنے دوستوں کے ہاں آزادانہ آمدورفت رہتی تھی۔

☆ ایک اور بہت اچھی سیرگاہ مال روڈ تھی۔ انارکلی سے لے کر چیرنگ کراس تک سڑک کے دونوں طرف لوگوں کی آمدورفت رہتی۔ سڑک کے دونوں جانب بے شمار درخت تھے۔ صبح وشام سڑک پر سرکاری گاڑی سے چھڑکاؤ کیا جاتا تھا۔ درختوں اور چھڑکاؤ کی وجہ سے اسے ٹھنڈی سڑک کہا جاتا تھا۔ ہائی کورٹ اور بڑے ڈاک خانے اور تار گھر کے درمیان چوراہے میں گول سا اونچا چبوترہ تھا، اس کی خوب صورت گھاس پر لوگ شام کو بیٹھتے اور باتیں کرتے۔ اس کے چاروں طرف ٹریفک چلتی تھی۔ یہ بڑا دلکش منظر ہوتا تھا۔ یہ چبوترہ گولائی میں خاصا پھیلا ہوا تھا۔ بعض لوگ گرمیوں میں رات کو وہیں سو جاتے۔ نہایت امن کا دور تھا۔ دہشت گردی اور خودکش حملوں کا تو کسی کو خیال بھی نہیں تھا۔ چوری چکاری اور قتل وغارت گری کا بھی زیادہ خطرہ نہ تھا۔

☆ کتابوں کے کاروبار کا مرکز معلوم نہیں کب سے کشمیری بازار تھا۔ مشہور تاجرانِ کتب کی بڑی بڑی دکانیں کشمیری بازار میں تھیں۔ قیامِ پاکستان سے چند سال بعد تک اس بازار کی یہی حیثیت رہی۔ اردو بازار کو اس زمانے میں موہن لال روڈ کہا جاتا تھا۔ قیامِ پاکستان کے کئی برس بعد اس کا نام اردو بازار رکھا گیا۔ اب اگرچہ شہر کے مختلف مقامات میں کتابوں کی بعض بڑی بڑی دکانیں موجود ہیں، لیکن کتابوں کی خرید وفروخت کا اصل مرکز اردو بازار ہے۔

☆ قیامِ پاکستان سے پہلے اور اس سے چند برس بعد تک لاہور میں ادیبوں، شاعروں اور اخبار نویسوں کے مشہور ٹھکانے چار تھے۔ ریلوے روڈ پر اسلامیہ کالج کے مین گیٹ کے سامنے عرب ہوٹل، نئی انارکلی کے اختتام پر نگینہ بیکری، انارکلی سے باہر بائیں جانب مال روڈ پر چائنیز اور کافی ہاؤس۔ ان کے بعد پاکستان ٹی ہاؤس نے بھی بڑی شہرت پائی۔ یہ درمیانے درجے کے ہوٹل یا چائے خانے تھے۔ شام کے وقت ان کی رونق بڑھ جاتی تھی۔ ان میں ادیب،

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

شاعر اور اخبار نویس جمع ہوتے اور قسم قسم کی باتیں کی جاتیں۔ میری ان سب ٹھکانوں میں آمد ورفت رہی اور بے شمار لوگوں کی بے شمار باتیں سننے کے مواقع ملے۔ ان مقامات میں تقسیم ملک سے قبل کے اہل علم اور اصحابِ قلم کی باتیں لوگ بڑی دلچسپی سے کرتے اور سنتے تھے۔ پرانے سیاسی رہنماؤں اور قدیم دور کے خطیبوں اور مقرروں کے واقعات نہایت شوق سے بیان کیے جاتے تھے، مسلمانوں کے بھی ہندوؤں اور سکھوں کے بھی۔! عرب ہوٹل کی بلڈنگ باہر سے اب بھی اسی حالت میں ہے، لیکن مدتِ مدید سے یہ ہوٹل بند ہے۔

☆ اب پرانا کلچر ختم ہوگیا ہے اور نئے حالات نے ایک بالکل نئے کلچر کو جنم دیا ہے۔ شہر کے مختلف علاقوں اور گلی محلوں کی صورت حال ایسی ہوگئی ہے کہ اگر کسی طرح کچھ عرصہ پہلے کا فوت شدہ کوئی بہت پڑھا لکھا اور لاہور کے تمام علاقوں سے واقف شخص بھی زندہ ہو جائے اور اس کے گھر کے سامنے لا کر اسے کھڑا کر دیا جائے اور کہا جائے کہ اپنا گھر پہچانو کہ کون سا ہے تو وہ ہرگز نہیں پہچان سکے گا اور اسے کچھ پتا نہیں چلے گا کہ وہ کہاں کھڑا ہے اور اسے کس طرف جانا ہے، بلکہ اگر اسے اس کے گھر میں داخل بھی کر دیا جائے تو بھی اسے معلوم نہیں ہو سکے گا کہ واقعی وہ اسی کا گھر ہے اور جو لوگ اس میں رہ رہے ہیں، یہ اسی کے بہن بھائی اور اسی کی آل اولاد ہیں۔ لوگوں کے لباس بدل گئے، رہن سہن کے طریقے بدل گئے، زبان بدل گئی، تہذیب بدل گئی، معاشرت بدل گئی، اندازِ گفتگو بدل گیا۔

☆ لاہور برصغیر کا بہت مشہور شہر ہونے کے باوجود قیامِ پاکستان تک مختصر تھا۔ موجودہ پھیلاؤ کا اس وقت کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ جس زمانے میں سمن آباد کی نئی آبادی ظہور میں آ رہی تھی، وہاں ہمارے ایک دوست نے جو دہلی سے لاہور آئے تھے، ایک پلاٹ خرید کر مکان بنایا۔ ہمیں رات کے کھانے کی دعوت دی۔ ہم دو آدمی تھے۔ سردیوں کا موسم تھا۔ رات کے نو بجے کھانے سے فارغ ہو کر مکان سے باہر نکلے تو چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا اور ہمیں کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ کدھر جانا ہے۔ وہاں سے تین آدمی چوبرجی تک ہمیں چھوڑنے آئے۔

☆ ایک اور واقعہ سنیے۔ قیامِ پاکستان سے قبل میں نے قرآنِ مجید کے ایک ناشر کا نام پڑھا، ''ایس سنت سنگھ، نسبت روڈ، لاہور۔'' پہلے تو اس پر تعجب ہوا کہ ایک سکھ دکان دار نے قرآن مجید شائع کیا ہے۔ پھر ''نسبت روڈ'' پڑھا تو خیال ہوا کہ یہ کتابت کی غلطی ہے، صحیح لفظ

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

''بسنت روڈ'' ہوگا۔ یہ بات میرے ذہن میں اٹکی رہی۔ قیامِ پاکستان کے بعد لاہور آیا تو ایک روز مجھے حضرت مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی نے کہیں بھیجا اور فرمایا: میو ہسپتال کے بڑے دروازے کے آگے ''نسبت روڈ'' پر جاؤ گے تو اس کی فلاں نمبر کی گلی میں فلاں شخص کا مکان ہے۔ یہ الفاظ سن کر فوراً ذہن میں آیا کہ مولانا جو لاہور کے رہنے والے ہیں، ''نسبت روڈ'' کہہ رہے ہیں، یہی صحیح ہوگا، لیکن یہ کیا نام ہے؟ اس سے کئی مہینے بعد اخبار ''الاعتصام'' کے تبادلے میں دہلی سے ایک ہفت روزہ اخبار آیا، جس میں ایک مضمون کا عنوان تھا، ''لالہ نسبت رائے''۔ میں نے یہ مضمون بڑے شوق سے پڑھا۔ اس میں لاہور کے ایک ہندو ''نسبت رائے'' کے حالات بیان کیے گئے تھے اور بتایا گیا تھا کہ لاہور میں اس کے نام سے ایک سڑک بھی ہے جو میو ہسپتال سے شروع ہو کر میکلوڈ روڈ پر ختم ہوتی ہے۔

☆ اب لاہور اتنا پھیل گیا ہے کہ اصل لاہور سے کئی گنا زیادہ علاقہ اس کے قبضے میں آ گیا ہے۔ نئے نئے ناموں سے نئی نئی آبادیاں قائم ہوگئی ہیں، رحمان پورہ، سمن آباد، گلبرگ، شاہ جمال، فیصل ٹاؤن، شادمان، گلشن راوی، گرین ٹاؤن، جوہر ٹاؤن، ڈیفینس وغیرہ وغیرہ۔ آج سے ساٹھ باسٹھ سال پہلے پورے لاہور کا چکر چند گھنٹوں میں آسانی سے بائیسکل پر لگایا جاسکتا تھا۔ اب پورے دن میں موٹر کار پر چکر لگانا بھی مشکل ہے۔ اردگرد کے بہت سے دیہات لاہور کی لپیٹ میں آ گئے ہیں۔

☆ سنٹرل جیل اور ڈسٹرکٹ جیل کو منہدم کر کے جو نئی کالونیاں بنائی گئی ہیں، وہ ہیں شادمان کالونی اور شاہ جمال کا کچھ حصہ۔ گورنر ہاؤس کے مال روڈ والے گیٹ کے سامنے ریس کورس روڈ ہے جو جیل روڈ سے جا ملتا ہے۔ وہاں مسجد کے بالمقابل سڑک کے دوسری جانب سنٹرل جیل کی ہیبت ناک ڈیوڑھی تھی۔ میں تحریک تحفظ ختم نبوت کے زمانے (1953ء) میں دو تین دفعہ مولانا داؤد غزنوی کے ساتھ سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری، شیخ حسام الدین اور دوسرے قیدیوں سے ملاقات کے لیے وہاں گیا۔ اس جیل سے متصل مغربی جانب لاہور ڈسٹرکٹ جیل تھی۔ ان دو جیلوں میں ہزاروں لاکھوں قیدی مختلف جرائم میں قید رہے۔ ان میں ڈاکو بھی تھے، قاتل بھی تھے، چور بھی تھے، سیاسی رہنما اور سیاسی کارکن بھی تھے، انگریزی حکومت کے باغی بھی تھے، کانگرسی بھی تھے، احراری بھی تھے، کمیونسٹ بھی تھے، سوشلسٹ بھی تھے، علمائے کرام بھی تھے۔ دیگر سیاسی اور مذہبی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے بھی تھے، بے شمار لوگوں کو یہاں پھانسی دیا گیا۔ بہت سے قیدیوں

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کو جیل کے اہل کاروں نے مارا پیٹا اور انھیں سخت سے سخت سزائیں دیں۔ شادمان کی اونچی اونچی عمارتوں میں لاتعداد قیدیوں کی ہولناک چیخیں اور دردناک آہیں دبی ہوئی ہیں۔ اگر وہ چیخیں اور آہیں کسی طرح ان بنگلوں اور کوٹھیوں کے مکینوں کو سنائی دے سکیں جو رات کے سناٹوں میں ان قیدیوں کی زبانوں سے نکلتی تھیں تو مارے ڈر کے ان کا بُرا حال ہو جائے۔

☆ لاہور کا ادبی محاذ اس دور میں بڑا فعال تھا، مشاعروں کا سلسلہ جاری رہتا تھا اور لوگ بڑے شوق اور کثرت سے مشاعروں میں شامل ہوتے تھے۔ لاہور کے علاوہ دیگر مقامات کے شاعروں کو بھی دعوت دی جاتی تھی اور وہ اپنا کلام سناتے تھے۔ بے شمار مشاعروں میں ہندوستان کے بہت سے شعراء نے بھی شرکت کی اور ان کا کلام سننے کے مواقع میسر آئے۔ اس زمانے میں جگر مراد آبادی، رتن چند آزاد اور دیگر بہت سے ہندوستانی شاعروں کو دیکھا اور ان کا کلام سنا۔ پاکستانی شعراء میں سے مولانا ظفر علی خاں، ملک نصر اللہ خاں عزیز، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، نیر واسطی اور دوسرے بے شمار حضرات کے مشاعروں میں شرکت کی اور انھیں سنا۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ساٹھ باسٹھ سال پہلے کے لاہور کا حلیہ اب بالکل بدل گیا ہے، وہ محفلیں اور مجلسیں ختم ہو گئی ہیں، جنھیں طویل مدت سے لاہور کے کلچر کا لازمی حصہ سمجھا جاتا تھا۔ ان اخبارات ورسائل کا بھی خاتمہ ہو گیا، جن کا لوگ روزانہ بے تابی سے انتظار کرتے تھے اور ان کو پڑھنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ ان اخبارات میں زمیندار، انقلاب، امروز، مشرق، پاکستان ٹائمز، کوہستان وغیرہ بہت سے روزنامے شامل ہیں۔ ہفت روزوں میں چٹان، اقدام، قندیل کی بڑی مانگ تھی۔ عرصہ ہوا یہ تمام رسائل وجرائد صحافت کی تاریخ کے ملبے میں دب گئے ہیں اور لوگ ان کے نام بھی بھول گئے ہیں۔

❀❀❀❀

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ستائیسواں باب:

بہن بھائی اور اولاد

ہم چھ بھائی تھے اور تین بہنیں۔ سب مجھ سے چھوٹے تھے۔ ایک بہن ۱۹۔ دسمبر ۱۹۶۵ء کو فوت ہوگئیں۔ دوسری نے ۵۔ مئی ۲۰۰۴ء کو وفات پائی۔ ان سے چھوٹا محمد حسین تھا۔ وہ ۱۵۔ نومبر ۱۹۳۶ء کو پیدا ہوا۔ کوٹ کپورہ میں اس نے پرائمری تک تعلیم حاصل کی۔ ستمبر ۱۹۴۷ء میں ہم اپنے موجودہ گاؤں آئے تو اسے جڑاں والا کے سرکاری سکول میں داخل کرادیا گیا۔ میں ۱۹۴۸ء کے آخر میں لاہور آیا تو محمد حسین کو بھی یہیں لے آیا۔

اس نے میٹرک پاس کرنے کے بعد ادیب عالم اور پھر ادیب فاضل کا امتحان دیا۔ اس زمانے میں وائی ایم سی اے ہال میں اکاؤنٹینسی سکھائی جاتی تھی۔ یہ نو دس مہینے کا کورس تھا جو محمد حسین نے پاس کیا۔ بعد ازاں کچھ عرصہ پرائیویٹ ملازمت کی۔ اس وقت تھوڑی بہت کوشش کر کے سرکاری ملازمت مل جاتی تھی، چنانچہ محکمۂ تعلیم میں ملازمت کی کچھ صورت پیدا ہو بھی گئی۔ لیکن اس اثنا میں ہم چار آدمیوں نے مساوی رقم ڈال کر دو نئے ٹرک خرید لیے۔ محمد حسین نے ڈرائیوری سیکھ لی اور لائسنس لے لیا۔ اب اس کے ٹرک کے پہیے پشاور سے کراچی اور واہگہ سے کوئٹہ تک گھومنے لگے۔ پھر حالات ایسے پیدا ہوئے کہ وہ جڑاں والا کی حسین شوگر مل میں (جس کا شمار ایشیا کی بڑی شوگر ملوں میں ہوتا ہے) بائیلر انجینئر بھرتی ہوگیا اور ریٹائرمنٹ کے بعد پنشن پائی۔ وہ کچھ عرصے سے بیمار تھا اور اپنے اکلوتے بیٹے ناصر محمود کے پاس بہ سلسلہ علاج فیصل آباد میں مقیم تھا۔ میرے اس بھائی نے وہیں ۲۷۔ اگست ۲۰۰۷ء کو رات کے سوا دس بجے وفات پائی۔ اسی وقت اس کی میت ایمبولینس پر گاؤں لائی گئی اور دوسرے دن دس بجے اس کا جنازہ اٹھایا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

میں نے اپنے اس بھائی کی تعلیم کا انتظام بھی کیا اور کاروبار کے لیے معقول رقم بھی دی۔ وفات کے وقت اس کا دو ٹرکوں میں اچھا خاصا حصہ تھا جو اب بھی ہے۔ شوگر مل سے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

ریٹائرمنٹ کے بعد اسے پنشن بھی ملتی تھی۔ وہ پنشن اب اس کی بیوہ کو ملتی ہے۔ اس نے اپنے اہل وعیال سمیت عمرے کا پروگرام بنایا تھا اور عمرے کا ویزا لگ گیا تھا۔ لیکن پیغام اجل آ گیا اور عمرے کے بجائے وہ بارگاہِ الٰہی میں پہنچ گیا۔ اس کی وفات پر میں نے اس کے متعلق مضمون لکھا تھا جو اخبار ''الاعتصام'' کی دو قسطوں (۲۹ نومبر اور ۶ دسمبر ۲۰۰۷ء) میں چھپا۔ اس کا عنوان تھا: ''میرا بھائی محمد حسین بھٹی'' مضمون کا آخری حصہ ملاحظہ فرمایئے:

''محمد حسین کی وفات بھی عجیب طرح ہوئی جو یقیناً قابل رشک ہے۔ ۲۷۔ اگست ۲۰۰۷ء کو نماز عشا کے بعد اس کے پوتے پوتیاں یعنی ناصر محمود کے بچے اس کی چارپائی پر بیٹھے (اپنے دادا سے) باتیں کر رہے تھے۔ دادا بھی خوش اور پوتے پوتیاں بھی خوش۔ دس بج کر چند منٹ ہوئے تھے کہ ناصر نے ان سے کہا: ''ابا جی آپ سو جائیں''۔ کہا: ''میں سو جاتا ہوں'' تم بچوں کو سلا دو۔'' ناصر بچوں کو مکان کی چھت پر لے گیا۔ انھیں چھوڑ کر دو تین منٹ کے بعد واپس آیا تو کہا: اب آپ سو جائیں جواب دیا: اچھا سو جاتا ہوں۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ۔ یہ آخری الفاظ تھے جو اس کی زبان سے نکلے۔ خود بخود ہاتھ پاؤں سیدھے ہو گئے۔ آنکھیں بند ہو گئیں اور میرا بھائی محمد حسین ہمیشہ کے لیے سو گیا۔ یہ شب کے ٹھیک سوا دس بجے کا وقت تھا۔'' ناصر نے اسی وقت بذریعہ ٹیلی فون لوگوں کو اطلاع دینا شروع کر دی۔ سب سے پہلے دس بج کر پچیس منٹ پر ہمیں اطلاع ہوئی۔ چھوٹے بھائی کی موت کی اطلاع سے جو اثرات قلب و ذہن پر ابھرے، انھیں لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ان اثرات کے آثار اب تک سطح قلب پر مرتسم ہیں، بلکہ مستقبل کے متعلق بعض معاملات ذہن میں آتے ہیں تو وہ آثار مزید نمایاں ہو جاتے ہیں۔

''ہمارے گھر کا غم زدہ قافلہ رات کے دو بجے لاہور سے روانہ ہوا۔ کھڑیاں والا پہنچے تو فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ وہیں جڑاں والا کو جانے والی سڑک کے بائیں جانب مسجد میں نماز پڑھی اور پانچ بجے ہماری گاڑی گھر پہنچی۔ میرے بھائی کی میت فیصل آباد سے ایمبولینس کے ذریعے ہمارے جانے سے پہلے آ چکی تھی۔ میرا

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

بھائی ہمارے وہاں پہنچنے سے سات گھنٹے پہلے سوا دس بجے کلمہ توحید پڑھ کر سویا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ مجھے دیکھ کر احترام سے کھڑا ہو جاتا اور آگے بڑھ کر سلام کرتا، لیکن آج آنکھیں بند کیے اور زبان پر خاموشی طاری کیے چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ اس نے خود تو سلام کیا کرنا تھا، میرے سلام کا جواب بھی نہیں دیا۔ میں نے اسے دیکھ کر کہا: تم تو اپنے اہل و عیال سمیت عمرے پر جارہے تھے، تمھارے ویزے لگ چکے تھے، لیکن تم مکے اور مدینے کے بجائے کسی اور ہی طرف جارہے ہو۔ اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ عمرے کا ویزا عارضی تھا اور یہ پکا ویزا ہے۔ عمرے کے بعد وہاں سے نکل جانا ضروری تھا، لیکن اب تم جہاں جارہے ہو، وہاں سے تمھیں کوئی نہیں نکال سکے گا۔ تم نے اپنے اس سفر پر روانہ ہوتے وقت کلمۂ توحید پڑھا ہے اور یہ کلمہ ان شاء اللہ تمھارے لیے جنت میں داخلے کا ذریعہ ثابت ہوگا اور عمرہ نہ کرنے کے باوجود تمھیں اللہ کی بارگاہ سے عمرے کا ثواب ملے گا۔

''محمد حسین کا جنازہ اس کی وفات سے پونے بارہ گھنٹے کے بعد (۲۸۔ اگست ۲۰۰۷ء کو) دن کے دس بجے اٹھایا گیا۔ میں نے اس کے سرھانے کا بائیں جانب کا پایہ پکڑا۔ تین اور شخص تھے، جنھوں نے تین پائے پکڑے اور ہم چار آدمیوں نے چارپائے ابھی کندھوں پر اٹھائے ہی ہوں گے کہ بے شمار لوگ پائے پکڑنے کے لیے ہماری طرف بڑھے۔ جنازہ اپنے آخری مقام کی طرف روانہ ہوا اور لوگوں کا ایک ہجوم تیزی کے ساتھ اس کے دائیں بائیں اور پیچھے چلنے لگا۔ اس ہجوم میں علماء بھی تھے، صلحاء بھی تھے، امراء بھی تھے، غرباء بھی تھے۔ خواص بھی تھے اور عوام بھی تھے۔ مختلف سیاسی افکار کے حاملین بھی تھے۔ چھوٹے بھی تھے اور بڑے بھی تھے۔ جنازے کے بعد تدفین کا مرحلہ آیا تو قبر پر دعا کی گئی۔ اس وقت اگرچہ بہت سے لوگ واپس آگئے تھے، تاہم بڑی تعداد میں لوگ موجود تھے۔ گاؤں کے لوگوں کے علاوہ لاہور، فیصل آباد، جڑاں والا، ستیانہ اور اردگرد کے دیہات کے بے شمار لوگ تھے جو معاشرے کے ہر طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔

''رات تک دیہات کے لوگ تعزیت کے لیے آتے رہے اور کئی دن یہ سلسلہ جاری

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

رہا۔ جیسے جیسے اس سے تعلق رکھنے والوں کو اس کی وفات کا پتا چلتا گیا، ان کی آمدورفت جاری رہی۔

''دوسرے دن لاہور کے ایک صحافی دوست نے لاہور کے اخباروں میں خبر لگوا دی تھی۔ خبر چھپنے کی وجہ سے تعزیت کرنے والوں کا سلسلہ مزید وسیع ہو گیا۔ میں گاؤں سے واپس لاہور آیا تو مختلف حلقوں کے دوستوں میں سے بعض نے ٹیلی فون کیے، بعض نے تعزیتی خطوط لکھے اور بعض گھر تشریف لائے۔ گھر تشریف لانے والوں میں متعدد علمائے کرام اور بعض صوبائی وزیر بھی تھے۔ ٹیلی فون کرنے والوں میں بھی بعض وزیروں کے نام شامل ہیں۔ مکہ مکرمہ سے بھی بعض حضرات کے تعزیتی ٹیلی فون آئے۔ کویت اور ہندوستان کے چند دوستوں نے بھی تعزیت کی۔

''روزناموں کے علاوہ ہفت روزہ اور ماہانہ رسائل و جرائد میں بھی نمایاں طور پر میرے بھائی محمد حسین بھٹی کی وفات کی خبر شائع ہوئی اور ان اخبارات کے عملے کے ارکان ہمارے غم میں شریک ہوئے۔ تعزیت کرنے والے لاتعداد دوست ہیں۔ سب کے نام لکھنا ممکن نہیں اور یہ بھی مناسب نہیں کہ کچھ لوگوں کے نام لکھ دیے جائیں اور کچھ کے نہ لکھے جائیں۔ ہم لوگ تعزیت کرنے والے تمام حضرات کے بے حد شکر گزار ہیں۔

''دعا ہے اللہ تعالیٰ میرے بھائی محمد حسین بھٹی کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور ہم لوگوں کو صبر کی توفیق سے نوازے۔ آمین یا رب العالمین''

اس طویل مضمون کی یہ آخری سطور ہیں جو ''الاعتصام'' کے دو شماروں میں چھپا۔

محمد حسین کا بیٹا ناصر محمود ہے۔ وہ چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا کہ میں اسے لاہور لے آیا۔ اس نے یہاں ایف اے تک تعلیم پائی۔ بعد ازاں کراچی چلا گیا۔ وہاں بی اے کا امتحان دیا۔ پھر جلال پور پیر والا کے دارالحدیث محمدیہ میں دینیات کا نصاب مکمل کیا۔ محمد حسین کا ایک بیٹا یاسر محمود کشمیر میں شہید ہو گیا تھا۔

میرے ایک بھائی طارق محمود نے جڑاں والا کے ایک ہائی سکول میں میٹرک پاس کیا۔ پھر میں اسے لاہور لے آیا۔ یہاں اس نے بی اے کا امتحان دیا۔ نتیجہ ابھی نہیں نکلا تھا کہ میرے ایک دوست (جو واپڈا کے ایک شعبے کے ڈائریکٹر تھے) ملاقات کے لیے میرے گھر

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

آ ئے۔ انھوں نے طارق محمود سے تعلیم کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا تو کہا کہ تم ملازمت کرنا چاہتے ہو تو کل میرے دفتر آ جاؤ اور کام شروع کر دو۔ وہ کلرک بھرتی ہوا تھا۔ اب اپنے شعبے کا سپرنٹنڈنٹ ہے۔ میں نے نہ کبھی محمد حسین سے کوئی پیسا لیا، نہ طارق سے! ان کی کمائی سے تو کیا لینا تھا، کبھی ادھار بھی نہیں لیا۔

میرے ایک بھائی محمد حنیف کے ایک بیٹے کا نام عمار ہے۔ بی اے کا امتحان دیا۔ ملنسار اور ماشاء اللہ خوب صورت نوجوان ہے۔ سب سے چھوٹا بھائی حکیم حامد محمود ہے۔ اس نے جڑاں والا سے میٹرک کرنے کے بعد فیصل آباد کے طبیہ کالج میں داخلہ لیا اور چار سالہ کورس مکمل کیا۔ پھر جڑاں والا کے سرکاری ہسپتال میں بہ طور حکیم ملازمت کرنے لگا۔ اس کے بعد اس کا تبادلہ سمندری کے سرکاری ہسپتال میں ہو گیا۔ بعد ازاں کئی سال جڑاں والا کے ہسپتال میں رہا۔ پھر پانچ چھ سال بچی کی (ضلع ننکانہ) کے سرکاری ہسپتال میں رہا۔ اب وہ جڑاں والا کے سرکاری ہسپتال میں خدمت انجام دیتا ہے۔

میرے ایک بھانجے کا نام محمد انور ہے۔ بہت سال ہوئے اس کے لیے بھی میں نے لاہور کے ایک سرکاری محکمے میں ملازمت کا انتظام کر دیا تھا اور وہ دفتر بھی جانے لگا تھا، لیکن اس کے والد مرحوم عبدالشکور نمبردار اسے گاؤں لے گئے۔ والد کی وفات کے بعد وہ ان کی جگہ نمبردار بنا۔

اس سے چھوٹا منور علی ہے۔ وہ جڑاں والا سے بی اے پاس کرنے کے بعد کراچی چلا گیا تھا۔ وہیں اس نے ایم اے (اسلامیات) اور ایم اے (سیاسیات) کیا۔ وہیں ایل ایل ایم کا امتحان دیا۔ میرے ایک دوست محمد فرید الحق کراچی کے مشہور وکیل تھے، کچھ عرصہ ان کے ساتھ رہا۔ سندھ ہائی کورٹ میں دس سال وکالت کی۔ پھر سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔ آج کل اسلام آباد میں سیکیورٹیز اینڈ ایکسچینج کمشن آف پاکستان کے اعلیٰ عہدے پر فائز ہے۔ میں کسی سیمینار یا میٹنگ میں اسلام آباد جاؤں تو عام طور سے میرا قیام منور کے گھر ہوتا ہے۔ اس کی اہلیہ ہماری عزیزہ ہے۔ منور سے چھوٹا محمد زبیر ہے۔ اور ہمارے گاؤں کے سکول میں ٹیچر ہے۔

میری دو بیٹیاں ہیں۔ ایک کی شادی گاؤں میں ہوئی اور ایک کی بہاول نگر میں۔ دونوں ماشاء اللہ بال بچوں والی ہیں اور اپنے اپنے گھر میں خوش ہیں۔ عاجزانہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں ہمیشہ خوش رکھے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے آج تک مجھے کسی رشتے دار کا احسان مند نہیں کیا۔ کبھی کسی سے ایک پیسا ادھار نہیں لیا۔ کبھی کسی کو اپنے کسی کام کے لیے نہیں کہا۔ رشتے داروں اور دوستوں کے کام البتہ بہت کیے۔ سب سے خوش طبعی سے ملتا ہوں۔ اپنے عزیزوں، بچیوں، بہن بھائیوں، بڑوں، چھوٹوں سب کے حقوق ادا کرنے کی پوری کوشش کرتا ہوں۔

اب میں اپنی ”جائداد“ اور آمدنی سے بھی اپنے قارئین کو مطلع کرنا چاہتا ہوں۔ لاہور کے علاقہ سانده میں پانچ مرلے کے مکان میں ہم دو بھائی رہتے ہیں۔ ایک میں اور ایک مجھ سے چھوٹا سعید احمد جو چار سال کی عمر میں میرے پاس لاہور آ گیا تھا۔ اس نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ پھر اپنے کاروبار میں مصروف ہو گیا۔ آدھا مکان میرا ہے اور آدھا اس کا۔ بلکہ اگر صحیح طریقے سے حساب کیا جائے تو آدھے سے زیادہ اس کا ہے۔ زمین کی قیمت کے علاوہ اس کی تعمیر، پلستر اور بجلی، سوئی گیس وغیرہ کی وائرنگ وغیرہ سب اسی کے خرچ اور محنت سے ہوئی۔ اگر میرا کوئی حقیقی بیٹا ہوتا تو شاید میری اتنی خدمت نہ کرسکتا جو سعید اور اس کے بیوی بچوں نے کی اور کررہے ہیں۔ میری اتنی ڈانٹ بھی وہ برداشت نہ کرسکتا جو یہ کررہے ہیں۔

میں قلم کا مزدور ہوں اور میری آمدنی کا ذریعہ یہی قلم کی مزدوری ہے۔ اور اللہ کے فضل سے بہت مناسب مزدوری ہے۔ دماغی کام کرنا اور لکھنا لکھانا بہت مشکل ہے۔ اور یہ مشکل کام اللہ نے میرے لیے آسان کردیا ہے۔

پانچ مرلے کا میرا ایک پلاٹ گاؤں میں ہے۔ بہت سال ہوئے، میں نے بھتے سے کئی ہزار اینٹیں خرید کر اس پلاٹ میں رکھوائی تھیں کہ دو کمرے رہائش کے لیے اور ایک بیٹھک تعمیر کراؤں گا تاکہ گاؤں جاؤں تو بہن بھائیوں کو تکلیف دینے کے بجائے اپنے چھوٹے سے مکان میں رہوں۔ مطالعہ کے لیے وہاں کتابیں بھی رکھوں گا۔ لیکن وہ اینٹیں لوگ اٹھا کر لے گئے اور میں صرف ایک چھوٹا سا کمرہ تعمیر کرا سکا۔

ہماری موروثی زرعی زمین جو ہندوستان سے آئی، سب بہن بھائیوں کی مشترکہ جائداد ہے۔ اس میں سے مرلوں کے حساب سے میرے حصے میں آئے گی۔

میں کتابیں خریدتا رہتا ہوں۔ چند روز پیشتر سولہ ہزار روپے کی کتابیں خریدیں۔ مختلف موضوعات کی تین ہزار کے پس و پیش کتابیں ہوں گی جو بالعموم میرے مطالعہ میں رہتی ہیں۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

بس میری کل جائداد یہی ہے۔

دوستوں کی میرے گھر آمد ورفت رہتی ہے۔ ان سے مل کر اور اپنی توفیق کے مطابق ان کی خدمت کر کے بے حد مسرت محسوس کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ یہ دوست میری بہت بڑی دولت ہیں اور ان کا اخلاص میرا اصل سرمایۂ حیات ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ یہ سرمایہ ہر صورت میں محفوظ رہے۔ میرے بہت سے پرانے ساتھی، جن کا تعلق لاہور، فیصل آباد، میرے گاؤں اور دیگر مختلف مقامات سے تھا، وفات پا گئے، مجھے ان کی وفات کا بے حد افسوس ہے۔ وہ مجھے بہت یاد آتے ہیں۔

میری بیوی میرا بہت خیال رکھتی تھی۔ میں اپنی چھوٹی سی لائبریری میں لکھنے پڑھنے میں مصروف ہوتا تو تھوڑی دیر کے بعد مجھے چائے وغیرہ کے لیے پوچھتی یا کسی بچے کو بھیجتی کہ مجھے کسی چیز کی ضرورت ہے یا نہیں۔ وہ سبزی وغیرہ مجھ سے پوچھ کر منگواتی تھی لیکن میں کھانے پینے میں نخروں کا عادی نہیں، جو ملا اللہ کا شکر کر کے کھالیا۔

میرے زیادہ تر دوستوں کا اسے علم تھا۔ وہ ان کے نام بھی جانتی تھی۔ کوئی دوست ملاقات کے لیے آتا تو موسم کے مطابق اس کے لیے چائے پانی کا انتظام کرتی۔ کھانے کا وقت ہوتا یا نہ ہوتا، اس کے متعلق ضرور پوچھتی۔ بعض دوست کہا کرتے تھے کہ بھٹی صاحب گھر پر ملیں یا نہ ملیں روٹی چائے تو مل ہی جاتی ہے۔ کوئی دوست کچھ دن نہ آتا تو پوچھتی کہ آپ کا فلاں دوست نہیں آیا۔ اس کا پتا کرو خیریت سے ہے۔ میرے دوستوں کو کھلانے پلانے سے اسے خوشی ہوتی تھی۔

عام طور سے عورتیں اپنے بھائیوں اور بہنوں کے بچوں کی بڑی تعریف کرتی ہیں۔ میری فلاں بہن کے بچے اتنے لائق ہیں اور اتنے پیسے کماتے ہیں، اتنی ان کی تعلیم ہے۔ فلاں بھائی کی اولاد بڑی لائق ہے۔ اس سلسلے میں بعض عورتیں بہت مبالغے سے کام لیتی ہیں اور بڑھا چڑھا کر ان کے متعلق باتیں کرتی ہیں۔ اپنے خاوند کے بھتیجے بھتیجیوں اور بھانجے بھانجیوں کا ذکر بہت کم کرتی ہیں۔ لیکن میری بیوی کا معاملہ اس سے الٹ تھا۔ وہ اپنے بھانجے بھانجیوں کے بجائے میرے بھانجے بھانجیوں، بھتیجے بھتیجیوں اور میرے بھائیوں اور بہنوں کا خیال رکھتی تھی۔

کئی سال ہوئے اسے پھوڑا نکلا۔ ایک لیڈی ڈاکٹر سے علاج کرایا لیکن آرام نہ آیا۔ اس اثنا میں اتفاقاً میرے ایک ڈاکٹر دوست ملاقات کے لیے آئے۔ میں نے ان سے پھوڑے کے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

بارے میں بات کی تو کہا پیشاب ٹیسٹ کراؤ، پتا چلے کہ پھوڑا شوگر کا تو نہیں۔ پیشاب ٹیسٹ کرایا تو معلوم ہوا کہ شوگر کا عارضہ لاحق ہو گیا ہے۔اسی اثنا میں میرا چھوٹا بھائی حکیم حامد محمود آیا تو اس نے کوئی دوا بنا کر دی، چند روز میں پھوڑے سے اللہ نے نجات دلا دی۔اب شوگر کے لیے ڈاکٹر محمد راشد رندھاوا سے رجوع کیا گیا۔شادماں میں جیل روڈ پر رندھاوا کلینک کے نام سے ان کا بہت بڑا کلینک ہے اور وہ دل کی بیماریوں اور شوگر کے ماہر معالج ہیں۔ان سے باقاعدہ علاج شروع ہو گیا۔وہ خود بھی ایک دو مرتبہ گھر تشریف لائے اور مریضہ کو دیکھا۔علاج میں بالکل سستی نہیں ہوئی۔ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق پرہیز بھی جاری رہا اور علاج بھی۔

بیماری کا سلسلہ پندرہ سال سے زیادہ مدت میں پھیل گیا۔اس طویل مدت میں بیماری بہت سے نشیب و فراز سے گزری۔ایسا بھی ہوا کہ مسلسل کئی کئی راتیں ہم سو نہیں سکے۔دن کو بھی یہی صورت حال رہی۔کبھی مریضہ کی ٹانگوں میں درد کی شدت آ گئی۔کبھی پیٹ میں تکلیف ہو گئی۔کبھی سانس کا عارضہ لاحق ہو گیا۔کبھی کوئی اور معاملہ پیش آ گیا۔اس قسم کے موقعے پر کسی سے مدد نہیں لی جا سکتی، بس اللہ ہی مدد کرنے والا ہے۔اس شدید تکلیف اور بے آرامی کے مواقع پر میرے بھائی سعید، اس کی بیوی اور اس کے بچوں نے اس کی بے حد خدمت کی۔سعید کی بیوی میری بیوی کی سگی بھانجی ہے۔بارہا ایسا ہوا کہ مریضہ ان سب خدمت گزاروں کو سخت الفاظ میں ڈانٹتی اور بعض اوقات ان کا شکریہ ادا کرتی اور انھیں دعائیں دیتی۔ان کی خدمت سے متاثر ہو کر اور اپنی تکلیف سے تنگ آ کر کبھی اس کی آنکھوں سے آنسو بھی جاری ہو جاتے اور کبھی ان کے ساتھ ہنسی مذاق کی باتیں کرنے لگتی۔

ڈاکٹر صاحب نے شریان میں لگانے کے لیے ایک ٹیکہ لکھ کر دیا۔دوسرے ٹیکے تو سعید کی بڑی بیٹی قدسیہ لگا دیتی تھی۔لیکن شریان میں ٹیکہ لگانا اس کے لیے مشکل تھا۔ہمارے ایک عزیز عبدالقدیر ہومیو پیتھی ڈاکٹر ہیں اور ان کا مکان ہمارے قریب ہے۔ٹیکہ روزانہ یا دوسرے دن لگانا ہوتا تھا۔عبدالقدیر بھٹی سرکاری ملازمت کرتے ہیں، وہ وقتِ مقررہ پر خود ہی آ جاتے اور ٹیکہ لگاتے۔ان کو وہ بڑی دعائیں دیتی۔

جون ۲۰۰۸ء میں اللہ تعالیٰ نے اس فقیر کو عمرے کی توفیق دی تو بہت خوش تھی۔عمرے سے فارغ ہو کر کویتی دوستوں کی دعوت پر میں کویت چلا گیا۔مکہ مکرمہ سے بھی، مدینہ منورہ سے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

بھی اور کویت سے بھی، میں نے ٹیلی فون کے ذریعے سے گھر رابطہ قائم رکھا۔

۱۵۔ جولائی کو واپس آیا، مریضہ کی طبیعت بیماری کے باوجود بہتر تھی۔ لیکن ایک ہفتے کے بعد حالت کچھ بگڑ گئی۔ ڈاکٹر صاحب کو اطلاع دی گئی تو انھوں نے فرمایا فوراً یہاں لے کر آؤ۔ انھوں نے دیکھا اور علاج معمول کے مطابق جاری رہا۔ لیکن تکلیف میں اضافہ ہوتا گیا۔ ۳۔ اکتوبر کو جمعے کا دن تھا۔ نماز کے بعد مسجد میں ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی تو مریضہ کا حال پوچھا۔ میں نے بتایا کہ طبیعت ٹھیک نہیں۔ فرمایا کل ضرور لے کر آؤ۔ سب ٹیسٹ دوبارہ کریں گے۔ رات کو بچوں نے مریضہ کو بتایا کہ ڈاکٹر صاحب نے کل آپ کو کلینک آنے کے لیے کہا ہے۔ بولی مجھے صبح جلدی جگا دینا تاکہ میں جانے کے لیے تیار ہو جاؤں۔ اس کے بعد رات آئی اور گزر گئی۔ صبح ہوئی اور ختم ہوگئی۔ لیکن مریضہ نے کوئی بات نہیں کی۔ بالکل خاموشی طاری رہی۔ حالت ایسی ہوگئی تھی کہ میں اسے ڈاکٹر صاحب کے کلینک نہیں لے جانا چاہتا تھا، لیکن افرادِ خانہ مصر تھے کہ ضرور لے جائیں گے۔ نہ اٹھنے کی طاقت، نہ بیٹھنے کی ہمت، نہ بات کرنے کی سکت۔ بہر حال افرادِ خانہ کے اصرار پر پک اپ لائی گئی۔ اس میں چارپائی رکھی اور ہم اسے ڈاکٹر رندھاوا صاحب کے کلینک میں لے گئے۔ پھر چارپائی پر ہی وہاں لے کر گئے، جہاں ان کے ٹیسٹ وغیرہ کے آلات نصب ہیں۔ کئی مریض بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے سب کو چھوڑا اور ہماری مریضہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ ٹیسٹوں کے بعد ای سی جی کا عمل شروع ہوا۔ یہ عمل جاری تھا کہ ایک بج کر اٹھاون منٹ پر مریضہ نے اس دنیا میں آخری سانس لیا اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اللہ کے دربار میں پہنچ گئی۔ نہ ڈاکٹر اسے ادھر جانے سے روک سکے۔ نہ ہم میں سے کوئی دم مار سکا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ ہفتے کا دن تھا اور تاریخ تھی ۴۔ اکتوبر ۲۰۰۸ء۔

میرے ذہن میں یہ خیال آرہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب ہمیں فارغ کریں اور ہم جلد از جلد مریضہ کو گھر لے جائیں۔ لیکن وہی ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے۔ اس کی زندگی کا خاتمہ وہیں ہونا تھا اور وہیں ہوا۔ اللھم اغفر لھا وارحمھا وعافھا واعف عنھا۔

ڈاکٹر صاحب کے کلینک ہی سے میرے بھائی سعید احمد نے اخبار ''الاعتصام'' کے دفتر حافظ احمد شاکر کو ٹیلی فون پر وفات کی اطلاع دی اور بتایا کہ نمازِ عصر کے بعد یہاں جنازہ پڑھا کر پانچ بجے ہم میت کو لے کر گاؤں روانہ ہو جائیں گے۔ وہ جن حضرات کو آسانی سے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

جنازے میں شمولیت کی اطلاع دے سکتے ہیں، دے دیں۔ چنانچہ انھوں نے مہربانی کی اور دوستوں کو جنازے کے وقت اور مقام سے مطلع کیا۔

ہم میت کو گھر لے کر آئے تو بہت سے حضرات یہاں تشریف لے آئے تھے۔ کچھ لوگ گاؤں سے عیادت کے لیے بھی آئے تھے۔ تقریباً پانچ بجے جنازہ حافظ احمد شاکر نے پڑھایا اور ہم نے چھ بجے الدعوہ کی ایئرکنڈیشن ایمبولینس پر میت کو رکھا اور گاؤں کو روانہ ہو گئے۔ حافظ احمد شاکر، ان کے صاحب زادے حافظ خلاد شاکر اور اخبار ''الاعتصام'' کے مینیجر جناب محمد سلیم بھی ساتھ گئے۔ گاؤں اطلاع ہو چکی تھی۔ ہم نو بجے گاؤں پہنچے۔ وہاں لوگوں کا ہجوم جمع تھا۔ گاؤں کے علاوہ لاہور، جڑاں والا، فیصل آباد سے جامعہ سلفیہ کے اساتذہ، متعدد تاجران و ناشرانِ کتب، فیصل آباد کی طارق اکیڈمی کے مالک و منتظم اور ان کے ساتھی، ستیانہ بنگلہ، چک نمبر ۳۶، بہاول نگر، اسلام آباد، راولپنڈی، بورے والا اور دیگر مختلف مقامات کے لوگ کثیر تعداد میں موجود تھے۔ رات کا وقت تھا اور پاکستان میں بجلی کی لوڈشیڈنگ کا جو معاملہ ایک عرصے سے چل رہا ہے، وہ سب کو معلوم ہے۔ بہت سے عمر رسیدہ اور کم زور افراد نے جو اس وقت جنازگاہ تک نہیں جا سکتے تھے، پیغام بھجوایا کہ ہماری رعایت سے جنازہ مسجد میں پڑھایا جائے۔

ہمارے گاؤں کی جامع مسجد کافی بڑی ہے۔ وہ لوگوں سے بھر گئی تھی۔ مسجد کی چار دیواری سے باہر بھی خاصی تعداد میں لوگ موجود تھے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ دس ہزار آدمی جنازے میں شامل ہیں۔ کسی نے آدمیوں کو گنا تو نہیں، اتنے تو شاید نہیں ہوں گے، تاہم بہت لوگ تھے اور گاؤں کے اعتبار سے بہت بڑا جنازہ تھا۔ پھر رات کا وقت۔

نماز جنازہ مولانا عبداللہ امجد (شیخ الحدیث دارالدعوۃ السلفیہ ستیانہ) نے پڑھائی۔ مولانا ممدوح کا شمار ہمارے قریب ترین رشتے داروں میں ہوتا ہے۔ ان کی حیثیت ماشاء اللہ استاذ الاساتذہ کی ہے۔ علم و فضل کے علاوہ اللہ نے ان کو تقویٰ و صالحیت کی نعمت سے بھی نوازا ہے۔ وہ عمر میں مجھ سے دس گیارہ سال چھوٹے ہوں گے، لیکن مَیں ان کی علمیت، ان کے طریق تدریس، ان کے طرزِ بیان اور ان کے تدین سے بہت متاثر ہوں اور ان کا بے حد احترام کرتا ہوں۔

دس بجے جنازہ پڑھا گیا اور تقریباً گیارہ بجے تدفین ہوئی۔ دوسرے دن لاہور اور فیصل آباد کے اخباروں میں وفات اور جنازے کی خبر آ گئی تھی۔ ہم گاؤں ہی میں تھے کہ ایک دوست

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

کا لندن سے تعزیتی ٹیلی فون آیا۔ دوسرے اور تیسرے دن بھی فیصل آباد اور دیگر مقامات سے دوستوں کی آمد ورفت رہی۔ فیصل آباد کے جو دوست جنازے میں شامل تھے، ان میں سے متعدد حضرات دوسرے دن بھی تشریف لائے۔ ہم لاہور آئے تو مختلف مقامات سے تعزیت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ تعزیت کرنے والے پاکستانی حضرات بھی تھے اور پاکستان سے باہر کے بھی! ٹیلی فون پر بھی اور خطوط کے ذریعے بھی یہ سلسلہ چلا جو کئی روز جاری رہا۔ میرے جو دوست تحریر و نگارش سے تعلق رکھتے ہیں یا میری کتابوں کے قاری ہیں، وہ پاکستان کے علاوہ بعض عرب ملکوں میں بھی رہتے ہیں، قارئین میں ہندوستان کے باشندے بھی ہیں، انگلستان اور امریکہ کے بعض مقامات میں بھی میرے قارئین سکونت پذیر ہیں۔ ان میں سے بعض نے مجھے تعزیتی خطوط لکھے اور بعض نے ٹیلی فون کیے۔ میں سب حضرات کا شکر گزار ہوں۔

میری بیوی کا ایک ہی بھائی تھا جس کا نام محمد اسرائیل تھا۔ وہ کئی سال ہوئے فوت ہو گیا تھا۔ اس کی چھ بیٹیاں ہیں، نرینہ اولاد کوئی نہیں۔ اس کا بھی اسے بہت احساس تھا۔

وہ اپنی مالی حالت کے مطابق (بلکہ بسا اوقات اس سے بڑھ کر) کسی کو بتائے بغیر مستحقین کی امداد کرتی رہتی تھی۔ یہ اس کا عمل خیر ان شاء اللہ بارگاہِ الٰہی میں ضرور درجۂ قبولیت کو پہنچا ہوگا۔ میں اپنی داستانِ حیات کے نقطۂ اختتام تک پہنچ گیا ہوں۔

میری تاریخ پیدائش ۱۵۔ مارچ ۱۹۲۵ء ہے۔ اس حساب سے عیسوی سال کے مطابق میرا کاروان حیات آج تک پانچ دن کم ۸۴ برس کا لمبا سفر طے کر چکا ہے۔ اس میں طفولیت کی منزل بھی آئی، نوجوانی کا مرحلہ بھی آیا۔ جوانی کا دور بھی آیا۔ کہولت کا عہد بھی آیا اور اب پیری کے شب و روز سے گزر رہا ہوں۔ لیکن پیچھے کو گردن موڑ کر دیکھتا ہوں تو زندگی کے پورے سفر کا چھوٹا بڑا کوئی نشان دکھائی نہیں دیتا اور کوئی چیز کہیں نظر نہیں آتی۔ سب معاملہ ناپائدار اور تمام سلسلے عارضی اور بے مقصد۔ وقت گزرنے کے ساتھ سب ختم۔

سفر کرتے ہوئے ہم راستے میں کہیں رک کر پیچھے کو گردن موڑ کر دیکھتے ہیں تو وہ تمام چیزیں صاف نظر آتی ہیں جو ہم پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ درخت بھی، فصلیں بھی، کھیت بھی، راستے کے چھوٹے بڑے مقامات بھی اور اس کے نشیب و فراز بھی۔ لیکن زندگی کے وہ لمحات جو سفر کے ساتھ ساتھ گزر رہے ہیں اور ہر آن ہماری رفاقت میں رہتے ہیں، کہیں نظر نہیں

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

آتے۔ یعنی ہر چیز کی کوئی حیثیت ہے اور وہ اپنی حیثیت کے مطابق موجود ہے، لیکن انسانی زندگی اور انسان کے لمحاتِ حیات کی کوئی حیثیت اور کوئی وقعت نہیں۔

میں نے گزشتہ صفحات میں اپنے طویل لیل و نہار میں بیتے ہوئے، وہ واقعات بیان کرنے کی کوشش کی ہے جو قلم کی رفتار کے ساتھ ساتھ میرے ذہن میں آتے گئے۔ میں ان واقعات کو ''گزر گئی گزران'' سے تعبیر کرتا ہوں۔ بہت سے واقعات میری بعض کتابوں میں بعض شخصیات کے ضمن میں بیان کیے جا چکے ہیں، مثلاً ارمغان حنیف میں، نقوش عظمت رفتہ میں، بزم ارجمنداں میں، قافلہ حدیث اور کاروان سلف میں یا ہفت اقلیم اور بعض دیگر تصانیف میں۔

ان واقعات کو آپ ''در حدیث دیگراں'' کا نام دے سکتے ہیں۔ میں نے کوشش کی ہے کہ وہ واقعات اس کتاب میں بیان نہ کیے جائیں۔ لیکن کوشش کے باوجود کہیں کہیں ان میں سے بعض واقعات ضبط تحریر میں آ گئے ہیں۔ یہ ایک مجبوری تھی۔ تاہم میں نے وہاں الفاظ بدلنے یا اختصار سے کام لینے کی کوشش کی ہے۔ اگر کہیں وہی الفاظ آ بھی گئے ہیں تو ہر ایک نے تو وہ کتابیں نہیں پڑھیں۔ پڑھی بھی ہوں تو دوبارہ پڑھنے میں کیا حرج ہے۔

اب میں قرآن کے ان دعائیہ الفاظ کے ساتھ آپ سے رخصت ہوتا ہوں:

﴿فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ﴾ (یوسف: ۱۰۱)

۱۰۔ مارچ ۲۰۰۹ء

محمد اسحاق بھٹی

اسلامیہ کالونی، ساندہ۔ لاہور

ٹیلی فون: 042-37143677

❀❀❀❀

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ